گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

دسمبر 2017

نگران اعلیٰ

معراج رسول



مایہ ناز رائٹر سیما مناف کی بزم میں خوشگوار ا...

کراچی

پاکیزہ

ان اعلیٰ : معراج رسول

یرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد





رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

سالانہ (اندرون ملک) 800 روپے......

جلد 45 شمارہ: 09 دسمبر 2017ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات



Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام: السلام علیکم......

تمام ملت اسلامیہ کو جشن عید میلا دالنبیؐ مبارک ہو۔

یہ وہ متبرک ساعتیں ہیں کہ جب خورشید نبوت کی تابنا کیوں سے ظلمت کے اندھیرے چھٹے، کفر وشرک کے آتش کدے بجھے اور جہالت وگمراہی کی گھٹاٹوپ سیاہی ایک روشن ومنور صبح میں ڈھلی اور رحمت العالمین کا ثمر بار سایہ دنیائے عالم پرضوفگن ہوا۔

آپ کی ذاتِ اقدس وجہ تخلیق کائنات ہے قرآن پاک میں جہاں اطاعت الٰہی کا بیان ہے وہیں اطاعتِ ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بھی ذکر بابرکت ہے۔ تمام مسلمانانِ عالم پر پیروی نبی اکرمؐ فرض ہے۔

امت محمدی کہلانے کے صحیح حقدار ہم اسی وقت ہوسکتے ہیں جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر مکمل عمل کریں جیسا کہ آل رسول اور اصحاب پاک رسول کی زندگیوں سے ثابت ہے۔ زبان سے تو آپ کی نبوت کی گواہی ہم ہر وقت دیتے ہیں مگر عمل سے ثابت نہیں کرتے۔

آج معاشرے میں بے راہ روی، ذہنی انتشار، اخلاقی گراوٹ اور نفسانفسی اسی بنا پر بڑھتی جارہی ہے کہ ہم دین میں اپنی مرضی کے معنی ومطالب اور تاویلیں نکال رہے ہیں۔ جو رسول خُلق عظیم کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں انہی کی امت کے دعویدار ہونے کے باوجود ہم انتہا درجے کی بداخلاقی، بدکلامی، بدسلوکی، بے اعتنائی وخودغرضی، کبرونخوت، شر وفساد اور نسلی و طبقاتی امتیاز کے مظاہرے سرِعام کرتے ہیں اور پھر بھی رحمت العالمین سے شفاعت کے طلب گار ہیں۔

عزیز قارئین سال **2017**ء کا سورج حسب معمول غروب ہونے کو ہے تو کیوں نہ اس ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ ہم اپنے روحانی عیبوں، اخلاقی کمزوریوں اور شخصی برائیوں کو بھی رخصت کردیں اور اس مبارک ماہ کی فضیلتوں اور برکتوں سے اپنی زندگیوں کو حقیقی طور پر سیراب کرلیں۔ رب کائنات کے حضور دعاگو ہیں کہ اس کا کرم، رحم، عطا اور بخشش ہمارے ساتھ رہے تاکہ دنیا وآخرت میں سرخروئی نصیب ہو۔ الٰہی آمین

تمام اہلِ وطن کو بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کا یوم ولادت مبارک ہو۔ اپنے ملک وملت سے وفا کا تقاضا ہے کہ ہم برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی دلانے والے اس عظیم رہنما کی خدمات اور اقوال کے مطابق تعمیر وطن کرتے رہیں۔

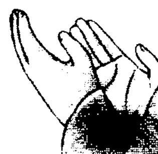
مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

اور بے شک ہم نے ان کو ایک (ایسی) کتاب دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم سے کردی ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔ (۵۲) کیا وہ اس کی حقیقت کا انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کی حقیقت ظاہر ہوگی۔ تو وہ لوگ جنہوں نے اسے پہلے ہی بھلا رکھا تھا کہیں گے، بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق لے کر آئے تھے۔ پھر کیا ہمارے لیے بھی کوئی شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے کہ جیسے عمل (بد) ہم کیا کرتے تھے۔ ان کے خلاف (نیک) عمل کریں۔ یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے سب ان سے گم ہوگیا۔ (۵۳) یقیناً تمہارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر مستولی ہوا۔ وہ رات کو دن سے ڈھانپتا ہے جو جلدی (جلدی) اس کی تلاش میں (پیچھے چلا) آتا ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔ آگاہ رہو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کل جہانوں کا پرورش کرنے والا صاحب برکت ہے۔ (۵۴) تم اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے، چپکے دعا مانگا کرو۔ یقیناً وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۵۵) اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو۔ اور اس (اللہ تعالیٰ) سے خوف کرتے ہوئے اور امید لگائے ہوئے دعا مانگا کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکو کاروں کے قریب ہے۔ (۵۶) اور وہ وہی ہے جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوشخبری دینے کے لیے ہوائیں بھیج دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھالائیں تو ہم نے اسے مُردہ بستی کی طرف ہانک دیا۔ پھر ہم نے اس سے (بارش) کا پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے ہر طرح کے پھل (زمین سے) باہر نکالے۔ اسی طرح ہم مُردوں کو (بھی زندہ کر کے قبروں سے) نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (۵۷) اور پاکیزہ زمین کی نباتات تو حکم خدا سے (خوب) اگتی ہے۔ اور جو (زمین) ناکارہ ہوتی ہے اس میں سے کچھ نہیں اگتا مگر تھوڑا۔ اسی طرح ہم لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں آیتوں کو پھرا پھرا کر بیان کرتے ہیں (۵۸) یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ پس اس نے کہا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں۔ یقیناً میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (۵۹) اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے یقیناً کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ (۶۰)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۵۲ تا ۶۰)



دین کی باتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِ النَّبِیِّیْنَ ط

افضل الانبیا، ختمی مرتبت، سید المرسلین، حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام...... سیدنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی ومفہوم۔ نبی، غیب کی خبر دینے والے کے ہیں یعنی احکام الٰہی پہنچانے والا۔

نبی اور رسول میں فرق...

نبی اور رسول میں یہ فرق ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص بعض مفسرین نے فرمایا کہ رسول شرع کے واضع ہوتے ہیں اور نبی اس کے محافظ ونگہبان...... ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ رسول صاحب کتاب وشریعت ہوتا ہے جبکہ نبی اس کا شارح

2:القرآن (غیب کی خبر دینے والے)

ترجمہ: اور یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کرتے ہیں (آیت ۴۴، آل عمران)

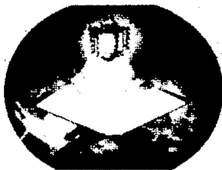
3:الحدیث۔ (نبی) ا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ کب نبی بنائے گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اس وقت جب آدم (آب وگل) روح اور جسد کے درمیان تھے تب مجھ سے میثاق نبوت لیا گیا یعنی روح اور جسم کا باہمی تعلق ابھی نہیں ہوا تھا۔

4:الرائے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ وہ غیر معمولی بات ہے اس جیسے الفاظ کسی عام انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتے۔ اس کی زندگی کا مقصد ومدعا، اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت سے منعکس ہوتا ہے۔ سنی سنائی باتوں سے وہ قطعی بیگانہ ہوتا ہے۔ اس کا دل سچائیوں کا امین اور حقائق کی روشنیوں سے منور ہوتا ہے۔ اس کی باتیں الہامی ہوتی ہیں۔ یہ الفاظ دیگر وہ کائنات کے حقیقی اسرار سے آگاہی رکھتا ہے اس کی ہر بات ترجمان حقیقت ہوتی ہے اس سے پہلے بھی انبیا پر وحی آتی رہی ہے لیکن اب کی بار وحی آخری اور تازہ ترین ہے۔ کیا یہ نبی اس خدا کا بندہ نہیں، اس کی باتوں کو ہم کیسے سنی ان سنی کر سکتے ہیں۔

(تھامس کارلائل ہیرو اینڈ ہیروز ورشپ)

4:الفضائل ہر نماز کے بعد 62 بار اس اسم پاک سیدنا نبی"...... پڑھنے والے کو عرفانِ حق حاصل ہوگا، نیز کسی مشکل میں باوضو حالت میں بکثرت پڑھنے والے کی ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



قرآن پاک سے عشق کی پُرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب یازدہم

متاعُ الغرور

جولوگ اس دنیا کی زندگی کوسب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں اور مال و متاع عیش وعشرت کی طلب کرتے ہیں دراصل وہ شیطان کے بہکاوے میں ہیں۔ شیطان انہیں فریب دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر جائز و ناجائز طریقے سے لوگ اپنے لیے دولت اکٹھی کرتے ہیں اور اپنی آخرت برباد کرتے ہیں۔

سورۂ لقمان (31) آیت نمبر 33 میں ارشاد ربّانی ہے۔ ''لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمہیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔''

سورۂ فاطر (35) کی آیت نمبر 5 میں بھی اسی طرح کی بات کہی گئی ہے۔ ''لوگو! خدا کا وعدہ سچا ہے تو تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ (شیطان) فریب دینے والا تمہیں فریب دے۔''

آیت نمبر 6۔ ''شیطان تمہارا دشمن ہے۔ تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو...... وہ اپنے (پیروؤں) کے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخ والوں میں ہوں۔''

جس طرح سورۂ عنکبوت میں دنیا کی زندگی کو کھیل تماشا کہا گیا ہے، اسی طرح سورۂ محمدؐ (45) میں بھی ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ ''دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے اور لوگو تم ایمان لاؤ گے اور پرہیز گاری کرو گے تو تم کو تمہارا اجر دے گا اور وہ تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔'' (آیت 36)

سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر 36 میں اللہ تعالیٰ خبردار کررہا ہے کہ ''(لوگو) جو (مال متاع) تم کو دیا گیا وہ دنیا کی زندگی کا (ناپائدار) فائدہ ہے اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔ (یعنی) ان لوگوں کے لیے جو

ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں۔''
سورۂ آلِ عمران آیت نمبر 14: ''لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔ (مگر) یہ سب دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔''
سورۂ نسا (4) آیت 77۔'' (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے اور بہت اچھی چیز تو پرہیز گار کے لیے (نجات) آخرت ہے اور تم پر دھاگے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''
آیت نمبر 120: ''وہ ان کو وعدے دیتا ہے اور امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ شیطان انہیں وعدے دیتا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔''
مضمون کے شروع میں سورۂ حدید کی آیت نمبر 20 کا ذکر ہوا تھا اس کا مکمل ترجمہ یوں ہے۔'' جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت... (وآرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اُگتی اور) تو اس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑجاتی ہے اور پھر چورا، چورا ہوجاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لیے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لیے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاعِ فریب ہے۔''
اوپر کی تمام آیات پڑھ کر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دنیاوی عیش وعشرت، مال، اولاد، مویشی کھیتی، زرد جواہرات سب چیزوں کی ہوس اور غرور، یہ سب شیطان کے بہکاوے اور دھوکے بازیاں ہیں۔ یہ ختم ہونے والی چیزیں ہیں۔ باقی رہ جانے والی چیز صرف اچھے اعمال ہیں جن کا صلہ اس زندگی میں ملے گا جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ظاہری نمود و نمائش آسائش، دولت کی ہوس اور شیطان کی دھوکا بازیوں سے محفوظ رکھے اور نیک و سیدھے راستے پر گامزن کرے۔ (آمین)

لبیک اللّٰھم لبیک

بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب آپ کھڑے ہوکر آواز دیں کہ اے لوگو! اللہ کا گھر بن کر تیار ہوگیا ہے۔ اس کی زیارت اور حج کے لیے آؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے مولائے کریم! میری آواز پہنچے گی کہاں تک؟ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ میرے خلیل! آواز دینا آپ کا کام ہے اور اسے اپنی مخلوق کے کانوں تک پہنچانا میرا کام ہے۔ آپ آواز دیجیے۔
چنانچہ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک چٹان پر کھڑے ہوکر جب یہ آواز دی کہ اے لوگو! اللہ کا گھر تیار ہوگیا ہے، اس کی زیارت اور حج کے لیے پہنچو تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آواز روئے زمین کے تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچائی اور جو بچے شکمِ مادر میں تھے، ان کے کانوں تک اور جو روحیں عالمِ ارواح میں تھیں ان کے کانوں تک پہنچائی۔ اس آواز کو سن کر جس نے ایک بار لبیک کہا اس کو ایک حج نصیب ہوگا۔ جس نے دوبار لبیک کہا اسے دو حج نصیب ہوں گے۔ اس واقعہ کو سورۂ حج (22) میں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ (آیات نمبر 26 تا 29)
مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کبھی حج کرسکوں گی یا نہیں..... گو کہ ہر مسلمان کی طرح میری بھی یہ آرزو تھی کہ اللہ کے گھر کا طواف کروں۔ اس سال میں نے اپنے بڑے بیٹے آصف کے ساتھ اوپن حج اسکیم کے تحت حج کیا۔ ہم لوگوں کی روانگی 5 فروری کو تھی مگر 4 تاریخ کو معلوم ہوا کہ ویزا نہیں لگا ہے، روانگی 6 کو ہے۔ پھر اگلے دن پتا چلا کہ ویزا نہیں لگا، روانگی 7 کو ہے۔ اب وسوسے دل میں جگہ پانے لگے، یا الٰہی! اب صرف حج کے بیچ ایک دن رہ گیا ہے۔ کیا میری روح نے حضرت ابراہیم کی آواز پر لبیک نہیں کہا تھا؟ جس قدر دعائیں ہوسکتی تھیں، کر ڈالیں۔ صرف یہی نہیں، میں اپنے ساتھ آصف کے دوست عمران کو بھی لے جارہی تھی جن کو میرے شوہر مرحوم (جن کا انتقال ایک سال قبل ہوا) کی طرف سے حج بھی کرنا تھا۔ ہم تینوں امید وبیم کی حالت میں تھے کہ خوشخبری ملی ویزا لگ گیا ہے۔ ہم 7 فروری کی

صبح روانہ ہوئے اور وہاں رہائش تک پہنچتے، پہنچتے شام ہوگئی۔ اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں نے حج افراد کا احرام باندھا تھا، اس میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ جب تک حج نہ ادا ہوجائے، احرام نہیں کھلتا، اسی دن رات کے دو بجے ہم تینوں طوافِ زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔

ہماری رہائش حرم شریف سے کئی کلومیٹر دور تھی۔ جگہ کا نام ششبہ بن داؤد تھا۔ کھانے پینے اور رہائش کا نفیس انتظام تھا۔ سواری کر کے حرم شریف پہنچے۔ عمران چونکہ ایک سال قبل حج کر چکے تھے اس لیے ہمیں اطمینان تھا۔ ہم دونوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے کا مرحلہ سب سے زیادہ یادگار ہوتا ہے۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں زمین کی طرف دیکھ کر آگے بڑھ رہی تھی۔

''ابھی اوپر مت دیکھیے گا۔'' عمران مستقل کہتے رہے۔

جب خانہ کعبہ بالکل سامنے نظر آنے لگا تو انہوں نے کہا۔ ''ہاں اب نظریں اٹھائیے۔'' میں نے شوق کے عالم میں نگاہیں اوپر اٹھائیں، سبحان اللہ! کیا روح پرور نظارہ تھا۔ خانہ کعبہ اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ روشنی میں جگمگا رہا تھا اور لاکھوں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر...... وہ سب کے سب خانہ کعبہ کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ایک ہی جذبہ، ایک ہی لگن، اللہ کی رضا، قربِ الٰہی کی تمنا اور وہ ہزاروں دعائیں جو قبولیت کے لیے مچل رہی تھیں، لوگوں کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔

کہتے ہیں خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے پر جو دعا مانگی جائے، وہ پوری ہوتی ہے، پتا نہیں میں نے کیا دعا مانگی تھی۔ میں تو اللہ کے گھر کی خوب صورتی میں کھو گئی تھی، لگتا تھا ہر طرف سے نور کی بارش ہو رہی ہے اور میں اس میں نہا رہی ہوں۔ منہ سے کچھ الفاظ نکلے تھے تو ٹوٹے پھوٹے سے۔ ''اے اللہ! تو خود جانتا ہے میں کیا چاہتی ہوں۔ بس تو وہ تمام جائز دعائیں پوری کر دے، ہر اس دعا کو پورا کر دے جو میں حج کے دوران مانگوں۔''

بس پھر میں بھی نیت کر کے طواف کرنے والوں میں شامل ہوگئی۔ دو چکر نیچے کیے۔ اس قدر مجمع تھا کہ مزید چکر کرنا مشکل لگا تو ہم اوپر چلے گئے اور باقی چکر اوپر ہی کیے۔ گو کہ وقت بہت لگتا ہے مگر سہولت رہتی ہے۔ مجھے چلنے کی عادت کہاں تھی، پاؤں زخمی ہوگئے مگر دل خوشی سے معمور تھا کہ طوافِ قدوم ہوگیا۔ مگر ہم ماں، بیٹا وہ جگہ بھول گئے جہاں عمران نے ملنے کو کہا تھا اور جہاں ایک تھیلی کے اندر ہمارے جوتے تھے۔ اب کیا کریں؟ چلتے، چلتے اور ڈھونڈتے، ڈھونڈتے فجر ہوگئی۔ ہم نے خوشی، خوشی نماز فجر ادا کی۔ یہ میری زندگی کی پہلی نماز تھی جو میں نے مسجد میں ادا کی۔

نماز پڑھ کر پھر وہ جگہ ڈھونڈنے لگے۔ اب سورج نکل چکا تھا۔ بہت دیر ہوگئی تھی۔ ہم رات دو بجے سے اب تک مستقل پیدل چل رہے تھے۔ میرا قدم اٹھانا محال تھا۔ پھر یاد آیا کہ کسی نے کہا تھا کہ آبِ زم، زم پی کر دعا کرو، فوراً قبول ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر آبِ زم زم پیا اور دعا کی۔ ''یا اللہ! تو عمران کو ملا دے۔'' اب جو پیچھے گھوم کر دیکھا تو عمران چپلوں کا تھیلا لیے کھڑے تھے۔ جان میں جان آئی۔ سواری کر کے کسی نہ کسی طرح رہائش گاہ پر واپس آئے۔

اگلی صبح منیٰ روانہ ہوگئے۔ یہ ہماری رہائش گاہ سے قریب ہی تھا۔ منیٰ میں ہمارا خیمہ بھی جمرات کے بہت قریب تھا اس لیے ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ منیٰ میں پانچ نمازیں ادا کر کے 9 ذوالحج کو میدانِ عرفات میں گئے۔ یہاں بھی خیمہ نصب تھا۔ کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ عالمگیر مسجد والوں نے بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورِ حکومت میں نیم کے ایک لاکھ درخت میدان عرفات میں لگوائے تھے جو کہ اب بڑے ہو چکے ہیں اور حجاج کو آرام دیتے ہیں۔ ہمارے خیمے کے آس پاس کئی نیم کے درخت تھے۔ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے وقوفِ عرفات کا فریضہ ادا کیا۔ اس وقت ہر حاجی کو چاہیے کہ صرف اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا نہ کرے بلکہ اپنے والدین کے لیے بھی ضرور دعا کرے۔ ان کے گناہوں کی بخشش اور جنت الفردوس میں جگہ دینے کی دعا...... اسی طرح ان تمام لوگوں کے لیے دعا جو اپنے پیارے تھے اور اس دنیا سے جا چکے، اس وقت مغفرت اور بخشش کے در کھلے ہوتے ہیں۔

جو دعا کی جائے، پوری ہوتی ہے۔ وقوفِ عرفات کے وقت سب گریہ وزاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ کسی کو دوسرے کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔

عرفات سے مزدلفہ اور پھر منیٰ واپسی کا سفر بھی آسان رہا...... بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے، میں دوپہر کے بعد گئی تھی۔ رش کم تھا۔ آسانی سے کنکریاں ماریں۔ پھر واپس رہائش گاہ پر گئے۔ بال کاٹ کر احرام سے باہر نکلے۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب طواف زیارت اور حج کی سعی باقی تھی۔ خیال ہے کہ اس سال تقریباً 32 لاکھ کا مجمع تھا۔ چونکہ سب لوگوں کو ایک ساتھ ہی طواف اور سعی کرنی ہوتی ہے اس وجہ سے یہ دن سخت ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہمت دیتا ہے۔ طوافِ زیارت اور سعی بھی میں نے اوپر کی۔ کافی وقت لگا مگر سکون سے فریضہ ادا ہوگیا۔ میرے ساتھ جو گروپ کے لوگ تھے، وہ سب بہت خوش اخلاق اور مخلص تھے۔ زیادہ تعداد نوجوان لڑکیوں کی تھی۔ ان سب نے میرا بہت خیال رکھا۔

حج کے بعد ہم لوگوں نے حرم شریف کے قریب رہائش لے لی تھی۔ اس لیے چار دن بہت آسانی رہی۔ کئی طواف کیے مگر مجمع اتنا زیادہ تھا کہ اوپر ہی سے کرنے پڑے۔ 20 تاریخ کو مدینہ منورہ گئے۔

مدینہ منورہ جا کر رہنا اور مسجد نبویؐ میں عبادت کرنا یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ ہماری رہائش انصار گولڈن ہوٹل میں تھی۔ مسجد نبویؐ کا گیٹ نمبر 25 اور ہوٹل کے گیٹ کے درمیان صرف ایک سڑک تھی۔ ہمارا کمرا چودھویں منزل پر تھا اور رخ مسجد نبویؐ کی جانب...... تمام رات میناروں کی روشنی کمرے کے اندر چھن، چھن کر آتی رہتی اور کھڑکی سے سبز گنبد اور مسجد کے اندر کا سب احوال نظر آتا رہتا۔ اذان ہونے کے بعد روانہ ہوتے تو بھی دو منٹ میں پہنچ جاتے۔ اب وہاں خواتین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک کی زیارت منع ہوگئی ہے۔ سامنے پارٹیشن کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور وہاں پر بھی اوقات مقرر ہیں۔ اس لیے یہ حسرت ہی رہ گئی کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کے پاس جاتے۔ بہرحال دور سے سلام و درود بھیج کر واپس آ گئے۔

ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ محبت میں نہ فاصلہ اہمیت رکھتا ہے اور نہ ہی ظاہری آنکھ کی کوئی حقیقت ہے۔ اگر انسان کی باطنی آنکھ کھلی ہو تو فاصلے آپ ہی آپ مٹ جاتے ہیں۔ مدینے کی گلیوں میں پھرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ساتھ، ساتھ رہا کہ ان گلیوں میں ہمارے پیارے آقا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہوں گے۔

اپنے 9 روزہ قیام کے دوران مسجد قبا دو بار گئے۔ وہاں پر دو رکعت نماز کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہے۔ مسجد قبلتین اور دوسری جگہیں بھی دیکھیں۔ جنت البقیع میں مدفون عظیم ہستیوں کے حضور سلام کا نذرانہ پیش کیا اور فاتحہ پڑھی۔

مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کا جو لطف و سرور ملا شاید اب وہ کہیں نہ ملے۔ مسجد نبویؐ کے امام کی آواز اس قدر دلنشیں تھی کہ کانوں میں رس گھولتی اور دلوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ان کی تلاوت تاحیات یاد رہے گی۔

حج سے واپس آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ گزر گیا ہے لیکن ہر نماز کے وقت خانہ کعبہ اپنی پوری رعنائی، آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے اور مسجد نبویؐ کے امام کی آوازیں دور ہواؤں میں سرسراتی، آج بھی محسوس ہوتی ہیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ ہم مسلمان جو ایک بار وہاں جاتا ہے، دل میں بار، بار جانے کی تمنا لے کر آتا ہے۔ آخر میں اپنے ہی کہے ہوئے چند اشعار لکھ رہی ہوں جو پانچ سال قبل لکھے تھے۔

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤں تو پھر بات بنے
خانہ کعبہ کو نگاہوں میں بسالوں یا رب
ایک ٹھنڈک سی اتر جاتی ہے دھیرے، دھیرے
پھول رحمت کے چنوں اور سجالوں یا رب
ہاں عبادت کے لیے عمر بہت تھوڑی ہے
اشک کچھ اور ندامت کے بہالوں یا رب
دلِ مضطر یہی کہتا ہے ٹھہر جاؤں یہاں
تیری سرکار میں آؤں تو نہ جاؤں یا رب

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرا اور تمام حاجیوں کا حج قبول فرمائے، آمین! (قارئین ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا لکھا ہوا یہ مضمون پہلی مرتبہ 2003 میں بھی شائع ہو چکا ہے)

(جاری ہے)

۔۔۔۔۔ یہ کہاں آ بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں۔۔۔
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے۔۔۔
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے۔۔۔
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے۔۔۔
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا۔۔۔
عبادات، معاملات۔۔۔
جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی۔۔۔

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 17

''ہیلو......! خیریت ہے ساحل؟ ابھی، ابھی میں نے آپ کی مسڈ کالز دیکھیں۔ کال بیک کرنے لگی تو آپ کی کال آ گئی۔'' تاجور کی تشویش بھری آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''خیریت نہیں ہے میم...... میں دو گھنٹے سے ٹرائی کر رہا ہوں...... سائٹ پر دیوار گرنے سے ایک مزدور کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

''مائی گاڈ......'' تاجور کو یک دم بہت بڑا دھچکا پہنچا تھا۔

''میم آپ کو سائٹ پر آنا ہو گا...... مزدور کی فیملی اور پولیس دونوں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ دوسرے مزدور بھی یہاں آ گئے ہیں۔ میں سائٹ پر ملوں گا آپ وہیں تشریف لے آئیں......''

''میں پہنچتی ہوں......'' تاجور کی گھبرائی ہوئی آواز ائرپیس میں ابھری اور رابطہ منقطع ہو گیا۔



ساحل نے اب کھل کر سانس لی۔ اور گارڈ کی طرف گھور کر دیکھا جو ہق دق کھڑا اس کی صورت تک رہا تھا۔
''ابے چور اچکا سمجھتا ہے؟ آج پتا چل گیا...... یہ شکل ہوتی ہے چور اچکوں کی... ..؟'' وہ برس پڑا...... یوں جیسے لاوا بہہ نکلا ہو......

پھر پاؤں پٹختا اپنی کار کی طرف چل دیا...... گارڈ روبوٹ کی طرح ٹکر ٹکر دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

تاجور کے سوال، الفاظ غیر معمولی تھے۔ سفینہ اور زارا بھی پریشان ہو کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیڈی صوفیہ کی ''بس'' ہو چکی تھی وہ اپنے معمولات سے ہٹ کر مصروف رہی تھیں۔ اب بالکل غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔

اب وقتِ رخصت تھا وہ آدابِ میزبانی حتی المقدور نباہنے کی البتہ کوشش ضرور کر رہی تھیں۔
''کیا ہوا اماں......؟'' سفینہ جو پرنس اور ثوبان کے درمیان چند لمحے پہلے بہت شاداں و فرحاں نظر آ رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر کھنچی تفکرات کی لہریں اسے ہولانے لگیں۔
''کچھ نہیں...... بس وہ سائٹ پر کوئی پرابلم آ گئی ہے، لیبرز کی طرف سے۔ ساحل ابھی نیا ہے ٹھیک سے tackle نہیں کر پا رہا تھا۔ پریشان ہو رہا ہے...... میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے......'' وہ عجلت میں مبتلا محسوس ہونے لگیں۔

پرنس نے غیر ارادی طور پر سفینہ کی طرف دیکھا تھا...... گھنٹے پل میں گزر گئے تھے۔ رخصت کی گھڑی سر پر آ پہنچی تھی...... اس کے بعد سفینہ نے لاہور چلے جانا تھا...... اور پھر کسی تقریب بہر ملاقات کا انتظار کرنا تھا۔

زارا کی کسی ہوئی طنابیں کھل گئی تھیں۔ اتنی دیر سے وہ سفینہ کی شادمانی دیکھ کر اندرونی جنگ میں مبتلا تھی۔ پرنس کی سفینہ کے لیے وارفتگی بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جھٹ ماں کی ہمدرد بیٹی بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اماں آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا......'' وہ ماں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھی...... ذہن تھا کہ پل بھر کے لیے پرنس سے غافل ہو کر نہیں دے رہا تھا...... ایک تپش تھی جو سینے سے اٹھتی تھی اور آنکھوں کو جھلساتی تھی۔

''ہمیں اجازت......'' تاجور نے لیڈی صوفیہ کے قریب جا کر نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ جو مُندی، مُندی آنکھوں سے بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ سب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
''تھینک یو تاجور......'' انہوں نے اٹھنا چاہا تو انجیلا نے انہیں اٹھنے میں مدد دی۔
"it was a very precious time" وہ اپنے نازک وجود کا بوجھ بھی اس وقت سنبھال نہ پا رہی تھیں۔
''جی بالکل...... انشاء اللہ...... آپ سے بہت جلد ایک اور خوب صورت ملاقات ہو گی۔'' تاجور مردانہ مضبوط اعصاب کی حامل ہونے کا مظاہرہ بہت خوبی سے کر رہی تھیں اور دل کا حال یہ تھا کہ اڑ کر سائٹ پر پہنچ جائیں۔
''زارا...... پیاری لڑکی تم تو میری فرینڈ بن چکی ہو...... میں تمہارا ویٹ کروں گی۔'' زارا کیونکہ لیڈی صوفیہ کے قریب تھی اس لیے الوداعی کلمات سے اسے پہلے نوازا گیا۔

زارا کو یوں لگا جیسے دھوپ میں چلتے، چلتے گھنے نیم کی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ اس نے فرطِ مسرت سے لیڈی صوفیہ کے شانے سے سر ٹکا دیا۔
''اوہ گریٹ......!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیڈی صوفیہ کی اپنائیت اسے پُر امید بنا رہی تھی۔ حوصلے بلند کر رہی تھی۔ سفینہ نے خود آگے بڑھ کر لیڈی صوفیہ



کا ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا...... انہوں نے بھی اسے گلے لگا کر گرم جوشی سے پیار کیا۔

☆☆☆

مرحوم کے گھر میں بہت سے لوگ عرصے بعد پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ کئی لوگوں کا فاقہ ختم ہوتا ہے...... مہینہ گزارنے کے لیے پیسہ نہیں مگر...... برباد کرنے کے لیے وقت بہت' وقفے، وقفے سے مرحوم یا مرحومہ کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد (جو اس کی زندگی میں کسی کو دنیا کی سب سے بڑی دوربین سے بھی نظر نہیں آسکتی تھیں) برادری یا خاندان کے تنازعات زیرِ بحث لائے جاتے۔

ہاتھ میں کھجور کی گٹھلیاں...... ہر گٹھلی پر کلمہ پڑھنا ضروری نہیں (ان کے انداز سے تو یہی لگتا) نند بھاوج ساس، آوارہ دیور، ظالم جیٹھ، فسادی ہمسایہ...... کا تعلق کسی بھی گٹھلی سے بن سکتا تھا۔

''جہالت قدرتی آفات سے بڑا عذاب ہے......'' ساحل سوچ رہا تھا۔ ساحل کو مرحوم کے لواحقین نے گھیرا ہوا تھا...... وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ جن کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ عورتیں بین کر رہی تھیں، سینہ کوبی کر رہی تھیں...... اس ملک میں رکشے والا جس بے فکری سے چوراہوں، دوراہوں پر رکشا گھماتا ہے اس کی وجہ بھی یہی غربت و جہالت ہے۔ کسی لش گاڑی سے ٹکر ہونا بھی رزق کے دروازے کھولنے کا بہانہ بن سکتا ہے۔

''میرا نقصان ہوگیا...... مجھے پیسے دو...... ورنہ میری بددعائیں تمہارے پیچھے پڑ جائیں گی...... میں غریب

ہوں، پیسے کہاں سے دوں......؟ مجھے بیچ دو...... جتنے کا بکوں وغیرہ، وغیرہ......''

ساحل سمجھ رہا تھا...... کہ یہ سب مالک سے خطیر رقم کا مطالبہ کرنے جمع ہورہے ہیں۔ حق تو مرحوم کے لواحقین کا بنتا تھا مگر لوگوں کو دلچسپی تھی کہ پیسہ کتنا ملے گا۔

افلاس کے دائرے میں چکرانے والے بندگانِ خدا اپنے آس پاس ان گھروں میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں جو کسی کو بوقتِ ضرورت قرض، ادھار دینے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

''یا اللہ...... میم کب پہنچیں گی......؟ کم از کم میں تو اس un wanted جلسے سے خطاب نہیں فرما سکتا۔'' وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

تاجور کے انداز میں عجلت بھرے تکلفات تھے، وہ خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی ماحول میں غیر حاضر دماغی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ درپیش بحران میزبان کے سامنے لاکر اس خوب صورت تقریب کا تاثر خلط ملط نہیں کرنا چاہتی تھیں پیشِ نظر یہ تھا کہ کسی طرح سواری میں سوار ہو جائیں۔

زارا کو اپنے خیالات سے فرصت نہیں تھی، وہ تاجور کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی مگر توجہ پشت پر تھی۔ سفینہ اور پرنس سُبک خرامی سے چل رہے تھے اور زارا سے دس ہاتھ کے فاصلے پر تھے۔ پلٹ کر دیکھنا تو غیر اخلاقی حرکت تھی جیسے کوئی دیوار سے کان لگائے کھوج لگا رہا ہو......

سفینہ اور پرنس باتیں کر رہے تھے مگر آواز اتنی آہستہ تھی کہ کوشش کے باوجود زارا کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا...... کچھ دل میں اٹھتے طوفان بھی سماعت کو متاثر کر رہے تھے۔

پرنس ہوا کے دوش پر تھا...... پاؤں کے نیچے زمین کا فرش محسوس نہیں ہو رہا تھا، رومانویت جو اس کے وجود کے کیمیائی عناصر کی مضبوط بنیاد تھی اس وقت اوجِ کمال پر تھی...... وہ پل، پل اپنی گرفت میں لے رہا تھا...... ایک تصور جو برسوں اس کی تخلیقات پر حاوی رہا...... اس وقت مجسم تھا۔ اپنے خوش قسمت ہونے کا یقین تو پہلے بھی تھا...... آج مُہر ثبت ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے لینڈ کروزر کا ڈور وا کر دیا تھا۔

تاجور نے سوار ہونے سے پہلے پلٹ کر پرنس کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سوار ہو گئیں...... زارا نے ان کی تقلید کی...... سفینہ نے توقف کیا۔

ایک باوقار نفیس انسان کم سے کم الفاظ کا بوجھ ضرور اٹھا رہا تھا مگر احساسات تکمیل کے سنگِ میل کی طرف سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

سفینہ نے نازک سا ہاتھ بلند کر کے پرنس کو خدا حافظ کیا اور اس بات سے بے خبر کہ ماں گھڑیاں گن رہی ہے۔ پرنس کی جادو بھری مسکراہٹ کا نظارہ کرنا ضروری خیال کیا...... تاجور بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔

زارا نے سیاہ شیشے سے ناک ٹکا کر باہر جھانکا۔

پرنس اب پشت پر ہاتھ باندھے لینڈ کروزر کو گیٹ کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا......

''کمال شخص ہے یہ...... کتنا relaxed...... کتنا خوش...... ملتے وقت بھی چہرہ ایسا ہی تھا...... رخصت ہوتے ہوئے بھی......'' وہ سوچ رہی تھی۔

سفینہ خوابوں کا خزانہ گود میں بھرے بہت سرشار نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

ساحل پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اپائنٹمنٹ لیٹر پر یہ نہیں لکھا ہوا تھا کہ تھانے پولیس کے چکروں کو بھی فیس کرنا ہوگا..... کیا ٹھاٹھ ہیں رئیسوں کے..... دن بھر مزدوروں کا خون پیتے ہیں۔ رات کو دعوتیں اڑاتے ہیں۔

تاجور کو دوبارہ فون کرنا بہت غیر مہذبانہ لگ رہا تھا..... جب ان کو ایمرجنسی یا ناگہانی صورتِ حال کی خبر پہنچ گئی تھی تو اسے اب صبر سے انتظار کرنا تھا۔

اتنی شاندار ملازمت کو وہ کسی خطرے سے تو ہرگز دوچار نہیں کرسکتا تھا۔

''بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں پہنچیں.....'' ڈی ایس پی نے قریب آ کر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''جی بس پہنچ رہی ہیں..... شاید وہ پرائم منسٹر کے ساتھ ڈنر کررہی تھیں۔'' اس نے جل بھن کر بظاہر نارمل انداز میں جواب دیا۔

''پرائم منسٹر..... تو کیا وہ اسلام آباد سے آرہی ہیں.....؟'' ڈی ایس پی کی پھیلی آنکھیں مدھم روشنی میں بھی چمک رہی تھیں۔ یوں بھی پولیس افسروں کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ پلکیں کم جھپکتے ہیں۔

''سر..... پرائم منسٹر کراچی بھی کبھی، کبھی آجاتے ہیں..... آپ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لندن تو بس چار قدم کے فاصلے پر ہے۔ کراچی بہت دور ہے۔ سمندر پھلانگ کر آنا پڑتا ہے ناں.....'' وہ دانت پیس رہا تھا مگر نرمی اور اخلاق کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھا۔

''ہاہا..... ہا.....'' پولیس آفیسر بہت محظوظ ہوا..... اسے گدگدانے کے بعد وہ اس سے دور ہٹ گیا..... اس سے زیادہ گدگدانے کی گنجائش نہیں تھی نہ توفیق.....



''اماں..... آپ..... اس وقت سائٹ جارہی ہیں؟'' سفینہ نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا..... کیونکہ انہوں نے ڈرائیور کو ہدایت کی تھی کہ وہ پہلے انہیں سائٹ ڈراپ کرے۔ بعد میں بچیوں کو لے کر گھر چلا جائے۔ واپسی کا کچھ نہیں بتایا کہ ذہن میں تھا کہ ساحل سائٹ پر موجود ہے۔ وہ بھی انہیں ڈراپ کرسکتا ہے۔ دوئم ابھی تو یہ بھی واضح نہیں تھا کہ وہاں کتنا وقت لگے گا۔ کس، کس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

''ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے.....'' تاجور کو بہرحال حقیقت بتانا تھی۔

سفینہ اور زارا مارے تحیر کے ہم آہنگ ہوئیں.....

''وہ جو کال آئی تھی۔'' سفینہ الفاظ ترتیب نہ دے پائی..... تاجور نے جملہ خود ہی مکمل کردیا۔

''ہاں ساحل کی کال تھی..... وہ بھی اس وقت سائٹ پر ہی ہے..... اس وقت اس نے بہت ہمت دکھائی اور بہت اچھی طرح سچویشن کنٹرول کی ہے..... مجھے اندازہ تو تھا کہ پڑھا لکھا خاندانی محنتی لڑکا ہے مگر یہ واقعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی ایمرجنسی میں بہت اسٹرانگ رول بھی پلے کرسکتا ہے۔'' تاجور نے بیٹیوں کے سامنے پہلی بار کسی ایمپلائی کی اس طرح دل کھول کر تعریف کی تھی۔ لاشعوری طور پر نظریں زارا پر ٹک گئی تھیں۔

سفینہ یک دم بہت متفکر نظر آنے لگی تھی۔

''اماں آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ ہوا کیا ہے؟'' زارا بھی اب ہر طرف سے ذہن ہٹا کر موجودہ لمحے میں مدغم ہورہی تھی۔ لفظ ایکسیڈنٹ ہی بہت چونکا دینے والا تھا..... پھر ماں رات کے اس پہر کسی ناگہانی صورتِ حال کا سامنا کرنے جارہی تھی۔ ساری تصوراتی دنیا پلک جھپکتے ہی پس پردہ چلی گئی..... خوفناک حقیقت عریاں ہورہی تھی۔

''وہ فیکٹری کے ایکسٹینشن میں کنسٹرکشن ہورہی تھی..... دیوار جو آج شام ہی مکمل ہوئی تھی کسی سوئے ہوئے مزدور پر گرگئی۔''

''مائی گاڈ......!'' سفینہ کا تو خوف سے خون ہی خشک ہونے لگا......زارا بھی دم بخود رہ گئی۔
''تم لوگ گھر جا کر آرام کرو...... ڈیڈ باڈی اسپتال پہنچا کر کچھ دیر میں، میں بھی آجاؤں گی...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... یہ چیلنجز تو لائف کا حصہ ہیں......انہیں فیس کرنا ہوتا ہے۔'' تاجور نے حقیقت بتا کر ساتھ ہی گھبرائی ہوئی بیٹیوں کو تسلی بھی دی......
''اماں ......میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' سفینہ کو ادراک ہو رہا تھا کہ صورتِ حال گمبھیر اور نازک ہے...... یہ الگ بات کہ ماں بہت مضبوط اعصابی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی......
''نہیں......تمہارا وہاں کیا کام......تم ریسٹ کرو، کل تمہیں فلائی بھی کرنا ہے۔'' زارا ٹکر ٹکر تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عجب لاجواب کر دینے والی صورتِ حال تھی......تمام تر نیک جذبات کے ساتھ دونوں اس مرحلے پر ماں کی خدمت سے قاصر تھیں۔

☆☆☆

پولیس، سول انجینئرز، آرکیٹکٹ سروئیر، ٹھیکیدار، مرحوم کے بھرے ہوئے لواحقین......ایک آفت تھی جو تاجور کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر آئیں ایک جم غفیر میں گھر گئیں۔ وہاں موجود ہر شخص ان سے کچھ کہنے کا خواہش مند تھا۔
ایسے میں ساحل نے ان کے قریب کھڑے ہو کر بہت اعتماد سے بپھرے ہوئے مجمع کو مخاطب کیا۔
''آپ لوگ بات نہیں کر رہے شور کر رہے ہیں...... بات کریں گے تو بات سمجھ آئے گی۔'' ساحل کی گھن گرج بڑی موثر تھی۔ معاً خاموشی چھا گئی۔ پولیس آفیسر بھی چھڑی بغل میں دبائے ہٹو بچو کے انداز میں تاجور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا......اور بہت مؤدبانہ انداز میں تاجور کو سلام کیا تھا۔
''آپ پریشان نہ ہوں بیگم صاحبہ......ہمیں تو ضابطے کی کارروائی پوری کرنا ہوتی ہے......پولیس آپ کی ہر طرح سے خدمت کے لیے تیار ہے......بہرحال ان لوگوں کو......'' اس نے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔
''کچھ دے دلا کر ہی جان چھڑانا ہو گی۔''
لینڈ کروزر سے اترنے والی بزنس چیئر پرسن کو آفیسر نے گھاگ شکاری کی طرح آنک لیا تھا......اور اب یہ حال تھا......ساری کائنات کا اخلاق و حلاوت اس کے لہجے میں اتر رہی تھی۔
''ارے ہمارا بندہ مار دیا......ریت میں سیمنٹ بھی ملایا تھا یا نہیں......؟'' ایک قوی الجثہ شخص جس کے آدھے بال سامنے سے اڑ چکے تھے......انداز سے کسی یونین کا لیڈر لگ رہا تھا، بڑے ڈرامائی انداز میں بولا تھا۔
''چپ کرو......تحقیقات پولیس کا کام ہے......'' آفیسر نے فوراً جھاڑ پلائی۔ سول انجینئر اور ٹھیکیدار کی حالت غیر تھی...... تاجور نے اس پہلوان نما شخص پر ایک نگاہ کی اور بہت وقار سے گویا ہوئیں۔
''تمہارے بندے کو میں نے نہیں مارا......دیوار گرنے کی وجہ سے ڈیتھ ہوئی ہے۔''
''بیس، بیس منزل کے ٹاور کھڑے ہیں......وہ نہیں گرتے......دیوار کیسے گر گئی، مسالے میں ڈنڈی ماری ہو گی۔''
''ذرا آرام سے، مسالا بیگم صاحبہ نے نہیں بنایا تھا۔'' ساحل نے فوراً اس پہلوان کے سامنے آکر اسے روکا۔
''ارے جب سیٹھ تھوک میں پکوڑے تلے گا تو پھر ٹھیکیدار یہی کریں گے ناں...... ارے وہ ٹھیکیدار ہی کیا جو ہیرا پھیری نہ کرے......وہ تو اپنا حصہ نکالے گا۔ بھلے بلاکوں کو گوند لگا کر چپکا دے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے خیر خواہوں کی طرف یوں دیکھا گویا داد طلب کر رہا ہو۔
''اچھا......ذرا آرام سے......رات ہے، بینک بند ہیں......کل تمہیں پیسے مل جائیں گے......کفن دفن بھی

ہماری ذمے داری ہے......اور اس کے بیوی، بچوں کو ہم خرچہ بھی دیں گے...... اب تم لوگ اپنے، اپنے گھر جاؤ...... پوسٹ مارٹم کے بعد میت پہنچا دی جائے گی۔'' پولیس آفیسر نے ساحل کی لیڈرانہ خصوصیت سے خاصا حسد محسوس کرتے ہوئے مورچہ سنبھالا۔

بیگم صاحبہ کو تو پولیس نے ممنونِ احسان کرنا تھا۔

''پتا نہیں یہ کون پھنے خان ہے......'' پولیس افسر کو اپنی موجودگی میں ساحل کی کوئی کارکردگی انتہائی ناقابلِ برداشت تھی۔

''مزدور کا کوئی بھائی یا بیٹا یہاں موجود ہے......؟'' تاجور کو مشکل دکھائی دے رہا تھا کہ یہ لوگ کچھ لیے بغیر یہاں سے ٹلیں گے......غربت و افلاس کے مارے لوگ جو چالیسویں کے کھانے کا انتظار کرتے ہیں کہ اس کھانے میں کوئی لفافہ یا تحفہ نہیں دینا پڑتا۔

ایک ادھیڑ عمر کا لمبا تڑنگا آدمی جھٹ مجمع میں گھسا اور پلک جھپکتے ہی ایک بارہ، تیرہ سال کے لڑکے کا ہاتھ تھام کر تاجور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''بیگم صاحبہ یہ صادق کا بڑا بیٹا ہے۔''

تاجور نے بچے کی طرف دیکھا......جس کی رو، رو کر آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ ہلکی، ہلکی سسکیاں لے رہا تھا۔ ایک ناگہانی نے اسے یتیموں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔

تاجور نے اپنا کلچ کھول کر پانچ ہزار کے کئی کرارے نوٹ نکالے......مزید تلاش کیے......پھر ساحل کی طرف دیکھا۔

''آپ کے پاس کچھ ہیں تو مجھے دیں......صبح اکاؤنٹ سے لے لیجیے گا۔'' ساحل تو اس وقت نفلوں کا بھوکا تھا

والٹ میں سات ہزار روپے تھے نکال کر تاجور کی طرف بڑھا دیے۔
تمام لوگ بڑی دلچسپی سے نوٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں تھی......''مایا'' کے لشکارے سب کی نگاہ کو چندھیا رہے تھے۔ بات کرنسی نوٹوں کی نہیں......نوٹ بانٹنے کے انداز کی تھی......تین کم چالیس ہزار فوراً ہاتھ میں آ گئے۔
''یہ رکھ لو......اپنی امی کو دینا...... باقی جو کچھ بھی ہوگا وہ کل ہوگا...... میں خود تمہاری امی سے ملنے آؤں گی۔''
تاجور نے نوٹ بچے کو دیتے ہوئے اس کے خاک آلودہ بالوں کے ٹوکرے پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔
اب بچے کے ہمدردوں، خیر خواہوں کی نظریں جن میں رشک بھی تھا اور حیرت بھی بچے پر مرکوز تھیں۔
مجمع منتشر کرنے کا منتر تاجور کے پاس تھا......آہستہ، آہستہ مجمع واقعی منتشر ہو گیا......تاجور نے اسٹاف کے لوگوں، کنسٹرکشن ٹیم اور پولیس کی طرف دیکھا۔
''آپ سب لوگ میرے ساتھ سائٹ آفس آیئے۔'' تاجور کے اوسان قابو میں تھے۔ وہ ایک منجھی ہوئی بزنس پرسن تھیں۔ وہ نہ خوفزدہ تھیں نہ ہراساں......ان کے پاس قوتِ خرید موجود تھی......بس اب سب نے اپنے، اپنے دام بتانا تھے۔

☆☆☆

ثوبان، پرنس کے بیڈ پر سو رہا تھا۔
اسے پریوں کے دیس سے واپس لانے کے خیال سے ہی پرنس کو تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چند ثانیے کی غور و فکر کے بعد اس نے تنہا اسپتال جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج جماعت سے نماز نہیں پڑھ سکا تھا۔ پہلے اپنے مخصوص مصلے پر عشا کی نماز ادا کی......خاص طور پر ثوبان کے لیے دعا کی اور ملازمین کو ضروری ہدایت دے کر اسپتال چلا آیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر ذکی اس کے منتظر تھے۔
''پیشنٹ مکمل ہوش میں ہے۔'' انہوں نے فوراً خوشخبری سنائی تھی۔
''ویسے کچھ پتا چلا کہ بے ہوشی کی وجہ کیا تھی......؟'' پرنس کو ثوبان کے گھر کی پُراسرار خاموشی یاد آئی تو تجسس کی حس پوری قوت سے بیدار ہو گئی۔
''سر پر شاید چوٹ لگی تھی......شاید سر دیوار سے یا کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا۔ اچھی خاصی swelling ہے۔'' ڈاکٹر ذکی نے جس انداز میں بتایا، لگ رہا تھا کہ انہیں بھی یقین ہے کہ عورت پر جسمانی تشدد کیا گیا ہے۔
''آپ بچے کو ساتھ نہیں لائے، وہ بار، بار بچے کا پوچھ رہی ہیں۔'' معاً ڈاکٹر ذکی کو دھیان ہوا کہ پرنس کے ساتھ بچہ نہیں ہے۔
''وہ بہت گہری نیند سو گیا تھا...... میں اس کی مدر سے مل کر انہیں تسلی دے دیتا ہوں۔''
''اوہ شیور، آئیں میرے ساتھ۔'' ڈاکٹر ذکی اب عجلت میں نظر آئے۔ رات کافی ہو چکی تھی وہ دن بھر آپریشنز میں مصروف رہے تھے۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا کافی تھک چکے تھے پرنس کی آمد سے انہیں اس خیال سے تقویت ہوئی کہ اب وہ گھر جا کر آرام کر سکتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ذکی کی تقلید میں اسپیشل وارڈ میں داخل ہوا تو ایک دلفریب خنکی، فنائل واسپرٹ کی ملی جلی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔
کمرے میں روشنی بہت ہلکی تھی، کافی کشادہ اور آرام دہ کمرا تھا۔ اٹینڈنٹ کے لیے بھی بیڈ موجود تھا۔ ڈارک براؤن لیدر صوفہ سیٹ، سینٹر ٹیبل، وارڈ روب...... بیڈ روم فریج بہت قرینے سے سب رکھا ہوا تھا۔
پرنس کی خصوصی ایڈوائز پر ڈاکٹر ذکی نے اس کے لیے اسپیشل وارڈ کا انتظام کیا تھا۔ ثوبان کی ماں بیڈ پر ٹیک

لگائے بیٹھی ان دونوں کو اندر آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پرنس کو پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سی جھجک محسوس ہورہی تھی۔ تاہم اس نے بہت مہذبانہ انداز اور دھیمی آواز میں سلام کیا تھا...... جس کا جواب سر کی جنبش سے دیا گیا۔

''مسز سلمان...... یہ آپ کے neighbour مسٹر پرنس شہپر علی خانزادہ......!'' ڈاکٹر ذکی نے اتنے اہتمام سے پرنس کا نام بتایا کہ عورت پر ایک طرح سے ہیبت طاری ہونے لگی۔

صرف پرنس ہی حاوی ہونے کے لیے کافی تھا...... عورت نے پرنس کی جادو اثر شخصیت سے خوف کھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''وہ...... ثوبان......؟'' باقی الفاظ حلق میں اٹک گئے...... یوں محسوس ہورہا تھا کہ سرِ عام رسوائی ہورہی ہو...... اعتماد کی بہت کمی محسوس ہورہی تھی۔

''جی وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا، میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا......'' پرنس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

رسوائی پر مجوب، بیٹے کے لیے آنکھوں میں تڑپ...... غیر مطمئن زندگی کے اشارے ایک، ایک ادا سے آشکار تھے۔

پرنس کے سامنے کچھ مناظر فلم کی طرح چلنے لگے۔

ایک مرتبہ جب وہ ثوبان سے ملنے گیا تھا اور دوسری مرتبہ جب گیٹ سے باہر کھڑی کار میں میاں، بیوی کو الجھتے دیکھا تھا اور یہ خاتون کار سے اتر کر اندر چلی گئی تھی۔

''اٹس اوکے...... پلیز آپ بھی گھر جا کر ریسٹ کیجیے...... میں اب کافی بہتر ہوں۔'' ثوبان کی ماں جس کو ڈاکٹر ذکی نے مسز سلمان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ان دونوں کی موجودگی سے خاصی گھبرا رہی تھی۔

پرنس تو حتی المقدور اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا...... اس کی زندگی میں سفینہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے کچھ وقت تنہا گزارہ تھا۔ اس کی روح میں جو پاکیزگی سرائیت کرچکی تھی وہ اسے بہت محتاط کرتی تھی...... اس کی دادی نے عورت کی تقدیس واحترام کا سبق پڑھایا تھا...... بقول لیڈی صوفیہ کہ حسین مرد اسے کہتے ہیں جو بہت احتیاط سے جیتا ہے۔

کبھی، کبھی حضرت علیؓ کا ایک قول بھی وہ دُہرایا کرتی تھیں کہ ''حیا عورت کے لیے خوب ہے اور مرد کے لیے خوب تر......''

ڈاکٹر ذکی کی تو طنابیں کھل گئیں جھٹ پرنس سے ہاتھ ملانے لگے۔

''مجھے اجازت......؟''

''آپ کے لیے لفظ شکر یہ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی رسم پوری کی جائے۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا...... ایک چھوٹے سے معصوم بچے کے لیے آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ یوں سمجھیں اتنی دیر آپ عبادت میں مصروف رہے۔'' پرنس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے...... نظر سے بھی سپاس گزاری کی۔

''اوہ...... یہ کچھ زیادہ ہوگیا...... بہر حال...... آپ کا اس میں حصہ زیادہ ہے۔'' وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محوِ کلام تھے اور ثوبان کی ماں حیرت سے ساکت تھی کہ اس کے بچے کی خاطر لوگ اپنا آرام قربان کیے ہوئے تھے۔

اتنی انسانیت، اتنی خوش کلامی...... شاید پہلی بار سن رہی تھی...... بچوں کی سی حیرانی نے اس کے حسن کو دو چند کردیا تھا۔

ڈاکٹر ذکی چلے گئے...... پرنس نے بہت احتیاط سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے بھی اجازت...... البتہ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔''

''جی میرا خیال ہے مجھے آپ کی مزید خدمات کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس وقت آپ میرے بچے کو سنبھال کر بہت بڑی خدمت تو کر ہی رہے ہیں۔''

آواز کی کھنک بڑی دلنشیں تھی...... فنکارانہ مزاج کے حامل پرنس کو اس کھنک سے نامانوس سی گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

''یہ فون آپ کے بیڈ کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ آپ اپنے ہزبینڈ کو فون کر کے انفارم کر سکتی ہیں۔''

یہ کہہ کر پرنس نے اپنے والٹ سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے...... اگر ثوبان سے صبح بات کرنا چاہیں تو اس پر نمبر درج ہیں۔ آپ بات کر سکتی ہیں...... میرا پی اے فون اٹینڈ کرے گا، آپ ثوبان کے ریفرنس سے بات کیجیے گا تو وہ آپ کی بات کرا دے گا...... باقی رہی آپ کے ڈسچارج ہونے کی بات تو وہ صبح ہی ہوگی...... میرا خیال ہے آپ کو ابھی ریسٹ کرنا چاہیے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے......'' وہ والٹ کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے گویا ہوا۔

اس پر آپ کا سیل نمبر نہیں......'' وہ کارڈ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی میرے پاس سیل ہی نہیں ہے۔'' پرنس نے اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا، اس بنا پر وہ اسے بہت اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔

عجیب نرالا شخص ہے، دیکھنے میں بھی اور انداز کلام بھی...... بہت منفرد، شائستہ، طمانیت کا قیمتی احساس دینے والا......

''مسز سلمان...... آپ ثوبان کے لیے......''

''میرا نام صندل ہے۔'' ثوبان کی ماں نے پرنس کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

پرنس کو نام خوش آیا...... مگر وہ بڑے وقار سے مسکرایا۔

''آپ مسز سلمان ہیں میرے لیے یہ کافی ہے...... اپنا خیال رکھیے گا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی نگاہ بھی اس پر نہ ڈالی تھی۔

اس کو بہت دیکھا جاتا تھا...... بہت چاہ سے دیکھا جاتا تھا...... اس لیے یہ اس کی خاص ادا بن گئی تھی کہ وہ لوگوں کے دیکھنے کو نہیں دیکھتا تھا۔

مزاج میں شکر گزاری اتنی رچی ہوئی تھی کہ خود نمائی کو داخلے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ بارش سے سیراب ہونے والے سبزے کی طرح تروتازہ و شاداب...... وہ جا چکا تھا۔

صندل مطمئن بھی تھی اور گم صم بھی......

''سلمان میں گم ہو جاؤں گی تو کیا کرو گے؟ حالانکہ میں گم ہونا نہیں چاہتی...... تم میری جگہ ایک اور صندل کو لے آؤ گے کیونکہ تم نفس کے ہاتھوں اتنے مغلوب ہو کہ حوا کی بیٹی کے بال سوکھنے نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ تو انسان ہی نہیں ہے۔''

صندل کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے...... ضبط کرنا چاہا تو سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

☆☆☆

''اتنے خوب صورت ڈنر کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا......'' زارا نے بیڈ روم میں جانے سے پہلے سفینہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا ارادہ کیا تھا...... وہ شاید سفینہ کے تاثرات جاننے کے لیے بھی بے چین تھی۔ اس وقت سے جب پرنس، سفینہ کو اسٹوڈیو لے کر گیا تھا...... وہ جاننا چاہتی تھی پرنس رومانس کے کس مرحلے تک پہنچ چکا ہے۔

سفینہ کا جواب بالکل توقع کے خلاف آیا تھا۔

''ہم اپنے مزے خراب ہونے پر افسوس کریں...... ایک زندگی اچانک دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کی فیملی

اس وقت جس تکلیف سے گزر رہی ہوگی اس کا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔'' دھڑام سے کچھ گرا...... سفینہ نے تو گویا تقریب بہر ملاقات پر تبصرہ کرنے ہی سے انکار کر دیا تھا...... اب وہ کیا پرنس کے فسانے چھیڑتی۔

''Sorry to say...... زارا...... اس وقت ہمیں اپنی ماں کی پریشانی کے بارے میں سوچنا چاہیے...... میرا ذہن تو مسلسل اماں کی طرف لگا ہوا ہے...... اتنا بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے...... اور اماں کو سب کچھ اکیلے فیس کرنا ہے۔''

''ساحل ہے ناں......'' زارا نے اپنے مخصوص لاابالی پن سے گرہ لگائی تھی۔

''ساحل صرف employ ہے۔ اماں کا بیٹا نہیں...... ایک حد تک ہی اماں کو اپنی سروس پرووائڈ کر سکتا ہے ناں۔'' سفینہ نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''اماں کا بیٹا...'' زارا طنزیہ مسکرائی...... ''اماں بہت لکی ہیں جو ساحل جیسا کوئی بیٹا نہیں......''

''کیوں......'' اس بیچارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... جو تم اس کے بارے میں اتنے نگیٹو خیال رکھتی ہو۔'' سفینہ کو درحقیقت حیرانی ہوئی۔

''جنگلی ہے بالکل...... شکل دیکھی ہے اس کی......'' کلاس'' نہیں ہے...... چمچہ لگتا ہے۔'' زارا نے کوفت سے اپنی ہی شکل بگاڑی۔

''in fact کلاس تو نہیں ہے...... کلاس ہوتی تو ہمارے ہاں جاب کیوں کرتا...... اپنا بزنس کرتا......'' یہ کہہ کر سفینہ نے اٹھنے کے لیے پر تولے۔

''ایک دن صبح صبح آ گیا...... سفینہ، تم دیکھتیں...... بہت انجوائے کرتیں...... میں نے تو کسی ماؤس کی طرح انجوائے کیا تھا۔'' زارا مسکرا تو ضرور رہی تھی مگر طنز و استہزا نمایاں تھا۔

''ریڈی میڈ سوٹ...... آلٹر بھی نہیں کرایا...... ایسے ہی پہن لیا...... اور پرفیوم کل کے لیے بچایا ہی نہیں...... سارا الٹ لیا۔''

''یہ بہت غلط بات ہے زارا...... اس کی کلاس نہیں ہے تو اس کا کیا قصور ہے...... ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگ کے نیچرل سیٹ اپ کو criticize کریں۔ تم بہت امچیور ہو...... بس جو دل میں آتا ہے بولنے لگتی ہو۔'' سفینہ کے انداز میں اب بڑی بہن والی سرزنش تھی...... اس نے خاصی خفگی سے زارا کی طرف دیکھا تھا۔

''بھلا یہ کوئی موقع تھا اس طرح کی باتوں کا...... گھر میں اتنی...پریشانی آ گئی ہے اور اس کو فکر ہی نہیں......'' سفینہ نے سوچا...... اسے تو اس وقت صرف اپنی ماں کی فکر لگی ہوئی تھی جو آدمی رات کو ایک بحران سے برسرِپیکار تھیں۔

''اماں کو فون کر کے پتا کرتی ہوں، اس وقت کیا سچویشن ہے؟'' سفینہ نے زارا سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ درحقیقت وہ یہی کرنا چاہتی تھی۔

سفینہ چلی گئی...... زارا نے ماسک نوچ کر خلا میں اچھال دیا۔

''تم کو تو سب کچھ مل گیا ہے...... تمہارے پاس سوچنے کے لیے اس ایکسیڈنٹ کے سوا اور ہے کیا...... اسٹوڈیو میں پرنس نے کتنی پیاری باتیں کی ہوں گی۔ بیچارے کو پتا نہیں کہ سب ضائع ہو گئیں...... یہ statue سلیکون سے بنا ہے ویری سیڈ...... پرنس...... miss selection ہو گیا ہے۔'' استہزائیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

حاسد بہت مظلوم ہوتا ہے مگر ظلم وہ خود اپنے آپ پر کرتا ہے...... ایک بے قراری کا عذاب تو قدرت کی طرف سے ویسے ہی طے ہے۔

''ہونہہ...... ایکسیڈنٹ تو ہوتے رہتے ہیں۔نیچرل ہے...... اب اسی کو لے کر بیٹھے رہیں......'' وہ اپنے شاندار بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بڑی نخوت سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

تاجور صبح دم گھر واپس آئی تھیں...... اتنی نڈھال تھیں چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں کہ جیسے گر پڑیں گی۔

سفینہ کی قدرتی طور پر آنکھ ضرور لگ گئی تھی مگر دو گھنٹے بعد خود بخود ایک اندیشے نے جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ جاگتے ہی ماں کو فون کیا تو انہوں نے اسے سکون سے سو جانے کے لیے کہا...... اور بتایا دیا کہ پانچ بجے تک وہ گھر آجائیں گی...... اسپتال، پولیس اسٹیشن، آفس میں ذمے داروں کے ساتھ میٹنگ...... چار گھنٹے تو چار پل کی طرح سرک گئے تھے۔

وہ آہستہ، آہستہ چلتی بیڈروم کی طرف جا رہی تھیں کہ سفینہ اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول کر سامنے آگئی...... اور بے اختیار ماں کو تھام کر گلے سے لگ گئی۔

''تھینک گاڈ...... ! آپ آگئیں، ابھی میں آپ کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔'' بیٹی نے جس انداز میں سواگت کیا اور دعاؤں کے نذرانے بھیجنے کا انکشاف کیا تاجور کو انتہائی تھکن کے باوجود ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ بے اختیار سفینہ کی پیشانی چوم لی۔

''آج تمہیں واپس جانا ہے سفینہ...... تم ریسٹ کرو بیٹا......'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے تھکے، تھکے لہجے میں گویا ہوئیں...... سفینہ بھی ان کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہوگئی۔

''آپ میری فکر نہ کریں اماں...... مجھے اسٹڈی اور ریسٹ کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔'' سفینہ نے کلچ ان کے ہاتھ سے لیا...... کھولا...... سیل فون نکال کر سائڈ ٹیبل پر رکھا اور کلچ وارڈ روب کھول کر مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔

''اماں آپ چینج کرلیں تو میں آپ کے پاؤں کا مساج کردوں گی۔ پھر آپ کو نیند بہت اچھی آئے گی......'' وہ جھک کر تاجور کے سینڈل اٹھا رہی تھی۔

بہترین فرمانبردار اولاد کی نعمت کا خوشگوار احساس ہی تاجور کی آدھی تھکن اتار گیا تھا۔ وہ ماں کی سینڈل کسی قیمتی سوغات کی طرح پیار سے اٹھائے مخصوص جگہ پر رکھنے ڈریسنگ کی طرف جا رہی تھی۔

''اماں آج آپ آفس نہیں جائیں گی...... بس صرف آرام کریں گی...... وہ جو آپ نے اتنے سارے لوگ رکھے ہوئے ہیں وہ ایک دن کے لیے نہیں سنبھال سکتے۔'' وہ ڈریسنگ سے واپس آتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بیڈروم فریج سے اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی...... سینٹر ٹیبل پر رکھے سادہ پانی کا جگ اٹھا کر گلاس آدھا بھرا پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور تاجور کے قریب آکر بہت محبت سے پیش کیا۔

''سوری اماں...... ! سب سے پہلے تو مجھے پانی دینا چاہیے تھا۔''

''کوئی بات نہیں، ان چار گھنٹوں میں آج جتنا پانی پیا ہے کبھی چوبیس گھنٹوں میں نہیں پیا......'' وہ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے مضمحل انداز میں مسکرائیں۔

''سفینہ...... میری جان...... یہ پاس ہوتی ہے تو گھر، گھر لگتا ہے......'' وہ پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

پرنس واپس آکر صرف دو گھنٹے سو پایا تھا...... اس کے اپنے اندر کی گھڑی نے مخصوص وقت پر بیدار کردیا۔

ثوبان اس کے پہلو میں گہری نیند میں ہلورے لے رہا تھا...... پرنس کو یک دم احساس ہوا جیسے اس کی خواب گاہ، خواب گاہ نہیں ایک بہشت ہے...... جس کے سرسبز درخت آنکھوں کو فرحت و راحت دے رہے ہوں...... نیچے

نہریں بہہ رہی ہوں...... پرندے خالق کی تسبیح میں رطب اللسان ہوں...... ہر طرف سے سلام کی آوازیں آرہی ہوں۔ایک معصوم بچے نے فطرت کو مادی دنیا کے عقب میں دھکیل دیا تھا۔

بچے سو رہے ہوں تو فطرت کی جلوہ آرائی کمال ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر ایک بوسہ ثبت کرے......مگر احتیاط دامن گیر تھی۔مبادا وہ جاگ پڑے......اور بہشت کے اطلس و دیبا کانٹوں کی چادر میں تبدیل ہو جائیں۔

وہ بہت احتیاط سے بیڈ سے اترا...... یوں کہ ببول کی جھاڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ملبوس سمیٹ کر احتیاط کی جاتی ہے۔

اب اس کے سامنے اپنے معمولات تھے۔نیم گرم پانی سے شاور لینا۔وضو کرنا، مراقبہ کرنا پھر مسجد چلے جانا۔ مسجد سے واپس آکر دادی کو سلام کرنا، ان کی خیریت معلوم کرنا اپنی بے لوث و انمول محبت کا نئے سرے سے یقین منتقل کرنا......پھر وہ جب تک چاہیں پرنس کا وقت اپنی مرضی سے استعمال کریں۔

اس کا خیال تھا کہ ثوبان چونکہ دیر سے سویا تھا چنانچہ وہ سورج نکلنے تک تو کم از کم خود سے بیدار نہیں ہو سکتا...... پھر بھی جب وہ مسجد کے لیے روانہ ہوا تو اپنی خاندانی ملازمہ (جس کی ماں، نانی، دادی سب نے پرنس کے گھر خدمات انجام دی تھیں) کو مستعد رہنے کی تاکید کی...... یہ خادمہ لیڈی صوفیہ اور پرنس سے پہلے جاگتی تھی اسی بنا پر اس کو ظہر کے بعد تین گھنٹے کا آرام دیا جاتا تھا اور اس سے مزید کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔

خادمہ کو ہدایات دینے کے بعد وہ مطمئن ہو کر مسجد چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ایک بوڑھے نوجوان کی کہانی
کہانی بھی اس کی اپنی زبانی
دال روٹی کی تلاش میں نکلا
اپنی say کھوئی پھر سب کی مانی
وہ چار چوٹ کی پڑی کہ یاد آئی
اپنی پیاری سی ماں وہ جنت مکانی
راؤ سلک کا کرتا، راڈو گھڑی پہن کر
اہلِ منبر فرما رہے ہیں دنیا ہے فانی
دو ہٹیاں والن دے پکن پراٹھے
کچھ جمع ہو تو ملے ڈھول دے دا جانی

بھوک سے پیٹ میں گڑگڑ سی ہو رہی تھی۔اور شاید بھوک کی وجہ سے نیند ٹوٹی تھی۔باہر نکل کر ناشتا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔کچن میں کوئی ایسی شے رکھی یاد نہیں آرہی تھی جس سے فی الفور بھوک مٹائی جا سکے۔سوائے نمکو اور ملک پیک کے۔جب سے سائٹ آفس ٹرانسفر ہوا تھا سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی ورنہ اتنی گروسری تو گھر میں موجود ہوتی تھی کہ فٹافٹ کچھ کھا پی کر دھندے سے لگ جائے۔

اپنی حالت پر خود ترسی کی کیفیت پیدا ہوئی جو فوراً ہی اشتعال میں تبدیل ہو گئی۔یہ بھی شاید ماں کی دعا تھی جو زہریلے اشعار سطح قرطاس پر الٹ کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا اور نا پختہ ذہن نوجوان کی طرح نشے کا سہارا نہیں لیتا تھا۔معاً اسے یاد آیا کہ ویجی ٹیبل بسکٹ جار میں پڑے ہوئے ہیں۔اس کا ایک دوست جو اس سے بھی زیادہ کنجوس

تھا کسی فارما کمپنی میں کوالٹی کنٹرول انچارج لگا ہوا تھا...... اس نے اسے حیرت انگیز معلومات سے نواز کر ہمیشہ کے لیے relaxed کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک کوالٹی بسکٹ میں دو روٹیوں کی کیلوریز ہوتی ہیں اس کے بعد سے اس نے چار بسکٹ کھا کر خود کو مطمئن کر لیا کہ اس نے آٹھ روٹیاں کھالی ہیں۔

کھانے کا مطلب کیا ہے...... جسم کی مشین کو ایندھن دینا...... چار بسکٹ جب مشین چلا سکتے ہیں تو فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اشعار لکھنے کے بعد یادداشت نے کام شروع کیا تھا...... اس نے فوراً اٹھ کر لاؤنج کی راہ لی۔ جہاں ٹیبل پر بسکٹ کا جار رکھا ہوا تھا۔ چار بسکٹ ایک گلاس دودھ...... ٹھیک ٹھاک ناشتا ہو گیا...... کمال ہی ہو گیا۔

پانچ روپے دیہاڑی کرنے والا مزدور چار پھلکے یا نان کھاتا ہے۔ اور ڈیڑھ لاکھ تنخواہ لینے والا چار بسکٹ......

اب وہ دودھ گلاس میں نکالتے ہوئے خود پر ہنس رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ سے بسکٹ کھا رہا تھا۔ الٹے ہاتھ سے دودھ انڈیل رہا تھا۔

آج اسے معمول سے پہلے سائٹ آفس پہنچ کر تا جور کے رجسٹر میں اپنی فرض شناسی رجسٹر کرانا تھی۔

شارٹ کٹ کی تلاش میں رہنے والے کبھی کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔

☆☆☆

پرنس نے آج اپنے معمول میں قدرے تبدیلی کی، لیڈی صوفیہ کے پاس جانے کے بجائے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ فکر یہی تھی کہ ثوبان بیدار نہ ہو گیا ہو۔

آہستگی سے دروازہ کھولا اور ہلکی روشنی میں پہلی نگاہ ثوبان پر پڑی۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا...... دونوں ہاتھ پھولے، پھولے گالوں پر تھے۔

پرنس سرعت رفتار سے آگے بڑھا...... سب سے پہلے بلائنڈز سرکائے...... کمرے میں یک دم اجالے بکھر گئے۔ اس کے بعد وہ ثوبان کے پاس آیا تو ایک دھچکا سا لگا۔ ثوبان بے آواز رو رہا تھا۔ اپنی سسکیاں دبانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

پرنس نے اسے یوں سینے سے لگایا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو......

''نہ، نہ ثوبان...... be brave۔ آپ اپنے دوست کے گھر میں ہو پھر کیوں روتے ہو؟'' پرنس نے اس کے آنسو چوم لیے۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے انکل......؟ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔'' ثوبان نے ہچکیاں روکنے کی مقدور بھر سعی کی تھی۔

''یہ میرا بیڈ روم ہے...... رات آپ نے میرے ساتھ یہ بیڈ شیئر کیا تھا...... وہ نماز کے لیے مسجد تو جاتے ہیں ناں......''

''پاپا تو نہیں جاتے۔'' ثوبان نے برجستہ کہا۔

''بہت سے لوگ گھر میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔'' اس نے ثوبان کی برجستگی پر خود کو شاید پہلی مرتبہ لاجواب ہوتا محسوس کیا تھا مگر لمحاتی وقفے سے جواب سوجھ گیا تھا۔

''وہ گھر میں بھی نہیں پڑھتے...... میں نے تو نہیں دیکھا...... ممی پڑھتی ہیں اور انکل جب وہ دعا مانگتی ہیں ناں تو بہت روتی ہیں...... میں نے بولا...... ممی آپ اتنا سارا کیوں روتی ہیں؟ پتا ہے انکل، ممی کیا بولتی ہیں۔'' اب ثوبان پُر جوش نظر آیا اور جلدی، جلدی آنسو صاف کرنے لگا۔

''کیا بولتی ہیں بیٹا؟'' پرنس زندگی کے ایک انوکھے تجربے سے آشنا ہونے جا رہا تھا۔ اس کی لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں...... اور یہ بچہ بجائے خود لائبریری تھا...... اس کی سنگت میں پل، پل کتاب بن رہا تھا۔

''ممی بولتی ہیں جب خوب سارا رو کر دعا مانگتے ہیں تو دعا قبول ہو جاتی ہے۔'' پرنس کے حساس و فنکارانہ ادراک پر ایک ضرب کاری پڑی...... وار او چھا نہیں تھا...... ٹھیک نشانے پر تھا۔

''لیکن ابھی تک ممی کی دعا تو قبول نہیں ہوئی انکل......؟'' ثوبان نے پلکیں جھپکیں۔

''جو لوگ اللہ کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان کے پاس بہت سارے آنسو ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی دعائیں جمع کرتا رہتا ہے...... جمع کرتا رہتا ہے۔ اور پھر وہ ان کو جنت میں بہت خوب صورت گھر دے گا...... خوش ہو کر خود ان سے باتیں کرے گا...... فرشتے السلام علیکم کہنے آئیں گے...... وہاں سب لوگ فرینڈز ہوں گے...... نہ کوئی کسی سے ناراض ہوگا...... نہ لڑائی کرے گا۔''

''پھر تو پاپا جنت میں نہیں جائیں گے وہ تو لڑائی کرتے ہیں....'' پرنس کے سامنے (یونیورسل) کائناتی فراست تھی...... ایک لمحے کو تو چکرا کر ہی رہ گیا۔

''وہ بات یہ ہے کہ اللہ کی مرضی سے لوگ جنت میں جائیں گے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے پاپا کے برین کی ڈسک چینج کر دیں اور پاپا بھی اچھے بچے بن کر جنت میں چلے جائیں۔ ابھی تو فی الحال ہم جلدی سے ممی کے پاس جا رہے ہیں...... آپ فٹافٹ فریش ہو کر بریک فاسٹ لے لو۔'' پرنس نے نونہال کو ولایت کے گر سلجھانے کے بجائے آناً فاناً راستہ تبدیل کرنا ضروری سمجھا۔

''میں ممی کے ساتھ ہی بریک فاسٹ لوں گا......''

پرنس کامیاب ہو گیا...... ثوبان کو اب ماں کے علاوہ کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ ماں سے ملنے کی تڑپ نے اسے.... بے چین کر دیا۔

''میرا ٹوتھ برش تو نہیں ہے انکل......'' بیڈ سے اترتے ہوئے ثوبان کو یاد آیا۔

''اوہ...... آج تو بس ایسے ہی کام چلانا ہوگا...... ممی کے پاس اسپتال جائیں گے ناں تو وہاں اسٹور سے برش لے لیں گے۔''

''او کے......'' ثوبان کو اب یقین واثق ہو گیا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہا ہے۔ آنسو بھی خشک ہو گئے...... اب وہ مکمل طور پر مطمئن نظر آ رہا تھا۔



کہاں کی نیند اور کیسی نیند بس آ گئی تھی...... تھکاوٹ کی انتہا پر فطری نیند ضرور آئی تھی مگر اچانک یوں ٹوٹی جیسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا ہو۔

آنکھ کھلتے ہی گزشتہ رات فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ احساسِ ذمے داری نے نیند کا فطری نشہ ہرن کر دیا۔

مزدور کی تدفین ہونے تک انہیں بہت کام تھے...... اسی آن سرعت سے ساحل کا دھیان ہوا اور ہاتھ خود بخود سیل فون پر جا پڑا۔

ساحل کا نمبر ڈائل کیا تو خوشگوار حیرت...... پہلی بیل پر کال وصول ہو گئی تھی۔

''السلام علیکم میم......!'' ساحل کی چوکس آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''وعلیکم السلام...... ساحل آپ ابھی گھر پر ہیں......؟'' تاجور نے ہدایات سے پہلے معلوم کرنا ضروری خیال کیا۔

''میں راستے میں ہوں...... سائٹ پہنچنے میں مجھے پانچ یا سات منٹ لگیں گے۔''

''او...... گڈ......'' تاجور کے اعصاب یکدم پُرسکون ہو گئے۔

سرما بہار زیست ہے .... دُردانہ نوشین خان

''اتنی دھند اور سردی میں چائے کا کپ لے کر کھلی سیڑھیوں میں جا بیٹھی ہو، عجیب سرپھری لڑکی ہو۔'' (ایک یاد)

کل کی سرپھری لڑکی آج کی سرپھری عورت ہے۔ وقت بیتتا ہے، سال گزرتے ہیں مگر فطرت تو نہیں بدلتی ناں، میری طرح کی کئی سرپھریاں ہوں گی جو سرما کی دیوانی ہوں گی۔ دھند اور دسمبر ایک حسین رومانوی عنوان بن چکا ہے۔ ہر سال دسمبر کی آمد پوری تازگی سے وارد ہوتی ہے۔ عرش صدیقی کی یہ نظم ''اسے کہنا، دسمبر لوٹ آیا ہے......

ہوائیں سرد ہیں اور وادیاں دھند میں گم ہیں۔''

سدا بہار ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس کی کوکھ سے جانے کتنے شاعروں نے کتنی نظمیں نکالی ہیں...... تخیل کا دریچہ کھلتا ہے۔ یہ کون میری ہم زاد ہے جو برف کی پھوار میں اوور کوٹ اسکارف لیے بانہیں پھیلائے گھومتی ہے، جو سرما کی صبحوں کی یخ بستگی کا والہانہ استقبال کرتی ہے جو سرما کی شاموں کے آنگن میں کوئلوں سے بھری انگیٹھیاں گنتا جھل، جھل کر سلگاتی اور دہکاتی ہے۔ جو سرما کی اترتی شام میں بام کی منڈیروں سے جلد آشیانوں کو لوٹ جانے والے پرندوں کی ڈاریں دور تلک دیکھتی ہے جو سرما کی کیاریوں میں کھلے سفید گلاب کا شبنمی بوسہ لیتی ہے۔ سرما کی رونقوں کا آغاز ہوتا ہے تو کہیں مل جل کر سوہن حلوے کی کڑاہی چڑھتی ہے۔ کہیں شب دیگ کا اہتمام ہوتا ہے۔ گجریلا اور حلوا جات بنتے ہیں۔ آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے رہنے اور ہاتھ پاؤں تاپنے میں اپنا ہی مزہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ گرمی کا روزہ اور سردی کی شب بیداری مومن کی بہار ہے۔ سبحان اللہ! یہ تو اعلیٰ پایہ کی روحانی مدارج کی رمزیں ہیں...... مجھ سی گناہ گار، سہل پسند کو سرما کے روزے بھاتے ہیں۔ نفلی روزے، منت کے روزے اور قضا روزے رکھنے کے لیے موزوں موسم ہے۔ پیاس کا احساس تک نہیں ہوتا...... افطاری بھی خوب کھائی جاتی ہے۔ یعنی ہم خرما و ہم ثواب' پاکستان کے میدانی علاقہ جات میں شادیاں اکثر سرما میں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں جہاں پنکھے، اے سی کی بچت ہوتی ہے وہاں مل بیٹھنے کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔ خواتین خانہ سے پوچھیے تو سرما کا ایک ایسا مثبت پہلو بتائیں گی جو عام طور پر خیال میں نہ آئے۔ وہ کہتی ہیں باورچی خانے سے چیونٹیاں،

''میم، یو ڈونٹ وری...... اگر آپ ریسٹ کرنا چاہیں تو ریسٹ کریں...... میں دیکھ لوں گا...... مجھے پتا ہے کہ ان سب کو کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔''

''تھینک یو ویری مچ ساحل...... آپ نے اس موقع پر بہت اچھی پرفارمنس دکھائی ہے۔''

''یو آر ویلکم میم لیکن یہ میری ڈیوٹی ہے......'' ساحل پھولا نہیں سما رہا تھا کیسے ہاتھ کے ہاتھ محنت کا صلہ مل رہا تھا...... ساری تھکاوٹیں اتر گئیں...... یوں جیسے...... چٹان پر پڑی دھول بارش کی پہلی پھوار سے صاف ہو جاتی ہے۔

''ہاں تم ذرا دیکھو...... میں تھوڑا لیٹ پہنچوں گی...... صادق (مرحوم) کے گھر بھی جانا ہے۔ آپ میرے ساتھ، ساتھ رہیں گے...... اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ مینج کرلیں۔''

''اوکے...... میم...... کوئی خاص بات ہوئی تو میں خود آپ کو کانٹیکٹ کروں گا۔ ڈونٹ وری...... اللہ حافظ......''

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

تاجور نے سکون کی گہری سانس لی اور بیڈ ٹی کے لیے گھنٹی بجائی۔



شاید عرصہ دراز بعد اتنی پُرسکون خواب گاہ کا تجربہ ہوا تھا...... پرنس سے ملنے کے بعد گویا پریوں نے تھپک، تھپک کر سلا دیا تھا۔ کچھ مسکن ادویات کا اثر بھی تھا...... وہ تب جاگی جب پرنس، ثوبان کو لے کر روم میں داخل ہوا...... کیونکہ ثوبان نے اندر داخل ہوتے ہی اضطراری کیفیت میں ماں کا ہاتھ پکڑ لیا تھا...... جس سے اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔

نیند بھری آنکھوں سے اس نے ثوبان کو یوں دیکھا جیسے اسے شک ہو کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

''ممی......'' ثوبان کی آواز نے نیند کا ہلکا پردہ بھی چاک کر دیا...... وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ثوبان کو لپٹا لیا۔

کا کروچ، کبھی غائب ہوجاتے ہیں۔ کمروں کی دیواروں پر چھپکلیاں نظر نہیں آتیں۔ موذی حشرات بھڑ، مکوڑے، کنکھجورے، بچھو، سانپ بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ یا زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ ماحول کی از خود صفائی ہوجاتی ہے۔ جہاں تک جاڑے کی بارش کا تعلق ہے۔ عالمی موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے سرما میں اب کم بارش ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منتوں، مرادوں کے بعد ہوتی ہے۔ اب مکانوں میں برآمدے بھی نہیں ہوتے۔ برآمدے میں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرنے اور شالیں، کمبل لپیٹ کر بھیگتے درختوں کو دیکھنے کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا۔ فلیٹ اور اونچی عمارتوں میں رہنے والے بالکونی یا ٹیرس سے بارش کا نظارہ کرتے اور گنگناتے ہیں۔

جو مزہ چوبارے
بلخ نہ بخارے
کبھی جو ٹوٹ کے برسا دسمبر

لگا اپنا، بہت اپنا دسمبر
جمع پونجی ہے یہی عمر بھر کی
میری تنہائی اور میرا دسمبر

جوں، جوں زمانہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے..... موسموں سے رعنائی اور برکت کم ہو رہی ہے..... آلودہ زہریلی دھند جسے اسموگ کہتے ہیں اس کا چند سال بیشتر تصور نہ تھا، یہ دخان ہے (دھواں)۔ اذیت ناک ہے اور اس میں گھٹن بھری ہوتی ہے۔ بارشیں کمیاب ہوگئی ہیں۔ سرما کا دورانیہ سکڑ سمٹ رہا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت کی بارشیں برسائے اور سبزے سبز نظر آئیں، فضائیں مصفا ہوں۔ دلوں کے میل بھی دور ہوں..... حسد، کینہ، بغض اور دوریاں ختم ہوجائیں۔ انسان کے اندر کا موسم، حیرت بھرا اور شکر گزار بچہ کبھی نہ معدوم ہو۔ یہی انسان کا باطنی حسن ہے اور یہی خالق کو پسند ہے۔

''ممی آپ ٹھیک ہیں ناں.....'' ثوبان دونوں ہاتھوں سے ماں کا چہرہ تھام کر بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ممی کی جان.....'' وہ رو پڑی۔

''تو پھر آپ کیوں روتی ہیں، کیا پین ہو رہا ہے؟'' ثوبان آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

ایک مصور کے لیے یہ ایک تصویر کشی کیے جانے والا منظر تھا..... وہ ایک ٹک اس نظارے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''اوہ آئی ایم سوری..... مجھے خیال نہیں رہا..... بس ثوبان کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول گئی..... یہ تو ممی کی جان ہے۔'' اس نے پرنس سے کلام کیا مگر توجہ اب بھی ثوبان پر تھی۔

''ممی..... ہم پاپا والے گھر نہیں جائیں گے۔ انکل کے گھر جائیں گے..... ممی، انکل کا گھر بہت بڑا ہے۔''

ثوبان نے بازو پھیلا کر گھر کی وسعت کا اندازہ کرانا چاہا صندل ایک دم گھبرا گئی۔

''نہیں بیٹا..... وہ صرف پاپا کا گھر تھوڑا ہی ہے..... میرا اور آپ کا بھی تو ہے۔''

''نہیں..... پاپا پھر ماریں گے۔''

صندل مارے شرمندگی کے گویا زمین میں گڑنے لگی۔

''وہ آپ کے گھر میں کوئی ملازم وغیرہ نظر نہیں آیا تھا..... گیٹ میں آٹو میٹک لاک ہے وہ بند کر دیا تھا..... اب چابیوں وغیرہ کا تو مجھے علم نہیں.....''

''اس کی آپ فکر نہیں کریں، سلمان کے پاس ہوتی ہے چابی، میں کچھ دیر بعد ان کو ٹرائی کرتی ہوں۔''

''جی! ثوبان نے آپ کے ہزبینڈ کے سیل سے ہی ڈاکٹر ذکی سے میری بات کرائی تھی۔''

''اوہ.....'' صندل نے اب ایک دم حواس باختہ ہو کر پرنس کی طرف دیکھا۔ ''وہ ان نون نمبر دیکھ کر ضرور ڈاکٹر صاحب سے کانٹیکٹ کریں گے۔ شاید کر بھی لیا ہو۔'' وہ کیوں پریشان نظر آئی پرنس کچھ سمجھ نہ سکا۔

اسی لمحے دروازہ ہلکی آواز سے وا ہوا..... صندل نے براہِ راست اور پرنس نے پلٹ کر دیکھا..... ثوبان خوفزدہ ہو کر بیڈ پر چڑھ گیا اور ماں سے لپٹ گیا، آنے والے کو پرنس نے پہچان لیا..... یہ وہی شخص تھا جو کار میں صندل سے جھگڑ رہا تھا..... یقیناً سلمان ہی تھا..... پرنس خود کار انداز میں بیڈ سے دور ہٹ گیا تھا۔ سلمان کی آنکھوں سے جھلکنے والی سرد مہری اور خشونت بہت ہی واضح تھی۔

''السلام علیکم..... !'' پرنس نے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا..... سلمان نے مصافحہ ضرور کیا مگر یوں گویا بحالت مجبوری کرنا پڑ رہا ہے۔

''یہ سلمان ہیں..... میرے ہزبینڈ.....'' صندل نے تھوک نگلتے ہوئے پرنس سے تعارف کرایا۔

''اور یہ شہپر علی خانزادہ.....'' سلمان نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو پرنس نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا تھا..... صندل کی حیرت کمال تک پہنچی..... اس حیرت میں سراسیمگی، خوف اور وحشت تھی۔

''آپ نے کیسے پہچانا.....؟''

''میرے سیل سے دو کالز کی گئی تھیں..... میں نے دونوں کو ٹرائی کیا ایک نمبر تو کسی ڈاکٹر ذکی صاحب کا تھا اور دوسرا لینڈ لائن نمبر تھا جو کسی شہپر علی خانزادہ کے ہاؤس منیجر نے ریسیو کیا اور بتایا کہ یہ پرنس شہپر علی خانزادہ کے گھر کا نمبر ہے۔''

سلمان مخاطب پرنس سے تھا مگر صندل کی طرف یوں دیکھ رہا تھا گویا کہہ رہا ہو کہ ''ابھی بتاتا ہوں۔'' سر کو ہلکا سا ہلا بھی رہا تھا..... جیسے کوئی غصے میں دانت پیستے ہوئے ہلاتا ہے۔

پرنس کو اندازہ ہوا کہ اب ضروری بات کر کے ہی اس قصے کو نمٹایا جا سکتا ہے۔

''جی میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں..... ثوبان نے مدد کے لیے بلایا تھا۔ آپ کی مسز بے ہوش تھیں۔''

''تھینک یو ویری مچ مسٹر..... اب یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ ثوبان اتنی دور تک کے neighbour تک کیوں اور کیسے پہنچا.....؟ دو گھر جو بالکل ساتھ ہیں..... ثوبان ان کے پاس کیوں نہیں گیا.....؟ بہت خوش قسمت ہیں میری مسز..... آپ رات سے ان کی خدمت کر رہے ہیں۔'' سلمان طنزیہ مسکرا کر بولا تو پرنس کو یوں لگا گویا چھت سر پر آ رہی ہو۔

''آئی ایم سوری..... میں کچھ دیر پہلے ثوبان کو لے کر آیا ہوں..... آپ کچھ زیادہ ہی مس انڈر اسٹینڈ کر رہے ہیں.....'' پرنس نے بہت باوقار انداز میں ایک طرح سے اسے لتاڑ دیا تھا۔

''جی سلمان..... یہ ابھی آئے ہیں، ثوبان رات کو ان کے گھر ہی سویا تھا۔''

''گڈ پلاننگ۔'' سلمان پر شاید ابھی تک نشے کا اثر تھا، بہت غیر محتاط انداز تھا..... یوں جیسے سامنے والے کو جان بوجھ کر اشتعال دلا رہا ہو تا کہ وہ پہل کرے تو وہ اسے شوٹ کر دے۔

پرنس نے بہت تحمل سے کیچڑ صاف کرنے کی نیت کی۔

''آپ اپنی فیملی کے پاس ہیں..... اگر آپ اپنی فیملی کے ساتھ نظر آئیں تو کسی کو اسپیس نہیں مل سکتی..... اس پر غور کیجیے گا۔'' پرنس کا انداز مدبرانہ ناصحانہ تھا..... مگر سلمان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

''اوکے ثوبان..... ٹیک کیئر.....!'' اس نے ثوبان کے قریب ہونے کے بجائے دور ہی سے ہاتھ ہلایا..... اور سلمان سے الوداعی مصافحہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا بلکہ اس کی طرف دیکھا ہی نہیں اور سیدھا دروازے سے باہر ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ثوبان کی ماں کو اب ایک نئی آزمائش کا سامنا ہو گا۔

☆☆☆

''اماں بہت تھکی ہوئی تھیں..... مگر پھر بھی ان کو جانا پڑا..... زارا میرے جانے کے بعد اماں کا بہت زیادہ

خیال کرنا۔''

زارا ناشتا کررہی تھی اور رات کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی کہ سفینہ نے آکر چونکا دیا۔

''ہوں...... وہ تو میں کرتی ہوں...... وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی اماں ہیں۔'' زارا نے ٹکڑا توڑ جواب دینے کے بعد سینڈوچ کا ٹکڑا بھی منہ میں لیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم خیال نہیں کرتیں...... مگر رات جو صورتِ حال ہوئی ہے اماں پر اس کا بہت برڈن آگیا ہے۔''

''ہوں......'' زارا نے ہنکارا ابھرا...... یوں جیسے جان چھڑائی ہو۔

''تمہاری فلائٹ کا کیا ٹائم ہے؟'' اس نے موضوع بدل کر نصیحت و فصیحت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

''شام پانچ بجے کی ہے...... گھر سے تو چار بجے نکل جاؤں گی۔'' سفینہ نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔

''پرنس تو سی آف کرنے ضرور پہنچیں گے؟'' زارا نے اعصاب پر حاوی پرنس کو لاشعوری طور پر موضوعِ گفتگو بنایا۔

''ارے نہیں......'' سفینہ قدرے شرما کر مسکرائی۔ ''میں کون سا ملک سے باہر یا حج پر جارہی ہوں۔''

زارا نے سفینہ کے چہرے پر ایک گہری نگاہ دوڑائی۔

چاہے جانے کی خوش خبری عورت کے انگ، انگ سے جھلکتی ہے...... یہی خالص عورت پن ہے...... عورت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسے چاہا جائے اور بدلے میں اس کی ذہانت و وفا داری سے لطف اندوز ہوا جائے...... انسانی خیالات تخلیق میں کارفرما کیمیائی عناصر کو یا تو توازن دیتے ہیں یا فطرت کو ناراض کر کے توازن بگاڑ دیتے ہیں۔

جب تخلیق متوازن ہوتی ہے تو نسوانیت مکمل ہوتی ہے...... اور ابلیس کی مکاری سے پہلے والی بہشت کا نظارہ دنیا میں نظر آتا ہے، جہاں آدم اور حوا ایک دوسرے کی قربت میں سرشار نظر آتے ہیں۔

ابھی سفینہ ابلیسی چالوں کی گرفت میں نہیں تھی...... اس لیے خوشی کو خوف کا ادراک بھی نہیں تھا۔

گزر جانے والا لمحہ آگہی کہلاتا ہے۔ ابھی گزرے لمحات صرف مسرتوں کے پیام دے رہے تھے...... یہ موجودہ لمحے کی آگہی تھی۔

''پرنس نے تو کل بہت ڈائیلاگ بولے ہوں گے......'' زارا نے اپنی فضول سی کھوج کو نئے سرے سے جگایا۔

''نہیں بھئی...... وہ بہت ڈفرنٹ ہیں...... فضول بات تو کرتے ہی نہیں ہیں فکشن create کرتے ہیں...... مگر بہت realistic ہیں میری ایک تصویر بنائی ہے وہ دکھائی اور...... بس......''

سفینہ چاہت کی خوش رنگ دھوپ میں خوب چمک رہی تھی۔

''اور بس......!'' زارا نے حیرت سے یوں دیکھا گویا کوئی جھوٹ پکڑنا چاہ رہی ہو۔

''اور بس......'' سفینہ مسکرائی۔

''اتنا زیادہ پرسنل نہیں ہوتے بھئی...... یہ باتیں کوئی بتانے والی ہوتی ہیں۔'' اس نے شریر انداز میں کہا تو زارا کا دل ہی بیٹھ گیا۔

''اس کا مطلب ہے خوب باتیں ہوئیں۔'' اس نے سوچا۔

''میں آدھے گھنٹے بعد سائٹ آفس چلی جاؤں گی......'' اس نے زارا کو مطلع کیا۔

''سائٹ آفس...... وہ کیوں؟'' زارا کو سمجھ نہیں آئی۔

''جتنا ٹائم ہے وہ سب اماں کے ساتھ گزاروں گی...... اماں کو بھی اچھا لگے گا۔'' سفینہ نے اپنی مخصوص سادگی سے جواب دیا۔

''ہاں اماں کو تو بہت اچھا لگے گا...... لاڈلی بیٹی ہوناں......'' زارا نے جلے دل کے پھپولے...... مسکرا، مسکرا کر پھوڑے۔

زارا نے دل فریب انداز میں ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا اور ڈائننگ سے چلی گئی۔

''فرق تو کرتی ہیں اماں...... مجھے تو ہزاروں مرتبہ جھاڑیں پلائی ہیں مگر یاد نہیں پڑتا کہ کبھی غلطی سے سفینہ کو ڈانٹا ہو۔'' عموماً سمجھا جاتا ہے کہ پردہ عقل پر پڑتا ہے...... مگر درحقیقت پردہ دل پر ہوتا ہے...... اور جب پردہ دل پر ہو تو انسان خودغرضی کا کمال حاصل کیے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''رات سفینہ بہت پیاری لگ رہی تھی ماشاء اللہ......'' لیڈی صوفیہ آج نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھیں...... کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کا کھانا لیٹ کھاتی تھیں پھر صبح کو ناشتے کے بجائے فریش جوس لیتی تھیں۔ برنچ ٹائم میں بھوک مٹاتی تھیں اور دوپہر کا کھانا وقت پر کھا کر دوبارہ اپنے معمول پر آ جاتی تھیں۔

اب نیند پوری ہونے کی وجہ سے بہت فریش نظر آ رہی تھیں اور خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسپتال سے واپس آ کر پرنس نے بھی دو گھنٹے آرام کر کے معمولات بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد اسٹوڈیو چلا آیا تھا...... اس کا موڈ بن گیا تھا کہ وہ کچھ دیر سفینہ سے بات کرے...... دل کے کسی کونے میں ایک نامعلوم سا احساسِ جرم چھپا ہوا تھا کہ شاید رات ثوبان کی وجہ سے سفینہ کو وہ توجہ نہیں دے پایا جو بہرحال اس کا حق سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے پی اے کو نمبر ملانے کے لیے کہا تو چند منٹوں بعد جواب ملا سفینہ گھر پر نہیں ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی طرح سفینہ کا سیل نمبر حاصل کر کے کہ لیڈی صوفیہ اسٹوڈیو چلی آئیں۔

وہ سفینہ سے بات کرنے کی کوشش اس لیے بھی کر رہا تھا کہ خیالات کی ایک یلغار اسے وقفے، وقفے سے گھیر رہی تھی...... بار، بار ثوبان اور اس کی ماں صندل ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتے تھے۔ لیکن اب لیڈی صوفیہ کی آمد کے باعث اسے اپنے تمام پروگرام موخر کرنا پڑے۔

''پرنس...... اب ایک مرحلہ تو طے ہو گیا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے، انگیج منٹ کی رسم کرنی چاہیے یا ڈائریکٹ شادی کی بات کی جائے؟'' وہ بڑی معصومیت سے پرنس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔

''یہ تاجور آنٹی سے ڈسکس ہونا چاہیے۔'' پرنس نے بڑا مناسب جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے وہ انگیج منٹ کرنا چاہیں اور آپ پہلے سے کہہ دیں کہ یہ ضروری نہیں...... پھر وہ اپنی بات نہیں کر پائیں گی۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھی بات کی...... میں آج ہی تاجور سے کانٹیکٹ کروں گی۔'' وہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ محبت بھری نظریں پرنس پر نچھاور کر رہی تھیں۔

''اگر وہ انگیج منٹ کی بات کرتی ہیں تو پھر تم سفینہ کو ساتھ لے کر انگیج منٹ رنگ لینے جانا...... چاہے ایک دن کے لیے لاہور بھی جانا پڑے...... رنگ اس کی پسند کی ہونا چاہیے۔''

''اُف کورس...... رنگ پسند کی ہو گی...... لیکن گرینڈ مام یہ کلیئر کر دیجیے گا کہ وہ لوگ میرے لیے رنگ نہ بنوائیں۔ مسلمان مرد کو سونا پہننے کی اجازت نہیں ہے۔'' پرنس کو اچانک خیال آیا کہ عام طور پر منگنی کی تقریب میں لڑکے کو بھی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔

''ہاں...... یہ ضروری ہے...... ویسے تو ہر مسلم کو خود ہی ان تمام باتوں کی معلومات ہونی چاہئیں خیر...... ہم بات

لیں گے۔ بس اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا...... جی چاہتا ہے سفینہ کل ہی اس گھر میں آجائے، میں بہت خوش ہوں یہ وہی لڑکی ہے جو میرے پرنس کے لیے تخلیق کی گئی ہے...... اجلی، پاکیزہ سی...... کتنی حیا ہے اس کی آنکھوں میں جو اس کو بے پناہ حسین بناتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے حیا تو خود حسن ہے۔'' لیڈی صوفیہ چونکہ بے حد خوش تھیں چنانچہ خوشی کے اظہار کے لیے راستے نکالتی جا رہی تھیں۔

سفینہ کا ذکر تھا...... تعریف تھی...... پرنس کو اور کیا چاہیے تھا...... وہ اپنی طرف سے کوئی بات کر کے موضوع بدلنا نہیں چاہتا تھا...... اس کے لیے یہ بہت تھا کہ کوئی اس کے پاس موجود ہے اور سفینہ کی باتیں کر رہا ہے۔

''میری ساس نے جو انگوٹھی مجھے پہنائی تھی وہ بہت منحوس ہے...... وہ میں نے سنبھال کر ضرور رکھی ہے مگر اپنی کسی بہو کو نہیں دی...... وہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بدلے میں بیس تولے سونا مل سکتا ہے...... میرے مرنے کے بعد اس کو سیل کر کے کسی غریب بچی کو شادی کا خرچہ دے دینا...... مگر اسے استعمال نہ کرنا۔'' لیڈی صوفیہ کی رو اب بہکنے لگی۔

انگوٹھی یاد آنے کا مطلب تھا اب وہ ماضی کی طرف لوٹ رہی ہیں...... اور کسی بھی وقت ماضی کا کوئی واقعہ انہیں حال سے منقطع کر سکتا ہے...... یہی وہ لمحات ہوتے تھے جب پرنس کو بڑی ذہانت و مہارت سے صورتِ حال سنبھالنا ہوتی تھی۔

''گرینڈ مام...... آپ کے پاس سفینہ کا سیل نمبر ہے...... میں نے لینڈ لائن نمبر پر ٹرائی کیا مگر وہ available نہیں ہے۔''

''اوہ...... تم کتنے سمپل ہو پرنس...... تم نے ابھی تک اس کا سیل نمبر ہی نہیں لیا۔ یہ کام تو پہلی فرصت میں ہی کرتے ہیں ڈارلنگ...... ہو...... ہو......'' لیڈی صوفیہ کھل کر ہنسیں...... جیسے بہت لطف اندوز ہو رہی ہوں۔

''میں ابھی زارا کو فون کر کے لے لیتی ہوں۔ بھئی مجھے ایک نہیں دو پیاری سی لڑکیاں ملی ہیں...... تمہیں لائف پارٹنر اور مجھے فرینڈ بہت مزے کی باتیں کرتی ہے۔ جب باتیں کرتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ چلو اس سے باتیں کرتی ہوں۔ شریر بھی ہے اور ذہین بھی...... جب تم نے گھر فون کیا تھا تو زارا سے پوچھ لیتے...... ویسے بھی آج سنڈے ہے وہ گھر پر ہو گی۔''

''ہاں، یہ خیال ہی نہیں رہا...... بس اب آپ اپنی فرینڈ سے خود ہی نمبر لے لیں۔'' پرنس نے خوشگوار احساسات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''اب میں اپنے بیڈروم میں جا کر اس سے کانٹیکٹ کروں گی...... اس چیئر پر زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتی...... تھوڑی دیر کے لیے تو یہ ٹھیک ہے۔'' وہ اب اپنی مخصوص کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں...... اور اسٹک پر دباؤ ڈال کر قدم اٹھانے کی کوشش کی۔ پرنس نے فوراً کھڑے ہو کر تھاما۔

''اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے گرینڈ مام...... میں انجیلا کو کال کرتا ہوں۔'' لیڈی صوفیہ ہنستی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئیں۔

''تم نے دیکھا خوشی نے مجھے کتنا انرجیٹک کر دیا ہے۔''

''مجھے بھی......'' پرنس نے شریر انداز میں کہا۔

''لو یو مائی سن......!'' لیڈی صوفیہ نے پرنس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

☆☆☆

زارا نے ریسیور اٹھایا...... موڈ اچھا نہیں تھا اس لیے...... سی ایل آئی پر نمبر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

''ہیلو......؟'' جیسے پتھر پھوڑے۔

''جی...... مس زارا سے بات کرنی ہے......'' مردانہ آواز میں بلا کی شائستگی تھی۔

''بول رہی ہوں۔'' نامانوس آواز پر سچ مچ زارا کے کان کھڑے ہو گئے...... لہجہ بھی بدل گیا۔

''لیڈی صوفیہ خانزادہ لائن پر ہیں...... بات کیجیے......'' یہ کہہ کر غالباً اس نے کال ٹرانسفر کی تھی۔
''لیڈی صوفیہ......'' اب تو زارا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
''ہیلو......'' لیڈی صوفیہ کی دھیمی مگر موسیقیت سے لبریز آواز سماعت سے ٹکرائی۔
''جی السلام علیکم گرینڈ مام......'' اس نے جلدی سے کینچلی بدلی اور حد درجہ تہذیب و خوش اخلاق لہجے میں سمونے کے لیے پورا، پوراز ورصرف کیا۔
''کیسی ہو زارا......؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔
''آئی ایم سوفائن...... آپ کیسی ہیں؟'' وہ اپنے اندر خوشی کی لہریں دوڑتی محسوس کر رہی تھی۔
''میں بھی ٹھیک ہوں...... ایکچوئیلی...... سفینہ سے کانٹیکٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔''
''جی، وہ اماں کے پاس سائٹ آفس میں ہے۔'' احساس مسرت جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
''اوہ آئی سی...... اچھا تو تم میرے آپریٹر کو سفینہ کا سیل نمبر لکھوا دو۔ I,ll be very thankfull to you ok!'' وہ ائرپیس میں سناٹا پا کر قدرے متفکر انداز میں گویا ہوئیں۔
''جی...... ٹھیک ہے۔'' زارا کو اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی...... کتنا سحر زدہ کرنے والا جملہ تھا...... لیڈی صوفیہ لائن پر ہیں...... وہ بھی زارا سے بات کرنے کے لیے...... اسے سفینہ کی وجہ سے ڈسٹرب کیا گیا۔
کتنا خوش ہوئی تھی...... جیسے لیڈی صوفہ اس سے بات کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوں...... وہ ان کے دل وروح میں سما گئی ہو...... ٹوٹ کر یاد آ رہی ہو...... اب یوں لگ رہا تھا جیسے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی ہو۔
''ہیلو......؟'' وہی مردانہ آواز اسے متوجہ کر رہی تھی۔
''جی پلیز...... نوٹ کیجیے......'' سخت مجبوری تھی وہ غلط نمبر بھی نہیں لکھوا سکتی تھی، یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ سگی بہن کا نمبر اسے یاد نہیں...... یا سرے سے اس کے پاس ہی نہیں۔
اس نے مارے باندھے نمبر بولا...... دُہرانے کا تکلف بھی نہیں کیا...... آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔
''کیا ڈرامے بازی ہے...... پرنس کے پاس سفینہ کا نمبر ہی نہیں......'' اب وہ کڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

نمبر حاصل ہونے کے بعد پرنس نے بہت اہتمام سے سفینہ سے بات کرنا چاہی تھی۔ فریش جوس کا گلاس تھام کر وہ الفاظ ترتیب دینے لگا جیسے تصویر بنانے سے پہلے خاکہ مرتب کرتا تھا۔
اسی لمحے لینڈ لائن پر آپریٹر نے اسے کسی گیسٹ کے آنے کی اطلاع دی...... سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔
''نام کیا بتاتے ہیں......؟'' اس نے اندازوں میں کھیلنے کے بجائے دوٹوک بات کی۔
''جی سلمان!'' آپریٹر نے شرمندہ انداز میں جواب دیا کیونکہ اصولاً تو اسے نام معلوم کرنے کے بعد ہی پرنس کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔
''سلمان......؟ کیا ان کا بیٹا ثوبان بھی ساتھ ہے......؟'' وہ الجھن میں پڑ چکا تھا۔
''جی نہیں...... ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔''
''اچھا...... (منیجر) ابراہیم سے کہو وہ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائے...... اور پانچ منٹ انتظار کرنے کا بولے۔''
اس نے ریسیور رکھ کر اضطراری انداز میں اپنے چہرے پر کئی بار ہاتھ پھیرا۔
''سلمان مجھ سے ملنے کیوں آیا ہے؟''

(جاری ہے)

وہ کمرے میں آیا تو وہ تیار بیٹھی تھی۔ سادے سے للن کے سوٹ میں بے پروائی سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی وہ کچھ ایسا تاثر دے رہی تھی کہ شاہ میر کچھ اندازہ نہ کرسکا۔ اس نے کمرے پر طائرانہ سی نظر ڈالی ایک اٹیچی، ایک بیگ اور ایک شولڈر بیگ سامنے پڑا تھا۔

''تیار ہو؟''اس نے سامان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' وہ مختصر سا جواب دے کر باہر جانے لگی تو اس نے پھر اسے پکارا۔

''سنو کتنے روز کا قیام ہے؟''

''معلوم نہیں......''اس نے پھر دولفظی جواب دیا۔

''اماں پریشان ہو جائیں گی۔''

اس کا دل چاہا کہے۔''میری بلا سے اماں تمہاری ہیں اور ان کی پریشانیاں بھی تمہاری پیدا کردہ ہیں، تم

شہرِ گل میں تمنا بہار کی

غزالہ جلیل راؤ



کس برتے پر اپنی اماں کی خواہش اور خوشیوں کو مجھ سے پورا کروانا چاہتے ہو۔ آخر تم ہو کون؟ میں کسی افسانے کی یا فلم کی ہیروئن نہیں کہ تم مجھے سیج پر ناپسند کر کے چلتے بنو گے اور میں گھٹ، گھٹ کر تمہاری چھت تلے خواہ مخواہ سسکتی رہوں گی۔ اگر اپنی اماں کی خوشیوں کا ایسا ہی خیال تھا تو پھر اس کو سچی خوشیاں دیتے......''

مگر فی الوقت وہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ آخر کو ایک انسان تھی اور انسانیت کے ناتے اس بوڑھے وجود کے لیے اپنے لب سی لیے تھے۔

اور جس کے ساتھ دھوکا اس کی اپنی اولاد نے کیا تھا۔ وہ چاہتی تو ایک جھٹکے میں بوڑھے وجود کو آر یا پار کر دیتی لیکن جس گھرانے میں اس نے آنکھ کھولی تھی...... جہاں وہ پروان چڑھی تھی۔ وہاں تربیت ہی ایسی دی گئی تھی کہ وہ یہی محسوس کرنے لگی کہ بستر پر پڑا وہ بزرگ وجود اس کی اپنی ماں کا ہے اور ماں اس کے نزدیک خدا کا پرتو تھی چاہے وہ کسی کی بھی ہو آخر تھی تو ماں......اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس کے نزدیک یہ قربانی نہ تھی بلکہ دھوکا دینے والے کا ساتھ دینا تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو عدالتوں میں اتنا گھسیٹے اتنا گھسیٹے کہ وہ بے موت مر جائے۔

مگر فی الحال اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ ایک تو اس کی ماں اپنے مرنے کی گھڑیاں گن رہی تھی اور وہ اسے آخری لمحوں میں اس اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی دوسرے شادی کے چند دنوں میں وہ اپنے ماں، باپ کو مسائل سے دوچار کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے ماں، باپ نے اسے بے تحاشا جہیز دیا تھا اور وہ جہیز جوں کا توں پڑا تھا۔

اس نے چند سادہ جوڑوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ مگر وہ اپنی طرح اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا خوب جانتی تھی۔

شاہ میر خوب صورت تھا، پڑھا لکھا تھا اور اچھے عہدے پر فائز تھا۔ ایک مشرقی لڑکی کے لیے جن خصوصیات کی پرکھ کرتے ہیں وہ سب اس میں موجود تھیں۔ لیکن شاید رشتہ کرنے والوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اچھے خاندان کے اندر بھی ناسور پیدا ہو جاتے ہیں......اور شاہ میر واقعی ایک ناسور تھا۔ جس کے ساتھ رہ کر وہ اس کے زخم کی طرح سلگ تو سکتی تھی لیکن جی نہیں سکتی تھی۔

شاہ میر کو اپنی آفس کولیگ عنبرین سے محبت تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کے ماں، باپ رشتہ دے دیں لیکن ذات پات اور رسم و رواج کی پابندیوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی محبت سے دست بردار ہو جائے کیونکہ عنبرین کے ماں، باپ نے اس کی نوکری چھڑوا کر اس پر بہت پابندیاں لگا دی تھیں۔ جبھی وہ اپنی محبت کی خاطر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

ماں باپ کے نزدیک سب سے بہتر علاج یہی تھا کہ وہ عنبرین کی شادی کر دیں۔ اور عنبرین نے ماں باپ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ اپنے پورے خاندان کو مصائب و آلام سے دوچار کرنے کے بجائے وہ خود مصلوب ہو گئی لیکن شاہ میر اپنی شکست قبول نہ کر سکا۔ یوں بھی دسترس میں نہ آنے والی چیز زیادہ پیاری لگتی ہے۔ معمولی ناک ،نقشہ اور واجبی سی قد و قامت والی عنبرین اس کے خوابوں میں اپسراؤں کا روپ دھارے بیٹھی تھی اور وہ اس کے فراق میں دنیا چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ عنبرین شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ یو کے چلی گئی تھی۔ اور چار برس بعد جب واپس لوٹی تو شاہ میر اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ اتنی بدل چکی تھی کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ شادی نے اس کو نکھارا ہی نہیں سنوار دیا تھا، وہ پہلے سے کہیں خوب صورت اور تروتازہ تھی۔

دو بچوں کی ماں بن کر اس نے اپنے ذہن کے ہر گوشے سے شاہ میر کو نکال پھینکا تھا، وہ اپنے آفس کے ساتھیوں سے ملنے اپنے شوہر کے ہمراہ آئی تھی اور شاہ میر کی ٹیبل پر تو وہ دوسرے ساتھیوں سے بھی کم وقت کھڑی رہی تھی۔

قیامت خیز گھڑیاں گزر چکی تھیں وہ چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع

ہوگیا وہ جو مرد تھا اس کی یاد میں برسوں سے تڑپ رہا تھا اور وہ عورت ہوکر سب کچھ بھول بیٹھی۔

وہ ماں، بہنوں کی منتوں سماجتوں کے باوجود شادی سے انکار کرتا رہا۔ لیکن اب بسترِ مرگ پر تڑپتی فالج زدہ ماں کی آرزو رد نہ کرسکا جس نے بیوگی کے لاتعداد ماہ وسال ان بچوں کو پالنے میں گزار دیے تھے۔ اس نے بہت سی تکلیفیں اٹھا کر انہیں پروان چڑھایا تھا۔ تعلیم دلائی تھی اور بیٹیوں کو ان کے گھروں میں آباد کیا تھا۔ لیکن بیٹے کا گھر بساتے، بساتے اپنے ابدی ٹھکانے کا سوچ بیٹھی۔

وہ اس کے انکار سے تنگ آکر عرصہ دراز سے خاموش تھیں لیکن اس بار وہ انکار نہ کرسکا۔ اور یوں ارم اس کی بہنوں کی پسند اس کی دلہن بن کر اس کے حجلۂ عروسی میں چلی آئی لیکن شادی کی پہلی رات ہی اس نے ارم سے دوٹوک بات کرنے کا سوچ رکھا تھا۔

وہ کمرے میں موجود تھا۔ سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا کسی ذہنی الجھن کا شکار تھا۔ کمرے میں تازہ پھولوں کی مہک کے ساتھ ائر فریشنر کی خوشبو ہم آہنگ ہوکر خوشگوار سا تاثر چھوڑ رہی تھی۔

ماحول میں چھائی خاموشی اور سناٹے میں صرف گھڑی کی ٹک، ٹک زندگی کی علامت بن کر ابھر رہی تھی ورنہ کمرے میں رکھی ہر شے ساکت، بے جان اور... بے حس وحرکت تھی۔

وہ روایتی دلہنوں کی طرح سر جھکائے اپنے بھاری بھرکم لباس میں ہراساں، ہراساں اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ رہی تھی۔

''شاید میں اسے پسند نہیں آئی؟'' دل نے... گوشی کی...'' لیکن اس نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں...'' دماغ نے دل کی بات رد کردی۔ ''اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے فکرمند ہے۔'' دل نے پھر سہارا دیا۔ لیکن وہ اس کے ہمراہ ماں سے ملنے گیا تھا۔ ماں بہت خوش تھی اور خوشی کے اظہار نے اس کی فالج زدہ آنکھوں سے آنسو رواں کردیے تھے۔

''تو پھر......؟'' اس نے کئی بار کھنکتی چوڑیوں سے بے جان کمرے میں ارتعاش پیدا کیا۔

نہ جانے کتنے سوالات شکلیں بدل، بدل کر اس کے سامنے آتے رہے اور رات دھیرے، دھیرے بیتتی رہی پھر وہ اٹھا اور اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''ارم......'' وہ چپ رہی، البتہ گٹھڑی بنے وجود میں ذرا سی ہلچل ہوئی۔

''آپ مجھے بے حس سمجھتی ہوں گی۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن میں مجبور تھا اور بہ حالتِ مجبوری مجھے یہ شادی کرنا پڑی۔ یہ شادی نہیں میری آرزوؤں کی موت ہے۔ اس لیے میں آپ سے سمجھوتا بھی نہیں کرسکوں گا۔ ماں کی شدید بیماری اور بہنوں کے اصرار نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا اور حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اس لیے بیاہ کر لائے ہیں؟'' وہ رکی۔

''وہ لڑکی جو سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قانون، مذہب اور تمام رسموں، رواجوں کے ساتھ بیوی کی صورت میں موجود ہے۔ اس کو آپ اپنی مجبوریوں کی کہانی سنا رہے ہیں اگر آپ اتنے ہی مجبور تھے تو آپ نے انکار کردیا ہوتا۔''

وہ ہکا بکا کھڑا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ چند گھنٹے پہلے جو لڑکی اس کے کمرے میں لاکر بٹھادی گئی تھی وہ اتنی بے باکی سے اس کی غلطی کا احساس دلائے گی۔ وہ کسی صورت یہ گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ہٹ دھرمی سے کام لینا چاہا۔

''جو ہوگیا سو ہوگیا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جب تک میرے نکاح میں رہو گی میرا ساتھ دو گی۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکوں۔''

''اس کا مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔'' اس نے طنز

سے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس دھوکے بازی کی اصل وجہ کیا ہے اور پھر اگر ڈراما ہی کرنا تھا تو اس مقصد کے لیے کسی بکنے والی کو کرایے پر لے آتے کسی معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''میں ہر قیمت پر اپنی ماں کو بچانا چاہتا تھا۔''

''اب میں کیا خدمت سرانجام دے سکتی ہوں۔'' وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

''اس وقت تک جب تک ماں اپنی آخری سانس پوری نہیں کر لیتی مجھ سے تعاون .....'' اس نے چبا، چبا کر کہا۔

''اور اس کے بعد؟'' اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔

''ہم دونوں کے راستے جدا ہوں گے۔''

''لیکن اس کی وجہ.....؟''

''عورت سے انتقام جس نے مجھے لوٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی ساری عورتیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ اور ان سے یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔''

''مسٹر شاہ میر میں تم سے ہرگز نہیں ڈروں گی، میں تمہیں وہ سبق دوں گی کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گے۔ تم ایک بزدل انسان ہو جو ایک طرف اپنی ماں کو اذیت سے مرتا نہیں دیکھ سکتا اور دوسری طرف اس اذیت کو کم کرنے کے لیے اسی جیسی عورت کا سہارا لینا چاہتا ہے۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔

''یہ تکلیف دہ سفر جو نامعلوم عرصے تک میں تمہاری ہمراہی میں کاٹوں گی۔ اس میں، میں تمہاری کسی شرط کی پابند نہیں رہوں گی۔ میں کیا کرتی ہوں، کب جاتی ہوں کب آتی ہوں یہ میرا ذاتی معاملہ ہوگا۔ تم صرف اپنے یا میرے رشتے داروں تک میرا ساتھ دو گے۔ بیٹیوں والے مجبور سہی لیکن اس قدر بھی مجبور نہیں ہوتے کہ شاہ میر جیسے لوگوں کے سمجھوتوں کو قبول کر لیں۔'' وہ بہت ثابت قدمی سے بولی تھی۔

''دو اجنبی مسافر گاڑی کے ڈبے میں کچھ وقت تو خاموش رہ سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں اس لیے دنیا والے اور تمہارے گھر والے کچھ کہیں تو جواب تم ہی دو گے، اس لیے کہ مجبور میں نہیں، تم ہو۔ اور یہ کہ میں طلاق سے نہیں ڈرتی، میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں، آج کے دور کی لڑکی...... میرے خاندان والے روشن خیال ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ اسلام میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے اور ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لفظ سے نفرت تھی لیکن انہوں نے ہم عورتوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ناپسندیدہ مرد کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرنا چاہیں تو اپنا یہ حق ضرور استعمال کریں اور مجھے سارے حق استعمال کرنے آتے ہیں، کاش مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنا پہلا حق استعمال کرتی جو نکاح جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی کے وقت استعمال کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال میں مجبور نہیں اور نہ میں مجبوری کی ہر بات قبول کرنے کو تیار ہوں گی۔'' وہ اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ایک، ایک زیور اپنے بدن سے جدا کیے اور پھر بال کھول کر باتھ روم میں گھس گئی۔

ٹھنڈے، ٹھنڈے پانی کی پھواروں نے اس کے تپتے ہوئے دماغ کو قدرے سکون بخشا اور نہ معلوم کب تک وہ شاور کے پانی اور آنسوؤں کے ریلوں کو گڈمڈ کرتی رہی۔

اس کا دل پھٹ پڑنے کو تھا۔ سارا وقت اس کی بہنیں، اس کی سہیلیاں اور شادی میں شریک لوگ ان دونوں کی کس قدر تعریفیں کرتے رہے تھے۔ اس کے ذہن سے ٹکرانے والا ایک، ایک جملہ اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا تب وہ خود کو کتنا خوش قسمت سمجھ بیٹھی تھی۔

''آہ کس قدر خوش ہوں گے میرے بہن، بھائی کہ میں اتنی اچھی جگہ بیاہی گئی ہوں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ میں کس جہنم میں جھونکی گئی ہوں۔'' اوپر سے پُراعتماد مگر اندر سے وہ ٹوٹ رہی تھی۔ کافی دیر بعد سادہ... سے نائٹ سوٹ میں باہر آئی تو وہ جوں کا توں صوفے پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اسے دیکھا تو چونک پڑا۔

اس کا حسن مکمل تھا۔ وہ کسی زیور یا سجاوٹ کی محتاج نہیں تھی۔ بڑی، بڑی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور

ان پر سایہ فگن پلکیں اس کے جذبات کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب تھیں۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو سمیٹا اور ایک پن لگا کر کھڑی ہوگئی۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اب وہ سونا چاہتی ہے۔ شاہ میر نے تکیہ اٹھایا اور سامنے صوفے پر رکھ کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

''میں دوسرے کمرے میں سونا چاہتی ہوں۔'' وہ اسے دیکھ کر بولی تھی۔

''یہ مناسب نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''اور میرے لیے یہ مناسب نہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا تو وہ نرمی سے بولا۔

''میں دوسرے کمرے میں سو جاتا ہوں مگر صبح میری بہنیں آئیں گی تو......؟''

''صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔''

رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ ہلکے سے کھٹکے پر اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اتنے بڑے دھوکے کے بعد اس کا اعتبار یکسر ختم ہو چکا تھا۔ وہ اس شخص کی بنی ہی نہیں تھی کہ سارے جذبے مٹی ہو گئے۔ اور اس کے بعد ابھر ابھر کر سامنے آنے والا جذبہ بھرپور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب اس سے اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے قریب آیا تھا۔ کسی نے جھک کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کے قریب کسی کی بے ترتیب سانسوں کو محسوس کیا تھا۔ اور پھر گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں تو ساری آوازیں قدموں کی چاپ میں گم ہو گئیں۔

اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف گھبرائی، گھبرائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا خاموشی تھی۔ درمیانی دروازہ اسی طرح بھڑا ہوا تھا جس طرح وہ رات بھر سے دیکھتی رہی تھی۔ البتہ شاید یہ ان کا برآمدہ تھا جس میں ہلکی، ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ بیڈ سے نیچے پیر لٹکائے وہ سوچتی رہی آخر وہ کیا کرے؟ عورت واقعی عورت ہوتی ہے اور مرد صرف مرد ہوتا ہے۔ ''اب مرد بھی دیکھتے ہیں اور عورتیں بھی اور خواب ٹوٹ جائیں تو پھر بکھرتے دونوں ہیں...... لیکن عورت اپنے آپ کو سمیٹ لیتی ہے۔ مگر مرد...... مرد بکھر جاتا ہے۔

اس نے آنکھوں سے بے دریغ امڈ آنے والے آنسوؤں کو بہنے دیا اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ایک نظر آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ پیروں پر بنے گل بوٹوں کو نہیں کھرچ سکتی تھی کتنی خوش ہو رہی تھی۔ وہ مہندی کا گہرا، گہرا رنگ دیکھ کر۔ مہندی والی نے بھی دونوں ہاتھوں میں اس کا نام بھر دیا تھا۔

''میری مہندی، میرے گجرے، میری چوڑیاں' میرا امنگوں بھرا ابھرا سلونا وجود کوئی چیز بھی تو اسے متاثر نہیں کر سکی۔ ایک دم ہی جھولی بھر کر دکھ مجھ پر انڈیل گیا۔'' وہ سوچتی رہی اور آنسو بھل، بھل بہتے رہے۔

موذن کی آواز نے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس کی امی ہمیشہ کہتی تھیں ارم تمہیں نماز کے لیے کئی بار اٹھانا پڑتا ہے اور وہ ہنس دیتی تھی۔

''امی جان......! دراصل تیسرے پہر کی نیند ہوتی ہی مزیدار اور گہری ہے لاکھ کوشش کرتی ہوں آنکھ ہی نہیں کھلتی۔'' آج تیسرے پہر کی نیند اچاٹ تھی اس نے اٹھ کر وضو کیا اور الماری کے اوپر رکھا مصلی بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔

اس کا دل بھر، بھر آیا وہ بلک، بلک کر تڑپ کر روتی رہی اور خدائے بزرگ و برتر سے اپنے لیے صبر اور ہمت کی دعائیں مانگتی رہی۔ پھر اس سرد برفیلی شب کی سحر بھی دن میں بدل گئی۔ اس کی نند صائمہ کمرے میں آئی تو ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

''بھابی آپ کی آنکھیں بہت سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔'' اس نے مسکرا کر صائمہ کو دیکھا اور ہنس کر بولی۔

''دراصل رات مجھے نیند ہی نہیں آئی اپنے بستر اور کمرے کے بغیر تو میں کبھی سوئی ہی نہیں۔''

شاہ میر کمرے میں آیا تو صائمہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں بھی بہت سرخ تھیں۔

''میں ناشتا لاتی ہوں۔'' صائمہ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''ناشتے کے بعد بھائی، بھابی تو دروازہ بند

کر کے سو جائیں گی اور آپ باہر چل کر انتظامات سنبھالیے، آج آپ کا ولیمہ ہے۔''

''تو پھر جلدی سے ناشتا لے آؤ، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔'' اس نے پیار بھری نظروں سے صائمہ کو دیکھا اور ہاتھ کا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔

وہ باتھ روم سے نکلا تو حیرت کے مارے اس کی سانس بند ہونے لگی۔ وہ فیروزی اور جامنی امتزاج کے گولڈن کام والے سوٹ کے ساتھ بھاری بھرکم جیولری پہنے گھرے میک اپ کے ساتھ تیار تھی۔

''میں ناشتا نیچے کے کمرے میں کروں گی۔'' مختصر سے اس جملے کے ساتھ ہی سلسلۂ کلام ختم ہو چکا تھا۔

صائمہ کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے اس نے کمالِ محبت سے کہا۔

''صائمہ انہوں نے تمہیں روکا نہیں کہ تمہیں ناشتا لانے کی زحمت اٹھانی پڑی حالانکہ میں نے رات ہی کہہ دیا تھا کہ ناشتا ہم ای کے ساتھ کریں گے۔''

''اوہ بھابی......'' صائمہ کی آنکھیں بارِ تشکر سے لبریز ہو گئیں۔ کل تک ان کو گمان تک نہیں تھا کہ آنے والی ان کے حق میں کیسی ثابت ہوگی۔ مگر آنے والی نے تو ایک دن کا دلہنا پا بھی نہ کروایا اور محبتیں بانٹنے لگی۔

ماں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور آنکھوں سے بلائیں لینے لگیں۔

''ان کا علاج کون سے ڈاکٹر سے ہو رہا ہے؟'' اس نے صائمہ سے پوچھا۔

''ڈاکٹر رفیع سے۔'' صائمہ نے دکھے لہجے میں کہا۔

''میرے چچا کی یہی کیفیت تھی۔ مہینوں ڈاکٹر رفیع کا علاج ہوا لیکن کوئی افاقہ نہیں تھا۔ پھر دوسرے ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا خیر اب تو وہ اچھا خاصا چل پھر سکتے ہیں۔ میں جاؤں گی تو چچا جان سے مکمل معلومات لے کر آؤں گی۔''

''بھابی آپ رات کو چلی جائیں گی اپنے گھر والوں کے ساتھ؟'' صائمہ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں گڑیا دستور یہی ہے ورنہ میرا دل تو نہیں چاہ رہا۔'' اس نے کن انکھیوں سے شاہ میر کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

ولیمہ بہت کروفر سے ہوا۔ شہر کی نامور شخصیات مدعو تھیں وہ کبھی، کبھی نظر اٹھا کر جب بہن، بھائیوں اور ماں، باپ کے مطمئن چہروں کی طرف دیکھتی تو اس کے دل پر قیامت سی گزر جاتی اس کا جی چاہتا پھوٹ، پھوٹ کر روئے اور آنے والے سارے مہمانوں سے کہے۔

''آؤ! میرے دل کی حالتِ زار کو دیکھو، کیسے الاؤ روشن ہیں، کس جہنم میں جل رہی ہوں۔''

لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس شخص کو ایسا سبق سکھائے گی کہ وہ رہتی دنیا تک خود کو معاف نہ کر سکے گا۔

وہی گھر تھا، وہی لوگ تھے، وہی درودیوار تھے۔ وہی اس کا کمرا تھا جس کی ایک دیوار میں بنے شیلفوں میں اس کی کتاب سجی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی سب چیزیں ویسے ہی سجی تھیں۔ باتھ روم میں اس کے کپڑے ٹنگے تھے اور اس کی الماری کی چابی اب بھی پھولوں والی باسکٹ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ لیکن وہ خود بدل گئی تھی۔ سر سے پیر تک اس گھر کے لیے اجنبی بن چکی تھی۔

اس کے بہن، بھائی اس کے اردگرد بیٹھے اس کے کپڑوں کو زیوروں کو انگوٹھیوں والے مہندی سے سجے ہاتھوں کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ چھوٹے، چھوٹے جملے، مسکراہٹیں، ہنسی، مذاق ہو رہا تھا اور وہ ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ ''چلو بس اب سوتے ہیں۔''

''پھپو میں آپ کے پاس سوؤں گی۔'' اس کی بھتیجی سیما مچل گئی۔

''آؤ!'' اس نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اپنے میں آ گئی۔ اور اسے لیے یونہی اپنے بستر پر لیٹ گئی...... کمرے میں چاندنی، دریچے سے چھن، چھن کر آ رہی تھی۔

''سیما سوگئی کیا؟'' چھوٹی بھابی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ایک دم گہری نیند میں ہے۔ وہ تو اندر آتے ہی سوگئی تھی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی جو سانس کم اور آہ زیادہ تھی۔ بھابی نے چونک کر اسے دیکھا اور اس نے فوراً ہنس کر کہا۔

''توبہ، توبہ کتنی واہیات رسموں سے سابقہ پڑتا ہے، شادی کرنا آسان بات نہیں بھابی! توبہ میں تو تھک گئی۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''بھابی ذرا پردے برابر کرتی جائیں۔'' اس نے جاتی ہوئی بھابی سے کہا۔ وہ شاید اس سے باتیں کرنے آئی تھیں لیکن اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ سونے لگی ہے۔

''خیریت، پہلے تو چاندنی کی دیوانی تھیں، اب کیا ہوا؟'' وہ ہنس کر بولیں۔ ''بڑی جلدی تبدیلی آئی ہے کچھ دیر تو صبر کرو۔''

''اوہو نہیں بھابی! اس دھندلی چاندنی سے تو خوف آتا ہے۔'' بھابی نے اسے حیران ہو کر دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

''بھائی مجھے گھر چھوڑ آؤ۔'' دوسرے دن ناشتے کے بعد اس نے بھائی ندیم سے کہا۔

''ابھی سے؟'' مارے حیرت کے سب برآمدے میں آن کھڑے ہوئے۔

''ممی پھپو پھر جارہی ہیں۔'' سیما زور سے چیخی۔ وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ''پھپو ابھی نہ جاؤ۔'' امی گم صم کھڑی تھیں۔ جیسے اب وہ پرائی تھی کچھ کہنے کا حق ہی نہیں رہا تھا۔

''بی بنو کا دل نہیں لگ رہا۔'' بھابیاں مسکرا رہی تھیں۔ تب چھوٹی بھابی جو اس کی دوست بھی تھیں اور ہم راز بھی لیکن شاید اب وہ بھی صرف بھابی تھیں۔ دوست یا ہم راز ہوتیں تو اس کے ساتھ ہوئے دنیا کے سب سے بڑے ظلم پر وہ انہی کے کندھے پر سر رکھ کر جل تھل مچا دیتی۔

''بے شرم کچھ تو شرم کرو، سب، پھپو، آپی کی رٹ لگا رہے ہیں اور تو ہے کہ طوطے کی طرح دیدے ہی پھیر لیے۔'' بھابی نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

''یہ بات نہیں بھابی دراصل وہ جس کی خوشی کے لیے میں اس گھر میں ہوں وہ لبِ دم ہیں ایسا نہ ہو کہ.....'' اس نے گردن جھکا لی۔

''بہانے نہ بنا.....'' چھوٹی بھابی نے پھر بھی نہ مانا کہ وہ ساس کی وجہ سے جارہی ہے۔

''اللہ کی قسم بھابی جو جھوٹ بولوں بس صرف اور صرف ساس کی خاطر......دیکھو ناں بھابی! آپ کو میری ماں اچھی لگتی ہے ناں۔''

''ہاں کیوں نہیں، ہمیں تو اپنی امی سے بڑھ کر عزیز ہیں۔'' تینوں بھابیوں نے کہا تو وہ حسرت سے بولی۔

''بھابی! یہ سب آپ لوگوں کی تربیت کا نتیجہ ہے اگر میں ابھی سے ان سے محبت کروں گی تو وہ بھی میری قدر کریں گے اور آئندہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوگا۔''

اماں نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا ان کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ وہ خوش ہو کر بولیں۔

''سدا سکھی رہو، جاؤ بہن کو چھوڑ آؤ، سدا سہاگن رہو پھر آجانا۔'' ان کے خیال میں وہ بے انتہا فرمانبردار بہو بن چکی تھی۔

اس کے آنسو کہیں اندر ہی اندر گر رہے تھے۔ یہ کیسا انوکھا دوراہا تھا۔ محبت کی عجیب تقسیم تھی۔ جس کے لیے اپنے رشتے چھوڑ دیے۔ گھر چھوڑا...... جسے سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں جسم و جاں کا مالک تسلیم کیا وہی منافقت کر رہا تھا۔

ارم کے لیے اس کی سب سے بڑی خوبی یا خامی اس کی فطری جرأت تھی۔ جس کی موجودگی میں وہ بڑے، بڑے فیصلے بہت بہادری سے بہت کم وقت میں بڑی منصوبہ بندی سے کر لیتی تھی اور یہ قدرتی امر تھا کہ ان فیصلوں پر کاربند رہ کر وہ بڑی ثابت قدمی اور حوصلے سے وقت کا انتظار کرتی تھی لیکن یہاں وہ تھک سی گئی تھی۔

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ آہستہ، آہستہ اس نے گھر کو اپنا کچھ اس طرح گرویدہ کرلیا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس کی لمحے بھر کی جدائی کو بھی محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہی اماں جن کے لیے اس نے سودے بازی اور منافقت کی تھی‘ ارم کی محنتوں، خدمتوں اور سچی رفاقت اور لگن سے صحت یاب ہوچکی تھیں۔ وہ ڈاکٹر جو اُن کی زندگی سے مایوس تھے وہی اب حیرت زدہ تھے۔ وہ اولاد جو اُن کی سانسیں گنتی تھی اور جس کا خیال تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکیں گی‘ وہ اب بہتر علاج، اچھی خوراک اور تندہی سے کی گئی دیکھ بھال سے اپنے پیروں پر چلنے لگی تھیں اور یہ سب اس کی محنتوں کا ثمر تھا۔

ارم ہر روز بلا ناغہ ان کی مالش کرتی تھی، ان کو وقت پر دوا اور غذا دیتی تھی، ان کو ورزش کراتی تھی اور صلے میں ان کا رواں، رواں اسے دعائیں بخشتا تھا۔ چھوٹی نند کے لیے وہ سراپا رحمت تھی۔ اس کے حصے کے سارے کام سرانجام دیتی اور اسے صرف پڑھائی پر توجہ دینے کے علاوہ کبھی، کبھی اس کی پڑھائی میں بھی مدد کردیتی تھی۔

اور وہ اس سے بے خبر نہ تھی جو اس کے لیے چیلنج بن چکا تھا۔ جس کو شکستِ فاش دینے کے لیے اس نے یہ راہ چنی تھی۔

وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا خیال رکھتی‘ رات کو اس کے لیے صبح کے لیے جو کپڑے نکالتی تو جوتے کے ساتھ جراب تک میچ کر کے رکھتی۔ رومال، ٹائی، گھڑی، سگریٹ‘ ایش ٹرے‘ شیونگ کٹ، جوتے پالش سے لے کر دانت میں خلال کرنے کی ٹوتھ پک تک اس کے سامنے رکھتی اور وہ حیرت کا مجسمہ بن کر سوچتا۔

”کیا چیز ہے یہ لڑکی..... کس طرح غیر محسوس طریقے سے چھا چکی ہے گھر بھر پر کیا جن ہے؟ جو بغیر آواز نکالے سارے کام کرگزرتی ہے۔ بھوت ہے، مشین ہے روبوٹ ہے یا کوئی آسمانی مخلوق ہے، تھکتی بھی نہیں، شکوہ بھی نہیں کرتی۔“ لیکن یہ تو وہ جانتی تھی۔ جب تھک کر بستر پر پڑتی تو انگ، انگ ٹوٹ رہا ہوتا اور جسم کے ہر حصے میں درد کی باڑ۔ سی اُگ آتیں۔ وہ جس کے لیے خود کو لوہے اور پتھر میں ڈھال رہی تھی کبھی، کبھی اس پر نظر پڑتی تو دل درد کا گھر بن جاتا۔ رہ، رہ کر سوچتی ”کون تھی وہ جس نے عشق اس سے کیا اور بیاہ کسی اور سے رچا بیٹھی۔ کاش میں، میں اسے ایک بار دیکھ پاتی۔“ پھر بہت جلد اسے موقع بھی مل گیا تھا۔

وہ آفس میں تھا۔ صائمہ تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔

”بھابی! بھیا نے فون کیا ہے، ان کے کالے کوٹ میں ان کا آئی ڈی کارڈ پڑا ہے۔ وہ نکال دیں ابھی دفتر سے آدمی آرہا ہے اس کو دینا ہے۔“

اس نے ہچکچاتے ہوئے سارے کوٹ دیکھ ڈالے کارڈ تو نہ ملا ایک لفافہ بند مل گیا۔ جس میں بہت ساری تصویریں تھیں۔ چند منٹ بعد پھر فون آیا کہ ”کارڈ اس کی اپنی جیب سے نکل آیا ہے۔ لہٰذا تلاش نہ کریں.....“ اس نے جلدی سے دروازہ اندر سے بند کیا اور لفافہ احتیاط سے کھولا۔ یہ سارے فوٹو گرافس یقیناً اسی لڑکی کے تھے۔ وہ غور سے دیکھتی رہی۔ کہیں کوٹ کو ہاتھوں پر ڈالے اس نے مسکراتے ہوئے تصویر کھنچوائی ہوئی تھی تو کہیں پتوں سے جھانکتے ہوئے کہیں چوٹی آگے ڈال رکھی تھی تو کہیں بال بکھیرے ہوئے اور کہیں اپنا سر شاہ میر کے کندھے پر... ٹکا رکھا تھا۔ باغوں، کلبوں اور ویرانوں میں کھینچی گئی تصویروں کا پلندا دیکھ کر اسے سخت افسوس ہوا۔

کس ڈھٹائی سے اس لڑکی نے کوئی اور گھر آباد کیا ہوگا، اسے پہلی بار شاہ میر پر رحم آیا اور اس لڑکی سے نفرت محسوس ہوئی۔ یقیناً اس کے اندر شرافت ہے کہ وہ اس فتنے کو بھلا نہیں پایا۔ مرد ہو کر اس نے تو کچھ خیال بھی رکھا۔ جبکہ اس نے عورت ہو کر ساری حدیں ختم کر ڈالیں۔ اس نے پھر لفافہ بند کیا اور اسی کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا لیکن اس دن اسے واقعی بہت زیادہ دکھ ہوا۔

☆☆☆

وقت آہستہ خرامی سے گزر رہا تھا، کبھی، کبھی تو وہ اپنے

جذبات سے خود دست وگریباں ہوتی جب اس کی پڑوسنیں اس کے سامنے اپنے، اپنے شوہروں کی باتیں کرتیں۔

''اللہ نہیں، وہ تو میرے بغیر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کرتے۔''

''نہیں بھئی آج کہاں؟ چھٹی کے دن تو بیویاں بالکل پابند ہوتی ہیں...... ہفتے میں ایک روز تو وہ گھر پر ہوتے ہیں، بھلا کہیں جانے دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں بس اس روز تم مجھ سے باتیں کرتی رہا کرو۔''

''ہائیں۔'' وہ چونک پڑتی۔ کیا باتیں کرتی ہوں گی یہ عورتیں۔'' اس کے مقدر میں تو وہ ہی پہلے روز کی باتیں آئی تھیں۔ جنہوں نے اسے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ اب تو صرف یہ ہوتا ہے۔ ''میرا رومال کہاں ہے؟'' فضا ہموار پا کر سوال ہوتا۔

''وہیں جہاں سارے رومال ہیں۔'' منہ اُدھر اور جواب اِدھر۔

''کھانا لگاؤں؟''

''کھالیا ہے۔''

''میں امی کی طرف جاؤں گی چار بجے نو بجے واپس آجاؤں گی۔ اماں کی دوائیاں ختم ہیں۔ بجلی کا بل پڑا ہے۔'' وغیرہ، وغیرہ......

اور اب اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا وقت آچکا تھا۔ اماں بالکل صحت مند تھیں۔ ڈاکٹرز نے طاقت کے علاوہ ساری دوائیاں بند کردی تھیں۔ صائمہ امتحان دے کر لمبے عرصے تک فری ہوچکی تھی اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے دو عورتیں بہت تھیں۔

اس رات وہ سارے کام نمٹا چکی تھی کچن کے ڈبے تک دھوڈالے تھے، مسالے واپس شیشے کی بوتلوں میں ڈال چکی تو صائمہ نے آکر کہا۔

''بس کریں بھابی، آپ تو اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر کام کرتی ہیں، سچی اماں کی جتنی دعائیں آپ کے حصے میں آئی ہیں اتنی تو ان کی پوری اولاد نہ لے سکی۔ آپ بہت اچھی ہیں بھابی۔''

''محبت ہے اماں کی ورنہ میں نے کیا ہی کیا ہے۔''

اس نے انکساری سے کہا تو صائمہ آبدیدہ ہوگئی۔

''ایسا تو نہ کہیں بھابی، رات اماں بھیا سے کہہ رہی تھیں۔ ''اپنی بیوی کے پاؤں دھو، دھو کر پیو...تو کم ہے نہ معلوم کون سی نیکی تھی جس کے طفیل ارم کو قدرت نے میری بہو بنادیا۔''

اس رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل، بدل کر وہ تھک چکی تھی۔

اداس اور میلی چاندنی دریچے سے اندر آرہی تھی۔ شاید آج چاند بھی اس طرح اداس تھا۔ وہ اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اس سے پہلے ہی ٹیرس کی ریلنگ پر شاہ میر جھکا کھڑا تھا قدموں کی آہٹ پر مڑا اس نے واپسی کے لیے قدم آگے بڑھا لیے۔

''ارم......'' اس نے وہیں سے آواز دی۔

''کہیے۔''

''واپس کیوں جانے لگیں، میں چلا جاتا ہوں۔'' اس کا لہجہ دکھ سے چور تھا۔

''نہیں، میں کمرے کی گھٹن سے پریشان ہوگئی تھی ویسے میں کل واپس چلی جاؤں گی۔''

''کہاں؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''اپنے گھر......'' اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔

''اور یہ کس کا گھر ہے؟''

''اس گھر سے میرا کوئی تعلق، کوئی رشتہ، کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ایک فرض تھا۔ اس انسانیت کے ناتے جسے میں نے بہ احسن نبھادیا۔ اسی انسانیت سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے۔ اس سات ماہ کے عرصے میں، میں نے اس گھر کی کسی چیز یا کسی شخص سے کوئی جذباتی تعلق پیدا نہیں کیا۔ اس گھر کی کسی چیز پر اپنا حق نہیں جتایا۔ اس لیے بہرحال مجھے جلد یا بدیر اس گھر کو چھوڑنا تھا۔ آپ کی امی اب بالکل تندرست بلکہ صحت مند ہوچکی ہیں اب اس گھر کو میری قطعاً ضرورت نہیں۔ میں نے ان ڈاکٹروں کو بھی محوِ حیرت کردیا ہے جنہوں نے ان کی سانسوں کو گنتی کی سانسیں بتا کر آپ کو اس

ناپسندیدہ فعل کے لیے مجبور کیا جسے شادی کہتے ہیں... بہرحال اب آپ مجبور نہیں ہیں۔'' وہ باوقار قدموں سے چلتی ہوئی بغیر اس کا جواب سنے کمرے میں لوٹ گئی۔

اب اس کا اپنے قدموں پر کھڑے رہنا محال تھا۔ وہ اپنے قول و فعل میں کتنی سچی تھی اس نے جو کہا کر دکھایا۔ اب بھی جو کہہ گئی تھی کر دکھائے گی۔ کاش اس کے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہوتی۔

کاش وہ اپنا فیصلہ بدل ڈالتی۔ اس سات ماہ کے عرصے میں اس نے گھر والوں کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ ان کے تعلقات محض دکھاوا ہیں۔ صائمہ جیسی تیز نظر لڑکی کو گمان تک نہیں گزرا کہ وہ دوسرے کمرے میں تنہا سوتی ہے۔

اس نے کبھی کسی کو محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ اس کی موجودگی میں چہک چہک کر بولنے والی لڑکی تنہائی میں اس سے ہم کلام ہونا تک گوارا نہیں کرتی۔

اور سچ تو یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا تھا اس کی مہربانیوں کے عوض تلافی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا بھاگ کر جائے اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہے۔

''اے پیاری لڑکی! اس گھر کو ہر لمحہ تری ضرورت ہے تو نے کیسے جان لیا کہ تیری ضرورتیں ختم ہوگئیں۔ اس گھر کے ہر فرد کو تمہاری عادت ہوگئی ہے۔ میں جو تمہارا کچھ نہیں...... لیکن جب دفتر سے گھر لوٹوں گا تو میری متلاشی نظریں گھر کے ہر کونے میں تمہیں ڈھونڈیں گی۔ تم اپنا فیصلہ بدل ڈالو۔''

مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اور پہاڑ جیسی لمبی رات گزر گئی لیکن جانے کیوں اس کے اندر کہیں موہوم سی امید تھی کہ وہ نہیں جائے گی۔ شام جب وہ گھر آیا تو ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ گھر اجاڑ اور سنسان پڑا تھا۔ کسی نے جھاڑو... تک نہ دی تھی رات جو چیز جہاں تھی وہیں پڑی تھی۔ سامنے اس کی بہن صائمہ کھڑی تھی، اس نے رو، رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں اس کی شکوہ بھری نظروں کے جواب میں خود بخود اس کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ امی کی طرف دیکھے، جھکے سر اور نظروں کے ساتھ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اجاڑ اور بیاباں کمرا کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ کوئی ایک گلاس پانی کی طلب مٹانے والا نہیں تھا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی چھوٹی، چھوٹی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ تکیے پر وہ کتاب پڑی تھی جو شاید وہ لے جانا بھول گئی تھی۔ وہ بے تابی سے آگے بڑھا شاید اس کتاب میں اس نے کچھ لکھ چھوڑا ہو۔

اس نے ساری کتاب بکھیر دی مگر وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی تھی، ایسی کسی چھچھوری حرکت کی اس سے توقع نہ تھی۔ وہ سر تھام کر بیٹھا رہا۔ کپڑے بدلے نہ جوتے اتارے...... کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔

پھر وہ اٹھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ اور جب تھک گیا تو گھر لوٹ آیا۔

امی اس کی منتظر تھیں چند لمحے اسے غور سے دیکھا پھر تڑپ کر بولیں۔

''مجھے شرطوں پر زندہ رکھنے والے، اس سے تو بہتر تھا میں مرگئی ہوتی۔ آخر وہ کون سی مجبوری تھی جس نے تجھے اتنا درندہ صفت ظالم بنا ڈالا۔ یاد رکھ اگر تو میری بہو کو جس طرح سے بھی ہو، واپس اس گھر میں نہ لایا تو میں اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ہی ختم کر ڈالوں گی۔''

وہ چپ چاپ گم صم کھڑا تھا وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا زبان اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ گردن سے باہر نکلا ہوا حلقوم اوپر نیچے گھوم کر کچھ نہ بول سکنے کی گواہی دے رہا تھا۔ جبڑے، جبڑے ہوئے اور زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ اور بے بس نظروں کی مجبوری اسے انتہائی مظلوم ثابت کر رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں کے آنسو تھمتے نہیں تھے۔ وہ انہیں بار، بار پونچھتی وہ پھر آنکھوں میں بھر آتے۔

''کچھ کرو'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ لیکن واپسی کے سارے راستے تو اس نے خود ہی بند کیے

تھے۔ اس نے کئی بار فون ملایا لیکن ہر بار یہ کہہ کر فون بند کر دیا جاتا کہ وہ گھر پر نہیں۔ اتفاق سے اگر وہ خود فون اٹھاتی تو بغیر ایک لفظ کہے فون رکھ دیتی۔ اس کے گھر والے شروع کے چند روز تک تو گومگو کی حالت میں تھے کہاں تو وہ بھاگنے کی کرتی اور کہاں وہ اپنے ہونٹوں پر اس گھر کا ذکر لانا تک پسند نہیں کرتی۔

پھر اس نے سب کچھ، ایک، ایک لفظ سب کے گوش گزار کر دیا۔ بڑے بھیا کا فیصلہ تھا کورٹ کے ذریعے طلاق حاصل کی جائے لیکن جب تک ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہو خاموش رہا جائے۔

جبکہ چھوٹے بھیا کا کہنا تھا۔ ''اس جیسے کمینے شخص کا بھروسا نہیں کہ عدالتوں میں گھسیٹنے کے باوجود طلاق نہ دے۔'' بھابیاں الگ، الگ رائے رکھتی تھیں۔ البتہ امی، ابو دونوں خاموش تھے ان کو اپنی تربیت پہ ناز تھا۔ وہ فیصلے کا حق صرف اسی کو دینا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے خاندان کے بزرگوں کو بھی بلانے کا فیصلہ کیا تا کہ بات عدالتوں تک نہ ہی پہنچے ان سے بھی مشورہ لے لیا جائے۔

اس روز بھیا بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ انہوں نے سب سے پوچھ کر ٹیلی فون ملایا۔ ارم کو بھابی کمرے میں لے گئی تھیں۔ دوسری طرف فون پر وہ خود تھا۔

''میری امی سخت بیمار ہیں اور وہ ارم کے بغیر زندہ نہیں رہیں گی۔'' تھکی، تھکی اور نڈھال آواز میں اس نے بتایا۔

''اور تم؟'' بھیا طنز سے بولے۔

''میں اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوں، پلیز بڑے بھیا آپ بڑے بن کر فیصلہ کیجیے۔ اپنی کوتاہیوں پر میں شرمندہ ہوں۔''

''تمہاری والدہ آسکتی ہیں؟'' بڑے بھیا نے کچھ سوچا اور فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

''مگر وہ تو سخت بیمار ہیں۔ چلیں اچھا ٹھیک ہے میں ان کو لے آؤں گا......'' وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

''مگر بھیا مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔'' یہ جملہ اس نے بڑے مان سے کہا تھا۔

گاڑی گیٹ کے اندر بالکل ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس آن رکی۔

دونوں بھابیوں اور شاہ میر نے مل کر امی کو اتارا اور تھام کر آرام سے اندر لے آئے۔

ارم بھیا کے فون کرنے سے بے خبر تھی۔

اس نے اچانک انہیں یوں آتے دیکھا تو گھبرا کر ان کے پاس چلی آئی انہوں نے روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا اور پھر اپنے اوپر اوڑھی چادر اتار کر اس کے پیروں میں ڈال دی جبکہ دوپٹا ان کے سر پر ہی ٹکا ہوا تھا۔

''میری بیٹی! کوئی سوال جواب نہ کرنا مجھے زندگی دی پھر کیوں چھین رہی ہو؟ شاہ میر تمہارا گناہ گار سہی لیکن وہ بہت نادم ہے بیٹی۔ وہ کہتا ہے میں ہیرے اور پتھر کی پہچان میں مات کھا گیا، وہ تمہیں منانے اور لے جانے آیا ہے، مجھے زندگی دی ہے تو مزید جینے کی آس بھی دے، دے اب میرا گھر تیرے بغیر ویران ہے۔ وہاں میرا دل بند ہو جائے گا۔'' گھر کے ہر فرد کی نظریں اس کے فیصلے کی منتظر تھیں۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر اس کی نظریں شاہ میر پر جا ٹھہریں جو دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اب اور شرمندہ نہ کریں۔'' اس نے امی، ابا کی جانب دیکھ کر کہا۔

''شاباش، بیٹی شاباش......'' بڑے بھیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابو نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ امی نے اس کے ماتھے کو چوما۔ بھابیاں بار، بار اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ وہ ساس کے قدموں سے قدم ملاتے اس کے لیے چوڑے وجود کی پناہ میں چلتے ہوئے یوں محسوس کر رہی تھی جیسے آج ہی اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے اور واقعی اس کے دل پر انوکھی اور سنسنی خیز خوشیاں پر پھیلائے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رہی تھیں۔



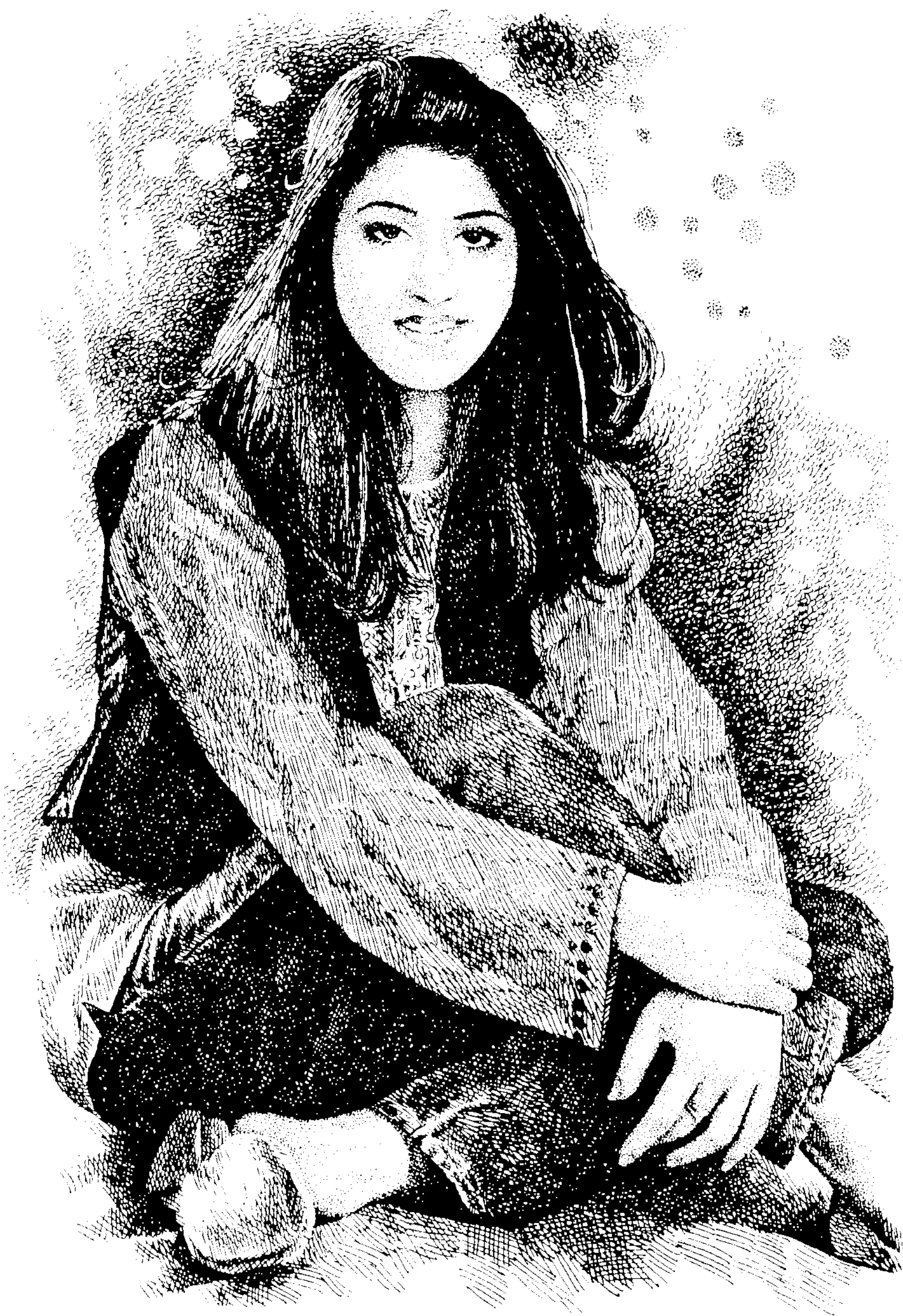
ناولٹ

محبت لفظ ہے لیکن......

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ وہ رات کو یوں اچانک کمرے سے باہر نکل گئے ہوں۔ معمول کی بات تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں کچھ غیر معمولی لگا، آہستگی سے پیر چپل میں مقید کیے بنا چادر لیے وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف آئی تھیں۔ خان جی طویل صحن عبور کر کے بالکل آخری سرے پر بنی بیٹھک میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اسی طرف چل دیں۔ نہ جانے ان میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی



تھی۔حویلی کے سرداروں کی یوں ٹوہ لینے کی جرأت کوئی کر بھی لیتا۔لیکن کم از کم صنوبر بی بی جیسی نرم و نازک، ڈرپوک سی عورت کبھی نہیں کرسکتی تھی پھر بھی نہ جانے کون سی ان دیکھی طاقت تھی جو اُن کو یہ سب کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ بہت تیزی سے صحن عبور کرتیں۔وہ اب دروازے کے قریب دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

''کیا خبر ہے دوراں؟'' خان کی بھاری آواز سنتے ہی ان کا کمزور دل یک بارگی ڈوب سا گیا تھا۔

''کام ہوگیا خان جی......'' مؤدبانہ لہجے میں انہوں نے کسی کو کہتے سنا تھا۔

''کام پکا ہے ناں......؟'' خان کے لہجے میں اس مرتبہ فکر تھی۔

''بالکل صفائی سے کام کیا ہے خان......سب کو یہی لگے گا کہ بہن کی طرف سے لگے بدنامی کے داغ کو برداشت نہ کرتے ہوئے بڑے خان نے خودکشی کرلی۔'' سردی کی شدید لہر نے اُن کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا گئی۔ بے ساختہ نکلتی چیخ کو منہ پہ ہاتھ رکھ کر انہوں نے بہ مشکل روکا تھا۔

''شاباش دوراں...... مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' خان جی کے لہجے میں اطمینان بھر گیا تھا۔

''اب سارے گاؤں میں اس بے غیرت کے چرچوں پر بڑے خان کی موت کی خبر حاوی ہوجائے گی...... پھر کچھ دنوں میں ان دونوں کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔تم ایسا کرو گاڑی نکالو۔ہم ابھی لاش لے کر شہر روانہ ہوں گے۔اور کسی کے ذمے لگادو کہ گھر، گھر اطلاع دے، دے۔ آخر سب گاؤں والوں کا پیارا خان مرگیا ہے۔'' وہ شیطانی قہقہہ انہیں اپنے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح محسوس ہوا تھا۔ مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کمرے میں واپس آکے بیڈ پر لیٹ گئیں۔دروازے کی طرف پشت کیے بند آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ان کے اتنے اچھے، بھائیوں جیسے جیٹھ اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ بہ مشکل ہچکیوں پر بند باندھنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

خان جی کمرے میں آئے اور چند لمحوں بعد ہی واپس نکل گئے۔

''کچھ دنوں بعد ان دونوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔'' منہ پر ہاتھ رکھے چیخوں کا گلا گھونٹتے وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''کون دونوں؟'' ذہن میں اٹھتے سوال نے آہستہ،آہستہ درد کم کرنا شروع کردیا تھا۔

''اور کون ہے جسے خان اس طرح......'' وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں......'' خیال آیا۔فوراً ہی سر نفی میں ہل گیا۔

''گھر سے بھاگ جانے والی بہن اور وہ لڑکا...... بھلا اور کون......؟'' ذہن نے ایک اور راہ دکھائی۔

''نہیں......ان دونوں کا تو کوئی اتا پتا نہیں...... مشکل ہے۔بہت مشکل......'' دل مطمئن نہیں تھا۔

''تو پھر کون......؟'' ننگے پیر ٹھنڈے فرش پر ٹہلتے ان کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں......تبھی جاڑے کی خاموش تاریک رات میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی گونج سنائی دی تھی۔وہ چونک کر دروازے کی طرف آئیں۔اور بے ارادہ ہی نگاہ سامنے برآمدے میں نظر آنے والے دروازے پر جم سی گئی۔

''بی بی اور ولی......؟'' لبوں نے خودبخود بول کے ان پر سب واضح کردیا تھا۔وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

''یا اللہ......'' درد کی تیز لہر نے ان کے دل کو اپنے حصار میں لیا تھا......اور پھر چند منٹ لگے تھے ان کو سوچنے میں......الماری کھول کر ایک بڑا بیگ نکالا، جو بہ آسانی کمر پر لادا جاسکتا تھا۔تیز بھاگنے کی صورت میں بھی اسے اٹھانا سہل تھا۔خان شکار پر جاتے وقت ہمیشہ یہی بیگ ساتھ لے کر جاتے تھے۔صنوبر کو یہ بیگ بہت پسند تھا۔

انہوں نے الماری کے نچلے حصے میں بنے سیف

میں سے چند بھاری زیورات اور نقدی کی چند ہری گڈیاں بیگ میں ڈال دیں۔ بیگ اب بھی کافی ہلکا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے سیف واپس بند کیا اور بیگ اٹھائے سامنے والے کمرے کی طرف چلی آئیں۔

''بی بی......'' انہوں نے تیز آواز میں پکارا تھا۔ اور ان کی توقع کے عین مطابق دوسری دستک پر ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

''کیا ہوا صنوبر......؟'' ان کے چہرے پر تشویش تھی۔

''بی بی اپنے زیور نکالیں۔'' وہ ان کا ہاتھ تھامے ان کو اندر لاتے ہوئے بولیں۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''جلدی کریں بی بی......'' وہ بڑھ کر خود الماری کھولنے لگیں۔ اب بی بی انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ذرا سی کھلی الماری میں موجود سیف کھولنے لگیں۔

''بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟ کیوں چاہئیں زیور......؟'' وہ لاک کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کہیں گلّے کا تو پتا نہیں چل گیا۔'' ایک دم ہی انہیں خیال آیا تھا۔ اُدھر صنوبر انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر کے زیور اور نقدی بیگ میں ڈالنے لگی تھیں۔

''صنوبر کر کیا رہی ہو؟'' وہ بے بس ہو گئیں۔

''جلدی کریں بی بی...... ولی کو جگائیں...... جلدی۔'' وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

''لیکن کیوں؟''

''جلدی...... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی...... ابھی تو جلدی سے ولی کو جگائیں۔'' وہ کام ختم کر چکی تھیں۔ سو تیزی سے بیگ بند کر کے خود ہی بیڈ پر گہری نیند سوتے بچے کی طرف لپکیں۔

''ولی...... ولی اٹھو......'' ذرا سا کسمسا کے بچے نے اپنی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی نیند میں ڈوبی آنکھوں میں بھی جھلملاتی تیز روشنی اس کی ذہانت کا پتا دے رہی تھی۔

صنوبر نے جھٹ ولی کو خود سے لپٹا لیا۔ پھر اس کے دونوں گال کئی بار چوم لیے۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں صنوبر......؟'' بی بی کو اب صحیح معنوں میں پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

''آپ دونوں کو ابھی، اسی وقت اس گھر، اس گاؤں سے کہیں دور جانا ہو گا بی بی، کہیں دور......'' وہ ولی کو خود سے لپیٹے بھیگے لہجے میں بولی تھیں۔

''دور...... لیکن کہاں اور کیوں......؟'' وہ ناسمجھی سے صنوبر کا روشن چہرہ دیکھے گئیں۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ کہاں...... لیکن یہ جانتی ہوں کہ کیوں......'' وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئیں ''اس لیے کہ...... آپ اور......'' وہ کہہ نہ سکیں۔ بی بی ان کی طرف دیکھتی رہیں۔

''آپ کی اور ولی کی جان کو خطرہ ہے بی بی......'' ان کی آنکھیں پھر برسنے لگیں...... بی بی مسکرا دیں۔

''کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے...... توبہ صنوبر تم بھی ناں......'' وہ سوئے جاگے ولی کی طرف بڑھ گئیں جو اب اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

''سو جاؤ بچے......'' وہ اسے واپس لٹانے لگیں۔

''نہیں، اٹھو ولی۔'' صنوبر تیزی سے ان کی طرف لپکیں اور لیٹتے ہوئے ولی کو دوبارہ پکڑ کے بٹھا دیا۔ پھر اِدھر اُدھر نگاہ کی۔ دور کونے میں ولی کے جوگرز پڑے تھے اور ان سے کچھ دور بڑے خان کے جوگرز وہ جوتوں کے دونوں جوڑے اٹھا کر بیڈ کے قریب آگئیں۔

''یہ ولی کو پہنا دیں۔'' انہوں نے جوگرز بیڈ پر رکھ کر خود بی بی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس بار بی بی نے خاموشی سے جوتے ولی کو پہنانا شروع کر دیے تھے۔ وہ خود بی بی کے چپل اتار کر انہیں خان کے جوگرز پہنانے لگیں۔

''صنوبر یہ کیا؟'' بی بی مچلیں۔

''جلدی بی بی...... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' صنوبر نے جھپٹ کر مضبوطی سے ان کے پاؤں پکڑے اور لمحوں میں جوگرز پہنا دیے۔ پھر ولی کو سوئٹر، دستانے اور اونی ٹوپی پہنانے کے بعد دوبارہ بی بی کی

طرف متوجہ ہوگئیں۔ تیاری مکمل تھی......
''بی بی ......!'' ان کی خوب صورت نیلی، نیلی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔
''کیا ہوا ہے صنوبر......؟'' بی بی کا دل ڈوبنے لگا۔ انہوں نے صنوبر کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
''وہ......وہ......'' صنوبر بول نہ سکیں...... کتنے ہی پل دبے پاؤں گزر گئے۔
''کاکی......'' ولی جو مسلسل خاموشی سے سب کارروائی دیکھ رہا تھا نے صنوبر کو پکارا۔
''مجھے نیند آئی ہے کاکی......'' اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ صنوبر نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر بی بی کو تکنے لگیں۔
''خان آپ دونوں کو مار دے گا بی بی۔'' صنوبر کی زبان خشک ہونے لگی تھی۔
''کیا مذاق ہے صنوبر۔'' بی بی اب تنگ آ چکی تھیں۔
''بڑے خان......'' وہ بولتے، بولتے رکی نہ جانے کیوں بی بی کا دل ڈوب، ڈوب گیا۔
''انہوں نے بڑے خان کو مروا دیا ہے بی بی۔'' وہ رونے لگی تھیں۔ بی بی ساکت سی صنوبر کو دیکھتی رہیں۔
''وہ ولی کو بھی مارنا چاہتے ہیں بی بی ......اس جائداد کے لیے آپ، ولی سب کو مار دینا چاہتے ہیں وہ۔''
''خان جی......'' صنوبر کو بی بی کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی اور تھا بھی ایسا ہی۔
وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بی بی واقعی ایک گہری کھائی میں جا گری تھیں۔ اور مزید گہرائی میں گرنے والی تھیں...... وہ انہیں بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہ رہی تھیں۔ آگے سب قدرت پہ تھا......ان کی قسمت پہ تھا۔
وہ یہ سب نہیں جانتی تھیں۔ نہ ہی جاننا چاہتی تھیں۔ بس انہیں ولی اور بی بی کو فی الحال کہیں دور بھیجنا تھا۔ جہاں خان کے خونی ہاتھ ان کو تلاش نہ کر سکتے......
''بی بی......!'' صنوبر نے ساکت سی بی بی کو ہلایا۔ وہ بے جان سی ان کو تکنے لگیں۔
''ہوش کریں بی بی......ولی کو بچا لیں۔''
''یہ کیسے ہو سکتا ہے صنوبر......؟'' بائیں آنکھ سے ایک آنسو لڑھکتا ان کا گال چھو گیا۔
''میں اتنی رات کو یوں اچانک اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی۔'' ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔
''خان......'' انہوں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے جیسے خود کو چلّانے سے روکا تھا۔ اور پھر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ صنوبر بھیگی آنکھوں سے ان کو آنسو بہاتا دیکھتی رہیں۔
''بی بی ......'' کچھ دیر بعد صنوبر نے دھیرے سے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے ان کو پکارا تھا۔ وہ اب سسک رہی تھیں۔
''ولی کو بچا لیں بی بی۔'' وہ دوبارہ بولیں۔
''ابھی سارے گاؤں میں خبر پھیل جائے گی۔ گاؤں والے جاگ گئے تو مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ ابھی ولی کو لے کر نکل جائیں اور کوشش کرنا کہ صبح کا اجالا پھیلنے تک آپ کسی بڑے شہر کی طرف نکل جائیں کیونکہ خان صبح تک واپس آ جائیں گے ... لالا کی لاش لے کر۔'' اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
''اٹھو' بی بی دیر نہ کریں ...'' وہ دوبارہ سے ان کے کندھے سے لگ کر سوتے ولی کو جگانے لگیں۔
''بی بی، ولی کو لے کر چلی جائیں ...'' اس نے اس بار ذرا تیز لہجے میں کہا تو بی بی چونک سی گئیں۔ پھر جلدی سے اٹھ کر بڑی گرم شال الماری سے نکالی۔
''یہ بیگ پہن لیں۔'' وہ ان کی مدد کرنے لگیں۔ بیگ لینے کے بعد انہوں نے چادر اپنے اوپر پھیلا دی۔
''ان جوگرز کی وجہ سے آپ کو بھاگنے میں آسانی رہے گی اگر خان کے کتوں کو خبر ہو گئی' انشاء اللہ میرے خیال میں صبح تک آپ آرام سے گاؤں سے نکل جائیں گی۔'' وہ سر ہلا گئیں۔ صنوبر جگ میں رکھے ٹھنڈے

پانی سے ولی کا منہ دھونے لگیں۔ وہ بیدار ہو گیا۔
''چلو بچے۔'' بی بی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
''کہاں کا کی......؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔
''شہر......'' صنوبر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔
''تمہیں شہر جا کر پڑھنے کا شوق تھا ناں...... یوں سمجھو وہ خواب پورا ہونے کا دن آ گیا۔''
''سچ میں کا کی......'' اس کی آنکھیں لو دینے لگیں۔
''بالکل سچ......'' وہ نم سی مسکراہٹ لبوں پر سجا گئیں۔
''جائیں بی بی...... اللہ کی امان میں۔'' انہوں نے بی بی کو گلے لگا لیا۔
رات کی تاریکی اور سردی ایک ہی ڈھنگ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ صنوبر دروازے کی اوٹ سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔
بی بی چادر تھامے، ولی کا ہاتھ پکڑے قدم بہ قدم دور جا رہی تھیں۔ پچھلے صحن کی طرف مڑنے والی تاریک تنگ گلی کی طرف...... جہاں دیوار کا ایک خستہ حصہ وہ آسانی سے عبور کر کے، اس خونخوار حویلی سے اپنے ولی کو بچا کر لے جا سکتی تھیں۔
ہاں شاید......

☆☆☆

وہ کتنی دیر واش بیسن میں مسلسل بہتے پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ کا پیالہ بنا کر بھر، بھر کر خود کو بھگویا۔ لیکن جلن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی اس کی نگاہ آئینے پہ پڑی تھی۔ ہاتھوں کا پیالہ بنا آواز کے ٹوٹ گیا تھا۔
یہ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس کا اپنا تو نہیں تھا۔ تو پھر وہ کون تھی...... جو بار، بار اس کے سامنے آ جاتی تھی۔
اسے اس چہرے سے نفرت تھی۔ پھر اسی قدر وہ چہرہ کیوں اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔
وہ پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ اتنے سرد موسم میں بنیان میں ملبوس بھی وہ پسینے سے تر ہونے لگا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر دھری سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ پھر ایک گہرا کش لیا، ذرا دیر سانس روکی اور پھر دھوئیں کے مرغولے کو ہوا کے سپرد کر دیا۔
اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں کرنٹ سا گزرا تھا۔ وہ مرغولہ ہوا میں ہی ساکت ہوا تھا اور دھوئیں نے کسی بہت ہی خوب صورت چہرے کی شبیہہ پکڑی تھی۔
وہی صورت ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔
''لالہ......'' اس نے چلاتے ہوئے سائڈ ٹیبل پر دھرے سامان کو ہاتھ کی زوردار ٹھوکر سے دور پھینک دیا تھا۔ یک دم شور سا گونجا تھا۔
پھر مکمل خاموشی چھا گئی تھی......

☆☆☆

رات جس قدر تاریک تھی، اسی قدر سرد بھی...... قمری مہینے کی آخری راتیں ہونے کی وجہ سے چاند بھی غائب تھا۔ سردی سے اس کا ننھا سا وجود کپکپا رہا تھا۔ مگر وہ ماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بھاگا چلا جا رہا تھا۔
اسے اپنے پیر شل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ سانس جیسے اکھڑی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ تیز سے تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماں کے قدم سے قدم ملا کر سب کچھ برداشت کیے کسی جنونی کی طرح دوڑتا چلا جا رہا تھا۔
رات کے خوفناک سناٹے میں اسے کئی بھاری دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ لوگوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ماحول مزید دہشت زدہ بنا دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی...... اور وہ جانتا تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے اسے کوئی مصیبت چھو بھی نہیں سکتی تھی۔
بھاگتے، بھاگتے وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا تھا کہ سخت سردی کے باوجود بھی اس کا وجود پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ شکاری کتوں کی آوازیں نزدیک سے نزدیک

تر ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تبھی اس کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اسے بہت زور کی ٹھوکر لگی۔ ماں کا مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''ماں......'' وہ بہت زور سے چلّایا تھا۔

☆☆☆

''باری، باری......'' کوئی بہت دور سے اسے پکار رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن تیز روشنی کی چبھن نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔

''باریال......'' اس دفعہ آواز قریب محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اس بار آنکھیں کھول دی تھیں۔

''دیدے......'' خود پر جھکی ماں کو دیکھ کر وہ تیزی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''تم مجھے پکار رہے تھے......'' وہ سائڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولیں۔

''نہیں تو......'' وہ صاف مکر گیا۔ انہوں نے مسکراتی نگاہ اس کی طرف کی۔

''وہم ہوا ہے آپ کو......'' ان کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے وہ نظریں چرا گیا تھا۔

''تم بھول رہے ہو۔'' وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ''ماؤں کو وہم نہیں ہوا کرتے۔'' وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''ماؤں کو تو الہام ہو جاتے ہیں۔'' وہ مسکرائیں۔

''توبہ ہے دیدیے......آپ اب میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں......'' وہ گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا۔

''بھول جاؤ باری......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

وہ نظریں جھکا گیا۔

''سب بھول جاؤ......کب تک ان خوفناک یادوں کو ساتھ لگائے رکھوگے۔ بعض اوقات ماضی کو بھول جانے میں ہی بہتری ہوتی ہے بیٹا۔''

''بہت کوشش کرتا ہوں دیدے......لیکن کچھ بھی نہیں بھول پاتا۔ ماضی جیسے کسی عفریت کی طرح میرے دل و دماغ سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔'' وہ پریشان تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کے بال جکڑتا وہ انہیں بے حد ڈسٹرب لگا۔ اور وہ بھی اپنے لختِ جگر کے دکھ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ غیروں سے دکھ ملیں تو ان کا مداوا ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن اپنوں کے ہاتھوں لگے زخم کبھی مندمل نہیں ہو پاتے بلکہ وقت کے ساتھ، ساتھ ناسور بن جاتے ہیں۔ اس مسلّمہ حقیقت سے وہ خود واقف تھیں۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

''تم اگر وہ سب نہیں بھول پاتے۔ تو یہ صرف اس لیے بیٹا! کہ تم نے اپنے دل میں انتقام کو جگہ دے دی ہے۔ سب اللہ پر چھوڑ دو باری...... اللہ ہی سب سے بڑا منتقم ہے۔'' وہ اس کے بال سہلانے لگیں...... اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دینے میں ہی انسان کی بھلائی ہے بچے......؟ تم بھی اپنا مقدمہ اللہ پر چھوڑ دو، تمہیں سکون مل جائے گا۔'' باری نے عقیدت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آپ بہت بہادر ہیں دیدیے......'' باری نے ان کے ہاتھوں پر لب دھرتے ہوئے کہا۔

''تم بھی بہت بہادر ہو میرے بچے......'' وہ مسکرائیں۔

''کیونکہ تم زریاب ولی خان کے بیٹے ہو۔'' فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے باریال کی پیشانی چوم لی۔ وہ بھی پُرسکون ہو کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

کمرے میں قدم رکھتے ہی عجیب سی بُو ان کی ناک سے ٹکرائی۔ سہراب علی خان نے بے اختیار ہی ناک پر ہاتھ رکھا۔

دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ لیکن موٹے پردوں

کی دبیز تہ نے کمرے کی تاریکی بڑھا رکھی تھی۔ وہ کھڑکیوں کی طرف بڑھے تو کوئی سخت سی شے ان کے پاؤں سے ٹکرائی۔ انہوں نے بہ مشکل خود کو گرنے سے بچایا۔

سہج، سہج کے قدم اٹھاتے بہت مشکل سے وہ کھڑکیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے اور پھر دھیرے، دھیرے سے انہوں نے پردے ہٹا دیے۔ سورج کی تیز چمکتی شعاعیں راستہ ملتے ہی کمرے کو روشنی سے نہلا گئیں۔ بستر پر گہری نیند میں غرق وجود اس دراندازی پر ذرا سا کسمایا اور چہرے پر تکیہ رکھ کر پھر محوِ خواب ہو گیا۔

انہوں نے ایک مسکراتی نظر اس وجود پر ڈالی اور پھر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کولڈ ڈرنکس کے خالی کین کے علاوہ بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کے انبار لگے تھے۔ بیڈ کے بالکل قریب بہت سی، سی ڈیز زمین پر بکھری تھیں۔ سی ڈی پلیئر آن تھا اور مخصوص انگلش گانے بار، بار ری پیٹ ہو رہے تھے۔ ایک مطمئن سی مسکراہٹ خان کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا...... جیسا وہ اسے بنانا چاہتے تھے۔ آوارہ، من موجی اور سب سے بڑھ کر.... بے پروا...... رشتوں، جذبات اور احساسات سے... ناسمجھ...... خود پرستی کا شکار...... انہوں نے اس کی خاص تربیت کی تھی۔ اسے مہم جُو بنایا تھا۔ اس کی شخصیت میں اس قدر ضد اور بے پروائی کا بیج بویا تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ اپنی مرضی کرتا...... اسی لیے انہیں اپنے سپوت میں اپنا مقصدِ حیات نظر آتا...... وہ جس منزل کے متلاشی تھے وہ اب زیادہ دور نہیں تھی۔ محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتے وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

''ضیا......'' کالے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اسے پکارا تھا۔ ان کی توقع کے عین مطابق اس نے ان کی پہلی آواز پر ہی آنکھیں کھول دیں۔ اور سیدھا لیٹ گیا۔

''با......'' اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں حیرت جاگی۔

غزل

تمہارے خواب کی تعبیر ہو جاؤں اجازت ہے
محبت کی میں اک تصویر ہو جاؤں اجازت ہے

کہیں جانے نہ دوں تم کو اگر تم میرے ہو جاؤ
تمہارے پاؤں کی زنجیر ہو جاؤں اجازت ہے

کسی کے ہو گئے ہو تم، مجھے شکوہ نہیں کوئی
کسی کی میں بھی اب جاگیر ہو جاؤں اجازت ہے

وہ اک تعویذ جو تم نے گلے میں ڈال رکھا ہے
میں اس تعویذ کی تحریر ہو جاؤں اجازت ہے

زمانے کے میں ہر اک وار سے تجھ کو بچا لوں گی
میں تیرے ہاتھ میں شمشیر ہو جاؤں اجازت ہے

تجھے یہ معجزہ بھی میں دکھا سکتی ہوں دنیا میں
جو تو چاہے تری تقدیر ہو جاؤں اجازت ہے

خدا نے یہ کرشمہ چاہتوں کو سونپ رکھا ہے
میں اک پل میں تیری توقیر ہو جاؤں اجازت ہے

شاعرہ: ثمین سیف، کراچی

''اتنی صبح......'' نیند سے بوجھل پلکیں لرزتیں، گر پڑتیں اور ضیا نیند بھگا تا زبردستی انہیں دوبارہ کھلنے پر مجبور کر دیتا۔

''صبح کہاں یار......؟ گیارہ بج رہے ہیں۔'' وہ مسکرائے تو ضیا اچھل کر بیٹھ گیا۔

''گیارہ بج گئے؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔ ''مجھے تو آج شہر کے لیے نکلنا تھا۔'' وہ شرمندہ ہوا۔

''تبھی تو تمہیں جگانے ہمیں خود آنا پڑا۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی گھمائی۔

''بس با...... میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔'' وہ کہہ کر نیچے اترنے لگا کہ سہراب علی خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''ضیا۔'' ان کے پکارنے پر وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بار، بار یاد دہانی کرائی جائے مگر ایک بات یاد رکھنا نہ جانے کتنے برس میں نے اس دن کا انتظار کیا ہے۔ کتنی راتیں انتقام کی آگ میں سلگ، سلگ کر گزری ہیں۔ مجھے مایوس نہ ہونے دینا ضیا...... تمہیں اس مقصد میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنی ہے۔ سو فیصد......'' ان کے لہجے اور آنکھوں میں عجیب سی شدت پسندی اتر آئی۔

''مجھے یاد ہے با...... سر کے بدلے سر...... ناک کے بدلے ناک...... اور عزت کے بدلے صرف عزت......'' وہ بھی اسی لہجے میں بولا تھا۔ اور ان کے اندر تک سکون اتر گیا تھا۔

ہر فکر سے آزاد، اخلاق کی قیود سے نابلد، دنیا میں صرف اپنی اور با کی پروا کرنے والا ان کا واحد سپوت ضیا علی خان ان کا فخر تھا۔

☆☆☆

آسمان کو زمین ہمارا عزم بناتا ہے۔

انسان اگر ارادہ کر لے تو خلا تک میں قدموں کے نشان چھوڑ سکتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو انسان کے لیے ناممکن ہو۔ پختہ ارادہ اور مسلسل محنت ناممکن تک کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

یہی سب اس نے کر دکھایا تھا۔ نہ صرف پوزیشن لی تھی بلکہ اسکالرشپ بھی حاصل کیا تھا اور سب سے بڑی کامیابی تو یہ تھی کہ وہ بقول امی، خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو یونیورسٹی پڑھنے جارہی تھی۔ اس خوشی نے اس کی نیندیں اڑادی تھیں۔ کل یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ آج وہ جلدی سونا چاہتی تھی لیکن نیند نہ جانے کہاں کھوگئی تھی۔ کروٹ بدلتے، بدلتے تنگ آ کر اس نے لائٹ آن کر دی اور سرہانے رکھی کتابوں کی ایک، ایک کر کے ورق گردانی کرنے لگی۔ تبھی ہلکا سا کھٹکا ہوا اور سبین اندر آئیں۔

''امی آپ......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟'' کتابیں رکھ کر اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ماں کے لیے جگہ بنائی۔

''تم بھی تو جاگ رہی ہو؟'' وہ مسکرائیں۔ اسے ماں کی مسکراہٹ کھوکھلی سی لگی۔

''کل یونیورسٹی جانا ہے ناں...... تو بس شاید اسی خوشی میں......'' وہ کھل کر مسکرادی تھی۔

''لالہ......!'' انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میری مانو بیٹا...... یونیورسٹی مت جاؤ۔'' ان کے لہجے میں منت بھر آئی۔

''کیوں امی؟'' اس نے بیزاری سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ میرے ماضی کا کوئی بھی تاریک سایہ تمہارے حال یا مستقبل کو گہنا دے۔'' وہ متفکر تھیں۔ وہ چپ رہی۔

''میری مان لو...... بس حمزہ سے شادی کے لیے ہاں کر دو۔ بعد میں بھلے پڑھائی کرتی رہنا۔''

''پلیز امی......!'' وہ بری طرح چڑ گئی۔

''آپ اپنی غلطی بار، بار ہم پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں۔'' اس کے انداز میں بدتمیزی تھی۔ سبین لب کاٹنے لگیں۔

''اور پھر پھپھو کے مزاج سے آپ اچھی طرح

واقف ہیں۔حمزہ کے رشتے کے لیے ہاں کہہ کر آپ ساری عمر مجھے پھپو کے طعنے سننے پر مجبور کرنا چاہتی ہیں۔'' اس کی آواز بتدریج اونچی ہورہی تھی۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو بیٹا۔'' وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولیں۔

''نہیں امی......اس معاملے میں تو ہرگز نہیں...... باقی رہی یونیورسٹی کی بات تو بے فکر رہیں۔آپ کی زندگی میرے سامنے ہے۔سو دفعہ سوچوں گی ایسا کوئی بھی قدم اٹھاتے ہوئے۔''

''لالہ......'' اس کے طنزیہ کاٹ دار لہجے نے انہیں اندر تک چھلنی کردیا تھا۔آنسو خود بخود پلکوں کی باڑھ پار کرنے لگے۔

''اب جائیں امی، مجھے نیند آرہی ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

سین خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی کڑھتی رہی۔ پھر لائٹ آف کر کے سونے لیٹ گئی۔

☆☆☆

''تم نے رات پھر امی کے ساتھ بدتمیزی کی۔'' وہ جانے کے لیے تیار تھی جب شاہ ویز تیز لہجے میں کہتا اس کے سر ہوا تھا۔

''امی خود میرے کمرے میں آئی تھیں۔ اور میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔صرف یونیورسٹی نہ جانے سے منع کیا ہے۔'' وہ بال بناتے ہوئے بولی۔

''تو یہ بات تم آرام سے بھی تو کرسکتی تھیں۔'' اس کے بے نیاز سے انداز پر وہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔

''تم ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ مجھے منع نہ کرتیں۔'' وہ اب اس کی طرف مڑ چکی تھی۔

''وہ ہماری ماں ہیں لالہ...... انہیں پورا حق حاصل ہے کہ جو چاہے بات کریں، جس چیز سے چاہیں منع کریں۔'' وہ دو قدم اس کے قریب ہوا۔

''لیکن انہیں یہ حق حاصل نہیں شاہ ویز کہ وہ ہم سے ہماری خوشیاں چھین لیں......ان سے جو غلطی سرزد ہوئی اس کی پاداش میں وہ ہماری چھوٹی، چھوٹی خواہشات کا گلا گھونٹ دیں۔'' وہ بیگ اٹھا کر چادر اوڑھنے لگی۔شاہ ویز اس بار چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

''کبھی، کبھی تم مجھے بالکل زرینہ پھپو کی کاپی لگتی ہو۔ ان کی ہی طرح خود غرض اور بے رحم......'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

''تھینکس فار دا کمپلیمنٹس ......'' وہ بے نیازی سے سر جھٹکتی باہر نکل گئی۔

''خدا تم پر رحم کرے لالہ......'' وہ بڑبڑایا تھا۔

وہ سین کا سگا بیٹا نہیں تھا۔ان کی بڑی نند کا بیٹا تھا جو اس کی پیدائش کے وقت ہی دم توڑ گئی تھیں۔ باپ نے دوسری بیوی کے ڈر سے اسے ساتھ رکھنے سے انکار کردیا تھا۔تب سین ہی تھیں جس نے اسے ایک ماں کا مکمل پیار دیا تھا۔ ان کی گود نے اسے پناہ دی تھی۔اور یہ بھی حقیقت تھی کہ شاہ ویز نے بھی ہمیشہ سگے بیٹے سے بڑھ کر دکھایا، وہ سین کا دایاں بازو تھا۔ ان کی سگی اولاد انہیں اتنا نہ سمجھتی تھی جتنا کہ شاہ ویز......شاہ ویز ہی تھا جس نے ان کی زندگی میں آنے والی ہر کمی پوری کی تھی۔اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی انہیں ہرٹ کرتا تو مطلب وہ شاہ ویز کو ہرٹ کرتا......

☆☆☆

''پاپا ہیں اندر؟'' چیونگم چباتے ہوئے بڑی... بے فکری سے اس نے ٹیبل بجا کر سیکرٹری کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''جی......'' جواب سنتے ہی وہ آگے بڑھی تھی۔

''میم......'' وہ چونک کے رکی......سیکرٹری ذرا سا جھجکی۔

''ایکچوئیلی......اندر کچھ انٹرویوز اسٹارٹ ہیں۔ آپ اگر کچھ دیر......''

''شٹ اپ......'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا اور سامنے موجود گلاس ڈور دھکیلتی اندر چلی آئی۔سکندر حیات نے متحیر نگاہ اس پر ڈالی اور ان کے لبوں پر خوب صورت مسکان بکھر گئی۔

''مائی ڈول......'' وہ کمرے میں موجود دوسرے فرد کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔

''یہ باہر کس کو بٹھا رکھا ہے پاپا...... you should dismiss her now'' وہ خفا، خفا انداز میں بولی۔ کرسی پر بیٹھا شخص پہلو بدل کے رہ گیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہوئے۔

''اس نے مجھے اندر آنے سے روکا۔'' وہ خفا تھی۔

''اچھا چھوڑو، یہاں بیٹھو......'' انہوں نے بات بدل دی اور اسے کندھوں سے تھام کر اپنی چیئر پر بٹھا دیا۔ اور تبھی اس کی نظر سامنے بیٹھے شخص پر پڑی تھی۔ اس کی گہری ڈارک براؤن آنکھیں اسی کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔ نظر ملتے ہی اس شخص نے فوراً نگاہوں کا رخ بدل لیا تھا مگر وہ نگاہیں نہ پھیر سکی تھی۔

"so young man!you can leave now" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کل تک کامیاب امیدواروں کو ان کے فون نمبرز پر اطلاع کر دی جائے گی۔ وش یو بیسٹ آف لک۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جو اس نے فوراً ہی تھام لیا۔ اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

''سنو......'' تبھی کمرے میں اس لڑکی کی آواز گونجی۔ وہ مڑا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

''باریال .... باریال ولی خان......'' اس نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

"what happened Aman" سکندر حیات نے پوچھا۔

''اسے جاب مل جانی چاہیے پاپا...... کافی کام کا آدمی لگ رہا ہے۔'' امن نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا کیا لو گی بیٹا؟''

''بلیک کافی......''

''او کے......'' انہوں نے کہہ کر بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔

☆☆☆

پانچ گھنٹوں کے طویل سفر نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ با نے اس کی رہائش کا انتظام شہر سے دور ایک سرسبز فارم پر کیا تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن تک اسے یہیں رہنا تھا۔ جب تک با کوئی دوسرا بندوبست نہ کر لیتے۔

سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی پکی سڑک پر آتے ہی اس نے سب شیشے اتار دیے تھے گاڑی کے...... تازہ ٹھنڈی ہوا نے اس کے شل اعصاب کو کافی پُرسکون کر دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

سڑک کے دونوں طرف جوار کے سرسبز کھیت تھے۔ یہاں دھول نہ ہونے کے برابر تھی۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ان کی کار ان کے آبائی فارم ہاؤس کے بلند و بالا لکڑی سے بنے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ فارم کے گیٹ سے تین رویہ سڑکیں جا رہی تھیں۔ ایک دائیں، ایک بائیں اور ایک سیدھی سامنے کی طرف ...... اس نے گاڑی سامنے والی سڑک پر ڈال دی۔ رہائشی حصے میں بنے بنگلے کے سامنے اوپن گیراج میں آتے ہی اسے بے پایاں خوشی کے احساس نے گھیرا تھا۔ با نے اس کی پسند کے مطابق گھر کو کلر کروا دیا تھا۔ اس کے اترتے ہی گھر کے سبھی ملازم بھاگے چلے آئے تھے۔

''سلام سردار......'' سبھی یک زبان بولے تو ضیا علی خان مسکرا دیا۔

''وعلیکم السلام...... کیا حال ہے جمال چاچا......'' وہ ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا گیا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''اور بی گل آپ کیسی ہیں؟'' سفید چادر میں ڈھکا وجود اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں ٹھیک ہوں، سردار کیسے ہیں؟'' وہ مسکرائیں۔

"سردار نہ کہا کریں بی گل...... مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سردار کو سردار نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نہالو تب تک میں چائے بنالیتی ہوں۔"

"ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئیے گا... بی گل......خان نے راستے میں کھانا نہیں کھایا تھا۔" قریب کھڑے پرانے ملازم دوراں نے ہدایت کی۔

"جی میں ابھی کچھ بنائے دیتی ہوں۔" انہوں نے کہا اور کچن کی طرف چل دیں۔

"خان، فریش ہولیں۔" دوراں نے ضیا کو مخاطب کیا جو سر کے نیچے ہاتھ رکھے صوفے پر تقریباً لیٹے آنکھیں موند گیا تھا۔

"ہم......" وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

"حمزہ آیا ہوا ہے؟" وہ یونیورسٹی سے واپسی پر گھر کے اندر داخل ہوئی تو حمزہ کی بائیک کھڑی تھی۔ شاویز اسی وقت سودا سلف لایا تھا۔ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔

"ہاں، زرینہ پھپو بھی ساتھ ہیں۔" اس نے شاپرز اٹھاتے ہوئے بتایا۔

"ہم......" وہ اندر جانے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"پھپو سے تو مل لو۔" وہ حیران ہوا۔

"تم لوگ مل لو...... مجھے کوئی شوق نہیں۔" تلخی سے کہتی وہ اوپر بھاگ گئی۔ لاؤنج سے باہر آتے حمزہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔

"نہ جانے لالہ اتنی بدگمان کیوں رہنے لگی ہے۔" وہ اداس ہوا۔

"تم ٹینشن نہ لو، اس کا تو مزاج ہی ایسا ہے۔" شاہ ویز شاپر سنبھالتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ حمزہ کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا پھر اوپر چلا آیا۔ سامنے برآمدے میں گھٹنوں پر سر دیے وہ دشمنِ جاں دکھائی دے گئی۔ وہ اور لالہ بچپن سے جس قدر قریب تھے۔ زرینہ کے برتاؤ اور طنزیہ لہجے نے ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی دوری پیدا کردی تھی۔ وہ ماں کی ساری غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام ٹھہرتا......

"کیسی ہو......؟" وہ اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ لالہ نے سر نہیں اٹھایا۔

"یہ بدگمانی کب ختم کروگی لالہ......" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولا تھا۔

"بدگمانی نہ خود پیدا ہوتی ہے نہ خود ختم......اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری بدگمانی کی وجہ کیا ہے؟" وہ سر اٹھائے بغیر تلخی سے بولی۔

"میں سمجھتا ہوں لالہ......تبھی کتنی کوشش کرتا ہوں اس خلیج کو پاٹنے کی جو امی اپنے لفظوں سے ہمارے رشتوں میں بنادیتی ہیں۔" وہ اسے منا رہا تھا۔ لالہ نے سر اٹھایا۔

"بعض زخم بہت گہرے ہوتے ہیں حمزہ......ان کا کوئی مرہم نہیں ہوتا۔" وہ تلخ ہوئی۔

"پھر میری تو سب سے بڑی بدقسمتی ہی یہی ہے کہ سارے زخموں کی وجہ میری ماں ہے۔"

"یہ صرف تمہاری سوچ ہے لالہ۔" اسے افسوس ہوا۔

"حقیقت ہے یہ......اور کوئی بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ پھپو کا رویہ، لوگوں کی باتیں، یہ سب امی کے ایک غلط قدم کی دین ہیں۔ کسی کو روکنا، کسی کا منہ بند کرنا ہمارے بس میں نہیں......بس میں ہے تو صرف خود کو دھتکار کے لیے تیار رکھنا۔"

"وہم ہے تمہارا...... مامی نے تمہاری تربیت اتنی اچھی کی ہے کہ کوئی تمہیں دھتکار نہیں سکتا۔" وہ اسے دلاسا دے رہا تھا۔ وہ تلخی سے مسکرادی۔

"تم جانتے ہو تمہاری ماں آج یہاں کیوں آئی ہے؟" وہ اسے کہتے بے حد بدتمیز لگی لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ لالہ وہ واحد ہستی تھی، جس کی کوئی بھی بات وہ آرام سے سہہ سکتا تھا۔

"نہیں......میں نہیں جانتا، تم بتاؤ۔" وہ سامنے

دیکھنے لگا۔
''دادی نے میرے اور تمہارے رشتے کی بات چھیڑی ہے۔ پھپو نے امی کو فون پر کھری، کھری سنا دیں۔ اب دادی کی باری ہے۔ وہ بھی لائیو' جاؤ.....تماشا دیکھو.....'' تلخی سے کہہ کر وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تو وہ بھی تیزی سے نیچے چلا آیا۔ کمرے سے آتے شور کی آوازیں لالہ کی بات کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔

☆☆☆

وہ کتنے ہی سیاہ پہاڑوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف سیاہ، سرمئی رنگ کے پہاڑ تھے۔ اور اس قدر بلند کہ دن کے وقت بھی اسے شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ آیا تو یہاں آیا کیسے؟

اس نے اردگرد گھوم، گھوم کر راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن بے سود.....تھک ہار کر اس نے ایک قدرے تراشیدہ پہاڑ پہ چڑھنا شروع کر دیا، اس پہاڑ پہ جگہ، جگہ ابھار تھے، تبھی وہ آسانی سے چڑھتا گیا تھا۔ کافی دیر کی تگ و دو کے بعد وہ بالآخر چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے چوٹی کے عین اوپر ذرا جھکے بڑے سے پتھر کو مضبوطی سے پکڑا اور جست لگا کر اوپر آ گیا۔ اور اگلے لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا تھا۔ دس بارہ سالہ کا ایک خوب صورت سا لڑکا چوٹی پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ باریال نے دیکھا پیچھے جگہ بہت کم تھی.....اور گہری کھائی تھی۔

''سنو..... پیچھے نہ ہو۔'' وہ خوفزدہ ہو کے چلایا۔
بچہ مزید پیچھے گیا۔ باریال کی سانس رکنے لگی۔
''سنو لڑکے.....'' وہ تیزی سے آگے کو بڑھا اور وہ بچہ پیچھے اور تبھی اس کے پیروں نے زمین چھوڑ دی تھی۔ باریال نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب وہ چوٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اور لڑکا نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ چیخنے لگا تھا۔

''ڈرو مت..... میں تمہیں بچا لوں گا۔'' باریال نے تسلی دی اور اسے اوپر کھینچنے لگا۔ تبھی اچانک ہی اس کا ہاتھ بھیگنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بچے کا ہاتھ پھسلنے لگا۔ وہ اسے تیزی سے اوپر کھینچنے لگا۔ لیکن اس بچے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلتا چلا گیا۔ باریال نے زوردار چیخ کے ساتھ آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اور تبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا.....خود کو اپنے کمرے میں بستر پر پا کر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

''نہ جانے یہ بچہ کون ہے؟ جو بار، بار خوابوں میں آ کر مجھے ڈرا سا دیتا ہے۔'' وہ پیشانی مسلنے لگا۔

جتنا وہ ان خوابوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اسی قدر اسے تنگ کرنے چلے آتے تھے۔ وہ پانی پی کر سونے لیٹ گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اسے ساری رات نیند نہیں آنی تھی۔

☆☆☆

پشتو کے مشہور گلوکاروں کا لائیو کنسرٹ تھا۔ وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرنے چلا آیا تھا لیکن بے ہنگم شور اور لمبے سفر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی اس کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔

''آر یو اوکے.....؟'' اسے پیشانی مسلتے دیکھ کر زید نے پوچھا۔
''ناٹ فیلنگ ویل یار.....''
''کیا ہوا تمہیں؟'' ابراہیم بھی پریشان ہو گیا۔
''معمولی سر درد ہے۔ ڈونٹ وری.....'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''باہر چلتے ہیں۔'' ابراہیم نے کہا تو سب نے اس کی پیروی کی۔
باہر آ کر ضیا کو سکون سا محسوس ہوا۔
''میرے خیال میں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' ابراہیم نے پیش کش کی۔
''ہاں، میں شاید ڈرائیونگ نہ کر سکوں.....تم مجھے چھوڑ کر گاڑی خود لے جانا۔'' اس نے بھی دوست کے لیے سہولت کی۔

''ہم پھر چلتے ہیں، تم اس کا خیال رکھنا۔'' زید نے کہا تو شاہد نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

ابراہیم اسے ڈراپ کر کے .... واپس چلا گیا تو وہ بی گل کو چائے کا کہہ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور بستر پر ڈھے سا گیا۔ لیٹے، لیٹے اچانک اسے خیال سا آیا۔ اٹھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز سے ایک ننھا سا بیگ نکالا۔ یہ بیگ اسے با جی نے دیا تھا۔ اور بطورِ خاص تاکید کی تھی کہ اس کے اندر موجود کاغذ پر لکھی تمام ہدایات توجہ سے پڑھ کر از بر کرے اور پھر کاغذ ضائع کر دے لیکن وہ اسے دراز میں ڈال کر بھول گیا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے بیگ کی زپ کھولی اور کاغذ نکال کر دیکھا۔ اوپر ایک نام لکھا تھا۔ نیچے کچھ مزید ہدایات تھیں، اس نے بے خیالی سے کاغذ پر نظریں دوڑائیں اور دوبارہ سے دراز کھول اس میں ڈال دیا۔ تبھی وہ ننھا سا بیگ اس کی گود سے پھسل کر نیچے جا گرا تھا۔ اور ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر اس سے نکل کر باہر آ گئی۔ ضیا نے پیر کی مدد سے اسے قریب کیا اور جھک کر تصویر اٹھالی۔

وہ کسی بے حد خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔ جس نے سفید رنگ کی شال سر پر لے رکھی تھی۔ اس کے شفاف چہرے پر بلا کی معصومیت تھی اور اس کی آنکھیں...... جیسے سرمے سے بھرے کالے کٹورے، بے حد سیاہ اور چمکدار آنکھیں...... ایک پل کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ بھی اسے ہی تک رہی ہیں...... حیرت سے منہ کھولے وہ ان کالی ساحر آنکھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ نہ سر کا درد رہا نہ کوئی اور خیال......

''خان...... چائے۔'' کاکا کی آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ کاکا چائے رکھ کر واپس جا چکے تھے اور ضیا اپنی حالت پر حیران کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر دل ہی دل میں اپنے بابا سے عہد کی تجدید کی اور پین نکال کر تصویر کے پیچھے لکھنے لگا۔

''گلِ لالہ......'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

سیٹی بجاتے ہوئے اس نے بیگ اور تصویر بھی دراز میں ڈال دیے تھے البتہ اس مرتبہ وہ دراز لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب مانوس سے شور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ لائٹ نہیں تھی البتہ کھڑکی سے اندر آتی چاند کی کرنوں نے کمرے کو کچھ نہ کچھ روشنی بخش دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل بری طرح گھبرایا۔ وہی مانوس سا شور رات کے سناٹے میں ایک مرتبہ پھر گونجا تھا۔

''اوزگل......'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ سلیپرز پاؤں میں پہن کر وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اور وہ نظروں کے سامنے تھی۔ سوئمنگ پول سے کچھ دور لگے آہنی جھولے پر سفید لباس میں لمبے سیاہ بال کھولے چاند کی چاندنی میں وہ کوئی مقدس روح لگ رہی تھی۔ اتنی دور سے بھی وہ اس کے چہرے پر رقم اداسی بہ آسانی پڑھ سکتی تھی۔

''جب آنکھوں سے خواب دیکھنے کا حق چھین لیا جائے ناں تو ان آنکھوں میں بس تنہائی اور وحشت گھر کر لیتے ہیں۔'' اوزگل نے اسے بتایا تھا۔ اور آج اسے واقعی یہ حقیقت لگ رہی تھی۔ لوہے کی کڑیوں کی آواز پھر سناٹا چیر گئی تھی۔

تبھی اس نے نیچے کسی کے چیخنے اور پھر اوزگل کو تیزی سے اٹھ کر ایک سمت دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔

کوئی بہت اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔ وہ ذرا جھک کر نیچے برآمدے کی سمت دیکھنے لگی اور پھر اندر سے چیخیں مارتا وجود اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اوزگل اسے سنبھالنے لگی تھی لیکن وہ وجود قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

''حد ختم ہونے کو ہے۔ حد ختم ہونے کو ہے۔'' وہ چلانے لگی۔

''سب برباد ہو جائے گا۔'' اوزگل اسے پیار سے سہلاتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔

''بھاگ جا تو بھی بھاگ جا...... ورنہ سب برباد ہو جائے گا۔'' وہ اسے کمرے میں لے گئی تھی...... آوازیں مدھم ہوتے ہوتے دم توڑ گئیں۔ وہ لمبی سانس لے کر دوبارہ بستر پر آ گئی۔

''لگتا ہے اللہ لوک کو پھر دورہ پڑا ہے۔ مجھے بھی بھیا کی طرح جلد شہر میں کسی اچھے کالج میں داخلہ لینا ہوگا۔ ورنہ یہاں رہ کر میں بھی ان سب کی طرح پاگل ہو جاؤں گی۔'' بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جیسے خود کو باور کرایا لیٹتے ہی گل مینہ کی آنکھ لگ گئی تھی...... وہ ایک مرتبہ پھر نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب چلی تھی۔

☆☆☆

''آ گئیں تم......؟'' وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو شاہ ویز کی مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا۔

''اُف آج تو گرمی نے برا حال کر دیا، اوپر سے بس میں اتنا رش......'' وہ چادر اتار کر پیڈسٹل فین کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''تو تمہاری اپنی چوائس ہے۔ کتنی مرتبہ آفر کی ہے کہ میں حاضر ہوں پک اینڈ ڈراپ سروس کے لیے...... مگر نہ جی......'' وہ خفا ہوتا کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''تمہاری جاب لگنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھتی ہوں کہاں رہتی ہے یہ آفر باقی......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھا...... فریش ہو لو...... میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں۔'' اس نے کچن سے آواز دی۔

''کیوں، امی کہاں ہیں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''وہ پھپھو کی طرف گئی ہیں...... نانو اندر سو رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں...... وہاں کیوں گئی ہیں؟'' اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

''کہہ رہی تھیں کافی دن ہو گئے ان کی طرف گئے ہوئے پھر ناراض ہوں گی۔'' کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں، وہ اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ وہ کچن کی کھڑکی میں آ ٹھہری۔

''اچھی طرح جانتی ہیں پھپھو کی عادت کو پھر بھی باز نہیں آتیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اب دیکھنا کتنے دن مائیگرین کی تکلیف میں مبتلا رہیں گی۔'' اس نے پیش گوئی بھی کر دی۔ شاہ ویز مسکرا دیا۔

''نانو نے بھی یہی سمجھایا تھا ان کو...... مگر تم جانتی ہو، امی کب کسی کی مانتی ہیں۔'' وہ ٹرے میں کھانا رکھتے ہوئے بولا اور باہر نکل آیا۔

''یہی من مانی ہی تو انہیں آج تک بھگتنی پڑ رہی ہے۔'' وہ شاویز کے پیچھے آئی۔

''بری بات لالہ......''

''کیا بری بات...... اچھی طرح جانتی ہیں کہ سب لوگ بات، بات پہ ان کے ماضی کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں...... ہمیں بھی کئی دفعہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی اولاد کا طعنہ سہنا پڑتا ہے...... لیکن وہ...... انہیں کچھ خیال ہی نہیں...... مزہ آتا ہے جیسے ان کو یہ سب طعنے سننے میں...... دوسروں کو خود موقع دیتی ہیں کہ وہ ان کو اور ان کی وجہ سے ہمارے کیریکٹر پر بھی بات کریں۔'' وہ اس موضوع سے کس قدر دکھی ہوتی تھی وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

''اچھا یہ لو...... موڈ صحیح کرو اپنا۔'' شاویز نے بات بدلی اور بھاپ اڑاتے گرما گرم ابلے ہوئے چاول، رائتہ اور دیسی گھی کا اور تڑکا لگی دال دیکھتے ہی شاویز نے اس کا چہرہ کھلتا دیکھا تھا۔

''ارے واہ...... امی نے میری فیورٹ ڈش بنائی تھی۔ اور تم نے ایویں سارا ٹائم مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔'' حسبِ معمول وہ ساری واردات اس کے سر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو چکی تھی۔ اور رغبت سے کھانا کھانے لگی...... وہ مسکرا کر اسے دیکھے گیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا ہے یاری؟ مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' صبح سے ہی وہ انہیں کھویا، کھویا لگ رہا تھا۔ اور اب ناشتا بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں کر رہا تھا تو وہ

پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھیں۔
”کچھ نہیں دیدے......“ وہ چونکا پھر سیدھا ہو کے ہی بیٹھ گیا۔
”کچھ تو ہے بچے...... کیا پھر سے وہی خواب تنگ کرنے لگا ہے۔“ انہوں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔
”دیدے......“ اس نے جیسے ان کی بات نہ سنی تھی۔ دھیرے سے پکارا تھا۔
”جی دیدے کی جان......“ ان کے لہجے میں محبت در آئی۔
”کیا میرا کوئی چھوٹا بھائی تھا۔“ اس کے سوال پہ ان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔
”نہیں...... میں تمہیں کئی دفعہ بتا چکی ہوں کہ تم زریاب خان کی اکلوتی اولاد ہو۔“
”پھر وہ لڑکا کون ہے؟“ وہ پیشانی مسلنے لگا۔
”کون لڑکا؟“ وہ خود پریشان ہوگئیں۔
”وہ میرے خواب میں آتا ہے دیدے...... ہمیشہ کسی نہ کسی مصیبت میں...... لیکن میں چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا پاتا۔“
وہ انہیں بے حد ڈسٹرب لگا۔
”اپنے خوابوں کو اپنے اوپر طاری مت کرلیا کرو، یہ سب خیال ہوتے ہیں۔ خالی خولی دھواں......“ وہ اسے تسلی دینے لگیں۔
”اب ناشتا کرو اور خود کو پُرسکون کرو...... آج تمہارا پہلا دن ہے آفس میں...... خوش، خوش جاؤ۔“
”ہم......م“ وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد البتہ دیدے خود کتنی ہی دیر تک اس کے خواب کے متعلق سوچتی رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ باہر نکل کر جیسے ہی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا، اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پہ شاویز کا نام دیکھتے ہی اس کے لبوں پر بہت پیاری مسکان مچل گئی۔
”کدھر غائب ہے شہزادہ......“ کال پک کرتے ہی شاویز کی کھلکھلاتی آواز سنائی دی تھی۔
”آج شام تیری طرف آنے والا تھا۔ جاب مل گئی ہے مجھے...... سوچا تھا مل کر ہی بتاؤں گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
”ارے واہ یار...... مبارکاں......“ وہ چہک اٹھا۔
”خیر مبارک......“
”ابھی آجاؤ ناں......“ شاویز نے کہا۔
”نہیں ابھی تو آفس کے لیے نکل رہا ہوں۔

شام کو ملتے ہیں۔'' اس نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''اوکے،اوکے......! ملتے ہیں پھر......اللہ حافظ......''
شاویز نے فون بند کر دیا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے بائیک اسٹارٹ کی تھی۔

☆☆☆

''خان۔'' گہری نیند میں وہ کسمسایا ضرور مگر کروٹ بدل کر فوراً ہی دوبارہ سو گیا۔
''چھوٹے خان جی......!'' دوسری پکار پہ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔
''کیا ہے کاکا؟'' نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھا گیا۔
''خان! آپ کے دوست آپ کا پوچھ رہے ہیں۔'' دوراں نے مؤدب لہجے میں کہا۔
''کہہ دو میں سو رہا ہوں۔'' اس نے واپس جانے کا اشارہ کیا۔
''کہا ہے خان......مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے آج ان کے ساتھ کہیں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔'' کاکا نے مزید بتایا۔
''یاد ہے مجھے......مگر ابھی میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے کاکا۔'' اس نے انکار کیا۔
''جی خان جی......'' مؤدب لہجے میں کہتا وہ مڑ گیا۔
''اچھا رکیں......'' وہ ابھی دروازے کے قریب ہی تھے۔ جب وہ اٹھ بیٹھا، وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔
''آپ جائیں......میں آرہا ہوں۔'' وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا......دوراں باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر باہر لاؤنج میں آیا تو وہ اس کے منتظر تھے۔
''چلو......'' چابی گھماتا ان سب کو جیسے حکم دیتا وہ باہر کی طرف بڑھا تھا۔
''بڑی جلدی ہے شہزادے کو۔'' زید خباثت سے ہنسا۔
''سچ یار......سنا تھا کہ رئیس زادے عاشق مزاج اور پیسہ پھینک ہوتے ہیں۔ آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔'' شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ مرد کی یہی شان ہے شہزادے......'' ضیا مڑ کر دو قدم آگے آیا۔ ''لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہ سب صرف یہاں تک......یونیورسٹی میں تم میں سے کوئی بھی نہ تو لڑکیوں کی طرف پھٹکے گا نہ ہی اوباشوں کی طرح یوں بات کرے گا۔'' اس نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے ان سب کو وارن کیا۔
''یہ کیا بات ہوئی؟'' زید چڑ کر بولا۔
''میں نے کہہ دیا ناں......'' ضیا اس کی خفگی کو خاطر میں نہ لایا۔
''کیا مطلب ضیا......'' ابراہیم حیران ہوا۔
''وقت آنے پر مطلب بھی سمجھا دوں گا۔'' اس نے جان چھڑائی۔
''اب چلو......'' اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

حمزہ اور اقرا کو وہاں آئے کافی وقت ہو چلا تھا لیکن لالہ ابھی تک ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ حمزہ نے محسوس کیا تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ لالہ ان سب سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے تو کبھی کبھار گفتگو ہو ہی جاتی تھی لیکن اب تو وہ سامنے آنے سے بھی کترانے لگی تھی۔ حمزہ کی تو گویا جان پر بن آئی تھی۔ اقرا تو نانو، مامی کے ساتھ بھی کافی مگن رہتی۔ لالہ کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے فاصلے پر ہی رہتی۔ لیکن حمزہ کے لیے یہ فاصلے جاں گسل تھے۔
''مامی، شاویز کہاں ہے؟'' چائے ختم کر کے اس نے سین سے پوچھا تھا۔
''ایک دو جگہ انٹرویو تھے اس کے......آتا ہی ہوگا۔'' انہوں نے بتایا۔
''اور لالہ......؟'' جھجکتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔
''آج جلدی آگئی تھی یونیورسٹی سے کہہ رہی تھی کہ کبوتروں کا پنجرہ صاف کرے گی شاید اوپر ہی

ہو.....'' اسے بتا کر وہ پھر اقرا کو اپنے ہاتھ کے بنے کپڑوں کے نمونے دکھانے لگیں۔ حمزہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آ گیا۔ سامنے ہی لالہ کبوتروں کو پچکارتی دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کی نظر حمزہ پہ پڑی..... لیکن وہ فوراً ہی رخ پھیر گئی۔

''کیسی ہو؟'' وہ دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔

''آج کل کیا مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو؟'' وہ اس کے سامنے آ گیا۔ ''اگر ایسا کچھ ہے تو مجھے بتادو..... میں خود ہی تمہارے لیے آسانی کر دوں گا۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... میں خود اپنا آپ چھپا تو لیتی ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''انسان تب چھپ سکتا ہے جب اسے کسی کی نظریں نہ پہنچ سکیں۔'' وہ اس کے قریب ہوا۔ ''تم تو میری نظروں میں اس قدر گہرا عکس پا گئی ہو کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔'' اس کی نظروں کی سچائی پر وہ نظریں بدل گئی۔

''آج پھپو نے یہاں آنے کی اجازت کیسے دے دی؟'' وہ بات بھی بدل گئی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''اقرا کو کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔'' دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ سفید شیفون کے سوٹ پر گلابی دوپٹے میں اس کی سفید رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

''اوہ..... مطلب گھر جا کے شاپنگ کا بہانہ بتانا ہے۔'' وہ ہنس دی۔

''میری مجبوری کا مذاق مت بنایا کرو.....'' وہ خفا ہوا۔

''تم محبت جیسے خالص جذبے کا مذاق مت بنایا کرو۔'' وہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

حمزہ بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔

قبولیت کا یقین رکھو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں دعا کیا کرو کہ تم قبولیت کا یقین رکھا کرو اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غفلت سے بھرے دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔ (ترمذی)

مخلص: ورشیا طارق، ڈی جی خان

''تم تو بنا بولے، بنا کہے میری ہر بات سمجھ لیا کرتی تھیں لالہ.....'' وہ اس کا بازو تھام کر اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر اب یہ اجنبیت کیوں؟'' اس کی آنکھوں میں لالہ کو اپنا عکس صاف نظر آیا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا لیکن سختی سے خود کو کوئی بھی نرمی برتنے سے روکا تھا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

''کیونکہ میں اپنی اور اپنی ماں کی اوقات اور تمہاری اور تمہاری ماں کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ تلخ ہوئی تھی۔

''اور ہاں ایک بات یاد رکھنا علی حمزہ زیدی..... کمزور سی لڑکی ہونے کے باوجود میں تمہیں کسی معاملے میں کوئی رعایت نہیں دے سکتی..... تمہاری ماں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں..... ویسے بھی میرا ماننا ہے جہاں عزت پر حرف آئے..... وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

حمزہ لب کچلتا رہا۔

''اب جاؤ..... ورنہ تمہاری اماں کو شک ہو جائے گا۔'' تلخی سے کہتی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی..... حمزہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گاڑی ایک قدرے تاریک لیکن کشادہ گلی میں داخل ہوئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ تاریکی صرف چند قدم کے فاصلے تک محدود تھی۔ دور و یہ دو منزلہ

عمارتوں کے درمیان پہنچتے ہی ہر طرف جیسے اجالے پھیل گئے تھے۔ نک سک سے تیار عورتیں ٹیرس پہ کھڑی آنے والوں کا جیسے استقبال کررہی تھیں۔ ضیا کی نئی چمچماتی ہونڈا سوک دیکھ کر ان سب میں شور سا اٹھا تھا۔ کچھ نے تو باقاعدہ سیٹیاں بجا بجا کر ان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

ذرا دور جا کر قدرے بڑے شیشے کے خوب صورت کام سے آراستہ بنگلو کے سامنے ان کی کار رکی تو چوکیدار نے فوراً گیٹ وا کردیا۔ وہ جیسے انہی کا منتظر تھا۔ گاڑی سے اتر کر صاف ستھری پتھریلی روش پر چلتے وہ اندرونی دروازے تک آئے تو ایک ادھیڑ عمر عورت نے ان کا استقبال کیا۔ اس نے اتنا زیادہ میک اپ کر رکھا تھا کہ ان سبھی کو اس کی شخصیت سے عجیب سی کراہیت محسوس ہوئی۔ ان پر صدقے واری ہوتی، وہ ان سب کو اوپر ایک ہال کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرا بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ سرخ رنگ کا نرم مخملیں کارپٹ اور اس پر سجے اتنے ہی آرام دہ کشن...... زید نے اس عورت سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور ضیا کا ہاتھ تھامے کھڑکیوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

ابراہیم اور شاہد نے بھی ان دونوں کی تقلید کی تھی۔ تبھی کمرے میں جیسے گھنٹیاں سی بجی تھیں۔ سب کی نظریں یکبارگی ہی اٹھیں اور سامنے بنے چھوٹے سے گول دروازے پر جھولتی، بجتے موتیوں کی لڑیوں پر جا کے ٹھہر گئیں۔ ان سب کی نظروں میں حیرت اور ستائش کا ملا جلا تاثر ابھرا تھا۔ تیکھے گلابی رنگ کا فراک پہنے بڑا سا ہرا دوپٹا سر پر سجائے وہ کوئی اپسرا تھی۔ وہ یونہی مبہوت سا اسے دیکھے گئے۔ اس کے کمرے میں آتے ہی سازندوں نے ساز چھیڑ دیے تھے اور آداب بجا لانے کے بعد وہ نازک اندام بدن تھرتھرانے لگا۔ وہ اس قدر مہارت سے کلاسیکل رقص پیش کررہی تھی کہ وہ دم بخود اسے دیکھے جارہے تھے۔ اس کا وجود گویا ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے قدموں کے نیچے زمین نہ ہو بلکہ وہ سمندر کی لہروں پر سبھج سبھج کر قدم دھر رہی تھی۔

وہ چاروں مبہوت سے اسے دیکھے جارہے تھے۔ رقاصہ کی گھاک نظریں مسلسل رقص کے باوجود بغور اُن کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ خانم نے ہی تو سمجھایا تھا اسے......

''یہاں آنے والا ہر مرد شکار ہوتا ہے۔ اب یہ تم پہ ہے کہ کتنا اچھا شکار ڈھونڈتی ہے۔'' ڈھول کی تھاپ پہ اس نے پیر مارے تھے۔

''مرد کی آنکھیں اس کے خاندان، اس کے اسٹیٹس کا پتا دیتی ہیں۔ غریب ہوگا تو آنکھوں میں بھوک، ہوس ہوگی...... امیر ہوگا تو ستائش اور اطمینان کہ مال اس کی حیثیت سے بڑھ کر نہیں......'' وہ ان کے قریب آچکی تھی۔ زید اور شاہد کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ ابراہیم کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ یہاں زبردستی لایا گیا تھا۔ اور ضیا اس کی آنکھوں میں ساکت سا سکون...... اور اس ناچتی حسینہ کی تیز نظروں نے ضیا علی خان کو تاڑ لیا تھا۔ وہ ناچتے، ناچتے اس کے قدموں میں بچھنے لگی۔ اس کا دوپٹا کھسک گیا اور لمبے کالے ریشم جیسے بال ضیا کا دامن چھونے لگے، دھیرے، دھیرے ناگن کی طرح بل کھاتی وہ دور ہونے لگی تو ضیا نے بڑھ کر نہایت نرمی سے اس کے بال پکڑ لیے۔ وہ ٹھٹکی اور قدرے ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے بال چھوڑ دیے۔

''ضیا، میرے خیال میں چلنا چاہیے۔'' ابراہیم نے فوراً کہا۔

''تم لوگ جاؤ...... میں یہیں رہوں گا کچھ دیر۔'' تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے آرام سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے زید اور شاہد کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر عورت لبوں پر مسکان سجائے اب اس کی زبان سمجھ رہی تھی۔ ضیا کی نظریں البتہ اب بھی اس پری پیکر پر جمی تھیں......

(باقی آئندہ)



جیون کہانی

شاہدہ ذاکر

آج سال کی آخری رات تھی وہ رات جس کا اختتام نئے سال کی نوید لاتا ہے۔ نیا سال، نیا سورج، جوش، امنگوں اور ولولوں سے بھرپور خوش کن احساس جو ایک طرف من میں نت نئی آرزوئیں اور جذبے جگاتا ہے تو دوسری طرف کچھ کر دکھانے کا جنون اور کامیابیوں سے جیون بھر لینے کی امیدیں بھی روشن کرتا ہے لیکن ان کے لیے تو یہ سال، مہینے، دن اور موسم محض الفاظ رہ گئے تھے...... بے معنی اور بے مقصد، جب سے

زندگی وھیل چیئر کی محتاج ہوئی تھی جیون پر ایک ہی موسم طاری تھا جمود کا موسم ......سرد، تاریک، بے رنگ، تکلیف دہ......

زندگی ان کے لیے بس ایک خاموش، طویل اور صبر آزما جنگ تھی اور ہدِ مقابل تھے۔ بیماری، تنہائی اور اپنوں کی بے حسی۔ فالج کے حملے کے بعد تمام تر قوت ارادی بروئے کار لا کر وہ اسی قابل ہوئی تھیں کہ وھیل چیئر کو دھکیل کر کمرے کی کھڑکی تک لے جاسکیں اور کمرا بھی کیا تھا محض ایک بستر اور الماری پر مشتمل ایک چھوٹی سی جائے پناہ......ان کے اس بے رنگ و بو جیون میں بہار کا جھونکا، ان کی تنہائی کی ساتھی اور بیرونی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھی یہ چار فٹ چوڑی اور چھ فٹ لمبی کھڑکی جس کے شیشے سے سر ٹکا کر وہ گھنٹوں باہر تکا کرتیں۔ دنیا کے ہنگامے، رونق، چہل پہل اور لوگوں کی گہما گہمی انہیں زندگی کا احساس دلاتے۔ تیسری منزل پر واقع ان کا یہ خوب صورت فلیٹ ایک ڈبل روڈ پر واقع تھا جس پر صبح چار پانچ بجے سے جو دودھ اور ڈبل روٹی والی گاڑیوں سے ٹریفک کا آغاز ہوتا تو رات گئے تک یہ سلسلہ جاری و ساری رہتا۔

ان کا بیٹا اور بہو بچوں کے ساتھ نئے سال کی آمد کا جشن منانے اور آتش بازی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ نو بجے ملازمہ ان کو کھانا کھلا کر دوائی دے کر، اپنا کام ختم کر کے اُن کی اجازت سے اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھی۔ کچھ دیر تو وہ ٹی وی سے دل بہلاتی رہیں پھر بور ہو کر اسے بھی بند کر دیا۔ آج باہر رونق اور شور وغل معمول سے کہیں زیادہ تھا۔ گاڑیوں کے ہارن، میوزک کا شور اور لوگوں کی آوازیں آخر کار انہیں متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ دھیرے، دھیرے اپنے کمزور ہاتھوں سے وھیل چیئر چلا کر وہ کھڑکی تک پہنچ گئیں جہاں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ اچانک ان کی نظر لال اونی فراک اور ٹوپی پہنے، کھلے، کھلے چہرے والی ایک دلکش بچی پر پڑی جو اپنے والد کی انگلی تھ[ا]مے جارہی تھی۔ یکا یک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جگہ وہ خود ہوں اور ساتھ ان کے والد ہیں۔ ... کا دریچہ کیا وا ہوا یادوں کے رتھ پر سوار ہو کر وہ ... کے جزیرے میں جا اتریں۔

آہ......بچپن...... زندگی کا خوب صورت ... دور...... آزادی......بے فکری......نہ غمِ زندگی، ... روزگار...... والدین کی بے لوث محبت اور ... بھائیوں کا پیار بھرا ساتھ چھینا جھپٹی، لڑائی جھگڑ[ے]، شکوے شکایت اور لمحوں میں سب کچھ بھلا کر گھر ان[کے] قہقہوں سے گونج رہا ہوتا۔ لیکن یہ حسین دور پلک جھ[پکتے] بیت گیا اور وہ بابل کے آنگن کو سونا کر کے پیا د[یس] سدھار گئیں۔

وہ سحرِ حیات سے سحر اشفاق کیا ہوئیں جینے [کے] انداز ہی بدل گئے۔ ایک پیار کرنے والے ہم سفر [کی] چاہت نے انہیں اندر تک سرشار کر دیا۔ اشفاق کے بھرپور التفات اور توجہ سے وہ خود پر نازاں ہوگئیں۔ ان کے جیون ساتھی نے پہلی ہی نظر میں اپنا دل ہار [دیا] تھا تو سحر نے بھی ان کی محبت میں خود کو سرتاپا بدل ڈالا۔ محبت کے خمار میں ڈوبے، تن من کا ہوش بھلا[ئے]۔ شادی کے یہ ابتدائی دن انہیں عمر بھر کے لیے انمو[ل] یادوں کا تحفہ دے کر ہوا ہوگئے۔

اگلے سال عمران کی آمد نے جہاں ان کی ذا[ت] کی تکمیل کر دی وہیں انہیں ممتا کے جذبے ... شناسائی بھی بخشی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ... اور علی کی صورت ان کے آنگن میں دو پھول اور کھ[لے] جنہوں نے نہ صرف ان کی زندگی کو بہار کے رنگوں ... سجا دیا بلکہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذ[مہ] داریوں کی صورت مصروفیات کا ایسا تحفہ دیا جس میں کھو کر وہ اپنی ذات کو بھی فراموش کر گئیں......وہ د[ن] رات ان کے کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور پڑھ[نے] لکھنے کی فکروں میں ہلکان رہتیں لیکن ان کی تمام تکا[ن] اپنے بچوں کی پیاری صورتیں دیکھ کر دور ہو جاتی، وہ ایک

ایسا محور تھیں جس کے گرد اُن کی پوری فیملی گھوم رہی تھی۔
شب و روز کا چکر یونہی چلتا رہا اور بچے اسکول، کالج کے دور سے نکل کر عملی زندگی میں داخل ہو گئے تب انہوں نے عمران کے سر پر سہرا سجانے کا پروگرام بنایا۔ ہر ماں کے دل میں چاند سی بہو لانے کا ارمان تو شروع سے ہی ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ان کا ارادہ اپنی حسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھانجی لانے کا تھا لیکن جب گھر میں شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو عمران نے جھٹ سے اپنی کلاس فیلو کا نام لے دیا۔ ایسے میں اشفاق بھی بیٹے کے ہمنوا بن گئے۔ کیونکہ بقول ان کے ”جب زندگی بچوں نے گزارنی ہے تو پسند بھی ان کی ہونی چاہیے۔“

یوں صائمہ بہو کی صورت ان کے آنگن میں اتری۔ شادی کے اولین دن تو گھومنے پھرنے اور دعوتوں میں ہنسی خوشی گزر گئے لیکن جب عمران نے دوبارہ ڈیوٹی جانا شروع کیا تو صائمہ نے اپنے کمرے کو ہی اپنا مسکن بنالیا۔ وہ مجبوراً ناشتے، کھانے کے لیے باہر آتی لیکن خاموشی سے ضروری کام نبٹا کر فوراً واپس چلی جاتی۔ شام کو عمران کی آمد پر وہ سج دھج کر اس کے ساتھ چلی جاتی پھر ان کی واپسی رات گئے ہی ہوتی۔ جب سحر نے بیٹے سے شکوہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے انداز نے انہیں وہ پرانی کہاوت یاد دلادی۔ ”بیٹا تب تک آپ کا بیٹا ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہوجاتی۔“ ایسے میں اشفاق ان کا سہارا بنے، ان کی دلجوئی سے وہ اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتی تھیں۔

اچانک پُرسکون انداز سے رواں دواں ان کی زندگی کی گاڑی ایک دم سے گہری کھائی میں جا گری۔ سرد، گہری اور تاریک...... تاریکی اس قدر تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آکسیجن کی بھی کمی تھی کیونکہ سانس لینا بھی دوبھر تھا۔ دنوں بعد جب سکتہ ٹوٹا اور حواس بحال ہوئے تو خار دار شاہراہ حیات پر تنہا رہ جانے کا غم انہیں مہینوں خون کے آنسو رلاتا رہا۔ ہنسی خوشی ناشتا کر کے گھر سے جانے والے اشفاق کو آندھی

طوفان کی طرح ان کی کار سے ٹکرانے والے آئل ٹینکر نے لمحوں میں ان سے چھین لیا تھا۔ تنہا زندگی انہیں بوجھ محسوس ہو رہی تھی اور جینے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن انسان اللہ کی رضا کے آگے بے بس ہے اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وقت کے مرہم نے آہستہ، آہستہ جدائی کے زخموں کو مندمل کرنا شروع کر دیا۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیٹا ہر پابندی سے آزاد ہو گیا اور چند ماہ میں پہلے سسرال پھر بیرون ملک ٹھکانا کر لیا۔ ان پے در پے صدموں نے سحر کو بیماریوں کا شکار بنا دیا۔ اب انہیں اپنی زندگی کا بھروسا نہیں رہا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہو جائیں اور پھر اللہ نے ان کی سن لی۔ قریبی عزیزوں سے مونا کے لیے اتنا بہترین رشتہ آ گیا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سہیل، ان کا داماد، دبئی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ اگرچہ بیٹی کو خود سے اتنی دور بھیجنے کے لیے ان کا ہرگز جی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے روشن مستقبل کی خاطر انہیں دل پر بھاری پتھر رکھنا پڑا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے لیے بہو بھی پسند کر لی تاکہ بیٹی کی رخصتی کے بعد گھر میں رونق ہو جائے۔ اور یوں ایک خوب صورت شام کو دھوم دھام سے حنا ان کے آنگن میں اتری تو اگلے دن ولیمے کی پُروقار تقریب میں مونا پیا کے سنگ روانہ ہو گئی۔

مونا کے دبئی روانہ ہونے اور علی کے اپنی زندگی میں مصروف ہونے کے بعد انہیں اپنی ذات..... بے مصرف محسوس ہونے لگی۔ علی اپنی جاب اور حنا بچوں کی ذمّے داریوں میں الجھتی چلی گئی۔ مونا سال میں ایک دفعہ چکر لگاتی، جب تک صحت نے ساتھ دیا وہ ملنے ملانے اور حنا کی مدد کرنے میں اپنا دل بہلائے رکھتیں لیکن پھر فالج کے حملے نے انہیں بستر تک محدود کر دیا اور اب وہ تھیں ان کا کمرا اور وہیل چیئر..... شروع میں تو بہو اور بیٹا ان کی دیکھ بھال کرتے رہے لیکن پھر ان کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کر دیا گیا تھا اور اب وہ تھیں اور جان لیوا تنہائی۔

سوچوں میں ڈوبے ہوئے انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ زندگی کے غم ان کے چہرے کی جھریوں میں راستہ بناتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی ایک یاد ان کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر چمکی جب بھی وہ بے حد پریشان ہوتیں یا کسی مسئلے میں الجھی ہوتیں تو اشفاق ان کو (relase) کرنے کے لیے کہتے

''بیگم! آپ اکیلی کیوں پریشان ہو رہی تھیں آپ تین مرتبہ تالی بجاتیں تو آپ کا یہ غلام حاضر ہو جاتا۔'' تو وہ ہنس دیتیں اور پھر نہ جانے ان کے من میں کیا سمائی انہوں نے دھیرے، دھیرے دونوں ہاتھ اٹھائے پھر ایک...... دو...... تین...... تین بار تالی بجائی اور پھر ایک معجزہ ہو گیا انہیں دیکھ کر بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اشفاق ان کے بالکل پاس کھڑے تھے وہی چمکتی آنکھیں اور روشن چہرہ...... مسکراتے ہوئے جیسے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا سحر نے بے تاب ہو کر تھام لیا۔

آتش بازی بارہ بجے شروع ہوئی۔ رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں سے سجے اس جشن میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یکا یک علی کو یوں محسوس ہوا جیسے ماں نے اسے پکارا ہو۔ ویسے ہی جیسے بچپن میں کبھی بہت پیار سے پکارا کرتی تھیں۔

''بلو! میری جان۔'' وہ یکا یک چونک گیا اور کھوئی، کھوئی نظروں سے اردگرد دیکھنے لگا لیکن ہر طرف وہی منظر تھا۔ نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی نے اس کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیا۔ اس نے اس احساس کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ دھیرے، دھیرے یہ احساس لاشعور سے نکل کر شعور پر پوری طرح قابض ہو گیا بے کلی اتنی بڑھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر طوفانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ جیسے ہی وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوا سامنے کا منظر دیکھ کر بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ بیہوشی کی حالت میں آدھی وہیل چیئر اور آدھی کھڑکی

میں پڑی تھیں۔

پہلا احساس ہر سو مکمل تاریکی کا تھا پھر سماعت نے دور سے آنے والی کچھ آوازوں کو قید کیا لیکن وہ اِس قدر مدھم تھیں کہ ذہن انہیں کوئی بھی معنی پہنانے سے قاصر تھا حواس کی بیداری کا یہ دورانیہ بھی محض چند سیکنڈ کے لیے تھا اس کے بعد ذہن پھر مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا پھر ایک دن انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دور سے انہیں کوئی بلا رہا ہے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن پلکوں پر منوں بوجھ دھرا تھا، بولنا چاہا تو زبان اکڑی ہوئی اور گلا خشک ہوکر کانٹے پڑے ہوئے تھے.... بہ مشکل وہ مدھم سی بے معنی آواز نکال پائیں تبھی پاس کھڑی نرس ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ ایک مہربان ہاتھ نے سہارا دے کر ان کا سر تھوڑا سا اونچا کیا اور چمچ کے ذریعے کچھ پانی ان کے منہ میں ڈالا۔ دو چار گھونٹ پانی پینے سے ان کی طاقت کچھ بحال ہوئی۔

دھیرے، دھیرے آنکھیں کھولنے پر سامنے کا منظر انہیں اپنی بصارت کا دھوکا محسوس ہوا۔ مونا اور عمران دائیں، بائیں ان کے ہاتھ تھامے بیٹھے تھے اور علی ان کی پائنتی بیٹھا تھا۔ ان کے بچوں کی سوجی آنکھیں، بکھرے بال اور شکستہ حالتیں ان کی دلی کیفیات کی غماز تھیں۔ خوشی ان کے انگ، انگ سے پھوٹنے لگی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے تو وہ سب ان کے بازوؤں میں آکر سسکنے لگے۔ انہوں نے باری، باری ان کو پیار کیا اور پُرسکون ہو کر مسکراتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔ یہی تو وہ انمول خوشی تھی جس کے لیے وہ کب سے ترس رہی تھیں، ان کی عمر بھر کی جمع پونجی، ان کی کل کائنات ان کی بانہوں میں تھی۔ ان سے زیادہ خوش قسمت دنیا میں کون تھا؟

ان کو ایک ہفتے کے بعد ہوش آیا تھا۔ علی نے ان کو بیہوشی کی حالت میں فوری طور پر ایمبولینس میں اسپتال پہنچایا تھا۔ بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے سیریس ہارٹ اٹیک کے باوجود ان کی جان بچ گئی ورنہ ڈاکٹرز کے مطابق تھوڑی سی بھی مزید تاخیر جان لیوا ثابت ہوتی۔ اطلاع ملتے ہی عمران اور مونا بھی پہلی فلائٹ سے پہنچ گئے۔ ہفتہ بھر ان کے بچے بھوک، پیاس اور نیند جیسے فطری تقاضوں سے بے خبر دن رات ان کی زندگی اور تندرستی کے لیے دعائیں کرتے رہے اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی سن لی اور ان کی ماں موت کی سرحد کو چھو کر لوٹ آئیں۔ ''قدرِ نعمت بعدِ زوال'' کے مصداق وہ تو ماں کو کھونے کے تصور سے ہی لرز گئے۔ اپنی زندگی کی مصروفیات میں مگن خواب غفلت میں پڑی ان کی اولاد کو اس جھٹکے نے پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔

دراصل یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک اسے کوئی نعمت میسر ہوتی ہے تو وہ اس کی قدر نہیں کرتا نہ ہی اس کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے لیکن جیسے ہی وہ اس سے محروم ہوتا ہے تو اس پر پوری طرح اس کی قدر و قیمت واضح ہوجاتی ہے۔ اپنی بے پروائی، ماں کی بیماری، پریشانی اور تنہائی نے ان کو بحرِ ندامت میں غرق کر دیا تھا۔ عمران دیارِ غیر میں کافی مشکلات جھیل کر اب اپنی زندگی میں سیٹ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا مونا بھی اس کے قریب ہی رہتی تھی اور اگلے سال علی بھی وہاں شفٹ ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بخوشی اس کے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہوگئیں۔ ان چند ہی دنوں میں تینوں نے اپنے بھرپور پیار اور توجہ سے ماضی کی غلطیوں کی کافی حد تک تلافی کر دی تھی۔ وہ اپنے گزشتہ رویّے پر بے حد شرمندہ تھے اور بار، بار ان سے معافی طلب کرتے اور وہ تو ماں تھیں' کیسے معاف نہ کرتیں۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم اور بابرکت ذات کے بعد ماں ہی تو ہے جس کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ اولاد کی ہر خطا کو نہ صرف کھلے دل سے معاف کر دیتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کی خوشیوں کے لیے دعاگو بھی رہتی ہے۔

امرت

شیریں حیدر

قسط 12



تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب وفراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......



دل ہے اکثر اداس رہتا ہے

''ڈرائیور لینے آیا ہے تمہیں امرت......'' سارہ نے مجھے ہولے سے ہلا کر کہا، میں جیسے کسی خواب سے چونکی تھی۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا، میں نے تو اسے واپس بھیج دیا تھا اور آنے کو تو نہیں کہا تھا۔

''پوچھتی ہوں میں اس سے......'' سارہ کہہ کر باہر نکل گئی، میں نے اپنی ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر رکھی اور پُرسوچ انداز میں سامنے کی دیوار کو گھورنے لگی۔ میں وہاں کیوں تھی اس وقت؟

''وہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا فون بند آ رہا تھا اور تم نے اتنی دیر بھی کر دی تو گھر والے پریشان ہو رہے ہیں......'' سارہ نے واپس آ کر ڈرائیور کا پیغام دیا۔

''میرا فون کیوں بند تھا......؟'' میں نے اپنے فون کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، نظر نہیں آیا تو بیگ میں چیک کیا، فون کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ ''گھر والے کیوں پریشان ہونے لگے میرے بارے میں......کون گھر والے؟ چاچو اور ماما تو کل سے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔''

''میں پھر پوچھ کر آتی ہوں ڈرائیور سے......'' وہ کہہ کر مڑنے لگی۔

''نہیں، نہیں رکو پیاری......'' میں نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ ''تم کتنی بار اس سے پوچھنے جاؤ گی۔''

''تم ٹھیک ہو ناں؟'' سارہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کیا وقت ہوا ہے سارہ......؟'' فون بند تھا اور اس کے گھر میں مجھے سامنے کوئی گھڑی نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔

''میں اپنے فون سے چیک کر کے بتاتی ہوں۔'' اس نے چھوٹے سے کچن کے کاؤنٹر پر پڑے فون کو اٹھایا۔ ''شام کے چھ بج رہے ہیں امرت!''

''اوہو......یقیناً زین گھر آیا ہو گا اور اسی نے ڈرائیور کو بھیجا ہو گا۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔ ''جانے اس نے کیا کیا سوچا ہو گا......اور یہ میں کیا اتنی دیر کے لیے سو گئی تھی جو مجھے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا......تم جگا دیتیں مجھے سارہ!'' میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا تم ذرا دیر کو سو گئیں......'' اس نے جیسے مجھ سے نظر چرائی۔ ''چلو تم اٹھ کر منہ پر پانی کے دو چھپاکے مارلو جلدی سے۔''

''اوکے پیاری......'' غسل خانے کا شیشہ اتنا بڑا اور شفاف نہ تھا مگر میری روئی اور سوجی ہوئی آنکھیں کیسے مجھ سے چھپی رہ سکتی تھیں، تو کیا میں اتنا روئی تھی...... میں نے خود سے سوال کیا، ساتھ ہی وہ تلخ یاد اپنی جزئیات سمیت مجھ پر وارد ہوئی۔ جانے سارہ کس طرح مجھے گاڑی تک لے آئی تھی۔

ڈاکٹر یاسمین کے بھیانک انکشاف نے میری ٹانگوں سے جان نکال دی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا، ہمارے خاندان میں تو یہ مرض کسی کو نہ تھا۔ پھر میں ہی کیوں؟ میرے وجود کے اندر اور باہر دھماکے ہو رہے تھے، سارہ نے مجھے تھام لیا تھا، وہ سمجھ رہی ہو گی کہ میں کرسی پر بیٹھے، بیٹھے ڈھے جاؤں گی اور ایسا ہی ہوتا جو وہ میرے ساتھ نہ ہوتی، مجھے تھام نہ لیتی۔

''اب......'' بہ مشکل میرے لبوں سے یہ نامکمل سا سوال ادا ہوا تھا۔

''کیا اب؟'' ڈاکٹر یاسمین نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑیں۔

''اب کیا ہو گا؟'' میں نے اپنے خوف کو زبان دی۔

''ہوں......'' انہوں نے کہہ کر میز پر اپنے سامنے پڑے پیپر ویٹ کو یونہی گھمایا۔ ''دیکھنا ہو گا، بہت سی چیزوں کو ذہن میں رکھنا پڑے گا، اس کے مطابق ہی فیصلہ کیا جا سکے گا۔''

''میں سمجھی نہیں......کیسا فیصلہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ظاہری بات ہے کہ اس کا علاج سب سے اہم ہے..... کیا نوعیت ہے، کیا اسٹیج ہے..... کتنا پھیلا ہوا ہے، یہ سب جاننا اہم ہے۔'' وہ رکیں۔ ''اس میں سب سے پہلے آپریشن کا فیصلہ کرنا ہوگا کیونکہ باقی سب سوالوں کے جوابات اس کے بعد ہی معلوم ہوں گے۔''

''تو اس میں رکاوٹ کیا ہے؟''

''تم جانتی ہو ناں کہ تم ماں بننے والی ہو اور اس دوران آپریشن کرنا اتنا آسان فیصلہ نہیں ہوتا..... مریضہ کو طویل بے ہوشی کے لیے دوا دی جانا ہوتی ہے اس کا بچے کو کسی بھی نوعیت کا نقصان ہوسکتا ہے.....''

''مثلاً بچے کو کیا ہوسکتا ہے؟'' میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

''کم از کم بھی اس کی زندگی کو نقصان ہوسکتا ہے یا کسی قسم کی معذوری.....'' ڈاکٹر کے انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔

''آپریشن بچے کی پیدائش کے بعد تو بھی کیا جاسکتا ہے ناں؟'' میں نے ہولے سے پوچھا۔

''بہت زیادہ رسک والی بات ہے..... اس حد تک کہ بچہ اس سے متاثرہ پیدا ہوسکتا ہے۔''

''وہ تو اسے بہرصورت خطرہ ہے..... پیدا مرض کے ساتھ ہو یا مرض کے علاج کے لیے آپریشن سے اسے کچھ ہو جائے۔''

''ہاں.....!''

''ہاہ..... میری بدقسمتی کہ اسے میری کوکھ سے پیدا ہونا تھا..... پیدا ہوتا بھی ہے کہ نہیں۔'' میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

''تم کیوں ہمت ہارتی ہو پیاری.....'' سارہ نے مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔ ''دنیا میں ہزاروں لوگ اس بیماری کا مقابلہ کرتے اور اس سے جیت بھی جاتے ہیں، اللہ کرے گا کہ تم بھی ان میں سے ایک ہوگی اور تمہارے بچے کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''پتا نہیں سارہ..... میں ایک مسئلے سے نکلتی ہوں اور دوسرے میں پھنس جاتی ہوں۔'' میں سسکنے لگی تھی۔

''تم اپنی دوست کو سنبھالو سارہ.....'' ڈاکٹر یاسمین کو دو دفعہ نرس بلانے آچکی تھی۔ ''سوری..... میں تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتی مگر ایک مریضہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ایمرجنسی میں لائی گئی ہے.....'' میرا گال تھپتھپا کر وہ باہر نکل گئیں..... مجھے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کرکے۔

''آپ کو پانی لا کر دوں میڈم؟'' نرس نے سوال کیا۔

''ہاں لے آؤ.....'' پھر سارہ نے اس سے شکریے کے ساتھ اس پانی کا گلاس لیا۔ ''پانی پیو امرت!''

''مجھے پیاس نہیں ہے.....'' میں نے منہ پھیرا۔

''پیاس کے بغیر پی لو!'' اس نے اصرار کیا تو میں نے ایک گھونٹ لیا، وہ میرے حلق میں ہی پھنس گیا تھا۔

''نہیں پیا جارہا ہے سارہ!'' میں نے حلق میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کے گولے کو پینے کی کوشش کی۔

''اچھا ٹھیک ہے.....'' اس نے گلاس ایک تپائی پر رکھ دیا۔

''چلیں سارہ.....'' مجھے بہت گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''چلتے ہیں..... تم ذرا سنبھل جاؤ!''

''ہوں.....'' میں نے سینے کی گہرائی سے سانس کھینچی۔ ''سنبھل جاؤں گی وقت کے ساتھ!''

''اچھا میں تمہارے ڈرائیور کو دیکھتی ہوں۔'' وہ باہر نکلی تو جلد ہی واپس آگئی۔

''کیا ہوا.....''

''باہر نرس بیٹھی ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم ابھی نہیں جاسکتے..... ڈاکٹر یاسمین کو تم سے ملنا ہے ابھی۔''

’’میں پھر آ جاؤں گی۔‘‘ گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا، بس میں وہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی۔
’’ڈاکٹر یاسمین نے خاص طور پر تاکید کی ہے میڈم کہ آپ کو جانے نہیں دینا...... وہ جونہی فارغ ہوتی ہیں انہوں نے آپ کو کچھ مزید ٹسٹ وغیرہ لکھ کر دینے ہیں۔‘‘ نرس، سارہ کے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آ گئی تھی۔
’’ٹھیک ہے...... ہم انتظار کر رہے ہیں۔‘‘ سارہ نے کہا تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔
’’مجھے اپنے گھر لے چلو سارہ...... میں شدتِ برداشت سے پھٹ جاؤں گی، میں ابھی اپنے گھر نہیں جانا چاہتی۔‘‘
’’ٹھیک ہے...... وہیں چلیں گے۔‘‘ سارہ نے میرے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی، مجھے لگا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔
’’سوری سارہ......‘‘ میں رو پڑی۔ ’’تمہیں خواہ مخواہ میں نے اپنے ساتھ تنگ کیا...... جانے تم نے مجھ سے کیا بات کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔‘‘ مجھے اچانک یاد آ گیا۔
’’کوئی مسئلہ نہیں ہے پیاری، اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی سب سے اہم ہے۔‘‘ اس نے بصد کوشش ایک مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی تھی۔
’’چلو کچھ وقت تو کٹے گا...... تم بتاؤ کہ کیا بات بتانا تھی تم نے مجھے؟‘‘ میں نے سوچا کہ دھیان اسی بہانے کہیں بٹے گا۔
’’کہا ناں کہ وہ بات اتنی اہم نہیں ہے امرت!‘‘ اس نے زور دے کر کہا۔ یقیناً اس کے سابقہ سسرال یا شوہر کی طرف سے کوئی مسئلہ کھڑا کیا گیا ہوگا، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔
’’کیا تم اپنے سابقہ شوہر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہو...... اس سے کوئی بات تو نہیں ہوئی تمہاری؟‘‘ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہی۔
’’ہوں......‘‘ اس نے گہری سانس لی۔ ’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں، جو کچھ بھی ہے اس مسئلے سے اہم نہیں ہے جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے......‘‘ اس نے میری بیماری کے مسئلے کو ہمارا مسئلہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا کہ وہ ہر مشکل میں میرے ساتھ ہے۔
سارہ نے بتایا تھا کہ اس کا سابقہ شوہر اس سے اپنی بیٹیوں کو اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا، مجھے بتاتے ہوئے وہ پُرسوچ انداز میں کہہ رہی تھی کہ جانے کیوں اس کی بیٹیوں کے باپ کے دل میں اب ان کی محبت جاگ گئی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً اس کی کوئی غرض ہوگی مگر کیا غرض ہوگی اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہوا تھا جب تک کہ ڈاکٹر یاسمین کی زبانی علم ہوا تھا کہ اس کے سابقہ شوہر کی دوسری بیوی کے ہاں کوئی اولاد زندہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے پیغام بھجوا رہا تھا کہ قانونی چارہ جوئی سے بچنے کے لیے وہ خود بچیاں اس کے حوالے کر دے، دونوں نہ سہی تو ایک ہی دے دے ورنہ وہ عدالت کے ذریعے اپنی بیٹیاں حاصل کر لے گا......
کیا مضحکہ خیز مطالبہ تھا، جیسے سارہ کے لیے ان میں سے کسی ایک بچی سے دستبردار ہونا اتنا ہی آسان تھا۔ جو وقت زیادہ مشکل تھا وہ تو اس نے گزار لیا تھا۔ شیر خوار اور پاؤں، پاؤں چلتی ہوئی دو بیٹیوں کے ساتھ وہ میکے کی دہلیز پر آ پڑی تھی، باپ تھا نہیں...... ماں کا اپنا وجود بھی بیٹوں اور بھائیوں پر بوجھ تھا تو اس کا وجود اور بھی مانندِ خار آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ ماں کی بے بسی کو محسوس کر کے، اپنی عزتِ نفس کو اپنے ہی وجود میں دفن کر کے وہ اس در پر ناپسندیدہ ہونے کے باوصف بھی پڑی رہی کہ اور کچھ نہیں تو ایک خستہ سے کمرے کی چھت تو میسر تھی۔ اپنی بچیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ملازمت شروع کر دی اور سردی، گرمی میں دو ننھے وجود اپنے ساتھ لیے وہ کس طرح پرنسپل سے بھی سو باتیں سنتی مگر برداشت کرتی۔ اس کی تعلیم اور اچھے وقتوں میں اپنے ابا کے کہنے پر کیے گئے ٹیچنگ سے متعلقہ کورسز کے باعث وہ اپنی فیلڈ میں اس اسکول کی دیگر

اساتذہ سے زیادہ قابل تھی۔

میکے میں بچیوں کو اس نے طرح، طرح سے ترستے اور چھوٹی، چھوٹی چیزوں سے محروم دیکھا مگر اُف تک نہ کی۔ اس کی بچیوں کی عمر تھی مگر انہیں چند گھونٹ دودھ تک نہ پلا سکتی تھی، خود اماں اس گھر میں کسی فالتو شے کی طرح تھیں تو اس کی کیا وقعت تھی۔ اس کے بڑے بھائیوں کے دل اس کے لیے اتنے چھوٹے ہو گئے تھے اور اس کی بھابیاں اپنے بچوں کی اترن اور کھلونے کوڑے میں پھینک دیتیں یا ملازموں کو دے دیتیں مگر اس کی بیٹیوں کی حسرت بھری نگاہیں انہیں نظر نہ آتی تھیں۔ وہ وقت تو انتہائی مشکل اور آزمائش والا تھا جو اس نے گزار لیا تھا، اب اس کے لیے بہتر وقت تھا، ملازمت تھی، بچیاں شہر کے بہترین اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں کیونکہ انہیں ماں کے اس اسکول میں معلّمہ ہونے کے باعث فیس معاف تھی۔

کیا رنگ ہیں اللہ کے بھی، وقت کیا، کیا کروٹیں لیتا ہے۔ جن بیٹیوں کی پیدائش کو اس نے مشیتِ ایزدی نہ سمجھا اور سارہ کو دو بیٹیوں کے پیدا کرنے کے جرم میں اپنے گھر اور زندگی سے نکال کر ایک دوسری عورت کو شوہر نے اپنی زندگی میں وہ مقام دیا تھا جو سارہ کا تھا۔ اب اس سے کوئی اولاد زندہ نہ پیدا ہو رہی تھی تو اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ اس کے کسی عمل کی سزا تھی اور اب وہ اس کا مداوا کرنا چاہتا تھا یا پھر اپنے ہاتھ آئی ہوئی بیٹیوں کو ہی غنیمت سمجھتے ہوئے وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے سارا زور لگا رہا تھا اور اس کے لیے سارہ کو کیا ایذا پہنچتی اس سے اسے کوئی غرض نہ تھی وہ صرف اپنی تسکین چاہتا تھا یا اپنے احساسِ جرم کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''ہاں تو امرت...... ٹھیک ہو تم؟'' ڈاکٹر یاسمین نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی نشست سنبھالتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ''سوری مجھے بہت ایمرجنسی میں جانا پڑا، جونیئر ڈاکٹروں سے صورتِ حال سنبھل نہیں رہی تھی، مریضہ کو اسپتال تک لانے میں گھر والوں نے بہت دیر کر دی تھی، گھر پر ہی دائیوں نے کوشش کر کر کے مریضہ کو موت کے منہ تک پہنچا دیا تھا۔ ایک ماہ پہلے میں نے اس کی ساس کو بتا بھی دیا تھا کہ بچہ آپریشن سے پیدا ہوگا مگر اس کا کہنا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی بچہ آج تک آپریشن سے پیدا نہیں ہوا۔''

''اب تو سب ٹھیک ہو گیا ناں۔'' میں نے اس کی وضاحت پر سوال کیا۔

''جاہل لوگ ہیں......'' اس نے غصے سے کہا۔ ''بہوؤں کی زندگی انہیں مذاق لگتی ہے، اپنی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی۔'' ان کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ''بلکہ پڑھے لکھے لوگوں میں کون سا کم جاہل ہیں، تم اپنی ساس کو ہی دیکھ لو پہلی بار تمہارے ساتھ آئیں کیونکہ انہیں یہ بچہ ضائع کروانا تھا، اس سے تمہاری زندگی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا کیا اور یوں بھی میں ایسے کام نہیں کرتی۔ اس کے بعد سے دیکھ لو کہ تم ہر بار تنہا آتی ہو، وہ دوبارہ تمہارے ساتھ آئی ہی نہیں۔''

''نہیں، وہ پچھلی بار آئی تھیں مگر اس روز میرے ٹسٹ کی رپورٹ نہیں ملی تو انہوں نے آپ سے فون کر کے پوچھا بھی تھا کہ ہمارے آنے کی ضرورت ہے یا نہیں اور آپ نے کہا تھا کہ نہیں۔''

''تم اتنی اچھی ہو کہ ان کے خلاف کچھ سنو گی ہی نہیں...... میں جانتی ہوں تمہیں پیاری لڑکی!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''وہ مریضہ اور اس کا بچہ دونوں ٹھیک ہیں ناں؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔

''ہوں......'' ڈاکٹر یاسمین نے گہری سانس لی۔ ''بہت نازک صورتِ حال تھی، ماں اور بچے میں سے ایک کو بچایا جا سکتا تھا، اس کی ساس کہنے لگی کہ الٹراساؤنڈ کر کے بتائیں کہ بیٹا ہے یا بیٹی تو تب فیصلہ کریں گے کہ ماں کو بچائیں یا بچے کو...... یار کوئی عورت اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے چاہے وہ بدترین ساس ہی کیوں نہ ہو۔'' دانت پیس کر اس نے کہا۔ ''مجھے تو اتنا غصہ آیا کہ کیا بتاؤں، میں نے کہا کہ میں ہر صورت میں ماں کو بچانے کی کوشش کروں گی حالانکہ

اسے بھی تم لوگ نیم مردہ ہی لائے ہو مگر میرا اللہ بڑا بے نیاز ہے...... اور میں آپریشن کے دوران مسلسل اس کی زندگی کے لیے دعا کرتی رہی اور میرے اللہ نے اس بیچاری کو زندگی بخش کر کے بڑا اکرم کیا، بڑی کمزور ہے اور اسے کافی عرصہ لگے گا دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں بھی......''

''اور بچہ۔''

''جب اسے لایا گیا تو ہم جبھی جان گئے تھے کہ بچہ دیر ہو جانے کے باعث مر چکا تھا۔''

''ہاہ!'' میں اور سارہ بیک وقت سسکیں۔

''اب تم جاننا چاہو گی کہ وہ تھا کیا؟'' ڈاکٹر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، میں کیوں جاننا چاہتی کسی اور کے بچے کے بارے میں، میں نے تو آج تک ان سے اپنے بچے کے بارے میں بھی سوال نہ کیا تھا۔ ''جب وہ ایک ماہ پہلے میرے پاس آئی تھی میں تب سے جانتی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہونے والا ہے مگر میں نے خود ہی انہیں نہیں بتایا۔'' وہ رکیں، اس کا مطلب ہے کہ انہیں میرے بچے کی جنس کا بھی علم ہوگا، میرا پیلا پھٹک ہوتا ہوا چہرہ انہوں نے دیکھا ہوگا۔ ''تم ٹھیک تو ہوناں امرت؟''

''ہوں......'' مری ہوئی آواز سے میں نے کہا، وہ میرے ٹھیک ہونے کی توقع کر رہی تھیں۔

''اچھا چھوڑو اس قصے کو!'' سارا قصہ تفصیل سے سنا کر وہ اب قصہ چھوڑنے کی بات کر رہی تھیں۔ ''تو کب ہم تمہارا آپریشن کر سکتے ہیں؟'' ڈاکٹر یاسمین نے سوال کیا۔

''کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟'' میں نے پُرامید نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ آپریشن کے بغیر تم ٹھیک ہو جاؤ گی؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آپ نے کہا ہے کہ اللہ بڑا بے نیاز ہے!'' میں نے انہیں یاد دلایا۔ ''اس لیے میں آپریشن کروانے کے بجائے......''

''میں نے تمہیں تھوڑی دیر پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ ان لوگوں کی بے جا ضد کی وجہ سے اس بچے کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔''

''اس بچے کی زندگی ہی اتنی تھی۔'' میں نے توجیہہ پیش کی۔

''وہ سب باتیں اپنی جگہ درست مگر تم کیا سمجھتی ہو کہ ان لوگوں کے دماغوں پر عمر بھر یہ بوجھ نہیں رہے گا کہ اگر وہ میری رائے مان لیتے تو شاید......''

''ایسا سوچنا تو غلط ہے، شرک ہے......'' میں نے جیسے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم سب کچھ درست کہہ رہی ہو امرت مگر پھر بھی تم بے مقصد ضد کر رہی ہو...... ہو سکتا ہے کہ تمہارے بچے کی جان کو خطرہ ہو اور آپریشن کر کے ہم اسے بچا سکیں...... یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوگا کہ اگر بروقت اس کی جان بچانے کی کوشش کر لی جائے تو وہ بچ سکتا ہے......''

''اللہ نہ چاہے تو کوئی انسان کسی کو زندگی نہیں دے سکتا اور اگر اس کی زندگی لکھی ہے تو کوئی اسے چھین نہیں سکتا۔'' میں اپنی ضد پر قائم تھی۔

''میں یقیناً مجبور کر کے تمہارا آپریشن نہیں کر سکتی مگر تمہیں یہ ضرور سمجھانا چاہتی ہوں کہ آپریشن کرنے کی غرض کیا ہے اور اس کے فوائد کیا ہیں......'' میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی، سارہ اس سارے وقت میں خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ ''ممکن ہے کہ آپریشن کر کے ہم اس عفریت کو نکال لیں اور اس کا ٹسٹ کروائیں تو علم ہو کہ وہ کینسر ہے ہی نہیں۔ اگر وہ کینسر ہے بھی تو اسے نکال دینے سے تمہیں اور بچے کو اس سے محفوظ کیا جا سکتا ہے، اگر یہ کسی ایسی جگہ پر ہے جہاں بچہ محفوظ ہے تو ہم بچہ deliver کریں گے تاکہ اگلے چند ماہ میں بھی اسے اس سے متاثر ہونے کا

خطرہ ٹل جائے۔''

''لیکن بچے کی اس وقت پیدائش سے اس کی زندگی کو اور بھی خطرہ ہے......'' سارہ نے فوراً کہا۔

''خطرہ تو اسے ہر دو صورتوں میں ہے...... رسک تو لینا پڑے گا، ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے، تم گھر جاؤ، سوچو، اپنے شوہر اور ساس سے بات کرو اور مجھے فون کر کے بتا دو تو میں آپریشن کے لیے وقت دے دوں گی تمہیں......'' ڈاکٹر نے کاغذ پر چند نوٹس بنائے اور میرے حوالے کیے۔ ''میں تو تمہیں بہت بہادر اور سمجھدار سمجھتی تھی امرت!'' وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بزدل اور بے وقوف کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''چلتی ہوں میں سارہ......'' میں نے اپنے شکن آلود لباس کو ہاتھوں سے جھاڑ کر درست کیا۔

''تم ریلیکس رہنا پیاری......'' سارہ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل مگر تم فقط یہ سوچو کہ اس سے کچھ برا بھی ہو سکتا تھا۔''

''مثلاً...... اس سے برا اور کیا ہو سکتا تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی بیماری کی بر وقت تشخیص ہو جانا، اس کے علاج کی سکت ہونا اور اس کے لیے آپ کو بہترین ڈاکٹر کا میسر ہونا...... سب اچھا ہی تو ہے امرت!'' اس نے رسان سے کہا۔ ''کیا ہوتا اگر کبھی تمہیں کوئی درد نہ ہوتا یا ہوتا اور کوئی عام ڈاکٹر تمہیں صرف درد دور کرنے کی دوائیں دے دیتی...... جس طرح ڈاکٹر یاسمین کو ایک شبہ ہوا اور انہوں نے اس کی جانچ کے لیے تمہیں ٹسٹ لکھ کر دیے اور ہمیں بر وقت علم ہو گیا کہ کیا بیماری ہے...... اس سے بچے کو کیا خطرات ہیں اور یہ کہ اس کو deliver کروانے کا آپشن بھی ہے۔''

''یہ سب کچھ اتنا ہی آسان ہے ناں جیسے سارہ......'' میں نے یاسیت سے کہا۔ ''یہ گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا کہ وہ بچہ زندہ پیدا ہوگا......'' میں نے دل کی گہرائی میں درد کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا۔ ''اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وہ اس موذی مرض سے متاثر ہوگا یا نہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا......'' اس نے مجھے اپنے ساتھ بھینچا۔ ''اللہ سے ہم اچھا گمان کریں تو وہ سب اچھا ہی کرتا ہے۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے......'' میں نے مسکرانے کی ناکام سعی کی۔

''بس اب اپنا چہرہ ٹھیک کرو اور جاؤ!'' اس نے میرے گال تھپتھپائے۔

''ایک کام میرے ساتھ بہت اچھا ہوا ہے سارہ......'' میں نے جواباً اس کے ہاتھ کو دبایا۔

''وہ کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میری زندگی میں تمہارے جیسی پیاری دوست کا ہونا!'' میں نے پوری سچائی سے کہا۔

''میرے ساتھ بھی یہی اچھا ہے بس امرت!'' اس نے ہنس کر کہا تو میں بھی ہنس دی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو چاچو اور ماما لاؤنج میں بیٹھے تھے، میں نے سلام کیا تو چاچو نے کہا کہ میں وہیں آ جاؤں۔ میں ان دونوں کے پاس بیٹھی تھی، میں نے گاؤں کے حالات پوچھے اور اموجان کی خیریت خاص طور پر پوچھی، دل اندر سے تکلیف میں تھا تو میں انہیں یاد کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں بیٹی کو ماں سے زیادہ ہمدرد اور کون نظر آتا تھا۔

''بھئی لگتا ہے کہ تم عائشہ بھابی سے بہت اداس ہو؟'' چاچو نے سوال کیا۔

''ہوں تو......''

''تو تم ساتھ چلی جاتیں۔'' انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

''وہ چاچو سفر سے تھکاوٹ ہو جاتی ہے......'' جی میں آیا کہ ان سے کہوں کہ میرا دل تو مچلا تھا مگر کسی نے پوچھا ہی نہیں۔
''بھابی بھی تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں......'' ماما نے بتایا، ان کے کہنے سے آنسو آنکھوں کے کناروں میں تیرنے لگے۔ ''تو ہمارے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں ناں ماں بیٹی کی ملاقات کروادی جائے۔'' یقیناً وہ سوچ رہی ہوں گی کہ وہ مجھے گاؤں بھجوادیں۔
''میں ٹھیک ہوں ماما......'' میں نے خود کو سنبھالا۔
''کیوں تم اپنی موجان سے نہیں ملنا چاہتیں؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔
''کوئی بات نہیں ماما...... جب وہ آئیں گی تو......'' میں ہچکچائی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کی کس ادا میں کیا راز ہوتا تھا۔
''وہ تو جانے کب......'' وہ رکیں۔ ''تم بتاؤ تم ان سے ملنا چاہتی ہو کہ نہیں؟'' ماما کے لہجے میں شرارت تھی، میں ان کی حسِ مزاح کو سمجھ نہ سکی تھی کیونکہ میرا اور ان کا رشتہ ایسا نہ تھا۔
''تو ہم نے سوچا کہ ہماری بیٹی تو ہمیں کبھی نہیں بتائے گی کہ وہ اپنی اموجان سے اداس ہے......'' چاچو نے مداخلت کی۔ ''ہم اپنی بیٹی کی اداسی کا سوچ کر......'' ان کی بات ادھوری ہی تھی کہ میں 'اموجان' کہتے ہوئے چیخ کر اٹھی تھی۔ اموجان ڈائننگ کی طرف سے برآمد ہوئی تھیں، انہیں ماما نے وہاں چھپا رکھا تھا اور اب شاید ان سے بھی اس سے زیادہ صبر نہ ہوا تھا۔
''آپ کیسے آ گئیں؟'' میں ان سے لپٹ گئی۔ میرے اللہ نے کیسے اس وقت میرے دل کی سن لی تھی کہ مجھے اس وقت ان کی ضرورت تھی۔ وہ تو سب جانتا تھا یقیناً۔
''تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے لیے گھر سے نکلنا کتنا مشکل ہے مگر میں زیبا اور خاص طور پر حسنہ کے اصرار کے سامنے انکار نہ کر سکی...... میں نے کہا بھی کہ ایک ہی دفعہ آؤں گی مگر ان دونوں کی رٹ تھی کہ اس میں ابھی بہت وقت ہے۔''
''آپ نے بہت اچھا کیا اموجان!'' میں نے ان سے لپٹے، لپٹے کہا۔ ''بلکہ ماما اور حسنہ نے بہت اچھا کیا کہ ضد کر کے آپ کو ساتھ لے کر آ گئیں......'' مجھے فوراً احساس ہوا کہ اس کا کریڈٹ ماما اور حسنہ کو دینا ضروری تھا، حالانکہ مجھے خود یہ بات اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہوئی تھی کہ وہ دونوں اصرار کر کے اموجان کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔
''چلو بھئی...... سب نے کریڈٹ لے لیا، ہمارا کوئی ذکر ہی نہیں۔'' چاچو نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔
''آپ کو کس بات کا کریڈٹ دیں بھئی؟'' ماما نے ابرو اچکائے۔
''گاڑی میں چلا کر لے کر گیا تھا...... بھابی کو میں نے منایا!'' چاچو نے فخر سے کہا۔
''ہاں بھئی آپ ہی کی بھابی ہیں تو آپ ہی کہنے سے مانتیں ناں!'' ماما نے اسی انداز سے کہا جو اُن کا خاصہ تھا۔ چاچو جھینپ گئے۔
''میں تو اپنی بیٹی کے کہنے پر آئی ہوں۔'' ماموں نے سب کو شرمندگی سے بچایا۔ حسنہ اتر آگئی جو کہ ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اموجان کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں اموجان سے اس کی اس محبت کے مظاہرے پر...... بے ہوش ہوتے، ہوتے بچی۔
''سب ٹھیک ہیں گاؤں میں اموجان؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔
''سب ٹھیک ہیں بیٹا...... سرمد نے اپنے بیٹے کا نام احمد رکھا ہے۔''
''اچھا...... بہت کیوٹ ہوگا ناں!'' میں نے بے ساختگی سے سوال کیا تو سب نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

''میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی امو جان!'' رات سونے کے لیے ہم اپنے کمرے میں آئے تو میں نے ان سے لپٹ کر کہا۔

''میں بھی ہر وقت تمہیں یاد کرتی ہوں بیٹا...... تم میری ہر وقت کی دعاؤں میں ہو۔'' انہوں نے میرے بالوں پر بوسہ دیا۔ ''اللہ تمہاری ساری مشکلات آسان کرے اور پریشانی سے بچائے۔''

''شکریہ امو جان!'' میں نے کہا۔

''تمہاری طرف سے بہت پریشانی ہوتی ہے......''

''کیوں امو جان؟'' میں نے ان کا چہرہ کھوجا۔

''پتا نہیں کیوں ...... دل میں عجیب، عجیب سے وہم آتے ہیں تمہاری طرف سے۔'' انہوں نے کھوئے، کھوئے انداز میں کہا۔

''کیا عجیب وہم امو جان؟''

''سب ٹھیک ہے ناں تمہارے ساتھ...... ڈاکٹر کیا بتاتی ہے؟'' انہوں نے بات بدلی۔

''سب ٹھیک ہے امو جان!'' میرے حلق میں کچھ پھنسا۔ من میں آیا کہ انہیں بتاؤں مگر وہ اسی روز تو پہنچی تھیں، میں فوری طور پر انہیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ جس پریشانی کی کیفیت سے میں دوچار ہوئی تھی اسے وہ برداشت نہ کر پاتیں شاید۔ ''آپ مجھے سنائیں کمیل کی نئی شرارتوں کے بارے میں، فاطمہ کیسی ہے، شامیر کا کوئی اتا پتا!''

''سب ٹھیک ہیں پیاری...... کمیل تو اب بہت تیز ہو گیا ہے، شرارتی بھی!'' انہوں نے تصور میں اسے دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ ''فاطمہ بھی ٹھیک ہے، کمیل کے ساتھ ہلکان ہوتی رہتی ہے، دھان پان سی تو ہے وہ خود بھی!'' انہوں نے بتایا۔ ''شامیر سے بہت کم رابطہ ہے، جب کبھی اس کے پاس وقت اور فون ہو تو بات ہو جاتی ہے، ہمارے پاس کوئی طریقہ اس سے رابطے کا نہیں ہے۔''

''اللہ اسے اپنی امان میں رکھے امو جان......'' میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ''میں اس کی طرف سے متفکر رہتی ہوں۔''

''دعا کیا کرو تم اس کے لیے...... بہن ہو اس کی اور اس حالت میں تو عورت کی دعائیں اور بھی زیادہ قبول ہوتی ہیں۔''

''تمنا نے چکر نہیں لگایا گاؤں کا؟'' ان کے کہنے پر مجھے خیال آیا۔ ''امید ہے کہ وہ خوش ہو گی اپنے گھر میں...... نہ کوئی دیور نہ نند، اکلوتی نند بھابی بن گئی ہے...... راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''

''کیوں بیٹا...... دیور اور نندیں کیا مسئلہ ہوتی ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہم نے تو عمر بھر انہیں اپنے بہن بھائیوں کی طرح سمجھا، تم اپنے دیوروں کو دیکھ لو، کیسے بے ضرر ہیں اور ایک نند تمہاری بیاہی ہوئی اور اپنے گھر کی ہے، اس کی کوئی دخل اندازی نہ مسئلہ اور حسنہ اس سے بڑھ کر پیار کرنے والی لگتی ہے، زیبا کی کایا کلپ پر بھی میں حیران ہوں کہ کس طرح بدل گئی ہے۔''

''ان کے بدلنے پر تو میں بھی حیران ہوں ......'' میں نے کہا، دل میں آیا کہ انہیں زائنہ کے بارے میں بتاؤں اور اپنے خدشے کا اظہار کروں کہ ماما اور حسنہ کا بدلا ہوا رویہ کسی خطرے کا پیش خیمہ نہ ہو مگر خاموش رہی کہ انہیں پریشان نہ کروں۔

''تم بتاؤ سب ٹھیک ہے ناں؟''

''جی امو جان...... آپ بتائیں، آپ کی اپنی صحت کیسی ہے؟''

''ہاں میں بھی بالکل ٹھیک ہوں...... یہ کچھ رقم کبیر نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔'' انہوں نے اپنے پرس میں

سے ایک لفافہ نکال کر مجھے تھمایا۔
''یہ تو بہت بھاری ہے امو جان!'' میں نے لفافہ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس کے اندر جھانکا، سارے براؤن نوٹ تھے''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' میں تقریباً چلائی۔
''کوئی بڑی رقم نہیں ہے، بیٹیوں کا حق ہوتا ہے..... اس سے تم اپنے بچے کی شاپنگ کرلو۔''
''شاپنگ تو ماما نے کر بھی لی ہے امو جان!''
''کیا؟'' میری بات پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔
''جی!'' میں نے ہنس کر کہا۔
''بچہ تو ٹھیک ہے ناں؟''
''کون سا بچہ؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''تمہارا بچہ امرت...... اور کون سا بچہ؟'' ان کے یوں کہنے پر میری ہنسی نکل گئی، آنکھیں لبریز ہوگئیں۔ امو جان مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔
''تم رو رہی ہو؟'' ماں تھیں کیونکر نہ میری آنکھوں میں نمی دیکھ پاتیں۔
''ارے نہیں امو جان...... ہنس، ہنس کر آنکھوں میں آنسو آ گئے!'' میں نے بازو سے رگڑ کر آنکھیں صاف کیں۔
''امرت کسے بے وقوف بنا رہی ہو تم!'' انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔
''تمنا کہہ رہی تھی کہ وہ میرے بچے کی پیدائش پر آ کر کچھ دن میرے پاس رہے گی۔'' میں نے ان کی بات کا نوٹس ہی نہ لیا تھا۔
''زین کا رویّہ اب کیسا ہے؟'' انہوں نے بھی میری بات کو نظر انداز کیا۔ ''وہ ہے کہاں، اس سے تو آج ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''
''آپ کو نیند نہیں آ رہی امو جان!'' میں نے ان کی بات ان سنی کر دی۔
''چلو تم بھی اب سو جاؤ!'' انہوں نے لیٹ کر کروٹ بدل لی، میں ان کے پاؤں کی طرف تکیہ رکھ کر آہستگی سے لیٹ گئی۔ ہم دونوں جانتی تھیں کہ ہم سو نہیں رہی تھیں، کمرے میں ایسی خاموشی تھی کہ کلاک کی سوئی کی حرکت کی آواز بھی تیز لگ رہی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، امو جان بھی نہیں سو پا رہی ہوں گی۔
''آپ کو کیا لگتا ہے امو جان...... ماما کا رویّہ کیوں تبدیل ہو گیا ہے...... یوں چند ہفتوں سے کہ یقین ہی نہیں آ رہا۔''
''زندگی میں آنے والی اچھی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے...... ان پر خواہ مخواہ میں گمان کرنا ٹھیک نہیں۔'' ان کی طرف سے جواب آیا۔ ''سو جاؤ تم اور دعا کیا کرو کہ جس طرح اس نے اس گھر کے باقی لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے نرمی پیدا کی ہے اسی طرح زین......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''سو جاؤ اب تم، رات کافی ہوگئی ہے!'' اب ان کی خاموشی سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی سونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

☆☆☆

کمیل سوتے میں اپنے بیڈ پر سے گر گیا تھا...... سویرے، سویرے امو جان کو خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہو گئیں، ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ کبیر بھائی اور فاطمہ کو بے پروا کہہ رہی تھیں۔ کبیر بھائی اور فاطمہ نے خود تو انہیں بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ تو تمنا نے امو جان کو کال کی تو اس نے یہ جانے بغیر کہ امو کہاں ہیں، ان سے سوال کیا کہ کمیل کے ٹانکوں کا کیا حال تھا اور اس کا بخار کیسا تھا۔ وہ لاعلم تھی کہ امو جان اچانک اسلام آباد آ گئی تھیں اور انہیں اس حادثے کے بارے میں علم ہی نہ تھا۔ امو جان کے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ واپس جانے کو....

جدید صحافت کے بانی جناب ضیا شاہد چیف ایگزیکٹو خبریں گروپ کی تہلکہ خیز کتب

ضیا شاہد کے قلم سے 4 معرکہ خیز کتابیں

امی جان

باتیں سیاستدانوں کی

پاکستان کے خلاف سازش

گاندھی کے چیلے

(1): "امی جان" (قیمت) 500

(2): "باتیں سیاستدانوں کی" (قیمت) 1,200

(3): "پاکستان کے خلاف سازش" (قیمت) 800

(4): "گاندھی کے چیلے" (قیمت) 800

(5): "ہنستا کھیلتا عدنان" (قیمت) 1,000

زیرِطبع۔ جلد آنے والی کتابیں

● قلم چہرے (صحافیوں کے تذکرے) ● نور جہاں اور دلیپ کمار

ہر اچھے بک سٹال پر موجود ہیں۔ ہاکر یا قریبی لائبریری سے حاصل کریں۔

نہ ملنے کی صورت میں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ سے حاصل کریں۔

0300-0515101/0333-4393422/03008422518/0321-4552371

qalamfoundation3@gmail.com

ایجنسی ہولڈرز۔

● خزینہ علم و ادب اردو بازار لاہور 042-37314169

● بک ...

بے تاب ہو گئیں۔ چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ پہنچی تھیں اور انہیں دیکھ کر میں نے دل میں شکر کی سانس لی تھا کہ کوئی تو ہمدرد اور غم گسار اس مشکل وقت میں ملا۔ میں نے فوراً کبیر بھائی کو کال کی، کمیل کی خیریت پوچھی اور انہیں بتایا کہ اموجان فوراً واپس آنا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے فون کر کے اموجان سے بات کی اور تسلی دی اور ان سے چند دن ٹھہرنے کو کہا، اموجان گھبراہٹ میں جانے کیا، کیا کہہ رہی تھیں۔

''اموجان کیا ہم میں سے کسی کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا کبھی؟'' میں نے اس وقت ان کی کال میں مداخلت کی جب وہ کبیر بھائی اور فاطمہ کو سخت سست اور جانے کیا، کیا کہہ رہی تھیں۔

''تم فوراً مجھے گاڑی بھیجو بیٹا...... '' انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ ''امرت سے مل لیا، اب دوبارہ آ جاؤں گی جب وقت آئے گا!'' انہوں نے جانے جواب میں کیا کہا تھا۔ ''بس کہہ دیا ناں ایک بار کہ مجھے گاڑی بھیجو، میں جمال یا اس کے گھر میں سے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتی اس لیے کہہ رہی ہوں۔'' وہ رکیں۔ ''ورنہ میں خود گاڑی کرایے پر لے کر آ جاؤں گی۔'' کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ اموجان کا وہ لہجہ جس سے ہم سب کی جان فنا ہوتی تھی تو کبیر بھائی کیوں نہ پہنچتے۔ انہیں پہنچنے میں اتنا ہی وقت لگا تھا جتنا سفر میں لگ سکتا تھا۔

☆☆☆

''ارے بھابی!'' ماما نے اموجان کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''ایسے کیسے جا سکتی ہیں آپ؟''

''کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے بھابی!'' چاچو نے بھی اصرار کیا۔ ''اس بچے کے والدین اس کے پاس ہیں، اس سے زیادہ آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟''

''یہ تو جس پر بیتتی ہے جمال، اسی کو علم ہوتا ہے...... میری تو جان ہے اس بچے میں، میں تم لوگوں سے تب پوچھوں گی جب تم لوگوں کا کوئی پوتا یا نواسہ...... '' وہ رکیں، بدحواسی میں ان کے منہ سے ایسی بات نکل گئی جو وہ کبھی نہ کہتیں۔

''چلیں بھابی، جیسی آپ کی خوشی، اللہ اسے جلد صحت یاب کرے اور ہم دوبارہ آپ کو لینے آ جائیں گے۔''

عام حالات میں اموجان کی طرف سے ایسی سخت بات کے جواب میں ماما سے ایسے نرم لہجے کی توقع نہ تھی، ایسی بات پر تو وہ بپھر جاتیں مگر انہوں نے تو جیسے ان دنوں مجھے حیران کرنے کا ٹھیکا لیا ہوا تھا۔

''میں آ جاؤں گی خود جب ضرورت ہو گی۔'' اموجان کا لہجہ پریشانی کی وجہ سے روکھا سا ہو گیا تھا۔

''آپ کا واپس جانا اتنا ضروری تھا تو آپ نے وہاں سے کبیر کو کیوں بلوایا، میں یا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آتے۔'' چاچو نے بھی ناراضی سے کہا۔

''مجھ سے رہا نہیں گیا...... مجھے واپس لازمی جا کر بچے کو دیکھنا ہے۔''

''آپ ڈاکٹر ہیں کیا جو آپ کا بچے کو دیکھنا اتنا ہی لازمی ہے؟'' چاچو کے یوں کہنے پر ہر کسی کی ہنسی نکل گئی۔

''ہاں ہوں میں ڈاکٹر!'' انہوں نے غصے سے تپتے ہوئے کہا۔ نکلتے ہوئے وہ مجھے ملنے لگیں تو میری آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''اوہوں...... یوں نہیں روتے کسی کو رخصت کرتے وقت، ہنسی خوشی الوداع کہو!'' ماما نے میرا سر تھپکا تو میرا دل چاہا کہ میں ان سے لپٹ کر رو دوں۔ پوتے کی محبت میں اموجان کو میری آنکھوں میں دکھ اور تکلیف کی تحریر نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

''جلد آ جاؤں گی میری جان!'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم اداس یا پریشان نہ ہونا، اللہ سب خیر کرے گا۔''

''میں مر بھی رہی ہوتی تو آپ کمیل کا سن کر یونہی چل دیتیں۔'' میں نے دل میں آنے والی سوچ کو زبان پر نہ

آنے دیا تھا۔ شاید میں ان کی اپنے بیٹے اور پوتے سے محبت سے جل رہی تھی۔

☆☆☆

اپنے بستر پر تنہا کروٹیں بدلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کیا میں جلد مرنے والی ہوں۔ زین شام کی چائے کے بعد دوستوں کی طرف جانے کا کہہ کر نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا، اسے علم نہ تھا کہ میں تنہا تھی کیونکہ اس کے سامنے تو اموجان تھیں۔ گھر والوں کو بھی شاید علم نہ ہوگا کہ میں مہمان خانے میں تنہا ہوں، جو میں یہاں درد سے تڑپتے ہوئے تنہا مر جاؤں تو ان سب کو تو سویرے ہی علم ہوگا ناں! میں سوچ کر سسکی۔ اپنا فون چیک کیا کہ شاید زین نے کال کی ہو کہ وہ لیٹ آئے گا اور میں نے کال مس کر دی ہو مگر کوئی کال تھی نہ پیغام۔

فاطمہ کو کمیل کے بارے میں پوچھنے کے لیے پیغام بھیجا۔ کوئی جواب نہ آیا، وہ غالباً سو گئی ہوگی۔ گاؤں میں تو رات جلد اترتی ہے۔

تمنا کو خیریت دریافت کرنے کا پیغام بھیجا تو جواب میں اس نے کال کر دی۔ میں نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی، وہ میری بھیگی ہوئی آواز سے جان جاتی کہ میں رو رہی ہوں۔ ”تم ٹھیک تو ہو ناں میری جان؟“ اس کا تشویش بھرا سوال آیا۔

”ہاں...... کیوں؟“ میں نے جواب بھیجا۔

”اپ سیٹ لگ رہی ہو؟“ واہ میری پیاری...... وہ تو یوں جیسے میرے دل میں جھانک رہی تھی۔ اموجان کی نظر نے میرے چہرے میں وہ کیوں نہیں دیکھا جو تمنا نے میرے کال نہ اٹھانے پر محسوس کر لیا تھا۔

”اپ سیٹ! وہ کیوں، اپ سیٹ کیوں ہوں گی بھلا میں؟“

”پتا نہیں کیوں...... رات کے اس پہر پیغام بھیجنا، ایسا عموماً ہوتا تو نہیں!“ اس کا جواب آیا، میں نے فون پر ہی وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔

”اوہ سوری تمنا...... نیند نہیں آ رہی تھی اور میں نے وقت دیکھے بغیر تمہیں پیغام بھیج دیا!“

”زین بھائی کہاں ہیں؟“

”سو رہے ہیں۔“ میں نے جھوٹ لکھا۔

”نیند نہیں آ رہی تو انہیں اپنے ساتھ جگاؤ ناں!“ اس نے پیغام کے آخر میں اسمائلی کی تصویر بھیجی۔ ”ویسے طبیعت ٹھیک ہے تمہاری، کہیں درد تو شروع نہیں ہو گیا...... مگر اس میں تو بہت وقت ہے ابھی۔“ وہ یکے بعد دیگرے پیغام بھیجے جا رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، سو جاؤ تم!“ میں نے اسے آخری پیغام بھیجا۔ سارہ کو پیغام بھیجنے کا سوچا مگر پھر رک گئی کہ وہ بھی سو رہی ہوگی۔

گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور پھر مہمان خانے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز۔ میں نے فون کو پاور ڈ آف کیا اور کروٹ بدل کر سوتی بن گئی، دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں کبھی بھی اچھی اداکارہ نہیں رہی۔ اگر زین میرے چہرے کی طرف آ کر دیکھ لیتا تو فوراً جان لیتا کہ میں سونے کی ناکام اداکاری کر رہی تھی۔

کمرا اندر سے لاکڈ تھا مگر اس کی ایک چابی زین کے پاس تھی، کمرے کے لاک میں چابی گھمانے کی آواز آئی پھر دروازہ عقب میں بند کر کے کمرے میں زین کے چلنے کی، کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب آن رہتا تھا، زین قدم گھسیٹ کر چل رہا تھا، بیڈ پر وہ دھپ کر کے یوں بیٹھا جیسے گرا ہو۔

”سو رہی ہو یا سوتی بن گئی ہو؟“ اس کی آواز معتدل نہ تھی، وہ پیے ہوئے لگ رہا تھا تو پھر وہ اس حالت میں گاڑی کیسے چلا کر گھر پہنچا تھا؟ میں نے سوچا۔ ”اگر جاگ رہی ہو تو اس طرف منہ کرو، مجھے تم سے کوئی بہت ضروری

بات کرنی ہے۔'' میں بے حرکت اسی کروٹ لیٹی رہی۔ ''لگتا ہے سو رہی ہے سالی!'' میرے وجود میں ایک جوار بھاٹا اٹھا، بہت برداشت کرلیا۔ میں نے فون ہاتھ میں لیا اور بیڈ کے نیچے بازو لٹکا کر اسے آن کیا، اس کی روشنی سے وہ جان جاتا کہ میں جاگ رہی ہوں، اس لیے میں نے اسے قالین پر الٹا رکھ دیا۔

''چل بھئی زین اٹھ کر کپڑے بدل لے، یہ تو پتا نہیں سو رہی ہے یا مر مرا گئی ہے!'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈریسنگ روم میں گیا تو میں نے فوراً ماما کا نمبر ملایا۔

''تم ٹھیک ہو امرت؟'' ان کے لہجے میں گھبراہٹ اور آواز میں ہکلاہٹ تھی، جو نیند سے جاگنے کے باعث خاصی نمایاں تھی۔

''آپ فوراً آئیں......'' میں نے ہولے سے کہا اور فون بند کر دیا۔ چند منٹوں میں وہ ہانپتی ہوئی پہنچیں۔ انہوں نے اپنے نائٹ سوٹ کے اوپر ہی ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔

''کیا ہوا امرت......؟'' میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اپنے کپڑے ڈریسر سے لے کر غسل خانے چلا گیا تھا اور اندر سے اس کے اونچا، اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''سن لیں آپ!'' میں نے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہوا......نہا رہا ہوگا۔''

''ماما وقت دیکھیں...... یہ ابھی گھر آیا ہے اور اس نے پی رکھی ہے، جانے گاڑی بھی کس طرح چلا کر آیا ہے جو راستے میں کوئی حادثہ ہو جاتا تو۔''

''تم نے تو میری جان ہی نکال دی ہے امرت...... میں سمجھی کہ تمہیں اسپتال جانا ہے اس لیے تم نے مجھے رات کے اس پہر کال کی ہے...... تمہارا خاوند ہے اسے تم نے ہی سنبھالنا ہے۔ اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی بات بات پر شکایت نہیں کرتیں۔ تمہیں کوئی کمی ہے کیا اس گھر میں؟ پی کر آیا ہے بے وقوف، میں صبح اس سے بات کروں گی کہ ایسی حالت میں گاڑی نہ چلایا کرے۔'' ان کی اس بات کے دوران ہی وہ باہر نکلا، تولیے سے بال رگڑتا ہوا۔

''آپ اس وقت اس کمرے میں کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے ماما کو دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

''کس وقت آئے ہو تم؟'' اس کا سوال نظر انداز کر کے انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''شراب پی کر گھر لوٹے ہو تم؟''

''ہوں......تو اس نے آپ سے شکایت کی ہے میری، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ جاگ رہی ہے، سونے کی اداکاری کر رہی ہے۔''

''جو بات میں پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دو!'' ماما نے غصے سے سوال کیا۔

''آپ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ میں گھر کیوں آ گیا، شراب پی کر مجھے وہیں رہنا چاہیے؟''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک تھپڑ کس کر لگاؤں تمہیں اور تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔'' ماما نے کہا۔

''یہ تھپڑ تم نے پہلی بار یہ جان کر لگایا ہوتا کہ یہ شراب پیتا ہے تو دوسری بار...... اس کی جرأت نہ ہوتی۔'' چاچو جانے کب سے کھڑے ساری گفتگو سن رہے تھے۔ ماما اور زین کے رنگ فق ہو گئے۔

''وہ......وہ، میں!'' ماما کی گفتگو بے ربط تھی۔

''میں پیاس کی وجہ سے جاگا تو تمہیں بستر پر نہ پایا، تمہارا فون بیڈ پر پڑا تھا، اسے دیکھا تو رات کے اس پہر امرت کی کال دیکھ کر میں سمجھا کہ اس نے تمہیں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے بلایا ہے، میں تو یہ سوچ کر آ گیا کہ شاید اسپتال جانا ہوگا اور یہاں یہ قصہ چل رہا ہے۔''

''کہاں سے آ رہے ہو تم رات کے اس پہر آوارہ گردی کر کے، کون سے دوست ہیں تمہارے جو نشے میں

وحشت کر کے رات کے اس وقت تنہا گاڑی چلا کر لوٹنے کو کہتے ہیں، جن کا اپنا کوئی دین ایمان ہے نہ انہوں نے تمہیں کسی قابل چھوڑا ہے۔'' چاچو نے باقاعدہ اس کا گریبان پکڑ کر سوال کیا تھا۔

''کیا کر رہے ہیں...... جوان اولاد کو یوں......'' ماما نے چاچو سے اس کا گریبان چھڑوانے کی کوشش کی، وہ خود تو شاید شاک میں تھا۔ نہا کر اس کا نشہ تو ہرن ہو گیا تھا مگر چاچو کی یوں انٹری نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔

''کیا جوان اولاد کو؟'' چاچو نے اس کا گریبان چھوڑنے کے بجائے اسے مزید جھنجوڑا۔ ''اور تم یہ سب ہمیشہ سے جانتی ہو...... تم نے بھی اس کے اعمال پر چشم پوشی کی، مجھے بتایا تک نہیں امرت!''

''میں نے ماما کو بتایا تھا چاچو!'' اب مجھ میں ہمت آ گئی تھی، زندگی اور موت کا خوف تو یونہی ختم ہو گیا تھا۔

''ہونہہ...... ایسی ماں تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہو گی جو اپنی اولاد کو برائی کی دلدل میں اترتے دیکھ کر خوش ہوتی ہو گی، اس کی برائیوں اور عیوب سے چشم پوشی کرتی ہو گی۔''

''میں اسے سمجھاتی ہوں جمال......'' ماما گھگیائی تھیں۔

''میں نے تو اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی محبت میں اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے خاندان میں شادی نہ کی تو میں اسے عاق کر دوں گا۔ مگر جو مجھے اس کا علم ہوتا تو میں خاندان کی کسی لڑکی کو برباد نہ کرتا بخدا!'' چاچو سکتے تھے۔ ''تم جانتی تھیں تو تم مجھے روک لیتیں؟''

''مجھے پہلے علم نہیں تھا، شادی کے بعد امرت نے ہی بتایا تھا۔'' ماما صاف جھوٹ بول رہی تھیں۔

''میں اپنے مرے ہوئے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا، میں نے اپنا شرابی اور بدکردار بیٹا ان کی خوب صورت، ذہین اور انتہائی سلجھی ہوئی بیٹی کے سر منڈھ دیا۔''

''کیا ہو گیا ہے جمال...... آپ اپنی طبیعت یوں سوچ سوچ کر خراب نہ کریں، امرت خوش ہے، دیکھیں اللہ انہیں اولاد سے بھی نوازنے والا ہے، بچے آتے ہیں تو میاں بیوی کے تعلقات بھی مضبوط ہوتے ہیں اور مرد اپنی خراب عادتیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔'' ماما نے انہیں بازوؤں سے تھام کر زین کو ان سے چھڑوایا تھا۔

''کیا نام تھا اس لڑکی کا جس کے ساتھ تم شادی کرنا چاہتے تھے...... اس کی شادی ہو گئی ہے کہ نہیں؟'' چاچو نے زین کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی نہیں ہوئی......'' اس نے ڈرے، ڈرے لہجے میں جواب دیا۔

''ہو گی بھی نہیں...... بیٹھی ہو گی وہ اب بھی تمہاری آس پر!'' وہ غصے سے بولے۔ ''ملتے ہو تم اب بھی اس سے؟''

''وہ پاپا......'' زین منمنایا۔ ''وہ!''

''وہ پاپا وہ کیا؟'' وہ چیخے...... ''اب بھی تم اسی بے حیا لڑکی کے پاس سے آ رہے ہو گے ذلیل انسان!'' چاچو کا یہ لہجہ میں نے کب سنا تھا اور ان کا یوں غصے سے لال ہوتا چہرہ۔

''جانے دیں ناں اس وقت جمال...... امرت سو تم لوگ بیٹا۔'' ماما نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

''اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تمہارا باپ ہوں...... تم میرے باپ نہیں ہو، بے شرم!'' کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔



''آپ سے بات کرنا تھی بھابی!'' یوسف میرے پاس آیا تھا۔ میں نے دوپٹے کو نماز کے بعد اسی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

''آؤ بیٹھو!'' میں نے مہمان خانے کے ٹی وی لاؤنج میں اسے بٹھایا، اسی میں ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا۔ ''میں چائے بنانے والی تھی، پیو گے؟''

''میں چائے نہیں پیتا..... البتہ اگر دودھ ہے تو وہ پی لوں گا!'' اس نے ہولے سے کہا۔
''یہ تو بہت اچھی بات ہے ورنہ آج کل کے نوجوان کہاں دودھ پیتے ہیں، کچھ وزن کم کرنے کا شوق اور کچھ یہ کہ دودھ پینا شاید پینڈوپن کی علامت ہے۔''
''دودھ پینا تو سنتِ نبوی ﷺ ہے بھابی!'' اس نے فوراً میری بات کاٹی۔
''ہاں بھئی وہ تو ہے..... تو تم سنت نبوی ﷺ کی تقلید میں دودھ پیتے ہو، یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' میں نے اس کے لیے دودھ گرم کرنے کے لیے رکھا، پلیٹ میں چند بسکٹ رکھے اور اپنی چائے بھی کپ میں انڈیل کر ٹرے میں رکھی اور اسے اٹھانے ہی لگی تھی کہ وہ لپک کر آیا اور ٹرے مجھ سے لے لی۔
''آپ بیٹھیں، میں لے کر آتا ہوں۔''
''سنت کی تقلید تو کرتے ہو اچھی بات ہے مگر فرائض بھی پورے کرتے ہو یا نہیں؟'' میں نے سوال پوچھا۔ میں نے اس گھر میں کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
''پہلے نہیں پڑھتا تھا، اب پوری کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے سچائی سے کہا۔
''اچھی بات ہے..... کوشش کرو اور ہر نماز کے ساتھ قضا نمازیں اور نوافل وغیرہ پڑھ کر اپنی نہ پڑھی ہوئی نمازوں کا ازالہ کرنے کی کوشش بھی کیا کرو۔''
''جی وہ بھی کرتا ہوں۔''
''یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یوسف!'' میں نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے چہرے پر بھورے بالوں کی داڑھی بھی تھی، جو ابھی ہلکی تھی مگر لگ رہا تھا کہ اس نے عرصے سے شیو نہیں کی تھی۔ ''داڑھی بھی رکھ لی ہے تم نے؟''
''رکھی تو ہے مگر پاپا اس کے پیچھے ہیں، ہر وقت ٹوکتے ہیں کہ کیا میں مولویوں والا حلیہ بنا کر پھرتا ہوں۔'' اس نے شکایت کی۔
''اتنا اچانک انسان تبدیل ہو جائے تو دیکھنے والے یونہی محسوس کرتے ہیں۔'' میں نے اسے تشفی دی۔ ''تم سناؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے، امتحان کب ہیں اور اب تمہیں میتھس سمجھ میں آتا ہے کہ نہیں؟'' وہ میتھس میں کمزور تھا اور گزشتہ برس فیل ہو جانے کے باعث ایک سال ضائع کر کے سارے مضامین کا دوبارہ اس سال امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔
''میرا تو اب پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا بھابی!'' اس نے دبے سے لہجے میں کہا۔
''تمہیں مجھ سے کیا بات کرنا تھی یوسف؟'' میں نے کچھ یاد آنے پر اس سے سوال کیا۔ اس کا یہ کہنا کہ اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا، ایک ایسی صورتِ حال تھی جس سے میں کنی کترانا چاہتی تھی، جانے وہ بھی کسی ایسی سرگرمی میں تھا کہ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہو سکتا تھا اور میں وہ جان کر اس میں فریق نہیں بننا چاہتی تھی۔
''میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا بھابی!'' اس نے رک کر گہری سانس لی۔ دودھ کا گلاس خالی ہو گیا تھا اور میری چائے کا مگ بھی، اس نے دونوں برتن ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر کچن کے سنک کی طرف گیا، کپ اور گلاس نکال کر انہیں دھونے لگا۔
''کیا کر رہے ہو یوسف؟'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔
''آپ بیٹھی رہیں، میں دھو دیتا ہوں، کوئی بات نہیں۔''
''تم چھوڑ دو یوسف میں دھولوں گی بعد میں، یہ مردوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں۔'' دونوں برتن دھو کر وہ

واپس لوٹ آیا، میں اپنے صوفے سے اٹھنے کی ہمت ہی جمع کرتی رہ گئی۔

''یہ کس نے کہا کہ یہ مردوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں؟'' وہ واپس بیٹھتے ہوئے بولا۔ یقیناً اسے اپنے دل کی بات چاچو تک پہنچانی ہے اور یہ مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ''ہمارے نبی پاک ﷺ سے زیادہ کون اچھا استاد ہے جس نے معاشرتی زندگی کے سارے اصول وقواعد ہمیں بتائے ہیں، وہ اپنا ہر کام اپنے دستِ مبارک سے کرتے تھے اور کسی کو اپنے کام کے لیے تکلیف نہیں دیتے تھے...... اپنے علاوہ وہ دوسروں کے کام بھی کر دیا کرتے تھے، کمزوروں اور ضرورت مندوں کی مدد کر دیا کرتے تھے!''

''بہت اچھی سوچ ہے تمہاری یوسف!'' میں دل سے اس کی سوچ کی معترف ہوئی۔

''میں اصل میں آپ کے پاس جو بات کرنے آیا ہوں وہ بہت اہم ہے، رازداری بھی شرط ہے اس لیے مجھے تنہا یہاں آنا پڑا ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے یوں آپ کے پاس تنہا نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیوں بھئی؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''کیونکہ میں آپ کا نامحرم ہوں ناں۔'' وہ سر جھکائے اور نیچی نظر سے بات کر رہا تھا۔

''وہ تو ہے مگر تم تو میرے چھوٹے بھائی ہو۔''

''کہنے میں ایسا ہی ہے مگر حقیقت تو حقیقت ہی ہے ناں۔'' اس نے کہا تو میں لاجواب ہوگئی۔

''اچھا بھئی کیا بات کرنا تھی تم نے؟''

''ہم سب اپنے والد کے فرمانبردار اور تابعدار بچے ہیں بھابی، زین بھائی میں اکھڑ پن ہے اور زائنہ آپی اپنی شادی کے بعد ذرا منہ زور اور زبان دراز ہوگئی ہیں...... حسنہ آپی پاپا سے ڈرتی تو ہیں مگر ماما کا انہیں کوئی خوف نہیں اور یہ ماما کے ہی بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ میں اپنے والدین کی نافرمانی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا نہ ہی ان سے کسی بات میں بحث مباحثہ کر سکتا ہوں، دلیل سے نہ بغیر دلیل کے!'' اس نے طویل تمہید باندھی۔

''ہوں؟'' میں نے اس کے رکنے پر سوالیہ انداز میں ہوں کیا کہ میں اس کی بات سن رہی تھی۔

''جو بات میں پاپا سے کرنا چاہتا ہوں، اس کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ پاپا کو ناراض اور خفا کر دے گی، اس لیے سوچا کہ اس بات کو میں کسی ایسے شخص کے ذریعے پاپا تک پہنچاؤں کہ جس سے پاپا کو بے انتہا محبت ہو، اس کی بات کو پاپا سنیں بھی، سمجھیں بھی، یقین بھی کریں اور اس پر عمل بھی کریں...... چاہے وہ بات جیسی بھی ہو۔''

''تو؟'' میں نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''اس گھر میں فقط آپ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جو ان تمام خصوصیات پر پوری اترتی ہیں۔'' وہ رکا۔ ''اس لیے میں نے اپنا مقدمہ آپ کو وکیل کر کے لڑنے کا سوچا ہے۔'' اس کے یوں کہنے پر میرے ہاتھوں اور پیروں میں سنسناہٹ ہونے لگی، بلاشبہ وہ بھی زین کی طرح کسی کے چکر میں مبتلا ہوگیا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو یوسف...... ایسا نہیں ہے، چاچو تم سب لوگوں کی بات سنتے اور سمجھتے ہیں، یقین کرتے ہیں اور مانتے بھی ہیں۔'' آخر تو تمہارے باپ ہیں وہ میں نے چاچو کی طرف سے صفائی پیش کی۔

''ایسا نہیں ہے بھابی!'' اس نے سر جھٹکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے پاپا کو کسی کو اتنی محبت اور عزت دیتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی وہ آپ کی کرتے ہیں۔'' اس کے کہنے سے میری انا کے غبارے میں ہوا بھر گئی۔ ''ہوں...... تو یہ بات ہے، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور یوسف کو ماما نے اس کام پر لگایا ہو کہ ہو میرے ذریعے کوئی ایسی منفی بات چاچو تک پہنچانا چاہتی ہوں جس کے باعث چاچو مجھ سے بدگمان ہوں۔'' میں نے سوچا، یقیناً ایسا ہی ہے۔ تو پھر بلی تھیلے سے نکلوا کر دیکھنا پڑے گی کہ میرے خلاف کیا سازش تیار کی گئی ہے۔

''کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔

☆☆☆

''تمہارے گال پر کیا ہوا ہے امرت؟'' ماما نے جانے کیسے نوٹ کیا تھا۔ میں ایسے رخ پر بیٹھی تھی کہ میرے چہرے پر زیادہ روشنی نہ پڑے۔ دوپٹا بھی میں نے نماز کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

''گال پر نشان؟'' میں نے یوں کہا جیسے میں جانتی ہی نہ تھی۔ ''کون سے گال پر؟''

''یہ تمہارا بایاں گال لال لگ رہا ہے۔'' ان کے کہنے پر میں نے یوں اپنا گال سہلایا جیسے اس نشان کو چھو کر محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

''کوئی ریش ہے یا کچھ لگا ہے..... کہیں گری وری تو نہیں تم؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں ماما.....'' میں نے انہیں کہا۔ ''کل ڈریسر کی الماری کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے الماری میرے دوسرے ہاتھ سے بند ہوگئی اور اس کا پٹ میرے گال پر لگا تھا مگر نہ تو مجھے کوئی درد ہوا اور نہ ہی میں نے نشان نوٹ کیا۔''

''اس طرح بے پروائی تو نہ کیا کرو بیٹا!'' انہوں نے کہا۔

''اس طرف منہ کرو..... مجھے دکھاؤ بیٹا!'' چاچو نے کہا تو باقی لوگوں نے بھی سر اٹھا کر دیکھا۔ دن بھر تو میں مہمان خانے میں ہی ہوتی تھی، جو کچھ کھانا ہوتا تھا وہیں پر خود بنا لیتی تھی مگر رات کا کھانا گھر کے سب افراد میز پر اکٹھے کھاتے تھے۔ میں نے اس روز بہانہ بھی کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں مگر ماما نے کال کر کے کہا کہ میں نہ آئی تو چاچو کو تشویش ہوگی اور وہ سب لوگوں کو کھانے سمیت لے کر مہمان خانے پہنچ جائیں گے۔

''کچھ بھی نہیں ہے چاچو..... آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''تم جھوٹ تو نہیں بول رہیں؟'' انہوں نے میری نظر سے میرے دل کا چور پکڑا تھا۔

''آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی چاچو!'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ تمہیں مہمان خانے کے بجائے زائنہ والے کمرے میں شفٹ کر دیا جائے..... کم از کم تم گھر کے اندر تو ہوگی اور پھر کون کس وقت آتا ہے اور جاتا ہے، اس کا علم ہوتا رہے گا۔''

''مہمان خانہ بھی تو گھر کی چار دیواری میں ہی ہے جمال!'' زین نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا تھا اور ماما نے فوراً تاویل پیش کی تھی۔

''تم ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہو۔'' چاچو نے ناراضی سے کہا۔

''زائنہ بھی تو چند دن تک آ جائے گی ڈلیوری کے لیے... پھر امرت کو اس کا کمرا خالی کرنا پڑے گا!'' ماما نے کہا۔

''امرت اس گھر کا فرد ہے اور زائنہ اب یہاں مہمان.....''

''ہاں وہ تو ہے۔'' ماما نے مصالحت سے کہا۔

''ویسے زائنہ کیوں یہاں آئے گی ڈلیوری کے لیے؟'' چاچو نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا امرت گاؤں جائے گی؟'' میرا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔

''نہیں امرت یہیں رہے گی۔'' ماما نے فوراً کہا۔

''زائنہ بھی اپنی سسرال میں رہے گی۔'' چاچو نے جواباً کہا۔ ''میں اس کے سسر سے خود بات کروں گا۔''

''وہ لوگ جانے کیسا سوچیں۔'' ماما ہکلائیں۔ ''آپ کا بات کرنا برا لگ سکتا ہے ان کو۔''

''اگر برا لگے گا تو میں کہوں گا کہ زائنہ کو بھیج دیں میکے.....اور اس صورت میں امرت بھی گاؤں جائے گی۔''

''گاؤں میں ایسی سہولیات کہاں ہیں۔''

''میں گاؤں میں ہی پیدا ہوا تھا زیبا بیگم!'' چاچو نے دانت کچکچا کر کہا۔ ''کل صبح اپنا سامان زائنہ والے کمرے میں منتقل کرواؤ امرت اور اس کے بعد مجھے اپنی بات دُہرانی نہ پڑے۔''

''یوسف کے چہرے پر داڑھی کتنی پیاری لگ رہی ہے ناں چاچو!'' میں نے بات بدلی۔

''تمہیں لگ رہی ہوگی۔'' چاچو نے کہا۔ ''مجھے تو یہ باتوں اور حلیے سے مولوی لگنا شروع ہوگیا ہے۔ پڑھائی سے جان چھڑوانے کو نیا روپ نکال لیا ہے اس نے، مذہب کی راہ اختیار کی ہے۔ بھئی پڑھ لکھ کر بھی تم مذہب کی طرف مائل ہو سکتے ہو...... مگر جو نکما جاہل ہے وہ پڑھائی چھوڑ تا دیتا ہے اور مذہب کا ٹھیکیدار بن جاتا ہے اسی لیے مذہب کو سمجھنا مشکل ہوگیا ہے۔''

''تو اس میں برا کیا ہے؟'' یوسف نے کہا۔ ''نماز اور قرآن پڑھنے میں کوئی برائی ہے کیا؟'' یوسف کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ ''بھابی نماز اور قرآن پڑھتی ہیں تو آپ نے کبھی کوئی اعتراض کیا؟''

''امرت کے گھر کا ماحول ہی ایسا ہے یوسف....'' چاچو نے جواب دیا۔ ''ہمارے گھر میں کوئی نماز پڑھے تو وہ انوکھی بات لگتی ہے کیونکہ تمہاری ماں نے تمہاری تربیت میں ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا......''

''تو آپ خیال رکھ لیتے ناں پاپا!'' یوسف نے آہستگی سے کہا۔

''میں خود اس ماحول سے آیا تھا اور پنج وقتہ نمازی تھا مگر تمہاری ماں نے مجھ سے بھی نماز کی پابندی چھڑوا دی کیونکہ ان کے گھر میں نماز پڑھنے والوں کو قدامت پسند اور فرسودہ کہا جاتا تھا۔''

''نعوذ باللہ!'' یوسف نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا پھر بھی میں نے بھابی کو کبھی نماز چھوڑتے ہوئے نہیں دیکھا...... وہ ہر نماز پابندی وقت اور باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی ہیں۔''

''اس نے تو اولاد کو گناہ اور ثواب کا فرق بھی نہیں سمجھایا۔'' چاچو نے ماما کے بارے میں ایک اور شکوہ کیا، یقیناً ان کا اشارہ زین کی طرف تھا۔

''گھر مردوں کی طاقت سے چلتے ہیں پاپا...... عورتوں کی کمزوریوں پر نہیں۔'' وہ اتنا سا نوجوان جسے ہم اس لمحے سے پہلے تک ایک بچہ سمجھتے تھے...... وہ کیا کہہ گیا تھا، ہم سب ایک دوسرے سے نظر چرا رہے تھے۔

''تم کب شروع کر رہے ہو بھئی نماز؟'' چاچو نے اپنا غصہ عارب پر نکالا۔

''جب آپ کہیں گے پاپا...... بلکہ جب آپ خود شروع کر دیں گے، میں تو ہمیشہ آپ کو ہی مانتا ہوں اور وہی کرتا ہوں جو آپ کہتے ہیں یا کرتے ہیں۔'' اپنی طرف سے اس نے بات مزاح کے انداز میں کہی تھی مگر وہ یوسف کی طرح کرسی کو زور سے گھسیٹ کر اٹھ کر گیا نہیں بلکہ وہیں بیٹھا خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کسی نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا شاید۔

☆☆☆

''کیسی ہو امرت؟'' سارہ کا پیغام تھا۔

''کیسا ہونا چاہیے؟'' میں نے سوال کے جواب میں سوال بھیجا۔

''اپنی امو جان کو بتایا تم نے؟''

''نہیں......'' میں نے لکھ کر جواب بھیجا ہی تھا کہ اس کی کال آ گئی۔

''کیوں؟ ابھی تک کیوں نہیں بتایا تم نے؟'' اس نے پوچھا۔ ''انہیں بتا دیتیں تو کم از کم تمہارے دماغ کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا...... زین کو بتایا؟'' وہ یکے بعد دیگرے کئی سوال کر گئی۔

''میں نے کسی کو نہیں بتایا سارہ...... امو جان کو اگلی صبح واپس جانا پڑ گیا تھا۔ کمیل گر گیا تھا، اسے چوٹ لگ گئی تھی اور امو جان بہت بے چین ہوگئیں اور اچانک چلی گئیں۔''

''یعنی تمہیں رات بھر میں اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ تم ان سے بات کرتیں...... جب وہ جا رہی تھیں تو تم جب ہی نہیں بتا دیتیں۔''

''رات کو سوچا کہ سفر کر کے تھکی ہوئی آئی ہیں، ایک دن انہیں آرام سے رہنے دوں اور پھر وہ اس قدر پریشان ہوگئی تھیں کمیل کی چھوٹی سی چوٹ کا سن کر...... میں اتنی بڑی بات انہیں کیسے بتاتی؟''
''تو زین...... ماما پاپا اپنے چاچو کو کیوں نہیں بتایا؟''
''سمجھ میں ہی نہیں آرہا سارہ کہ کس طرح کس کو بتاؤں...... گھر پر بھی ہر وقت کسی نہ کسی بات کی وجہ سے عجیب سی صورت حال رہتی ہے، سوچتی بھی ہوں تو بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔''
''ہم کہیں ملیں آج شام کو؟'' اس نے بے تابی سے کہا۔
''آج تو نہیں سارہ......'' میں نے اسے ٹالا۔ ''کسی اور دن دیکھیں گے۔''
''ہممم...... میں تو جلد سے جلد تم سے ملنا چاہ رہی تھی امرت!'' میں جانتی تھی کہ اسے میری پریشانی بھی تھی اور وہ میری واحد دوست بھی تھی۔ اس کے ساتھ میں اس طرح اپنے دل کی بات کر لیتی تھی جس طرح تمنا کے ساتھ۔ جونہی میرے گال کا نشان ہلکا ہوتا میں اس سے ملنے کو چلی جاتی۔
میں نے اس روز اسے اپنے چہرے پر اس لال نشان کی وجہ سے ٹالا تھا جس پر گھر کے باقی لوگ تو میرے جواب سے مطمئن ہوگئے تھے مگر سارہ کبھی نہ ہوتی۔ ماما کی دانست میں وہ لاکھ کم عقل عورت سہی مگر جتنا وہ مجھے جانتی اور سمجھتی تھی وہ کبھی یقین نہ کرتی کہ الماری کا پٹ میرے چہرے پر ایسا نشان بنا سکتا تھا۔ میں نے گھر والوں کے سامنے تو دوپٹا لپیٹ کر اپنا بھرم رکھ لیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے بہلنے والی نہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک مرد کا طاقت سے بھرپور تھپڑ جب پہلی بار عورت کے نازک گال پر پڑتا ہے تو حیرت، صدمے اور کرب کا کیا عالم ہوتا ہے۔ اس نے یہ سب سہا تھا جو میں اب سہنا شروع ہوئی تھی۔ زین کا وہ تھپڑ پہلا سہی مگر آخری ثابت ہونے والا بہرحال نہ تھا۔

☆☆☆

''تم نے...... تم نے کال کر کے ماما اور پاپا کو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے بلوایا تھا؟'' اس نے پوری طاقت سے چیختے ہوئے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ میں سسکی تک نہیں، صدمے نے میرے حواس ہی چھین لیے تھے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی مجھ پر یوں ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے کبھی کسی سے پوری زندگی میں تھپڑ نہ کھایا تھا۔ میرے گال پر سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، کچھ چل رہا تھا، میں سمجھی کہ لہو بہہ رہا ہے، ہاتھ پھیر کر محسوس کیا تو ایسا نہ تھا مگر اپنے ہی ہاتھ کے نرم سے لمس سے بھی تکلیف ہوئی۔ یقیناً میری نازک جلد جلن کی وجہ سے حساس ہو رہی تھی۔
''مم...... میں نے......'' میں ہکلا کر رہ گئی۔
''تم نے صرف میرا اچھا والا روپ دیکھا ہے آج تک امرت۔'' وہ چلایا۔ میں سوچ کر رہ گئی کہ اس کا کون سا اچھا روپ میں نے دیکھا تھا اس وقت تک۔ ''میں برا بنا تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں گا تاکہ تم آسانی سے بے حیائی کر سکو اور جانے کن، کن کے بچے میرے نام سے اپنے پیٹ میں اٹھا کر گھومو......'' وہ تھپڑ سے زیادہ تکلیف دہ باتیں کر رہا تھا۔ ''میں بھی اس دن اپنے باپ کو بلاتا اور دکھاتا جس دن تم ارسل کے ساتھ میری ماں اور بہن کے ہاتھوں رنگے ہاتھ پکڑی گئی تھیں تو میں دیکھتا کہ آج تم کہاں ہوتیں۔''
''میری بدقسمتی ہے زین...... یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔'' میں سسکی۔ ''وقت اس بات کو ثابت کر دے گا۔''
''اچھا...... تمہاری بدقسمتی!'' اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''تو تم کسی اور کا بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں؟''
''کاش میں نے تم سے شادی سے انکار کر دیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔'' میرے آنسو بہے جا رہے تھے۔
''کون تھا وہ؟'' اس نے میری ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔

''میں تم جیسی ہوتی تو ہوتا کوئی نہ کوئی......'' میں نے دو بدو کہا، میرے وجود کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ ایک تو اس کی جرأت کہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا، اس پر مجھ پر فحاشی کا الزام لگایا اور اپنے بچے کی ولدیت سے بھی انکار کر دیا اور اس پر مستزاد وہ مجھے اپنے جیسا بدکردار سمجھ رہا تھا۔ اس نے پھر ہاتھ اٹھایا مگر میں نے انتہائی غیرارادی طور پر اپنا وفاع کرنے کے لیے اپنی کہنی اپنے چہرے کے سامنے کر لی۔ پہلے تھپڑ کے وقت مجھے اس کا موقع نہ ملا تھا کیونکہ وہ بہت غیر متوقع تھا۔ اس نے کندھے سے مجھے دھکا دیا، میں ہلکی سی کوشش سے سنبھل گئی، اگر زوردار دھکا ہوتا تو میں گر سکتی تھی۔

اگلے روز جب چاچو نے کہا کہ میں گھر کے اندر منتقل ہو جاؤں تو ہلکے سے انکار کے بعد میں راضی ہو گئی، میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ زین کو تو اس نئی صورت حال سے مشکل ہوتی مگر مجھے سوچ آئی کہ وہاں مہمان خانے میں وہ مجھے جان سے بھی مار کر چلا جاتا تو گھر والوں کو علم ہونے میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔ یہاں گھر کے اندر ذرا سا چیخنے گا تو پہلے سوچے گا کہ آواز کہاں کہاں جا رہی ہے۔

☆☆☆

''کتنی بے مروت ہو امرت...... اپنی بہن کے پاس نہیں آتی [illegible] سے اس کے گھر میں رہتے ہوئے دیکھو۔'' تمنا کو کال کی تھی تو اس کا شکایات کا دفتر کھل گیا۔ دل و دماغ پر [illegible] کا بڑھ گیا تھا، سوچا کہ اسے کال کر کے شریکِ راز کروں، اس سے پوچھوں کہ آگے کیا کروں۔ امو جان تو آئیں اور ہوا کے جھونکے کی طرح ان کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ چلی گئیں۔ وہ جو رکتیں تو انہی کو شریکِ راز کرتی کہ ماما سے بات کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی اور زین سے اس دن سے سوائے انتہائی ضرورت کے کوئی بات نہ ہوتی تھی، نہ تنہائی میں نہ کسی کے سامنے۔ کسی کو محسوس بھی نہ ہوا تھا کہ ہم معمول میں بھی تو ویسے ہی میاں بیوی تھے۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تمنا......'' کہتے ہوئے میرے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنسا۔

''ایسے تو طبیعت خراب رہتی ہی ہے امرت! یہ تو خوشخبری ہے اور ماں بننا کوئی اتنا آسان نہیں ہوتا...... تمہیں کوئی بیماری تھوڑا ہی ہے۔'' وہ تو یوں کہہ رہی تھی جیسے مجھ سے پہلے وہ ان مراحل سے گزر چکی ہو۔

''ہاں جیسے تم نے تو کئی بچے پیدا کر رکھے ہیں۔'' میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''ابھی تو ہم خود بچے ہیں جی!'' وہ کھل کر ہنسی۔ ''دور، دور تک ہمارے بچوں کی آمد کے کوئی امکانات نہیں ہیں اور نہ ہی تمہاری طرح لاعلمی میں پریگننٹ ہو جانے کا کوئی ارادہ ہے، ہمارے بچے ہمارے پلان کے مطابق آئیں گے۔''

''ہر بچہ اللہ تعالیٰ کی پلاننگ کے تحت پیدا ہوتا ہے تمنا...... یوں بڑے بول نہ بولا کرو۔''

''مذاق کر رہی ہوں یار!'' اس نے فوراً کہا۔ ''اچھا بتاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک کیوں نہیں رہتی؟''

''وہ......'' میں اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکی تھی۔ کچھ اور بولتی تو وہ سمجھ جاتی کہ میں رو رہی تھی۔

''تم رو رہی ہو امرت؟'' اب اس کے لہجے میں شرارت نہیں بلکہ تشویش تھی۔

''اوہوں!'' میں نے خود پر ضبط کیا۔

''تم نے جھوٹ بھی بولنا شروع کر دیا ہے میرے ساتھ امرت؟''

''تمہیں مس کر رہی ہوں پیاری!'' میں نے اپنے لہجے کو سنبھالا۔

''جانتی ہوں...... کیونکہ میں بھی تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''زندگی میں یہ سب تو ہوتا ہے، ایک گھر میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے بچے...... بڑے ہوتے ہیں تو اڑانیں بھر لیتے ہیں، اس گھر آنگن کو چھوڑ دیتے ہیں جہاں ان کا بچپن بیتا۔ ہم ایک ماں باپ کی اولاد نہیں بھی تھے امرت

مگر مجھے آج تک اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے یہی لگتا ہے کہ میں اور تم جڑواں بہنیں ہیں۔'' وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

جانتی ہی نہ تھی کہ ہم مختلف ماؤں کے بطن سے پیدا ہونے والی جڑواں جیسی ہی تھیں، ہم دونوں کا باپ تو ایک ہی تھا۔ وہ ایسی ہی سادہ تھی۔ مجھے تو خیر دادی جان کی زبانی علم ہوگیا تھا کہ ہاجرہ پھپو سے ابو جان نے ہی نکاح کیا تھا اور اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا مگر تمنا یہی سمجھتی تھی کہ اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے تھے اور اقبال تایا اور تائی نے اسے اپنی بیٹی بنالیا تھا کیونکہ وہ بے اولاد تھے، انہوں نے ہی اسے پالا پوسا تھا۔

ان کے ہاں وہ اگرچہ کم ہی رہتی تھی، پڑھائی کے سارے دور میں ہمارا ساتھ رہا، امتحانوں کے اریب قریب بھی ہم رات، رات بھر اکٹھے ہی پڑھتیں اور چھٹیوں میں گھر آتیں تو بھی ہم ہماری ساری مصروفیات اسی نوعیت کی ہوتیں کہ ہمارا دن رات کا ساتھ ہوتا۔

''میں تو سفر بھی نہیں کرسکتی اور تم سے دل بہت اداس ہے......'' میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''جونہی تمہاری ڈلیوری ہوتی ہے میں آجاؤں گی۔'' اس نے مجھے یقین دلایا۔

''تم آج آنے کا کہو تو میں آج ہی ڈلیوری کروالیتی ہوں۔'' میں نے دل کے درد کو لہجے کی بشاشت سے چھپایا۔

''تم بتادیتیں کہ میرا بھانجا ہے یا بھانجی تو میں اس حساب سے تیاری تو کرلیتی۔'' وہ ہنسی۔ ''امو جان کہتی ہیں کہ تم نے سرپرائز رکھا ہوا ہے۔''

''میں نے خود بھی چیک نہیں کروایا تمنا...... میرا یقین کرو۔''

''تم بہت بورنگ ہو یار!'' اس نے کہا۔ ''تمہارا دل نہیں کرتا کہ تم اپنے بچے کی جنس کو جانو، اسے بیٹا یا بیٹی ہونے کی حیثیت سے محسوس کرو؟'' اس نے سوال کیا۔ ''میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں نے اس بچے کا نام بھی رکھ لیا ہوتا اور جب میں تنہا ہوتی تو اسے اس کے نام سے پکار کر اس سے باتیں کرتی، اپنے شوہر کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی تو یہ نہ کہتی کہ ہمارا آنے والا بچہ بلکہ اس کے نام سے ہم اس کی باتیں کرتے...... آج کل ایسا ہی ہورہا ہے پیاری۔''

وہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ میرے اور زین کے بیچ ایسی محبت نہ تھی جیسی وہ سوچ رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی اس بچے کی جنس جاننے کا تجسس نہ تھا اور اب جب ڈاکٹر یاسمین نے یہ کہہ دیا تھا کہ اس بچے کے بچنے کے امکانات ہی کم تھے تو میں اور بھی مایوس ہوگئی تھی اور یہ جاننا بے معانی ہوگیا تھا کہ وہ بیٹا تھا یا بیٹی۔ ڈاکٹر جلد از جلد اس بچے کی پیدائش چاہ رہی تھی اور میں وقت گزار رہی تھی، بچے کی قبل از وقت پیدائش میں بھی کچھ قباحتیں تھیں۔ اس میں کچھ ابنارمل بھی ہوسکتا تھا، اس کے دماغ کو کچھ اثرات ہوسکتے تھے...... کوئی معذوری وغیرہ۔ اس لیے میں اس کی قبل از وقت پیدائش کو ٹال رہی تھی تاکہ بچے کو مزید میرے ساتھ رہنے کا وقت مل سکے۔ حالانکہ اس کا مزید میرے وجود میں رہنا اس بات کے امکانات کو بڑھا رہا تھا کہ وہ میری بیماری سے متاثر ہوسکتا تھا۔

ماما کو بتانا ضروری ہوگیا تھا، اس کے لیے بھی مجھے حوصلہ چاہیے تھا، تمنا یا امو جان کا ہونا مجھے ہمت دیتا۔ چاچو کے سامنے ایسی بات کہنے میں جھجک تھی۔ چلو...... ڈاکٹر یاسمین سے کہوں گی کہ وہ ماما کو فون کرکے بتادیں۔ میں نے تمنا کو مزید پریشان کرنے کے بجائے سوچا اور اسے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون بند کیا تھا کہ وہ مزید پریشان نہ ہو اس کی چھٹی حس نے اسے بتادیا کہ امرت یوں رو دینے والی نہیں...... اسی لیے اگلے دن جس وقت میں ڈاکٹر یاسمین کے پاس جانے کو تیار ہورہی تھی اور ماما سے کہہ رکھا تھا کہ وہ بھی تیار ہوجائیں۔ تیار ہوکر لاؤنج میں پہنچی تو میری آنکھوں کو یقین ہی نہ آیا۔ تمنا وہاں بیٹھی مزے سے چاچو کے ساتھ گپ شپ کررہی تھی، اس

نے چاچو کو ہی شاملِ راز کیا تھا اور صبح کی پرواز سے پہنچ گئی تھی۔ میں بے اختیار بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کا تو کوئی کچھ نہ پوچھے۔

☆☆☆

''کیسی ہیں آپ؟'' ڈاکٹر یاسمین نے ماما سے سوال کیا تھا۔
''میں تو بالکل ٹھیک ہوں..... آپ اپنے مریض کا حال پوچھیں۔'' ماما نے بشاشت سے کہا تھا۔
''اسے بھی پوچھ لیتے ہیں۔'' انہوں نے دراز کھولی اور اس کے اندر خواہ مخواہ کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا شاید۔ ''اس کی طرف سے تو مجھے بہت پریشانی ہے، اسی لیے تو آپ کو بلوایا ہے۔'' میں نے جب ڈاکٹر یاسمین سے یہ کہا تھا کہ وہ ماما کو خود فون کر کے بتا دیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ایسی بڑی بات انہیں فون پر بتانا مناسب نہیں، انہیں ساتھ لے کر آؤں تو وہ بات کریں گی۔ میں نے درخواست کی تھی کہ وہ بات اس طرح بتائیں جیسے کہ میں بھی اس بات کو پہلے سے نہیں جانتی۔ شاید انہیں حالات کا کچھ اندازہ تھا اس لیے اس پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا، اب انہیں اداکاری کرنا تھی جو شاید ان کی فیلڈ نہیں تھی۔
''سب خیر تو ہے ناں ڈاکٹر یاسمین؟'' ماما نے تشویش سے کہا اس پر ڈاکٹر یاسمین کو حیرت ہونا لازمی تھی کہ وہ ساس جو پہلے دن اپنی بہو کو اس کے پاس لائی تھی اور کہا تھا کہ انہیں اس کا بچہ ضائع کروانا ہے وہ اب اس کے بارے میں ڈاکٹر کے منہ سے ایک فقرہ سن کر تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ 'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!' انہوں نے دل میں سوچا ہو گا۔
''کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' تمنا نے سوال کیا تو ڈاکٹر یاسمین نے میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔
''بہن ہے میری۔'' میں نے اس کا تعارف کروایا۔ ''تمنا!''
''ایسا ہے مسز جمال کہ بچے کی پیدائش کا عمل از خود ایک انتہائی دشوار مرحلہ ہے..... اگر کوئی مسئلہ نہ ہو، حمل نارمل ہو اور بچے کی نشوونما ٹھیک ہو رہی ہو تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی.....''
''تو کیا بچہ آپریشن سے پیدا ہو گا؟'' ماما نے اس کی بات کاٹی، غالباً وہ طویل تمہید سے بور ہو رہی تھیں۔
''بچہ آپریشن سے ہی پیدا کرنا ہو گا مسز جمال!'' ڈاکٹر نے رسان سے کہا۔ ''آپ میری پوری بات تو سنیں!''
''جی کہیے..... ویسے حیرت ہے کہ سب ٹھیک ہے پھر بھی بچہ آپریشن سے.....'' وہ بڑبڑانے سے باز نہ آئیں۔ ''آج کل کی بچیوں کے نخرے بھی تو بہت ہو گئے ہیں، نارمل طریقے سے بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہتیں۔'' وہ جتنا بھی اچھا بننے کی کوشش کرتیں، ان کے اندر کی شخصیت اپنا چولا اتار کر کسی نہ کسی طرح ضرور سامنے آ جاتی تھی۔
''نہ صرف یہ کہ بچہ آپریشن سے پیدا کرنا ہو گا بلکہ فوری طور پر.....''
''وہ کیوں..... ابھی تو بہت وقت باقی ہے میرے حساب سے؟'' ماما نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔
''سب ٹھیک تو ہے ناں ڈاکٹر؟'' تمنا نے تشویش سے کہا۔ ''بچہ قبل از وقت کیوں پیدا کروانا چاہتی ہیں آپ؟''
''دیکھیے مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے مگر حالات ہی ایسے بن گئے ہیں۔'' ڈاکٹر یاسمین بہ مشکل اپنے لہجے کو نرم رکھ پا رہی تھیں۔ ''اگر آپ دونوں اپنے سوالات کا سلسلہ بیچ میں بند کر دیں اور مجھے اپنے تئیں صورتِ حال واضح کرنے دیں تو بہتر ہو گا۔''
''مجھے تو گھبراہٹ شروع ہو گئی ہے امرت!'' تمنا نے میرا ہاتھ تھام کر میرے کان کے پاس ہولے سے کہا۔ 'تمہاری ڈاکٹر تو کچھ زیادہ ہی ڈراما کر رہی ہے۔'' اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔ میں نے کافی کوشش کی کہ میں بھی گھبرائی ہوئی اور خوفزدہ نظر آؤں مگر جانے مجھ سے ایسا کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ چند دنوں میں میں نے خود کو اتنا

سنبھال لیا تھا۔

''اصل میں مسز جمال.....صورتِ حال آپ کی سوچ سے بڑھ کر پریشان کُن ہے.....نہ آپ کی بہو کا آپریشن سے بچہ پیدا کروانے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی ہر ڈاکٹر کو آپریشن کر کے مریضوں سے زیادہ فیسیں بٹورنے کا شوق ہوتے ہوں گے کچھ ایسے ڈاکٹر جو آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے، وہ اپنے پیشے سے بددیانتی کر کے اپنی پوری برادری کے نام پر دھبا لگا دیتے ہیں۔ امرت کا بچہ جلدی پیدا کروانے کی وجہ یہ ہے کہ دیر کی صورت میں ماں اور بچے دونوں کی جان کو خطرہ ہے.....اگرچہ ابھی پیدا کروانے میں بھی خطرہ ہے مگر اس میں نقصان کی شرح کم ہوگی۔ اس صورت میں بچہ مکمل صحت یاب یا نارمل ہو.....اس کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔''

''یہ کیا بات ہوئی.....ایسی کیا صورتِ حال ہے کہ جلد پیدا کرو تو بچہ ابنارمل بھی ہو سکتا ہے اور دیر کرو تو جان کو خطرہ.....تو پھر دیر ہی کر لیں، جان دینا اور لینا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر کم از کم جلد پیدا کروا کر جو امکانات ہیں وہ تو عمر بھر کے لیے ایک.....'' وہ کوئی سخت لفظ کہتے، کہتے رکیں۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا، ماما نے تو یوں لمحوں میں فیصلہ سوچ بھی لیا تھا اور دھڑلے سے اس کا اعلان بھی کر دیا تھا، میں اتنے دنوں سے اس چھوٹے سے وجود کو تکلیف میں ہونے کا سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ یہ فرق ہوتا ہے ایک ماں میں اور دادی میں۔

''کیا میں وجہ جان سکتی ہوں ڈاکٹر یاسمین؟'' میں نے تھوک نگل کر سوال کیا۔ جانتی تھی کہ اس کے انکشاف سے بم پھٹنے والا تھا.....کم از کم مجھے تو اداکاری کرنا تھی ایسی نوعیت کی اور میں بہت بری اداکارہ رہی ہوں۔

''ہمیں شبہ ہے کہ.....'' ڈاکٹر یاسمین نے جو بات پہلے مجھے ہمت کر کے بتا دی تھی، وہی بات انہیں ماما کے سامنے کہنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ بھی ماما کے الفاظ کی سختی اور لہجے کی بے حسی سے متاثر ہوئی تھیں۔ ''امرت کی بچہ دانی میں رسولی ہے۔'' انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔

''کیا؟'' ماما نے حیرت سے پوچھا، میں ساکت بیٹھی تھی، تمنا نے مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

''بلکہ.....کینسر.....''

''ٹھک!'' کی آواز آئی، تمنا میری کرسی کے ساتھ جوڑ کر ایک اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ اچانک گر گئی تھی، اسٹول الٹ گیا تھا غالباً۔ مگر نہیں اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں، اس کے ہاتھ مڑے ہوئے تھے۔

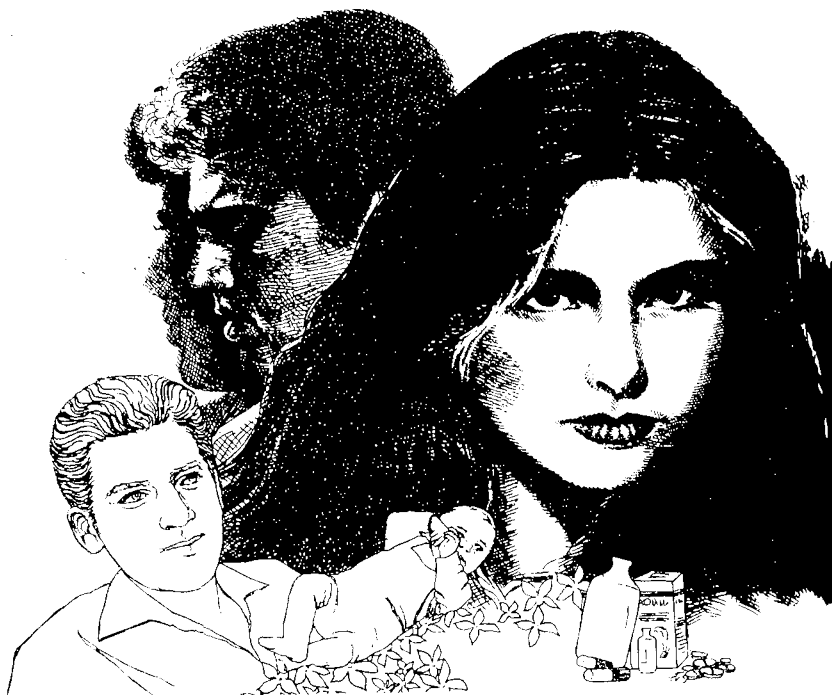
''میری بہن کو دیکھیں ڈاکٹر.....'' میں چیخی۔

''نرس.....'' ڈاکٹر نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بھی بجائی اور بے اختیاری سے آواز بھی دی۔ زمین پر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انہوں نے تمنا کی نبض تھامی، اس کے چہرے پر ہولے، ہولے چپت لگائے۔ نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ ''فوراً اسٹریچر منگواؤ اور اسے کسی بیڈ پر ڈالو.....لگتا ہے کہ کسی نوعیت کا دورہ پڑا ہے، اسے کوئی پرابلم ہے تو نہیں میرا مطلب ہے مرگی وغیرہ؟'' اس نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، ہرگز نہیں.....'' میں نے پورے وثوق سے کہا، حالانکہ اندر سے میں خود بھی پُر یقین نہ تھی، ممکن ہے اسے کوئی مسئلہ بہت بچپن میں ہوا ہو یا شادی کے بعد۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر فوراً باہر کی طرف لے جایا گیا اور ڈاکٹر یاسمین بھی ساتھ ہی نکلیں۔

''تو تم یہ سب جانتی تھیں؟'' ماما نے مجھے گھور کر سوال کیا۔ ''اتنی بڑی بات سن کر تم یوں سکون میں ہو جیسے تمہیں نہیں بلکہ مجھے کینسر ہو۔''

(جاری ہے)



چاند کا داغ

ہما بیگ

''سرپرائز!'' فرحان کی آواز نے گپ شپ
صروف سب دوستوں کو چونکا دیا۔ یہ ان خوش
پ دوستوں کا گروپ تھا جنہوں نے اسکول سے
تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی پھر مختلف تعلیمی
میدانوں میں قسمت آزمائی کے لیے نکل گئے مگر آج
بھی ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کسی نے
میڈیکل کو چنا تو کسی نے جرنلزم میں نام کمایا۔ گروپ
میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مگر جنس کے

فرق سے قطع نظر وہ صرف بہت اچھے دوست تھے۔

فرحان اور آمنہ فرسٹ کزنز تھے اور آج انہوں نے سب دوستوں کو سرپرائز پارٹی پر بلایا تھا۔

''جلدی بتاؤ کیا بات ہے کل سے ٹینشن ہو رہی ہے۔'' عظیم جو شروع ہی سے بے صبرا واقع ہوا تھا۔ فوراً بول پڑا۔

''صبر پیارے عظیم۔'' فرحان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے بٹھایا۔'' آپ ہمیشہ سے عظیم ہیں اور رہیں گے۔ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ سب کو بیٹھنے تو دو۔''

''ہاں ،ہاں بھئی میزبان کو کرسی پیش کی جائے۔'' فرزانہ جو گائنا کالوجسٹ تھی اور آمنہ کی قریبی سہیلی بھی...... اس نے ٹیڑھی نظروں سے آمنہ کو دیکھا اور بولی۔

''لڑکی یہ آپ خاموش کھڑی کیوں مسکرا رہی ہیں؟'' ماجرا کیا ہے؟ کچھ تو پتا چلے۔''

''پیارے دوستو...! اب ہم آپ کو ایک اہم بات بتانے جا رہے ہیں دل تھام کر بیٹھیے میں یعنی مسمی فرحان کی بات محترمہ آمنہ سے پکی ہوگئی ہے۔عنقریب آپ سب کو شادی پر مدعو کیا جائے گا۔''

فرحان کی بات ختم ہوتے ہی مبارک سلامت شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی شکایات بھی کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔لڑکوں نے فرحان کو گلے لگا کر دعائیں دیں اور لڑکیوں نے آمنہ کو۔

ایک بار پھر فرحان نے بولنا شروع کیا۔'' دراصل ہمارے خاندانوں میں باہر شادی نہیں ہوتی۔ نہ جانے کتنی نسلوں سے یہی ہو رہا ہے جیسا آپ سب جانتے ہیں، میں اور آمنہ تو صرف دوست تھے، آمنہ کے رشتے آنے لگے تو امی فوراً میرا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ اور اس طرح یہ رشتہ پکا ہوگیا۔سب سے پہلے ہم نے آپ سب کو اطلاع دینی ضروری سمجھی۔ کیونکہ آپ ہی ہمارے سب سے قریبی دوست ہیں۔ اب پارٹی شروع آمنہ منہ میٹھا کراؤ سب کا۔''

سب کھانے میں مصروف ہوگئے تو اوصاف جو سرجن تھا فرحان کا ہاتھ پکڑ کر بہانے سے باہر لے گیا۔

''یار فرحان پڑھے لکھے ہو کر یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟ اپنے اور آمنہ کے بلڈ ٹیسٹ کرائے؟ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا؟''

''اوصاف ، بھائی کیا کہہ رہے ہو، ہم دونوں ماشاءاللہ صحت مند ہیں، ہم دونوں کو کوئی بیماری نہیں تو کیوں ڈاکٹر کے پاس جائیں۔'' فرحان کے لہجے میں ترشی تھی۔

''ناراض مت ہو میرے دوست، موروثی بیماریاں ہر خاندان میں ہوتی ہیں۔ جبکہ تمہارے خاندان میں صدیوں سے کوئی رشتہ باہر نہیں ہوا۔ ایسی صورتِ حال میں بچوں میں کوئی بڑی بیماری ہونے کے بہت چانس ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ایک بھی ایسی بیماری تم دونوں میں ہوئی تو بچوں میں مہلک بیماری کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے بلڈ ٹیسٹ کروالو، بلڈ گروپ کے مائنس اور پلس کے فرق سے بھی بچوں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے اور معذوری کا بھی خطرہ بڑھ جاتا ہے۔''

فرحان کے ماتھے پر ناگواری سے سلوٹیں پڑ گئیں۔

''ڈاکٹر صاحب آپ بھی حد کرتے ہیں، ہم خوشیاں منا رہے ہیں اور آپ ہمیں ڈپریشن میں ڈال رہے ہیں، اسے دوستی کہتے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے فرحان باقی دوستوں کی طرف چل دیا۔ سب نے محسوس کیا کہ کوئی بدمزگی دونوں کے درمیان ہوئی ہے۔ مگر انہوں نے کسی کو نہیں بتایا۔

دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہوگئی۔ سب دوستوں نے دل بھر کر ارمان نکالے۔ مگر فرحان اور اوصاف کے درمیان کھنچاؤ ہی رہا۔ ہنی مون کے بعد فرحان نے نوکری پر جانا شروع کر دیا۔ مگر آمنہ نے جاب چھوڑ کر گھر داری سنبھال لی۔ ایک سال پلک جھپکتے بیت گیا۔ آمنہ کے کان میں چپکے سے خوشیوں نے خبر سنائی۔ اور جب یہ نوید فرحان تک پہنچی تو اس نے آمنہ کو گلے سے لگا کر کہا۔

''آج تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی۔ بولو کیا مانگتی ہو شہزادی، آج بادشاہ سلامت کوئی بات نہیں ٹالیں گے۔''

''اوہو بادشاہ سلامت تو پھر یہ کہ اب کس لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا ہے؟ الٹیوں نے تو میرا برا حال کر دیا ہے۔ کمزوری الگ ہوگئی ہے، کچھ کھایا نہیں جا رہا۔''

''بیگم صاحبہ آپ حکم تو کریں ...... ویسے اگر مناسب سمجھو تو فرزانہ کے پاس چلتے ہیں۔ تمہاری پکی سہیلی بھی ہے اور ڈاکٹر بھی کافی سمجھدار ہے۔'' فرحان نے مشورہ دیا۔

''آپ نے میرے دل کی بات کر دی۔ میں بھی اسی کے پاس جانا چاہ رہی ہوں۔ کل ہی اس کا اپائنٹمنٹ لے لیتی ہوں۔'' آمنہ نے خوشی سے فرحان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

اگلے ہی دن وہ ڈاکٹر فرزانہ کے پاس پہنچے۔ اس نے اس کا چیک اپ کیا۔ کچھ ضروری ہدایات دیں اور ساتھ، ساتھ کچھ ٹیسٹ بھی کروانے کے لیے دیے۔

''ٹیسٹ کی رپورٹس آجائیں تو طاقت کی دوائیں بھی لکھ دوں گی مگر ٹیسٹ فوراً کروا کے لے آنا۔ فرحان یہ آمنہ ہمیشہ کی غیر ذمے دار ہے اب تم نے یہ ذمے داری اٹھانی ہے سمجھے۔''

''اے ہماری بچپن کی سہیلی آپ فکر ہی نہیں کریں۔ اب یہ سارے ٹیسٹ کروا کر جلد از جلد لانا میری ذمے داری ہے۔'' فرحان نے پیار سے فرزانہ کے سر پر چپت لگائی اور لیبارٹری کی طرف چل دیا۔ واپسی میں فرحان نے آمنہ کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں اسے کھانا کھلوایا۔

ایک ہفتے کے بعد فرحان ہی رپورٹس لے کر فرزانہ کے پاس پہنچا۔ اس نے آمنہ کی خیریت پوچھی اور رپورٹس دیکھنے لگی۔

''فرحان تم دونوں نے شادی سے پہلے اپنا بلڈ ٹیسٹ نہیں کروایا؟''

''فرزانہ بھلا کیوں کرواتے ہم ٹیسٹ! تم بھی اوصاف والی باتیں کر رہی ہو۔'' فرحان نے بدمزگی سے کہا۔

''اچھا تو یہ بات تھی۔ فرحان تم پڑھے لکھے ہو کر ایسی بات کر رہے ہو، اوصاف کی بات مان لی ہوتی تو اچھا تھا۔ آمنہ کا بلڈ گروپ negative ہے۔ اب اگر تمہارا positive ہوا تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ دوسرے اس کے خون میں minor leucemia آیا ہے۔ اب خدانخواستہ تمہارے خون میں بھی آیا تو بچے کو صحت کے کئی مسائل ہو سکتے ہیں۔''

''فرزانہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' فرحان نے بوکھلا کر کہا۔

''اب تم بھی اپنے ٹیسٹ کروا کر میرے پاس لے آؤ اور آمنہ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، وہ ٹینشن لے گی۔''

فرزانہ نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر فرحان کو دیے۔ گھر آیا تو اس کی خاموشی دیکھ کر آمنہ پریشان ہوگئی تو بہ مشکل فرحان نے اسے ٹالا۔

''کوئی بات نہیں جانم بس اب ہم اپنے آنے والے مہمان کے لیے تیاری شروع کریں گے تم لسٹ بناؤ کیا، کیا لینا ہے، وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا اور پھر تو ہمارے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوگا۔'' فرحان نے پیار سے کہا۔ اس کی رپورٹس آنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ انہیں لے کر وہ آفس سے سیدھا فرزانہ کے کلینک پہنچا۔ آمنہ کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا بس کہہ دیا تھا کہ ''آج آفس میں کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جائے گی۔ تم پریشان مت ہونا۔''

''ہیلو ڈاکٹر کیسی ہو؟ سب کیسا چل رہا ہے؟''

فرحان نے تکلفاً اس کا حال چال پوچھتے ہوئے رپورٹس اس کے سامنے رکھیں۔

''سب ٹھیک ہے فرحان! تم بتاؤ آمنہ کیسی ہے اور تم کیسے ہو؟ آفس کیسا جا رہا ہے۔'' فرزانہ نے رپورٹس پڑھتے ہوئے فرحان کی طرف دیکھا۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہاری فیملی میں کون، کون سی

بیماریاں common ہیں؟ مطلب شوگر، بلڈ پریشر، پولیو، اندھا پن، بہرہ پن یا کچھ اور...... شکر خدا کا تمہارے بلڈ میں لیوکومیا نہیں پایا گیا۔ مگر دوسری بیماریوں کا خطرہ بہرحال ہے۔ دیکھو حمل ہونے سے پہلے ہی لڑکی کو مناسب مقدار میں آیوڈین اور فولا دکھلانا ضروری ہے۔ بہر حال اب آمنہ کی خوراک کا تمہیں بہت خیال رکھنا ہوگا جس میں یہ اہم اجزا شامل ہوں، وہ خاص طور پر اسے کھلاؤ، کچھ دوائیں بھی میں لکھ کر دے رہی ہوں۔ باقاعدگی سے کھلانا اور باقاعدہ چیک اپ کے لیے لانا، سمجھے۔''

''جی ڈاکٹرنی صاحبہ جو آپ کا حکم ......اب اجازت، آمنہ انتظار کر رہی ہوگی، اپنا بہت خیال رکھنا سہیلی۔'' فرحان نے خوش دلی سے کہا۔

نو مہینے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ فرحان دفتر میں تھا جب اس کی امی کا فون آیا کہ'' آمنہ کو فوراً اسپتال لے جانا ہے، جلدی گھر پہنچو......''

''جی امی بس ابھی آتا ہوں، آپ آمنہ کو تیار کیجیے۔''

آفس سے ہی فرحان نے فرزانہ کو فون کر دیا تھا۔

''پریشان مت ہو! تم ٹینشن لوگے تو آمنہ بھی ٹینس ہوگی۔ میں اسپتال میں ہی ہوں تم لوگ فوری پہنچو۔''

فجر کی اذان کے ساتھ ہی ایک معصوم سی رونے کی آواز نے دنیا میں آنے کا اعلان کیا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ خود اپنی گود میں نیلے کمبل میں لپٹے ہوئے بچے کو لے کر لیبر روم سے باہر آئی۔

''مبارک ہو آنٹی پوتا ہوا ہے اور چونکہ اس کے ماں، باپ کی میں مشترکہ سہیلی ہوں اسی لیے پہلے میں نے اسے پیار کیا اب دادی اور نانی کا حق بنتا ہے یہ لیجیے۔''

آمنہ کی امی نے فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس سے بیٹی کی خیریت پوچھی۔ رو، رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

''آنٹی ابھی تک آپ فرزانہ کے لیے اسی طرح پریشان ہوتی ہیں جیسے جب وہ ہمارے ساتھ اسکول جاتی تھی۔ اب وہ بڑی ہوگئی ہے خود ماں بن گئی ہے... اور فرحان کی ذمے داری ہے۔'' فرزانہ نے ان کو ماتھے پر پیار کیا اور تسلی دی۔

''فرزانہ بیٹی، ماں کے لیے بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔ چاہے جتنے بھی بڑے ہو جائیں، کل تمہاری امی سے بات ہوئی تھی وہ تمہاری طرف سے پریشان تھیں کہہ رہی تھیں ہر وقت اسپتال میں مصروف رہتی ہے۔ دن کی خبر ہے نہ رات کی......''

''آپ بھی ناں چلیں آئیں آمنہ سے تو مل لیجیے۔'' فرزانہ ہنستے ہوئے بولی۔

دونوں گھروں میں دل بھر کر خوشیاں منائی گئیں۔ آمنہ اور فرحان کی خوشی قابلِ دید تھی۔ سب دوست بھی مبارک باد کے لیے آئے۔ پارٹی، پارٹی ایک رٹ تھی ان سب کی۔ وہ کتنے بھی بڑے ہو گئے تھے مگر جب ملتے تو اسکول کے بچے بن جاتے۔ پارٹی ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔

آمنہ اور فرحان کیری کاٹ میں ننھے عمران کو لے کر آئے تو سب نے خوشی سے نعرے لگائے۔'' ماشاءاللہ نظر بد دور'' کہہ کر سب نے بچے کی نظر اتاری۔ خواتین نے حسبِ عادت زور، زور سے بولنا شروع کر دیا۔ کسی نے ایک دم کہا۔

''آہستہ بولیے خواتین، بچہ آرام سے سو رہا ہے اگر اٹھ گیا تو ماں، باپ کو سکون سے نہیں بیٹھنے دے گا۔''

''ارے نہیں دوستو... ! ہمارا بیٹا ماشاء اللہ بہت ڈسپلن والا ہے۔ شور سے ڈسٹرب نہیں ہوتا۔ جب دل چاہتا ہے اٹھتا ہے، روتا ہے، دودھ پیتا ہے، سو جاتا ہے، ہم تیز آواز میں ٹی وی دیکھتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔'' فرحان ہنستے ہوئے بولا۔

''واہ بھئی کیا زبردست بات ہے، ہمارے بچے تو شور برداشت ہی نہیں کر سکتے، خوش قسمت ہو تم دونوں۔''

اوصاف اور فرزانہ نے ایک دوسرے کو ذومعنی انداز میں دیکھا۔ مگر کچھ بولے نہیں...... کہیں پچھلی دفعہ کی طرح بدمزگی نہ ہو جائے۔ سب نے مزے سے کھانا کھایا۔ ننھا عمران اٹھا تو فرزانہ نے اسے گود میں اٹھایا، پیار کیا اس سے اسی کے انداز میں باتیں کیں پھر آمنہ

کو دے دیا۔

اگلے دن فرزانہ نے فرحان کو آفس میں فون کیا، خیریت پوچھی، فرحان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ابھی کل ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔''

''فرحان تم نے بچے کو چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا؟ ویکسی نیشین وغیرہ کروائی؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''ہاں ویکسی نیشن تو باقاعدگی سے کروا رہے ہیں، ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑی ابھی تک۔ بس پیدائش پر ہی دکھایا تھا اب تو کچھ نہیں کیا۔'' فرحان بے پروائی سے بولا۔

''پڑھ لکھ کر بھی فرحان تم نے حد کر دی۔ کیا کہوں تم کو فوراً عمران کو چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس لے کر جاؤ۔ میں تم کو اس کا نمبر بھیج رہی ہوں۔ میرا نام لینا فوراً اپائنٹمنٹ مل جائے گی۔'' فرحانہ کے لہجے میں کڑواہٹ فرحان نے اپنے دل میں محسوس کی۔

شہر کے سب سے بڑے چائلڈ اسپیشلسٹ سے فرزانہ نے ٹائم لے دیا۔ طے شدہ ٹائم پر دونوں میاں بیوی ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو فرزانہ بھی موجود تھی۔ دونوں ڈاکٹر نے مل کر ننھے عمران کا چیک اپ کیا۔ آپس میں گفتگو کی پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر فرزانہ نے کھنکھار کر بولنا شروع کر دیا۔

''آپ دونوں نے کبھی بچے کو آواز دی تو اس نے رسپانس دیا؟ کبھی شور سے ڈسٹرب ہوا؟ نہیں ناں آپ نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟''

''ہم سمجھے ابھی چھوٹا ہے بڑا ہوگا تو خود بخود رسپانس دے گا۔''

ڈاکٹر نے بچے کے کان کے پاس گھنٹی بجائی مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔'' دیکھا آپ دونوں نے... آج کل تو بچے پیدا ہو کر فوراً ہی آواز کی طرف سر گھماتے ہیں تا کہ چھ مہینے کا بچہ تو آوازوں پر کافی الرٹ ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر محسن نے تھوڑی دیر توقف کے بعد بولنا شروع کیا۔

''ابھی بچہ بہت چھوٹا ہے..... حتمی رائے نہیں دے سکتے آپ ENT اسپیشلسٹ کے پاس اس کو لے جائیں۔''

''آپ کچھ تو بتائیں اس کو کیا مسئلہ ہے، یہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں۔'' فرحان بے تابی سے بولا۔

آمنہ نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پایا ہوا تھا۔

''فرحان لگتا ہے بچہ قوتِ گویائی وسماعت سے محروم ہے مگر تم لوگ ہمت نہ ہارو، اللہ سے دعا کرو وہ تو ہمارے حق میں بہتری فرمائیں گے۔'' فرزانہ نے آمنہ کو گلے سے لگا کر کہا۔ آمنہ کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

کیسے وہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے گھر پہنچے، کیسے گھر والوں کو صورتِ حال بتائی۔ بس ایک قیامت گزر گئی۔

''اوصاف ٹھیک کہہ رہا تھا، میں نے اس کی بات سمجھنے کے بجائے اس سے قطع تعلق کر لیا۔'' فرحان نے کمرے میں آ کر آمنہ سے کہا۔

''اوصاف نے کیا کہا تھا اور تم نے مجھے نہیں کیوں بتایا؟ بولو فرحان۔''

ٹھنڈی سانس بھر کر فرحان نے اس شام کا واقعہ بتایا کہ شادی سے پہلے بلڈ اسکریننگ کتنی اہم ہوتی ہے۔

''فرزانہ نے بھی کہا تھا کہ حمل سے پہلے اور بعد میں خواتین کو کیا کھلانا چاہیے، کیا نہیں لیکن میں نے بعد میں تو تمہاری خوارک کا خیال رکھا مگر پہلے نہیں...... اگر پہلے ٹیسٹ ہو جاتے تو تمہاری غذا میں وہ اجزا شامل ہوتے.... جن کی تم میں کمی ہے یا مجھ میں کمی یا زیادتی ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔''

آمنہ نے شوہر کی حالت دیکھتے ہوئے اپنی ہمت مجتمع کی، کسی کو تو سمجھداری دکھانی تھی، یہ وقت رونے کا نہیں بلکہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کا تھا۔

''فرحان، اب بھی ہمارے پاس وقت ہے، کل ہی اوصاف سے معافی مانگنے ہم چلیں گے اور اب وہ اور فرزانہ جیسا کہیں گے وہی کریں گے تاکہ آئندہ ہمارے ہاں نارمل بچے ہوں۔'' دونوں ایک عزم کے ساتھ بڑے پیار سے بچے کو دیکھنے لگے۔



ناولٹ

جو دھڑکا وہ دل تھا

بنتِ سحر

''چار سال بعد حسن علی کو زویا سے محبت ہوگئی ہے......'' رنگ محل کی کھڑکیوں ،دروازوں سے جیسے خوشبوئیں باہر لپکی تھیں...... یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ یہ کیوں ہورہا تھا......؟ حسن علی اور زویا سے محبت؟ نہیں......نہیں...... یہ شاید اس کا وہم تھا......جگمگاتے فانوسوں کی ست رنگی روشنیوں کے درمیان کھڑی وہ زویا تھی......باوقار انداز میں کسی سے بات کرتی ہوئی...... ڈیپ ریڈ کلر کا انارکلی فراک پہنے وہ اتنی ہی عام لگ رہی تھی جتنی چار سال پہلے تھی...... باوردی ویٹر اس کے سامنے سے گزرا تھا۔اس نے اسے باوقار انداز میں بلایا تھا۔

''اورنج جوس......پلیز......'' اب وہ ٹشو سے گلاس کے کنارے صاف کرتی ہوئی جوس پی رہی تھی......گہری ذہانت سے بھری آنکھوں میں بلا کی نخوت تھی۔

مدھم میوزک کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ حسن علی کرسی پر گر سا گیا۔ ذہن کی چوکھٹ پر وہ برفیلی شام اتر آئی......وہ سانولی سی لڑکی اس



کے سامنے کھڑی تھی۔
''تمہیں کیا لگتا ہے، میں تم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کروں گا......تم میرا آئیڈیل نہیں ہو......ہو ہی نہیں سکتیں......کیا ہے ایسا تم میں کہ میں تمہیں ایک لحہ بھی سوچے بغیر اپنی زندگی میں شامل کرلوں......؟'' وہ پوچھ رہا تھا......اور وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ جیسے کھڑے، کھڑے زمین میں گاڑدی گئی ہو...... پہلا آنسو...... دوسرا......موتیوں کی لڑیاں بکھر رہی تھیں......وہ اس کے چمکتے بوٹوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔
''نہ اس وقت میری زندگی میں تمہاری جگہ ہے اور نہ ہی چار سال بعد ہوگی۔''
اور اب چار سال بعد...... وہ جملے حسن علی کو پسپا کررہے تھے......اب وہ کیسے زویا کے سامنے جائے اور کہہ دے......
''زویا اکرام مجھے تم سے محبت ہے۔''
اور وہ سانولی سی لڑکی جو اورنج جوس کے سپ لے رہی تھی......وہ برفیلی شام کے منظر کو اپنی یادداشت کے خانے میں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ نہیں بھولی......کچھ بھی نہیں......
اور وہ......سر جھکائے بوٹوں سے کارپٹ کی پٹیوں کو اکھاڑنے کی کوشش میں تھا...... دور سے وقت کی راہداریوں سے اسے اپنی آواز سنائی دی تھی......اسے اس آواز سے خوف آیا تھا...... بے تحاشا خوف......
''دادی......وہ میرے لائق نہیں ہے...... میں کیسے ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرلوں جس کا اسٹیٹس، قابلیت، کچھ بھی تو مجھ سے میچ نہیں کرتا......
ican,t do this'' اور پردے تھامے کھڑی زویا اکرام پتھر ہوئی تھی۔ گویا کوئی مجسمہ......وہ سیڑھیوں پر بیٹھی رورہی تھی......اور تب...... غیر ارادی طور پر اس نے اپنی دانست میں حسن علی کو بددعا دی تھی۔
''اللہ کرے......تمہیں مجھ سے محبت ہوجائے۔''
اور جب وہ اس دعا کے کبھی قبول نہ ہونے کا یقین بھی کرچکی تو......خیر......دعاؤں کی ڈائری سے کسی سوکھے پھول کے مانند وہ دعا قبولیت کے درجے میں داخل ہوچکی تھی۔
''چار سال بعد حسن علی کو زویا سے محبت ہوگئی ہے......''

وہ بے خبر ہے......اور وہ باخبر تھا......رنگ محل کے احاطے میں محبت کی رونمائی ہونے والی تھی۔ گلدانوں میں سجے گلابوں کی مہک ابھری اور سارے میں بکھر گئی۔
اور حسن علی اسٹیچو بنا بیٹھا ہے، کوئی حرکت نہیں...... ہر جنبش سے خالی......

☆☆☆

مجھے ان سب کی جانچتی، پرکھتی نظروں سے خوف آیا تھا......وہ سارے مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے...... میں الیاس ماموں کے پیچھے چھپنے کی کوششوں میں تھی۔ رنگ محل کی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوتی نارنجی دھوپ میں سب کے چہروں کے تاثرات دیکھنا مشکل نہیں تھا۔ مگر کاش یہ مشکل ہوتا۔
احمر کی زبان پھسلی تھی ''یہ تو......'' فضا نے اپنے بھائی کو زور سے چٹکی کاٹی تھی۔
اریبہ نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ سستے کاٹن سوٹ میں ملبوس، سوفٹی چپل پہنے، الجھے بال وہ سانولی رنگت والی لڑکی کم از کم ایسی شخصیت ہرگز نہیں تھی کہ اس پر دوسری نظر ڈالنے کی خواہش دل میں ابھرتی۔ اسی لیے اس نے بے رحمی سے تبصرہ کیا تھا۔
''اسارہ پھپھو تو بہت خوب صورت تھیں مگر یہ تو ان جیسی بالکل بھی نہیں......'' مجھے اس کا یہ تبصرہ جیسے لہولہان کرگیا تھا۔ میں چپ پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن پر نظر جمائے کھڑی رہی......جس سے اب بھی خون رس رہا تھا۔
''جاؤ......زویا، وہاں بیٹھ جاؤ......'' الیاس ماموں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔
صوفے کی دوسری طرف ''وہ'' بیٹھا تھا۔ کلر پینسلز سے بائیولوجی کی ڈائیگرامز بنا رہا تھا۔ ان سب میں سے وہ سب سے بے نیاز نظر آتا تھا۔ جیسے کسی دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا اس کی شان کے خلاف ہو......
بہرحال ایک بات ماننے والی تھی کہ اس کے تیکھے نقوش میں بلا کی کشش تھی...... سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے ......ٹراؤزر، ٹی شرٹ میں وہ ملبوس تھا...... میں صوفے کے کونے پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ وہ اچھلا۔
lease stay away from me" اور میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی......اور پہلا بار...... ہاں......شاید پہلی بار مجھے اس کرب سے بھ

زیادہ کا سامنا کرنا پڑا تھا جو میں امی کی وفات کے بعد سے کرتی آرہی تھی...... تب مجھے اپنی ڈائری میں لکھی اس نظم کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ یہ نظم مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ جبکہ میں اس کا مطلب پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی اور...... مگر اب مجھے اسی نظم کے لفظوں سے خوف آرہا تھا۔

ننھی لڑکی......
تم اندھیروں سے ڈرتی ہو
سنسان راہوں سے خوفزدہ ہوتی ہو
مگر اصل خوف تب ہوگا
جب کوئی تمہارا نہ ہوگا
تب لفظ ڈرائیں گے
لہجے خوفزدہ کریں گے
تب تم سمجھوگی
ڈر کیا ہوتا ہے
افسوس...... تم ننھی لڑکی ہو......

میں وہیں کھڑی تھی جب گلاس ڈور کھول کر وہ اندر آئیں ذرا رکیں...... اور پھر وہیں ٹھٹک گئی تھیں۔ سفید چکن کا سوٹ پہنے وہ وہ بہت گریس فل لگ رہی تھیں...... ان کا چہرہ جیسے نور سے بھرا ہوا لگتا تھا۔ وہ میری طرف بڑھی تھیں اور مجھے گلے سے لگالیا تھا۔

''میری بچی...... میری زویا...... کتنی پیاری ہوگئی ہے...... اور...... آنکھیں تو ہو بہو اسارہ کے جیسی ہیں۔''

مجھے خود سے لگائے ہوئے ہی الیاس ماموں کی طرف پلٹی تھیں۔

''اس کی آنکھوں کو دیکھو الیاس...... یوں لگتا ہے میری اسارہ ان آنکھوں سے جھانک رہی ہو......''

''جی اماں! اس کی آنکھیں اسی جیسی ہی ہیں...... روشن...... چمکیلی......'' الیاس ماموں مسکرائے تھے۔ نانی نے مجھے اپنے آپ سے لپٹایا ہوا تھا اور پہلی بار مجھے لگا تھا۔ ''زویا اکرام...... تم اکیلی نہیں ہو۔'' ان کے وجود سے شفقت سی امڈ رہی تھی...... مجھے جیسے امی کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔

''پتا ہے میں نے تمہارے لیے نئے کپڑے سلوائے ہیں...... جوتے بھی بنوائے ہیں...... اور ڈھیر سارے کھلونے بھی......''

''دادی، وہ بچی نہیں ہے جو کھلونوں سے کھیلے گی۔'' احمر ہنسا تھا

دادی نے خشمگیں نظر اس پر ڈالی تھی۔ الیاس ماموں نے انہیں متوجہ کیا تھا۔

''اچھا اماں...... چلتا ہوں...... آفس میں ضروری میٹنگ ہے......'' وہ میرے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ نانی مجھے اپنے کمرے میں لے آئی تھیں جہاں ہم دونوں کو اکٹھے رہنا تھا۔ کمرا کشادہ اور ہوا دار تھا...... بڑے پٹ والی دو کھڑکیاں تھیں جو باہر کی جانب کھلتی تھیں...... دیوار گیر اسٹائلش سی الماری تھی...... اٹیچ باتھ بھی تھا...... پورے کمرے کے فرش پر ایرانی غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ گلدانوں میں سجے پھول تازہ تھے اور ان کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔

وہ زویا اکرام کا رنگ محل میں پہلا دن تھا۔

☆☆☆

اور رنگ محل کے باسیوں سے میرا تفصیلی تعارف دوپہر کے کھانے پر ہوا تھا۔

نانی اماں کے دو بیٹے تھے، الیاس ماموں اور رضوان ماموں...... نزہت مامی اور ندرت مامی دیورانیاں ہونے کے ساتھ، ساتھ سگی بہنیں بھی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رنگ محل میں شانتی اور سکون تھا...... نزہت ممانی کے دو بچے تھے۔ احمر اور فضا...... جبکہ ندرت مامی کے اریبہ اور حسن تھے۔

دوپہر کے کھانے کی میز اتنی طویل اور انواع اقسام سے بھرپور تھی کہ مجھے وہ دسترخوان یاد آیا تھا جو میں اور امی فرش پر بچھاتی تھیں۔ امی کی یاد نے جیسے مجھے اداس کردیا تھا...... نانی مختلف ڈشیں اٹھا، اٹھا کر میرے سامنے رکھ رہی تھیں۔

''زویا...... بیٹا لو ناں...... یہ سب کچھ میں نے تمہارے لیے بنوایا ہے۔ یہ تمہارا بھی گھر ہے۔''

''دادو...... یہ اس کا گھر نہیں ہے، یہ ہمارا گھر ہے۔'' بریانی میں چمچ ہلاتا وہ زبردست انداز میں چونکا تھا۔ نانی نے سالن میرے سامنے رکھی پلیٹ میں ڈالا تھا۔

''یہ زویا کا بھی گھر ہے...... اب یہ بھی یہیں رہے گی۔'' میری نظریں اس پر ہی تھیں۔ مجھے لگا تھا اس کو میرا یہاں رہنا ناگوار گزرا تھا...... اور میں سچ ہی سمجھی تھی۔ وہ جیسے میری طرف دیکھ کر ناگواری سے بولا تھا۔

"but why...?" نانی جیسے اس کی بات نہیں سمجھی تھیں..... مگر میں سب سمجھ رہی تھی۔

''میں اپنی یتیم نواسی کو اکیلا چھوڑ دوں.....؟'' ان کے انداز میں غصہ تھا۔

''آئی ڈونٹ کیئر..... بٹ آئی تھنک orphans کی جگہ یتیم خانہ ہی ہوتی ہے۔'' وہ کرسی دھکیلتا ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر منہ صاف کرتا ہوا بولا تھا۔

زندہ درگور ہونا کسے کہتے ہیں مجھے رنگ محل میں اپنے پہلے دن کی گزری دوپہر میں پتا چل گیا تھا..... میں نے پلیٹ دھکیلی تھی۔ ندرت مامی اٹھ کر میری طرف آئی تھیں۔

''سوری بیٹا..... حسن شروع سے ہی موڈی اور پوزیسو نیچر کا ہے..... تم یہ پاستا لو ناں.....'' وہ مجھے بہلا رہی تھیں۔ میں بچی نہیں تھی سب سمجھتی تھی..... میں نے ڈش پکڑ لی تھی۔ نانی خاموش سی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میں لاتعلق سے انداز میں پاستا کھانے لگی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نانی کے کمرے میں آ گئی تھی..... زندگی نے اس طرح رنگ بدلا تھا کہ میں ''حیران'' رہ گئی تھی..... نارنجی شام جب رنگ محل میں اتری تو وہ سب لان میں جمع تھے..... رنگ محل روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ ایک پل کو مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ "dreamland" ہو..... اور میں اس ڈریم لینڈ کی نک چڑھی باسی ہوں..... زینت بوا چائے اور اسنیکس سرو کر رہی تھیں..... کیکٹس کے پودوں پر خاکستری رنگ کی تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔

''تو آپ کے کیا مشاغل ہیں؟'' احمر نے چٹکی بجا کر مجھے متوجہ کیا تھا۔ میں نے سر اٹھایا تھا۔

''جی کچھ نہیں..... بس اسٹڈی.....''

''کون سی کلاس میں ہیں آپ؟''

''جی..... میں نے ایف ایس سی کیا ہے.....''

سب میری طرف متوجہ تھے..... میری نظریں لش گرین گھاس پر جمی تھی۔

''واؤ..... گریٹ..... آپ کا فیورٹ سبجیکٹ کون سا ہے؟''

اس سوال پر میں نے حسن علی کا جھکا ہوا سر اٹھتے ہوئے دیکھا تھا..... اریبہ رف پیپر پر کوئی اسکیچ ڈرا کر رہی تھی۔

''بائیولوجی.....'' میں نے جواب دیا..... احمر نے حسن کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''اس کا مطلب ہمارے خاندان میں ایک اور ''بائیولور'' آ چکا ہے.....'' تیکھی ناک والا وہ لڑکا پہلو بدل کر رہ گیا تھا.....

''اُف پلیز، اسٹاپ اٹ..... بائیو کی ڈائیگرامز اور چیپٹرز دیکھ کر ہی میرا تو سر چکرانے لگتا ہے۔'' فضا نے لمبی سی چیخ آزاد کی تھی۔ مجھے یہ بعد میں پتا چلا تھا کہ فضا بائیو سے الرجک تھی اور اسی لیے اس نے آرٹس کے مضامین چنے تھے۔ اریبہ نے اسکیچ مکمل کر کے ادھر ادھر لہرا کر ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا..... اور پھر اس ماسٹر پیس کو ٹیبل پر رکھ دیا۔ سارے اس پر ٹوٹ پڑے تھے اور اپنی، اپنی ماہرانہ رائے دے رہے تھے۔

"It so unpredictable" احمر نے سر کھجایا۔

''کچھ جانا پہچانا سا ہے.....'' فضا نے غور سے اسکیچ دیکھا اور بڑبڑائی تھی۔

حسن نے خالی اسنیکس کا پیکٹ ڈسٹ بن میں اچھالا اور ٹیبل پر جھک گیا تھا..... چند ثانیے دیکھتا رہا..... جائزہ مکمل ہوا تو پہلے ان سب کو دیکھا پھر دوسری نظر اریبہ پر ڈالی جو جوش و خروش سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

''آئی تھنک..... اریبہ یہ تم ہو..... جو اپنے لمبے بال بکھرائے کھڑکی سے جھانک رہی ہو..... ایم آئی رائٹ.....؟'' وہ اب پوچھ رہا تھا..... اریبہ نے صدماتی کیفیت میں اسکیچ اٹھایا اور نفی میں سر ہلایا تھا..... رنگ محل پر سنہری شام جیسے روشنیوں کے رتھ پر سوار ہو کر آئی تھی..... میں نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور بے دھیانی میں میرے منہ سے پھسلا۔

''میں جانتی ہوں یہ کیا ہے؟'' اریبہ نے حیرانی سے اسکیچ فولڈ کرتے ہوئے مجھے دیکھا..... جیسے وہ اس بات پر ایک پرسنٹ بھی یقین نہیں کرنا چاہتی ہو۔ میں کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"Its rapunzal" میں یہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھ آئی تھی..... دروازے کے ہینڈل پر میرا ہاتھ تھا جب میں نے حسن کی استہزائیہ ہنسی سنی تھی۔

"wrong answer" اب میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا..... اریبہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں حسن..... اس نے ٹھیک کہا یہ راپنزل کا ہی

اسکیچ ہے......'' اور اس بار حسن کے تاثرات دیکھنے کو میں رکی نہیں تھی...... دروازہ دھکیلتے اندر آ گئی تھی۔

رنگ محل میں شامیں بڑی شان سے اترتی تھیں...... رنگ محل کے در و دیوار جیسے کسی طلسم کی لپیٹ میں لپٹے نظر آتے تھے...... طلسم کے استعاروں کو یہاں مجسم دیکھا جا سکتا تھا...... ہاں یہ سچ ہی تو تھا......

☆☆☆

میں لاؤنج میں بیٹھی کتابوں پر اپنا نام وغیرہ لکھ رہی تھی جو کل ہی رضوان ماموں لائے تھے اور پرسوں انہوں نے میرا داخلہ کروانے بھی جانا تھا۔ لاؤنج کی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور نرم گرم سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میرے قریب آن رکی تھی۔

''ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں...... چلو گی؟'' یہ آفر تھی یا سوال کی کوئی قسم میں نہیں سمجھ سکی تھی۔ میں نے سامنے پڑے کتابوں کے ڈھیر کو اور پھر اریبہ کو دیکھا جو منتظر نظروں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

''سوری...... میں بزی ہوں، آپ ہو آئیں...... ویسے بھی مجھے شاپنگ کا اتنا شوق نہیں ہے......'' میں نے مسکرا کر کہا تھا۔ اریبہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ فضا سیڑھیوں سے اتر رہی تھی...... اور وہ ہاتھ میں بریسلٹ تھامے ہوئے تھی...... اریبہ نے اسے دیکھا تھا۔

''جیولر کے پاس بھی جانا ہے کیا؟''

''ہاں...... اریبہ...... بریسلیٹ کا ڈائمنڈ گر گیا تھا...... ٹھیک کروانا ہے۔''

''تم بھی چلو ناں زویا......'' فضا کی... نظر مجھ پر پڑی تھی۔

''نہیں فضا...... میں کام کر رہی ہوں۔'' میں نے بکس کے ٹائٹلو پر نظر ڈالی تھی۔ وہ ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ باہر سے زوردار ہارن کی آواز آئی...... اریبہ نے ٹیبل سے گزرتے ہوئے شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا تھا۔

''ایک تو یہ دونوں ہر وقت جلدی میں ہوتے ہیں...... ایسی افراتفری مچاتے ہیں کہ بندہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ کون سا کام ضروری سر انجام دینا تھا۔'' فضا کچن کی طرف لسٹ لینے گئی ہوئی تھی جب تک وہ آئی اریبہ، حسن اور احمر کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھی۔

''جب تک ہم جیولر کے پاس ٹھہریں گے تب تک حسن اور احمر کچن کا سامان اسٹور سے لے آئیں گے......'' فضا نے فٹافٹ پروگرام طے کیا تھا۔ اریبہ نے قہقہہ لگایا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں آسانی سے یہ کام کر لیں گے؟''

''ہاں...... بھئی...... یہ دونوں تو بڑے سگھڑ ہیں...... خیر...... اب چلو...... کیا پتا غصے میں ہمیں یہیں چھوڑ کر ہی چلے جائیں۔'' وہ دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ میں نے گلدانوں میں سجے لمبی ٹہنیوں والے پھولوں کو دیکھا تھا جو ابھی بوا سیٹ کر کے گئی تھیں...... کتابوں کا کام مکمل کر کے میں حفاظت سے کتابیں نانی کے کمرے میں رکھ آئی تھی۔ اب میں گھوم پھر کر رنگ محل کا جائزہ لے رہی تھی...... طویل قدیم طرز کی راہداریاں تھیں...... چار برآمدوں کے سیٹ تھے...... سارا فرش سرخ ٹائلز کا تھا جو پانی پڑتے ہی چمکنے لگتا تھا...... لاؤنج سے دو طرف سیڑھیاں اوپری منزل کی طرف جا رہی تھیں...... اوپری منزل پر چار کمرے تھے اور ٹیرس پر دو دھانی جھولے تھے جن پر بیٹھ کر اکثر اریبہ اور فضا پڑھا کرتیں یا واک مین کانوں پر چڑھائے میوزک سے لطف اندوز ہوتی نظر آتی تھیں۔ ٹیرس پر اسپراگس اور کیکٹس کے گملوں کے ساتھ، ساتھ چند پودے چنبیلی کے بھی نظر آ رہے تھے جن کی خوشبو جیسے چاروں طرف سے رنگ محل کو اپنے حصار میں لے لیتی تھی...... اوپری منزل کی ہفتہ وار صفائی ہوتی تھی کیونکہ ایک تو یہاں آمد و رفت کم تھی دوسرا یہاں کے مکین فراغت کے وقت اوپر کا چکر لگاتے تھے۔

میں دھانی جھولے پر بیٹھی سوچ رہی تھی ...... یہ زندگی بھی کیسے، کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا ننھیال ایسا ہوگا۔ امی کی پسند کی شادی کے فیصلے نے نانی، نانا سے تعلق کا خاتمہ کروا دیا...... مگر رشتے اور خون کے تعلق ختم نہیں ہو سکتے کبھی نہیں...... اگر نانی سب بھلا کر ماموں کو مجھے نہ لینے بھیجتیں تو میں آج کہاں ہوتی...... شاید انہی تنگ و تاریک گلیوں والے اندھیرے گھر میں پڑی سسک رہی ہوتی۔

میں نے آنکھوں میں آئے آنسو آہستہ سے دوپٹے سے پونچھ لیے تھے...... میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے آنسو دیکھے...... اور میں بے خبر تھی کہ کوئی میرے آنسو دیکھ

چکا تھا۔
مجھے یہاں آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور جو انجان جگہ پر رہنے کی فطری سی جھجک ہوتی ہے وہ کسی حد تک دور ہو چکی تھی۔ میں نے پردے سمیٹ کر ایک سائڈ پر کر دیے تھے۔ ٹیبلٹس باکس سے نانی کی دوائیاں نکالیں اور کچن سے ایک گلاس دودھ لے آئی تھی۔ سارا کمرا ہلکے گلابی رنگ میں پینٹ کیا ہوا تھا جو آنکھوں کو ذرا بھی نہیں چبھتا تھا۔ رنگ محل کے ہر کمرے کا پینٹ مختلف تھا۔ ہر کمرا ایک نئی حیران کن جگہ تھی اور ہر بار مجھے حیرت سی ہوتی تھی ...... نانی نے گولیاں نگل کر دودھ کا لمبا گھونٹ بھر کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''آج کل انسانوں کو عجیب و غریب بیماریاں چمٹ گئی ہیں پہلے کہاں ایسے ہوتا تھا......'' میں جو دور نظر آتے مکانات پر نظر جمائے کھڑی تھی۔ نانی کی بات پر چونک گئی۔

''جی نانی...... ٹیکنالوجی کا استعمال جہاں فائدہ مند ہے دوسری طرف مضر اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں...... امی بھی جان لیوا بیماری کا شکار ہوئی تھیں......'' میری آنکھوں میں نمی آنے لگی۔ میں ذرا سا رخ موڑ گئی تھی۔

''زویا...... اسمارہ کو کیا ہوا تھا؟''

''بلڈ کینسر......'' میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

''بہت تکلیف میں رہی ہو گی میری بچی......'' وہ جیسے افسردہ ہوئی تھیں...... میں ان کی طرف پلٹی تھی اس بار میں نے آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی...... کھلی کھڑکیوں سے سنہری دھوپ کارپٹ میں جذب ہو رہی تھی۔ میں آہستہ سے چلتی ہوئی بیڈ کے کنارے آ بیٹھی تھی۔

''پتا ہے نانی وہ وقت قیامت جیسا تھا...... میں اور امی بھری دنیا میں اکیلے تھے...... دن بھی راتوں سے مشابہ تھے۔ ہر بار نئی تکلیف...... ہر بار نئی اذیت...... راتوں کو میں میڈیکل اسٹورز کے چکر کاٹتی تھی اور امی اس اندھیرے کمرے میں خون اگل رہی ہوتی تھیں...... میں فرش صاف کر، کر کے تھک جاتی تھی...... کبھی چڑ جاتی اور کبھی بے بسی کے عالم میں رونے لگتی تھی...... ہم دونوں بہت اکیلے تھے سوائے اللہ کے ہمارے پاس کوئی سہارا نہیں تھا...... مجھے ان راتوں سے بڑا خوف آتا تھا...... جو تھا سب امی کی بیماری پر لگ گیا، میں نے اپنی سونے کی بالیاں بیچ دی تھیں۔ امی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا...... اور ماؤں سے بڑھ کر کچھ ہوتا بھی نہیں...... نانی وہ وقت بہت مشکل تھا...... بہت مشکل......'' میں رو رہی تھی۔ ان دنوں کی اذیت بھلانے والی نہیں تھی۔

''میں اندھیرے کمرے میں فرش پر بیٹھی ہوں، امی خون تھوک رہی ہیں، بادلوں کے گرجنے کی آواز آ رہی ہے...... کھڑکیوں پر اولے گر رہے ہیں...... اور...... امی دھم سے فرش پر گر پڑیں۔ خوف مجھے جکڑ رہا تھا۔ میں نے سر اٹھایا، چھت ٹپک رہی تھی...... ٹپ ٹپ...... ٹپ...... گدلا پانی میرے بالوں کی جڑوں میں جذب ہو رہا تھا...... میں باہر کی طرف بھاگی، بجلیاں کڑکنے کی آواز...... ساری گلی جل تھل تھی...... میں ننگے سر دروازے بجاتی رہی مگر کواڑ نہیں کھلے۔ وہاں ''بند دلوں'' کے ''بونے'' رہتے تھے جو کسی کی بھی مدد کو نہیں آتے...... جب میں ٹھٹھرتی ہوئی ننگے سر اور ننگے پاؤں گھر لوٹی تو بارش کے گدلے پانی میں سرخ خون جذب ہو کر سیڑھیوں سے قطرہ، قطرہ گر رہا تھا۔ بعض منظر پتھر کرتے ہیں اور میں...... پتھر ہوئی بیٹھی ہوں۔

میری امی برآمدے کے فرش پر اوندھی پڑی ہیں اور میں ان کا سر گود میں رکھے بلک، بلک کر رو رہی تھی...... امی...... آنکھیں کھولیں۔ خدا کے واسطے امی مجھے دیکھیں۔ میں بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں...... امی آنکھیں کھولیں۔ اور بند آنکھیں کہاں کھلتی ہیں؟ وہ بھی زمین اوڑھ کر لیٹ گئی تھیں۔'' نانی نے مجھے خود سے لپٹا لیا تھا۔

''نہ رو میری بچی...... میں جانتی ہوں تم دونوں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہو گی...... کتنا کہتی تھی تمہارے نانا کو کہ اسمی کو معاف کر دیں...... مگر انہوں نے ہمیشہ اپنی انا کو بلند رکھا...... مٹی میں مٹی ہو گئے مگر انا کی عمارت مسمار نہیں ہونے دی۔''

نانی رو رہی تھیں......

''اسمی ہمارے گھر کی رونق تھی جب سے گئی تو لگا رنگ محل کو قبرستان بنا گئی ایسی خاموشی کہ پو چھو مت...... در

بھی ہلتا تو وجود کانپ، کانپ جاتا تھا...... بہت وقت لگا ہے ان خاموشیوں کے ٹوٹنے میں بہت وقت......''

میری نظریں دیواروں پر ابھرتے سائے کی طرف تھیں...... تبھی دروازہ کھلا اور ندرت مامی اندر آئی تھیں۔

''ہاں بھئی...... کیا باتیں ہو رہی ہیں نانی، نواسی میں؟''

''بس...... امی کی باتیں کر رہے تھے۔''

''ہاں اماں...... امی نے بڑی تکلیف میں وقت گزارا...... خیر جو قسمت میں لکھا ہو...... انسان کی کیا مجال جو ٹال سکے......'' وہ بولی تھیں...... میں اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھنے لگی تھی۔

''درست کہتی ہو ندرت......'' نانی نے ہنکارا بھرا۔

''اماں...... آج دوپہر میں کیا بناؤں......؟'' ندرت مامی نے سراثبات میں ہلا کر نانی سے پوچھا تھا۔

''جو مرضی بنا لو ندرت...... جو سارے بچے شوق سے کھاتے ہوں......'' نانی کی بات پر ندرت دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی تھیں۔

''زویا...... تجھے جو اپنی پسند کا کھانا ہو نزہت اور ندرت کو بتا دے وہ بنوا دیں گی۔'' نانی کی غنودگی بھری آواز آئی تھی...... دوائی کا اثر ہو رہا تھا۔

''نہیں نانی...... جو سب کھائیں گے میں بھی وہی کھا لوں گی۔''

''ارے بیٹا...... تمہارا اپنا گھر ہے۔'' وہ غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی...... کاریڈور میں سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

''اپنا گھر نہیں ہے یہ میرا...... میں تو یہاں ایک ''پناہ گزیں'' کی حیثیت سے ہوں...... جو لمحوں، پل بھر کو ٹھہرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں...... جانے وقت کے کھیل میں میرا کتنا حصہ باقی ہے۔'' میں کچن میں چلی آئی تھی۔ ندرت مامی کوکنگ رینج کے سامنے کھڑی گوشت بھون رہی تھیں...... مجھے دیکھا تو مسکرا دیں۔

''کچھ چاہیے تھا زویا......؟''

''نہیں مامی...... بس میں پانی پینے آئی تھی......'' انہوں نے ایپرن کی ڈوری کستے ہوئے مجھے شفقت سے دیکھا۔

''ریفریجریٹر میں کولڈ ڈرنک رکھی ہے وہ لے لو......'' میں نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر شیلف پر رکھی اور دو شیشے کے گلاسوں میں انڈیلی...... ایک گلاس

غزل

دریا چاند ستارے فری
چپ ہیں غم کے مارے فری

ڈوب رہی ہے دل کی کشتی
دیکھ رہے ہیں سارے فری

کیوں بہتے ہیں رفتہ رفتہ
میری آنکھ کے دھارے فری

ہم کو تنہا چھوڑ گئے ہیں
اپنی جاں سے پیارے فری

کون لکھے گا درد کہانی
اکثر میرے بارے فری

اس نے لوٹ کے کب آنا ہے
خود کو کون سنوارے فری

کلام: فریدہ فری، لاہور

مامی کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔

''شکریہ زویا...... کام میں مصروف تھی تو پیاس لگی ہوئی تھی تو خیال ہی نہیں آیا.. شکر ہے کہ تم آ گئیں۔''

''کوئی بات نہیں مامی......'' میں ہولے سے مسکرا دی تھی۔

نزہت مامی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں اور اب کچن کا سارا کام... ندرت مامی کر رہی تھیں۔ وہ پھرتی سے سارا کام دیکھ رہی تھیں۔ ان کے انداز سے ذرا بھی تھکن ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ میں نے خالی گلاس دھو کر کارنر میں بنے اسٹینڈ پر احتیاط سے رکھ دیے تھے۔

''مامی...... میں آپ کی کچھ ہیلپ کرواؤں......؟'' میں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

''ارے نہیں زویا بیٹا...... میں سب کر لوں گی، تم بس ٹیبل پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہو......'' وہ ہنڈیا میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی تھیں۔

کچن میں چھوٹی سی کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی میں

اسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور تب تک کھانا بھی بن گیا تھا۔ مامی کے منع کرنے کے باوجود بھی سلاد میں نے بنا دیا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا تھا یوں انہیں اکیلے کام کرتے ہوئے دیکھنا...... اسی لیے تھوڑی بہت مدد کرنا میں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔

"sorry zoya, I was so busy" رضوان ماموں نے کھانے پر مجھ سے معذرت کی تھی۔

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''اٹلی کا ٹور تھا تو اتنا وقت لگ گیا...... کل ہی تمہارا ایڈمیشن کروادوں گا۔ اسناد وغیرہ سب ریڈی ہیں ناں......؟'' فضا اور اریبہ کھانا کھانے کے ساتھ، ساتھ کسی فیشن میگزین کے تازہ شمارے پر بحث کر رہی تھیں...... احمر اور حسن کسی کرکٹ میچ پر تبصرے کر رہے تھے جبکہ نزہت مامی، ندرت مامی کو تقریب کا احوال بتا رہی تھیں...... باقی بچے الیاس ماموں تو وہ فی الحال آفس میں تھے۔

''جی ماموں...... سب ریڈی ہے۔''

''آگے کیا ارادے ہیں؟''

''جی بی ایس سی کروں گی۔''

''گریٹ...... ایف ایس سی میں کتنے مارکس ہیں تمہارے......؟'' وہ پوچھ رہے تھے میں نے ہاتھ میں پکڑے شیشے کے گلاس پر گرفت مضبوط کی تھی۔

''جی...... ماموں...... میں نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے......''

میں نے جتنے ''عام'' سے انداز میں یہ خبر اُن کے گوش گزار کی تھی اس خبر کاری ایکشن اتنا عام ہرگز بھی نہیں تھا...... فضا اور اریبہ کی بحث ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی...... حسن اور احمر بھی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں ممانیاں بھی میری طرف متوجہ تھیں۔

سب کی نظریں میری طرف تھیں...... مجھے مرکزِ نگاہ بننا کبھی پسند نہیں رہا تھا مگر اب...... میں جھینپ گئی۔

''واؤ بھئی...... ہماری زویا تو بہت انٹیلی جینٹ ہیں...... اتنی بڑی خبر پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' رضوان ماموں میرے سر پر پیار سے چپت لگا کر بولے تھے۔

''ماشاءاللہ......'' دونوں ممانیاں بولی تھیں۔

''پتا ہے تم جب سے یہاں آئی ہو مجھے حیران کر رہی ہو...... اور یہ حیرانی مجھے بہت پسند آئی ہے۔'' اریبہ نے مجھے خاص طور پر کہا تھا۔

"you are amazing" فضا نے مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔ میں ہولے سے مسکرائی تھی اور تبھی میری نظر اس پر پڑی تھی جو اب مکمل طور پر لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا......

حسن علی ایک ایسی پہیلی تھا جو میں ان دو ہفتوں میں کسی طور نہ سلجھا سکی تھی۔ ایک ایسا سوال جو حل ہی نہیں ہو سکے۔

جانے ایسا کیوں تھا...... میں نہیں جانتی تھی...... میں...... ''بے خبر'' تھی۔ رنگ محل کی دیواروں پر سفید سے کا عکس پڑ رہا ہے......

☆☆☆

کالج کیا اسٹارٹ ہوا یوں لگا زندگی مصروفیت کی دبیز تہ میں دبتی جا رہی ہو...... دن، رات وہی تھے مگر بس اگر بدلا تھا تو انداز ہی بدلا تھا۔ میں رنگ محل کے باسیوں کی زندگی میں یوں داخل ہوئی تھی کہ نہ مجھے علم ہو سکا اور نہ انہیں خبر ہو سکی تھی...... میں نے اپنے آپ کو ان کی زندگیوں میں ''عادت'' کی طرح شامل کر لیا تھا...... سوائے حسن علی کے...... رضوان ماموں کو میرے علاوہ اب کسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پسند نہیں آتی تھی۔

''پتا ہے زویا...... جب تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پیتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ سارے دن کی تھکن ایک دم سے غائب ہو گئی ہو...... تم ایک اچھی کافی میکر ہو......'' اور میں اسٹڈی روم کی الماریوں میں سے کتابیں کھنگالتی ہوئی منہ حیرت سے کھول لیتی۔

''سچ ماموں...... کیا میں واقعی اچھی کافی میکر ہوں؟'' میں پوچھتی۔ اور مجھے آج تک یہ یقین نہیں ہو سکا کہ میں اچھی کافی بناتی ہوں...... شاید گھر کی مرغی دال برابر والی مثال مجھ پر فٹ آتی تھی۔ لیپ ٹاپ کے بٹن پریس کرتے وہ خوب صورت ہنسی ہنستے تھے۔

''ارے بیٹی...... اب تو تمہیں یقین ہو جانا چاہیے آئی تھنک یہ سوال تم پچھلے دو ہفتوں سے کرتی آ رہی ہو......''

''کیا پتا آپ لوگ میرا دل رکھنے کو کہہ دیتے ہوں؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

''ارے نہیں...... دل بھی ایک یا دو بار رکھا جاتا ہے...... دو ہفتوں سے اب میں دل رکھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔'' کافی کا سپ لیتے ہوئے انہوں نے دلیل پیش

کی اور میں کچھ مطمئن ہوگئی۔

''زویا...... یہ سب کس نے سکھایا؟'' کبھی ندرت مامی کے ساتھ مل کر سلائی کڑھائی کروادیتی تو وہ ششدر رہ جاتیں۔

''امی نے مجھے سب سکھایا مامی...... سلائی کڑھائی، کھانا پکانا...... سب کچھ....'' میں انہیں جواب دیتی۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

''سچ کہتی ہو...... امی بہت گنوں والی اور سگھڑ تھی...... تبھی تمہیں سب سکھا دیا...... ایک ہماری اولاد ہے' ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتی۔''

''تو چچی جان آج کل ناک پر مکھی کون بیٹھنے دیتا ہے بھلا؟'' احمر اچھل پڑتا تھا۔

نزہت مامی کی چپل اڑتی ہوئی احمر کی طرف لپکتی مگر وائے ری قسمت...... نزہت مامی کا نشانہ کبھی نشانے پر نہ لگتا تھا...... اور اسی بات کا انہیں قلق اور احمر کو بے تحاشا خوشی ہوتی۔

رنگ محل میں شام کی چائے کا اہتمام میں نے اپنے سر لے لیا تھا...... چائے، کباب، چپس، نمکین بسکٹ...... اس دن لان میں لگے سفیدے کے درخت ٹھنڈی ہوا سے جھول رہے تھے...... سکھ چین کے پتوں کا ساز سا بج رہا تھا۔ زرد شام رنگ محل کی چوکھٹ پر اتری ہوئی تھی...... مالی بابا نے ابھی پودوں کو پانی دیا تھا۔ چائے کے بعد کچھ وقت نوجوان پارٹی گپ شپ کے لیے بیٹھتی تھی...... اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے دل بہلالیا جاتا تھا۔ میں اپنا کپ تھامے آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کی طرف نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

''تم کیسا لائف پارٹنر چاہتے ہو؟'' اچانک احمر نے حسن سے سوال کیا۔

مجھے لگا وہ اس سوال سے کنی کترا جائے مگر میں غلط تھی...... اس نے جواب دیا تھا اور تفصیل سے دیا تھا۔

''میں ایسا لائف پارٹنر چاہتا ہوں جو بہت بولڈ، خوب صورت اور مجھے سمجھنے والی خصوصیات رکھتی ہو......'' جانے کیوں مجھے چائے میں تلخی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''واؤ...... کیا ایسی شخصیات زمین پر ہی پائی جاتی ہیں؟'' یہ احمر کا سوال تھا۔

''آف کورس......'' وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔

مجھے لگا تھا میں پگھل رہی ہوں...... زرد موم کے مانند...... مسکراہٹیں بھی پگھلا دیتی ہیں...... یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

''کہیں تم اپنی مس پرفیکٹ ڈھونڈ تو نہیں چکے؟'' گولڈن نیل پالش چیک کرتی فضا نے مائیکرو اسکوپک انداز اپنا کر حسن کو دیکھا۔

''ابھی نہیں...... اتنی جلدی قیمتی چیزیں نہیں ملا کرتیں۔''

''کیا اسے ڈائیلاگ سمجھا جائے؟''

''او نہیں...... یہ تو ایک فیکٹ ہے۔''

''میرے خیال میں میری فرینڈز میں سے کسی کو کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے تم......'' اریبہ نے نیل پالش کی بوتل کی کیپ بند کی اور پھر اپنے بھائی کو دیکھا۔

''اس سے تو میں بیچلر ہی اچھا ہوں۔'' حسن نے گھور کر بہن کو دیکھا۔

''بیچاری ٹھیک تو کہہ رہی ہے......'' احمر نے لقمہ دیا تھا اریبہ نے یکا یک فضا کو متوجہ کیا۔

''فضا...... تم شزا کو تو جانتی ہو ناں جو براؤن ہیئر کلر لگاتی ہے اور ڈارک لینسز یوز کرتی ہے۔''

''اچھا...... وہ...... کٹ کھنی بلی جو مجھے آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھتی ہے۔'' احمر چیخا۔

''تمہیں......؟''

''یس!'' وہ تفاخر سے مسکرایا۔

''اسے تم میں بھلا کیا نظر آیا؟''

''کیا مطلب......؟'' وہ صدمے سے چور آواز میں بولا تھا...... میں ان کی باتیں سنتی مسکرا رہی تھی۔

''لگتا ہے بیچاری شزا کی نظر کمزور ہوگئی ہے تبھی تو......'' اریبہ نے بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹا۔

''ہونہہ...... اتنی بھی مس ورلڈ نہیں تمہاری وہ بھوتنی دوست......'' وہ جل کر بولا۔

ہلکی ہوا کی لہر سے پھولوں کی بھینی، بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی...... نارنجی ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا...... تبھی پورچ میں رضوان ماموں کی گاڑی آن رکی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' وہ بیگ تھامے سیدھے لان کی طرف آگئے تھے۔

''کچھ خاص نہیں......'' احمر مسکرایا۔

وہ میری طرف مڑے تھے۔
''زویا بیٹا......پلیز ایک کپ کافی میرے لیے بیڈ روم میں بھجوادو......'' وہ چلے گئے تو میں اٹھ کر کچن میں آگئی۔
فضا نے ہاتھ پھیلا کر ناخنوں کو دیکھا اور پھر دوبارہ نیل پالش کا ڈھکن کھول کر پھر نیا کوٹ لگایا۔
''زویا...... کتنی گھل مل گئی ہے ناں یہاں...... بہت اچھی لڑکی ہے......''
"I am not agreed with you"
حسن نے ناگواری سے فضا کو دیکھا تھا۔
اریبہ نے بھائی کو دیکھا تھا۔
"but why" اس کے انداز میں حیرت تھی۔
''مجھے تو وہ بالکل بھی اچھی نہیں لگی...... وہاں کھانے کو ایک وقت کا بھی نہیں تھا اور یہاں خود کو سارے گھر کا مالک سمجھ رہی ہے۔ اسٹرینج......شکل دیکھی ہے اس کی دوسری نظر ڈالنے کا بھی دل نہیں چاہتا۔'' حسن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔
''تم اتنے materialistic کیوں ہو رہے ہو؟'' احمر نے غصے سے اسے دیکھا۔
''ہاں میں ہوں۔'' حسن نے خالی کپ میز پر رکھا۔ ''مگر دیکھنا اب وراثت میں اس کا بھی حصہ نکل آئے گا۔''
فضا تیسرا کوٹ لگانا بھول گئی تھی۔ اریبہ حیرت سے بھائی کو دیکھنے لگی۔
''تم مت بھولو کہ وہ ہماری سگی پھپھو کی بیٹی ہے اور وہ یہاں کی ہر چیز کی مالک ہے۔'' فضا نے حسن کو مخاطب کیا تھا۔
وہ غصہ ہوتا ہوا کرسی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔
''اسے زویا سے کیا پرابلم ہے؟'' احمر نے اریبہ کو دیکھ کر کہا۔
''مجھے تو خود کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا۔'' وہ بے بسی سے بولی تھی۔
رنگ محل کی روشنیاں جل اٹھی تھیں......شام، رات کے وجود میں داخل ہونے کو تھی۔
☆☆☆
اندھیری رات ہر طرف خیمہ زن ہو چکی ہے...... ہر طرف اندھیرا ہے......کالا......سیاہ......میں اس ٹھٹھرتی ہوئی رات میں لان میں لگے سنگی بینچ پر تنہا بیٹھی ہوں...... مجھے بالکل بھی سردی نہیں لگ رہی۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی مضبوط ہو گئی ہوں یا پھر مجھ پر موسموں نے اثر انداز ہونا چھوڑ دیا ہے...... چار سال بعد وہ لوٹ آیا ہے......اور وہ چار سال بعد کی کہانیاں مجھے سنانے آیا ہے۔ اور زویا اکرام تو چار سال پہلے کے وقت میں زندہ ہے ناں......
''کیسے بھلادوں وہ سب......؟ بھولنا......بھلانا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟''
مرد بھلا دیتے ہیں مگر عورت گزرا ہوا وقت پلو سے باندھے رکھتی ہے......میں بھی باندھے ہوئے ہوں اور اب جب وہ پلو کھولتی ہوں تو دل نئے سرے سے ریزہ، ریزہ ہونے لگتا ہے......زویا بنت اکرام اتنی بہادر نہیں......بالکل بھی نہیں......
مجھے ہر نارنجی شام اور نیلے پہر کا دکھ یاد ہے...... کیسے کہہ دوں...... کیسے؟
''جاؤ حسن علی...... چار سال پہلے کی اذیت، کرب میں نے تمہیں معاف کیا......'' چار سال پہلے...... مجھ سے بے انتہا نفرت کرنے والا، میری طرف جاتا ہر رستہ بدلنے والا، مجھے اب کہہ رہا ہے۔ ''زویا...... مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''
اور میں اس بات پر ہنسنا چاہتی ہوں......قہقہہ لگانا چاہتی ہوں......اور میں واقعی ہنس بھی رہی ہوں۔ لیکن میں رونا بھی چاہتی ہوں......پھوٹ، پھوٹ کر پتا ہے کیوں؟ کیونکہ میرا دل میرا نہیں رہا، میرا وجود اس سے خالی ہے۔
''زویا اکرام...... جس کے واپس پلٹنے کی اتنی دعائیں، مناجاتیں، آج جب وہ پلٹتا ہے تو چار سال پہلے کی اذیت کی کہانی کیوں؟'' سوالوں کا دربار میرے گرد لگ گیا ہے......اور مجھے سوالوں سے خوف آتا ہے......ایک بات تو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں......جانتی ہوں......اگر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک پل بھی دیکھ لیا ناں تو پگھل جاؤں گی......اس کی مسکراہٹ تک جو مجھے پگھلا دیتی ہے......
''زویا اکرام...... مات کا ہر رستہ تم تک ہی آرہا ہے......''
میں نے جھکا سر اٹھایا، رنگ محل کی سرخ اینٹوں والی دیواریں مجھ پر طنزیہ قہقہے لگاتی ......سارے راستے

بند...... ساری امیدیں فریب......
اور ان سب سے بے نیاز وہ نیلے پہر کی محبت مسکرا رہی ہے...... بھید بھری مسکراہٹ......
"love is a magic"

☆☆☆

وہ سڑک کے کنارے چلتا جا رہا ہے...... تار کول پر بکھرے زرد پتے اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ دور سے...... بہت دور سے وہ بازگشت سنائی دیتی ہے، روتی ہوئی سی آواز......
"حسن علی...... میری برداشت، میرے صبر کو مت آزماؤ، میں بڑی مشکل سے سنبھلی ہوں بہت وقت لگتا ہے...... بہت وقت لگا ہے یہ ہنسی کا نقاب اوڑھنے میں، اسے تو سلامت رہنے دو۔" اس نے پتھر کو ٹھوکر لگائی تھی...... پتھر کسی گہری کھائی میں جا گرا۔
"میں خوب صورت نہیں ہوں، ایک عام سی لڑکی ہوں ناں جس پر دوسری نظر ڈالنے کو بھی کسی کا دل نہیں چاہتا۔ میرے پاس اسٹیٹس، شکل کچھ بھی تو نہیں تو پھر...... ہاں پھر تمہیں کیسے، کس طرح زویا اکرام سے محبت ہوگئی؟" وہ سوال سیسے کی دیوار بنا اسے گھیر رہا تھا۔
"ہاں...... مجھے کیسے زویا اکرام سے محبت ہوگئی؟" وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا، ہلکی ہوا سے اس کی پیشانی پر بکھرے بال اڑنے لگے۔
"میں ایک خود غرض انسان ہوں اور میں پوزیسو بھی ہوں ہر حوالے سے، اپنی ذات کے حوالے سے...... بھی اور زویا اکرام نے سیدھا میرے دل پر ضرب لگائی تھی، کیسے اپنا دل اس کے حوالے کر دیتا، کیسے......؟ مگر اب لگتا ہے مر جاؤں گا، میں نہیں جانتا...... وہ عام سی ہے تو اب "عام" کیوں نہیں لگتی؟ اگر اس پر دوسری نظر ڈالنے کو بھی دل نہیں چاہتا تو پھر میرا دل کیوں اسے "بار، بار" دیکھنے کو چاہتا ہے؟ میں، "میں" نہیں رہا...... زویا اکرام میں "تم" ہوگیا ہوں۔" وہ تڑپ، تڑپ کر رو رہا تھا، سر اِدھر، اُدھر نفی میں ہلاتا ہوا۔ ایک خوب صورت مرد، ایک عام سی لڑکی کے لیے۔
"میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر زویا!" جنگلی پھولوں کی مہک اڑ رہی تھی اور وہ نڈھال سا بیٹھا تھا، تھکا ہارا، مات کھایا ہوا۔ یکایک وہ اٹھا اور واپس مڑا کچھ... بڑبڑاتے ہوئے۔

"وہ چار سال پہلے کی وضاحت مانگے گی تو سب کہہ دوں گا...... مجھے تم سے کبھی نفرت ہو ہی نہیں سکی، چاہ کر بھی نہیں...... تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا زویا......"
وہ برستی بارش میں ٹھٹھرتی برفیلی رات کو رنگ محل میں قدم رکھتا ہے اور رنگ محل کی ست رنگی روشنیوں کا عکس اس پر پڑ رہا ہے۔
"وہ" سنگی بینچ پر بیٹھی رو رہی ہے اس کا وجود بارش میں بھیگ رہا ہے مگر وہ بے نیاز بیٹھی ہے، سر گھٹنوں میں دیے وہ روتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہی ہے، کچھ ایسا جو نیلی بارش میں دھنک بکھیر رہا ہے۔ حسن علی خیال کا ہاتھ تھام کر وہ لفظ سنتا ہے جو وہ کب سے روتے ہوئے بڑبڑا رہی ہے۔
"please come back Hasan Ali,I forgive you" اور پھر رنگ محل محبت سے بھر گیا...... ہر راہداری سے محبت جھانک رہی ہے۔

☆☆☆

"وہ مجھے اکتوبر کی روشن صبح کو ملا تھا جب ہم تینوں رنگ محل سے تھوڑے فاصلے پر بنے واکنگ ٹریک پر واک کو نکلے تھے...... واکنگ ٹریک پر ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس بچے، بوڑھے سبھی تھے...... فضا جو بچوں کی دیوانی دو گول مٹول بچوں کے گالوں پر چٹکیاں کاٹ چکی تھی جس کا انہوں نے کافی برا مانا تھا اور منہ بسورتے ہوئے اپنے دادا، دادی کو شکایت لگا چکے تھے جن کے ساتھ وہ واک پر آئے تھے۔
"تمہیں کیا ضرورت ہے دوسروں کے بچوں کو چٹکیاں کاٹنے کی۔" اریبہ نے فضا کو چھڑکا۔
"میں تو بس پیار کر رہی تھی انہیں۔" وہ جاگرز کے تسمے ٹھیک کرنے لگی...... لوگ آ جا رہے تھے۔
"اچھا...... یہ پیار تھا...... بیچاروں کے گال لال ٹماٹر ہوگئے تھے......" اریبہ نے اسے یاد دلایا تھا جیسے...... زمانے بھر کی بے پروا فضا پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا......
"یار...... کیا کرتی تمہیں تو پتا ہے کہ ایسے گول مٹول چہرے دیکھ کر مجھ سے نہیں رہا جاتا...... ہاتھوں میں کھجلی سی ہوتی رہتی ہے۔"
"کسی دن بے موت ماری جاؤ گی اسی وجہ سے۔"
"کیا یہ اتنا بڑا جرم ہے؟" پونی کستی ہوئی فضا نے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

''ہاں.....اگر یہ ننھے devil اپنے والدین سے جا کر من و عن شکایت لگا آئیں تو کافی چانسز ہیں۔''

ہینڈ بیگ سے اریبہ نے ٹفن نکالا تھا جس میں سیب کی دو قاشیں تھیں.....ہم تینوں کنارے رکھے بنچوں پر بیٹھ گئے.....واک مین کانوں سے لگائے، اسپورٹس شوز پہنے لڑکے واکنگ ٹریک پر خراماں، خراماں چلے جا رہے تھے..... ہمارے پاس سے گزرتے تو رفتار دھیمی پڑ جاتی.....اور جب نظر اریبہ تھانیدارنی پر پڑتی تو کھسیانی ہنسی ہنستے رفتار تیز ہو جاتی.....میں اور فضا خوب ہنستے۔

ٹیولپس کے آتشیں پھولوں پر تتلیاں منڈ لا رہی تھیں.....کافی فاصلے پر کیکٹس کی قطار لگی ہوئی بھی نظر آ رہی تھی۔ میرا ایک چکر رہتا تھا.....میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی.....وہ دونوں کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔

''زویا.....'' اریبہ نے آواز دی.....میں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''پانی کی بوتل لیتی جاؤ.....''میں شکریہ کہہ کر بوتل اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ جب میں نے آدھا چکر لگا لیا تو وہ مجھے ٹریک کے کنارے کھڑا نظر آیا تھا.....دونوں ہاتھ باندھے، پیشانی پر بکھرے بال، جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ مسکرا رہا تھا۔

''سنیں.....کیا میں پانی لے سکتا ہوں؟''میں رک گئی تھی کیونکہ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا.....وہ پوچھ رہا تھا..... میں نے چپ چاپ دائیں ہاتھ میں پکڑی بوتل آگے کر دی۔

''شکریہ مس۔'' کہہ کر اس نے تھام لی تھی اور شائستگی سے گھونٹ،گھونٹ پینے لگا۔

''ویسے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''اس کی روشن آنکھوں میں سوال تھا۔

''ضروری نہیں ہر کسی کو آپ نے دیکھ رکھا ہو.....'' مجھے تاؤ سا آ گیا تھا۔

''اوہ..... سوری شاید آپ کو برا لگا.....'' وہ معذرت کر رہا تھا.....میں رخ موڑ گئی تھی۔

''اصل میں شاید آپ یہاں گیسٹ ہیں.....تو میں نے یونہی پوچھ لیا۔''

اس نے بوتل آگے بڑھائی تھی..... میں نے بوتل اس سے لے لی اور ٹریک پر آہستہ، آہستہ بھاگنے لگی.....

وہ بھی ساتھ،ساتھ چلنے لگا تھا.....میں ٹھٹکی.....اسے دیکھا اور پھر نظر انداز کر دیا۔ پرفیوم کی ہلکی سی مہک پھیلنے لگی تھی "sorry again" وہ ہولے سے معذرتی انداز میں بولا تھا.....میں چپ چاپ چلتی رہی اسے مکمل اگنور کرتے ہوئے ہاف ٹریک ختم ہوا تھا میرا چکر ختم ہوا تھا.....وہ میرے سامنے آ کر بولا تھا۔

''انسان کو اس وقت رونا چاہیے جب اس کے پاس کوئی آنسو پونچھنے والا موجود ہو.....تنہا رونا اور اپنے آنسو خود ہی صاف کرنا، بہادری نہیں ہوتی..... یہ چیز ہمیں ہی کمزور کرتی ہے.....'' میں حیرت سے منجمد ہوئی تھی.....وہ کون تھا؟ کیوں ایسا کہہ رہا تھا..... یہ کہہ کر وہ پلٹنے لگا تھا مگر پھر مڑا۔

''جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جب آپ مسکراتی ہوں گی تو آپ کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہوتی ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ آگے دوڑتا ہوا نکل گیا تھا.....میں ساکت کھڑی تھی۔

وہ دونوں میرے قریب آئی تھیں.....فضا سیب کی قاش نفاست سے کتر رہی تھی۔ میں گم صم سی کھڑی تھی..... اریبہ نے چٹکی بجائی تھی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''فضا بھی مجھے دیکھ رہی تھی..... میں اس کی طرف ہی نظریں جمائے کھڑی تھی۔

''کون.....؟''میرے منہ سے بے خیالی میں پھسلا تھا۔

''ارے یہی حماد.....اور کون.....''اریبہ نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔

''حماد کون ہے؟'' جواباً میں نے پوچھا تھا.....ہم واپسی کی طرف گامزن تھے..... پاس سے ہی ایک پپی ٹائپ لڑکا کتا ہاتھوں میں پکڑے اس کے بال سہلاتے ہوئے گزرا تھا۔''آخ.....انگریز کی اولاد.....'' اریبہ نے جھرجھری سی لی تھی۔

''آخ.....انگریز کی اولاد.....''

فضا نے ٹفن میرے سامنے کیا تھا میں نے سیب کی ایک قاش اٹھالی تھی.....ہلکی ہوا سے کنارے لگے درختوں کے پتے گر رہے تھے..... بڑا قدرتی سا منظر تھا.....فضا نے پتا اٹھایا اور ہتھیلی پر رکھ کر اڑا دیا.....ساتھ،ساتھ ہی وہ بتانے لگی تھی۔

''ارے یہ حماد تھا..... رنگ محل کے ساتھ والا بنگلا انہی کا تو ہے اس کے ابو ہمارے بزنس پارٹنر ہیں..... کافی آنا جانا ہے ہمارا ان کے ساتھ..... یہ ٹرپ پر مری گیا ہوا تھا تبھی اتنے دنوں سے چکر نہیں لگایا.....'' فضا نے تعارف کا مرحلہ بخوبی سرانجام دیا تھا۔

''بائی داوے..... کیا کہہ رہا تھا؟'' اریبہ نے لاتعلق سے انداز میں مجھ سے پوچھا تھا۔

جانے مجھے کیوں وہ انداز لاتعلق سا ہو کر بھی ''لاتعلق'' نہیں لگا تھا..... شاید یہ میرا وہم تھا۔

''کچھ نہیں بس پانی مانگا تھا اس نے.....''

وہ سر اثبات میں ہلاتی کنارے پڑے چھوٹے پتھروں کو جاگرز کی ٹھوکروں سے اڑاتی رہی۔ ہلکا گلابی سورج مشرق سے ابھر رہا تھا۔ جب ہم رنگ محل کے گیٹ پر پہنچے تو رضوان ماموں اور الیاس ماموں گاڑی میں بیٹھے آفس جا رہے تھے ہمیں دیکھا تو ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گئے..... میں مسکراتے ہوئے آخر میں گیٹ کے اندر قدم رکھنے لگی تھی کہ جب میں نے پیچھے اس کی آواز سنی تھی۔

''دیکھا..... میں نے کہا تھا ناں کہ آپ مسکراتے ہوئے بہت پیاری لگتی ہوں گی..... یونہی مسکراتی رہا کریں..... اچھی لگتی ہیں.....'' میں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئی تھی..... میں نے پلٹ کر دیکھا وہ ساتھ والے بنگلے کے گیٹ کے پاس کھڑا تھا..... دونوں ہاتھ جینز کی پاکٹ میں، مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا..... میں تپ ہی گئی تھی۔

''لوفر.....'' اور پیچھے ہنسنے کی آواز آئی تھی۔

میں زور سے گیٹ بند کرتی غصے میں اندر آ گئی تھی..... سفیدے کے لمبے سروقد درخت مسلسل ہل رہے تھے..... رنگ محل سورج کے گلابی رنگ میں رنگ گیا تھا۔

☆☆☆

میں اریبہ کی ڈائری میں تحریر کردہ پروین شاکر کی نظم پڑھ رہی تھی..... نانی میرے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔

''نیم خوابی کا فسوں ٹوٹ رہا ہو جیسے
آنکھ کا نیند سے دل چھوٹ رہا ہو جیسے
رنگ پھیلا تھا لہو میں نہ ستارہ چمکا
اب کے ہر لمس تیرا چھوٹ رہا ہو جیسے
پھر شفق رنگ ہوئی کوچۂ جاناں کی زمیں
آبلہ پاؤں کا پھر پھوٹ رہا ہو جیسے
روشنی پائی نہیں، رات بھی باقی ہے ابھی
چاند سے ربط مگر ٹوٹ رہا ہو جیسے
سرخ بیلیں تو ستونوں پہ چڑھی ہیں لیکن
کوئی آنگن کا سکوں لوٹ رہا ہو جیسے

وہ جانے کب اندر آیا تھا..... میں نے جلدی سے دوپٹا اٹھا کر سر پر ڈالا..... وہ سامنے کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا..... انداز ایسا تھا جیسے مجھے مکمل نظر انداز کرنے کا تہیہ کر کے بیٹھا ہو..... اور اسی بات پر مجھے حیرت سی ہوئی تھی۔

''دادی یار..... ایک بات تو بتائیں۔'' وہ نانی سے ہی مخاطب تھا۔

''ہاں بچے..... پوچھو.....'' نانی نے تیل کی بوتل کا ڈھکن لگایا تھا۔

''کیا میں آپ کو لوفر لگتا ہوں، آوارہ لگتا ہوں؟'' اس کی سیدھی نظر مجھ پر تھیں..... میں کھسیا گئی تھی۔

''ایں..... یہ کس نے کہا؟'' نانی کچھ زیادہ ہی صدماتی حیرت میں مبتلا ہوئی تھیں۔

''ہے کوئی ایسا..... بس آپ صرف میرے سوالوں کا جواب دیں.....'' حماد نے اصرار کیا تھا۔

''ارے نہ بھئی..... جس نے بھی کہا غلط کہا..... میرا حماد کیوں لوفر ہونے لگا۔'' نانی نے جواب دیا۔

وہ اب تفاخرانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا تھا..... میں تپ کر اٹھنے لگی تھی جب نانی نے مجھے مخاطب کیا۔

''ارے زویا..... تم حماد سے ملیں؟''

''نہیں دادی..... پلیز آپ ہی انٹروڈکشن کروا دیں.....'' شریر نظریں..... مجھے جی بھر کر تاؤ آیا تھا دل کر رہا تھا تیل کی بوتل اس کے منہ کے اوپر ہی انڈیل دوں..... خیر..... حسرت ہی رہی۔

''حماد..... یہ میری نواسی ہے زویا..... میری بیٹی اسمارہ کی بیٹی..... اب یہیں رہے گی۔''

وہ حیران ہوا تھا..... مگر یہ چند پل کے تاثرات تھے اگلے ہی لمحے وہ نارمل تھا۔

''جی..... تو زویا کیسی ہیں آپ، کیا مشاغل ہیں آج کل آپ کے.....؟'' وہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''جی میں پڑھ رہی ہوں..... اور بس'' بک ریڈنگ'' کا ہی شوق ہے.....'' میں نے متانت سے اسے آگاہ کیا تھا۔ وہ متاثر ہوا تھا یا متاثر کُن زبردستی چہرے پر

سجائے تھا۔ میں بالکل بھی نہ سمجھ سکی تھی۔

''واؤ گریٹ...... بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں آج کل بک ریڈر...... تو آپ کس، کس کو پڑھتی ہیں؟'' نانی نے جیسے بدمزہ ہو کر قریبی گلدان اٹھا کر اس کے گرد بندھی ڈوری کو سختی سے لپیٹنا شروع کر دیا تھا جو قدرے ڈھیلی ہو چکی تھی...... میں نے تیل کی بوتل کو دائیں ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔

''کیٹس، شیلے میکسم گورکی اور آج کی پائلو کو ہلو، قرۃ العین حیدر، ممتاز، مفتی وغیرہ......'' میں اسے بتا ہی رہی تھی کہ دروازہ دھکیلتا ہوا وہ اندر داخل ہوا تھا۔

حماد اسے آگے بڑھ کر ملا تھا...... وہ جم سے لوٹا تھا شاید...... اس نے آگے بڑھ کر ٹشو باکس سے ٹشو نکالا تھا......

''یار تمہاری کزن تو بہت ادبی اور منفرد مزاج کی ہیں......'' میری طرف دیکھتے ہوئے حماد نے حسن کو کہا تھا۔

''کون فضا......؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''ارے نہیں...... یہ زویا......''

حسن نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا...... کیا تھا وہ...... نفرت، حقارت یا کچھ اور......؟

''ہاں...... ایسے لوگ سستے شوق ہی پال سکتے ہیں......'' حماد جیسے شرمندہ ہوا تھا...... میں جیسے زمین میں گڑ گئی تھی...... ''ایسے لوگ سے کیا مراد تھی......؟'' میری آنکھوں کے آگے جیسے دھندسی چھانے لگی۔ سارے منظر غائب...... بس اِک کھارے پانی کی چادر...... میں پلکیں جھپکتی سیڑھیوں کی طرف بھاگی تھی۔ فضا سیڑھیاں اتر رہی تھی...... مجھے تیزی سے اوپر جاتا دیکھ کر ٹھٹکی۔

''کیا ہوا زویا......؟'' مگر میں آنکھیں ہاتھ کی پشت سے رگڑتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

''زویا...... کو کیا ہوا دادی......؟'' فضا الجھن بھرے تاثرات کے ساتھ نانی کی طرف آئی۔

''ارے کچھ نہیں...... '' تیل کی بوتل رکھنے گئی ہے''

''میرا خیال ہے وہ رو رہی تھی۔'' وہ حماد کی طرف مڑتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔

''کیسے ہو حماد اور ٹرپ کیسا رہا......؟'' فضا مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی...... حماد اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''فائن ...... ٹرپ تو بہت زبردست رہا...... کمال کا weather تھا مری کا بہت انجوائے کیا۔'' وہ ٹرپ کا احوال بتا رہا تھا...... اور حسن علی، وہ سیڑھیوں کی طرف بے خیالی میں دیکھ رہا تھا جہاں سے زویا گئی تھی...... ان بھیگی ہوئی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں کچھ تھا...... شکوہ، شکایت، دکھ یا پھر کچھ اور......؟ اس نے سر جھٹک دیا تھا۔

''اوہ...... میں بھی کیا سوچنے لگ گیا......''

دوسرے لمحے وہ، حماد اور فضا کسی بحث میں الجھے نظر آئے تھے...... اتنی بے معنی اور بے مقصد سی گفتگو نے نانی کو سخت کبیدہ خاطر کیا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' حماد نے پوچھا۔

''ارے...... میرا تمہارے ہنگاموں سے دل گھبراتا ہے...... سر درد کرنے لگ جاتا ہے۔''

''دادی پولیٹیکل ایشوز میں تو ہر کوئی دلچسپی رکھتا ہے۔'' حسن ہنسا تھا......

''مگر ہر کوئی تم لوگوں جیسا کوّے کا دماغ نہیں رکھتا......'' وہ بیزاری سے بولی تھیں۔ مینگو شیک سے بھری گلاسوں کی ٹرے اٹھائے اریبہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''ایک تو ہمارے گھر کے لوگوں کو حشرات اور چرند، پرند پر بات کرنے کا بڑا شوق ہے...... بھلا کوئی بتائے انہیں، دنیا جہاں میں اور موضوعات کا فقدان ہے کیا۔''

''ڈونٹ وری ڈیئر...... آج کا موضوع بڑا انٹرسٹنگ ہے......'' فضا ہنسی تھی۔ رنگ محل کے در و دیوار میں ان کی شریر اور کھلنڈری ہنسی گونج رہی ہے۔

کبوتر اڑان روک کر اس بے فکری ہنسی کی بازگشت سنتے ہیں اور رنگ محل کی اوپری منزل پر سیڑھیوں پر بیٹھی اس اداس لڑکی کی کتھا سننے والا کوئی نہیں...... ''کتنا بڑا دکھ ہوتا ہے ناں یہ دنیا کا کہ آپ کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہو مگر آپ کو سننے والا کوئی نہ ہو...... کوئی سامع نہیں...... خود سے گفتگو تو اذیت ہی دیتی ہے۔'' زویا بنت اکرام کی اداسی میں شراکت کی استدعا ہے...... بک ہا...... کوئی سامع نہیں......

☆☆☆

''محبت گلابی پہر کا ایسا کلمہ ہے جو جس دل میں اترتا ہے اس کو سحر زدہ کر دیتا ہے...... جہاں محبوب کی آنکھوں سے ہی جہاں کے فسانے مجسم دیکھے جاتے

(نوٹ: ادارۂ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کا اس اشتہار سے کوئی تعلق نہیں)

ہیں......اور سماعتیں صرف محبوب کا ساز سنتی ہیں اور پھر سر دھنتی ہیں...... اور سچ ہی تو ہے محبت گلابی پہر کا جادو ہے......''میں کھڑکی میں کھڑی چاند کو دیکھ رہی ہوں جس کا ہر کوئی دیوانہ ہے......اسیر ہے......مگر آج اریبہ علی کو چاند کی چاندنی دیوانہ نہیں کر رہی......اسیر نہیں بنا رہی...... پوچھو تو وجہ بہت آسان اور سادہ سی ہے۔

اریبہ علی محبت کے گلابی پہر میں قدم رکھ چکی ہے......

جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے......''اسے'' بھی مجھ سے محبت ہوگئی......مگر وہ اظہار سے کتراتا ہے......بوکھلاتا ہے......مگر کب تک نظر انداز کرے گا...... میں ایک بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کے سارے راستے میری طرف آتے ہیں جہاں بھی جائے گا میری طرف ہی پلٹے گا...... میں یہ نہیں جانتی کہ مجھے اس سے محبت ہونا کب شروع ہوئی۔ ویسے کتنا دلچسپ سوال ہے ناں یہ......

شاید محبتوں کے وقت نہیں ہوتے ان کے تو......''اسباب'' ہوتے ہوں گے......ہم نے کافی شاپس کے مدھم اور خوابناک ماحول میں گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کی ہیں...... میں اس بات پر ہنسنا چاہتی ہوں جو اس نے مجھ سے کہی تھیں۔

''سنو اریبہ علی......وقت ختم ہو جائے گا مگر ہماری باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔''

ہم دونوں نے اپنی بیسٹ چیزیں آسانی سے ایک دوسرے سے شیئر کیں......اور وہ فضا کہتی ہے۔''اریبہ تمہیں کبھی شیئرنگ نہیں آئے گی۔''

مگر فضا نہیں جانتی ناں کہ سو بندوں میں ایک تو ایسا ہوتا ہے ناں جس کے لیے آپ وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو آپ نے کبھی نہیں کیا ہوتا......میرے ساتھ تو کم از کم ایسا ہی ہوا ہے برستی بارشوں میں فلیٹ روڈ کی سڑکوں پر ہم نے اس اطمینان سے بڑھ کر بہت سکون کے ساتھ چہل قدمی کی ہے جو اکثر لوگ ہموار تارکول کی سڑکوں پر کرتے ہیں......فرق اتنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو گرنے ہی نہیں دیتے......

یہ جو محبت ہوتی ہے ناں...... یہ آپ کو گرنے نہیں دیتی......کبھی نہیں......کسی بھی حال میں نہیں......فلیٹ روڈ کے کنارے لگے گلابی پھول ہلکی بارش کے پانی میں سر اٹھاتے ہیں اور مسکرا دیتے ہیں اور ان کی سرگوشی بڑی زوردار ہوتی ہے......کھٹ سے سماعتوں میں سفر کرتی ہے۔

''محبت کے گلابی پہر میں دو اشخاص کے لیے وائلن بج رہا ہے۔''اور وہ وائلن ہر بار نہیں بجتا...... ہر کسی کے لیے نہیں بجتا......مگر وہ ہمارے لیے ہر اس گلابی پہر بجایا جاتا ہے جب ہم فلیٹ روڈ پر قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔

جانے وہ وائلن کون بجاتا ہے ......مجھے نہیں معلوم......شاید کسی کو بھی نہیں معلوم......

شاید ''وہ'' چھپا بیٹھا ہے......مگر کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے وہ ''محبت کا فرشتہ'' ہوگا۔

ہمارے گھر ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر پھر بھی ہم دونوں اپنے، اپنے گھروں کے ٹیرس پر بیٹھے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ کر رہے ہوتے ہیں۔

''کہیں چلیں؟''

''کہاں......؟''

''چاند کے پار......''

''نہیں......چاند کو یہیں بلا لیتے ہیں۔''

''بلانے سے چاند آ جاتا ہے؟''

''ہاں......آ جاتا ہے۔''

''جھوٹے......''

میں تپ کر موبائل آف کر دیتی ہوں......اور وہ وہیں سے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کرتا ہے۔

''سنو اریبہ...... میرے ٹیرس پر چاند اترا ہے۔''

اور میں دیکھتی ہوں......ساکت ہوتی ہوں......''وہ'' مجھے نظر آتا ہے۔

''اور ہاں......ٹیرس پر چاند اترا ہے۔''

رنگ محل کی کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے کی دیوار پر کہانی جنم لیتی ہے......اور قصہ گو ہوائیں کہانی کا پہلا باب یہاں سے شروع کرتی ہیں۔

''اریبہ علی کے لیے حماد اصغر چاند ہی تو ہے۔''

☆☆☆

برفیلی شام میں لیمپ پوسٹ کی روشنی دھند میں دراڑیں ڈالنے کی کوششیں کرتی رہی مگر ناکام رہی...... گارڈن میں، میں اکیلی بیٹھی تھی...... جانے کیوں دل بھر آ رہا تھا......باقی سارے اندر تھے اور میں باہر ہی آ کر

بیٹھ گئی تھی...... کبھی، کبھی اپنے آپ سے دکھ سکھ بانٹنے کو دل چاہتا ہے ناں...... میرا بھی دل چاہ رہا تھا...... بھید بھری دھند نے چاروں اور سفید اندھیرا طاری کر دیا...... ہاں اندھیرے سفید بھی ہوتے ہیں۔

''تم رو رہی ہو......؟'' وہ پوچھ رہا تھا...... جو کہتا تھا میرا بہترین دوست ہونے کا اعزاز اسے حاصل ہے۔

''ہاں ......بس دل چاہ رہا تھا......'' میں اس دھند لکے میں جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی...... کیا کھوج رہی تھی۔

''تمہارا ہر وقت رونے کو دل کیوں چاہتا ہے؟'' یہ سوال نیا نہیں تھا...... وہ اکثر اسے دُہراتا۔

''جن کا کوئی نہیں ہوتا...... جو تنہا ہوتے ہیں...... وہ ایسا ہی کرتے ہیں......'' اس نے جینز اور ٹی شرٹ کے ساتھ بلیک اپر پہنا ہوا تھا...... اب وہ اپر کی جیبوں سے بادام اور پستوں کا پیکٹ نکال کر ہمارے درمیان چھوڑی گئی جگہ پر رکھ رہا تھا...... یہ روز کا معمول تھا۔

"please dont do this" اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

''کیا نہ کیا کروں......؟'' میں نے جواب مانگا تھا۔

''یہی خود ترسی کی باتیں......''

''یہ خود ترسی والی باتیں نہیں......'' میں نے ہر لفظ پر زور دیا تھا۔ بادام منہ میں ڈالتا وہ بغور مجھے دیکھنے لگا...... جیسے میں اس کے لیے کوئی کتاب بن گئی ہوں۔

''تم کیوں یہ کر رہی ہو اور جانے کب سے کر رہی ہو...... میں، نانی اور باقی سب تمہارے ساتھ نہیں ہیں کیا؟'' یہ سوال لاجواب کر دینے والا تھا...... مگر میں نہیں ہوئی تھی...... اور وہ بھی یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں لاجواب نہیں ہوتی تھی۔

''پتا ہے زویا...... بعض اوقات انسان خود کو بڑا ہی اکیلا اور تنہا سمجھ رہا ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں...... بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں...... محسوس ہی نہیں کرتا...... تب غلطی اس کی اپنی ہوتی ہے...... بی بریو یار...... you are not alone

سرد دھند میں میرا بہترین دوست مجھے دلاسا دے رہا تھا...... شاید میں واقعی ''تنہا'' نہیں تھی۔ میں نے اسے دیکھا جو رنگ محل کے احاطے میں لگے دھاتی فوارے کے اوپر چمکتے گلوب کو دیکھ رہا تھا۔

''پتا ہے تمہاری سب سے اچھی بات کون سی ہے؟''

میں نے اسے مسکرا کر دیکھا...... وہ زبردست انداز میں چونکا تھا۔

''کون سی بات؟''

''یہی کہ تم ہمیشہ پوزیٹو سوچتے ہو...... کاش میں بھی ایسی ہوتی۔''

''ڈونٹ وری...... تم بھی ہو جاؤ گی......'' اب وہ مکمل طور پر میری طرف متوجہ تھا۔

''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے زویا...... میں کچھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں ضرور بتاؤ۔'' میں ٹھٹکی تھی۔

''مجھے محبت ہو گئی ہے۔'' اس نے جھجک کر بتایا اور رک کر میرے تاثرات کو جانچنا چاہا...... میرے ہاتھ میں پکڑا بادام چھوٹ کر نیچے گر پڑا...... جیسے رنگ محل کی دھند گلابی ہو گئی تھی۔

''کس سے......؟ کون ہے؟'' میں نے اشتیاق میں دو سوال اکٹھے پوچھ لیے تھے۔

اس کی آنکھوں میں جیسے تاروں کی کہکشاں اتر آئی تھی...... جو جلتی، بجھتی رہے...... سحر طاری کرنے والی...... میں بھی...... سحر زدہ سی بیٹھی تھی۔

''اور یہ محبتوں کا حق ہے کہ ان کے قصے سحر زدہ ہو کر بڑے احترام سے سنے جائیں۔''

''میں اسے دیکھتا ہوں تو پھر کسی اور چیز پر نظر نہیں پڑتی...... اس کی آنکھوں میں مجھے دنیا چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے...... کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے زویا کہ کسی کی آنکھوں میں آپ سارے رنگ دیکھ لیں......؟ میرے ساتھ بار، بار ایسا ہو رہا ہے...... میں نے کبھی نہیں سوچا کہ کسی وجود کی اپنی خوشبو بھی ہوا کرتی ہو گی...... مگر ہوتی ہے...... جہاں بھی وہ ہوتی ہے جیسے مجھے الہام ہونے لگتا ہے...... محبت کہیں الہام کا دوسرا نام تو نہیں......؟ پتا ہے اس کی ہنسی کے آگے سارے ساز پھیکے لگتے ہیں...... اب کوئی اور ساز دل کو لگتا ہی نہیں...... کیا اسے ہی محبت کہتے ہیں؟ مجھے تو پتا نہیں چلا...... اب تو لگتا ہے کہ محبت بے خبری کا دوسرا نام ہے......'' وہ ہنستا ہوا بتا رہا تھا...... اور لگا کہ فلیٹ روڈ کے گلابی پہر میں وائلن بجنے لگا ہے ناں...... بج رہا ہے...... اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے...... اور میں بے خودی اسے سن رہی ہوں۔

''زویا......کیا واقعی یہ محبت انسان کو اتنا خوشگوار بنا دیتی ہے کہ وہ ہر پل ہنسنا، مسکرانا، قہقہے لگانا چاہتا ہے......؟'' وہ پوچھ رہا تھا رنگ محل میں یہ سوال گونج رہا ہے۔ اب روشنیوں سے گندھی دھند رنگ محل پر اتری ہوئی ہے۔ وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر اب قہقہہ لگا رہا تھا۔

بلکہ ہم دونوں ہنستے رہے......اور اس بات سے ہم بالکل بے خبر تھے کہ کوئی تھا جو ہمیں دیکھ کر سلگ رہا تھا...... اور گلابی دھند واقف تھی کہ وہ ہستی کس کی تھی۔ رنگ محل پر دھند بھری رات اتر آئی......سفید، ہاں، راتیں سفید بھی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

''نفرتوں کے سائے میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا سا محبت کا پودا بھی پرورش پا رہا ہوتا ہے......اور وقت آنے پر وہ تناور درخت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔''

میں نے خود کو بڑی اچھی طرح سمجھایا...... دلیلیں، واسطے، منتیں سب کچھ مگر یہ دل سمجھتا ہی نہیں...... میں حیرت کے اول درجے پر ہوں...... مجھے اور محبت......؟ نہیں، نہیں مگر یہ ایسا سفید سچ ہے جس پر بے یقینی کا ذرا برابر بھی چھینٹا نہیں ہے۔ کاش یہ میرا وہم ہوتا......مگر محبت وہمی تو نہیں ہوتی...... افسوس صد افسوس کہ یہ ہوتی...... محبت ہوئی بھی تو کس سے بک ہا...... دل کو ڈپٹ کر چپ بھی تو نہیں کرا سکتی......

محبت نے اتنی چوری اور چپکے سے گھات لگائی تھی کہ سنبھل ہی نہیں سکی......بس محبت ہوگئی اور احساسات کے ہاتھوں منادی کرا دی گئی۔ ''زویا بنت اکرام تمہیں محبت ہوگئی ہے۔''

اور اس کے جانے کے بعد میں رنگ محل کے در و دیوار میں اسے کھوجتی ہوں......ڈھونڈتی ہوں......مگر وہ نہیں نظر آتا......ساری کھوج اکارت جاتی ہے۔

رنگ محل کی اوپری منزل پر میں کمرے میں اکیلی بیٹھی گیٹ کی طرف دیکھتی رہتی ہوں......بغیر پلکیں جھکائے...... یہاں تک کہ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے...... میں کھارا پانی بہنے دیتی ہوں اور وہ پانی اس صاف شفاف کاغذ پر گرتا ہے جس پر ادھ کھلا پین پڑا ہے۔

بڑا دل چاہتا ہے کہ اسے خط لکھوں......مگر رک جاتی ہوں۔

یہ جو ''انا'' نامی عمارت ہوتی ہے ناں......اسے ڈھانے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھ میں ہے ہی نہیں......

گزرے برسوں میں ہم نے ایک دوسرے کو بہت نظر انداز کیا مگر ہوا کیا......؟ اب تو یوں لگتا ہے کہ نظر انداز ہی تو نہیں کر سکے۔

اور مقناطیس کے ایک جیسے پول تو ایک دوسرے کو repel کرتے ہیں اور ہم دونوں تو مخالف تھے attract ہونا ضروری ہے......اور یہ ہوگیا......کب، کیسے؟

محبتوں میں شاید ''کب'' اور ''کیسے'' جیسے سوال اٹھانے والے بے وقوف ہی تو ہوتے ہیں......اور جس روز ہم ایک دوسرے سے شدید نفرت کا دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں اسی وقت ہم پر محبت وارد ہو جاتی ہے۔

''نفرتوں، عداوتوں کے کھیت میں جب محبت کی بارش برستی ہے تو نکلنے والی فصل نفرت یا عداوت کی نہیں ہوتی......وہ تو محبت کی اٹھان لے کر بڑی ہوتی ہے۔''

☆☆☆

''قبول ہے۔'' اس سرد برفیلی صبح اسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں میرا لہجہ بھی ٹھنڈا تھا...... بہت سرد......جیسے میں گلیشیر بنی بیٹھی تھی......اِدھر نانی کی آخری خواہش پوری ہوئی اور اُدھر ان کی سانسوں کے تار بکھرے اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی......ڈاکٹر رحمان نے سانس کی رفتار چیک کی اور آنکھوں کی پتلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"sorry...she is no more" میری گھٹی، گھٹی سی چیخ نکل گئی تھی......بیماری سے پہلے کی وہ شام مجھے آج تک نہیں بھولی۔

''پتا ہے زویا......اسمارا کی گھر چھوڑتے وقت کی وہ آخری نظر مجھے نہیں بھولتی......وہ اس گھر سے کچھ بھی نہیں لے کر گئی تھی......بس اس کے تن پر پہنے کپڑے اس گھر کے تھے...... مجھے آج بڑی یاد آ رہی ہے اس کی......اور مجھے یوں لگتا ہے اب میرا بھی وقت قریب آن پہنچا ہے......'' وہ اداس تھیں، میں جانتی تھی مگر وہ اس حد تک اداس ہوں گی یہ میں قطعاً نہیں جانتی تھی......رنگ محل کے باہر پھیلی رات سے کہیں زیادہ نانی کی باتوں میں رات سا اندھیرا پن جھلکتا تھا...... میں نے لیمپ کا سوئچ آف کیا

اور اسٹڈی ٹیبل پر دھری کتابوں کو ترتیب دیتی نانی کے پاس بیڈ پر چلی آئی تھی۔

''پلیز نانی...... ایسی باتیں مت کریں۔''

''ڈر رہی ہو؟'' وہ ہنس کر پوچھ رہی تھیں ساتھ، ساتھ ان کی انگلیاں میرے بالوں میں چل رہی تھیں۔

''ہاں...... نانی بہت ڈر لگتا ہے امی کے بعد آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔'' میں ان سے لپٹ گئی تھی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا...... جس میں زیرو پاور کے ننھے بلب کی روشنی دراڑیں ڈال رہی ہے...... اور کمرے کی بند کھڑکیاں کھول کر دیکھو تو باہر رات ہے...... بھید بھری...... اور...... اور ساحر......

''نہیں زویا...... یہاں سب تمہارے اپنے ہیں...... ہر کوئی تم سے پیار کرتا ہے۔''

''جی...... مگر ہر کسی کی اپنی جگہ ہوتی ہے ناں...... آپ کی چھوڑی گئی جگہ کو کون بھرے گا......؟'' سوال کیا۔

''کوئی جگہ خالی نہیں رہتی کبھی نہ کبھی بھر ہی جاتی ہے اور یہ جو وقت ہوتا ہے ناں یہ سارے دکھ درد کی دوا بن جاتا ہے...... مرہم ہو جاتا ہے......'' نانی نے کہا تھا میں چپ بیٹھی رہی، ان کی انگلیاں اب بھی میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔

''میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی...... حتمی فیصلہ کر کے ہی رہوں گی...... سانسوں کا کیا بھروسا آج ہوں کل نہ ہوں......'' میں نے خوف سے سر اٹھایا تھا۔

اور وہ فیصلہ کر کے گئی تھیں...... ان کی آخری خواہش ہی ان کا آخری فیصلہ تھا...... اور ان کے فیصلے کا احترام کیا گیا تھا...... زویا بنت اکرام کا حسن علی سے نکاح کا فیصلہ......

وہ ٹھنڈی ٹھار صبح مجھے ٹھنڈا کر گئی...... ایسا جمود کہ جو ٹوٹ ہی نہ سکے...... نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے میرے ہاتھ کتنی بار کانپے تھے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں...... اور نانی اچانک زندگی سے منہ موڑ گئی تھیں۔

اسپتال کے اس ٹھنڈے کمرے کی دیواروں پر لگی سینریوں پر روتے ہوئے میری نظر پڑی تھی...... آنسوؤں کی دھند کے پار الفاظ بھی گم ہونے لگے تھے۔

''موت برحق ہے......''

''ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

رنگ محل کا ہر فرد شدتِ غم سے نڈھال تھا...... رنگ محل کا اہم ستون نہیں رہا تھا...... آنکھیں خشک ہی نہیں ہو رہی تھیں...... میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے روتی رہی...... میرا دوپٹا میرے قدموں میں پڑا تھا، روتے ہوئے فضا نے دوپٹے کو میرے سر پر جمایا تھا...... وہ دن رنگ محل پر بڑا بھاری تھا۔ بہت......

☆☆☆

کرسٹل پیسر کی احتیاط سے ڈسٹنگ کرتی میں ٹھٹک گئی تھی...... بھاری پردوں کے پار سے اس کی آواز آ رہی تھی۔

''نہیں دادی...... آپ نے یہ کیسے سوچ لیا......؟''

اس کے سوال میں حیرت تھی مجھے علم تھا۔

''کیا کمی ہے زویا میں......؟'' نانی میرا نام لے رہی تھیں...... میں چونک گئی تھی اور ڈسٹر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''کیا خوبی ہے اس میں......؟ وہ میری آئیڈیل نہیں ہے کسی بھی لحاظ سے...... شکل صورت، اسٹیٹس کچھ بھی تو اس کے پاس نہیں ہے...... اتنی عام سی لڑکی کے ساتھ لائف گزارنا...... ناممکن ہے میرے لیے......'' وہ قطعیت سے گویا ہوا تھا...... میں نے ٹیبل کا کونا پکڑا تھا...... ہاں میں ''عام'' سی تو تھی۔

اور وہ خوب صورت کشادہ پیشانی گھنے بال، روشن آنکھیں، ایک نظر ڈالو تو دوسری نظر ڈالنے کی تمنا...... بے اختیار دل میں جاگتی تھی...... اور دوسری طرف ''میں'' تھی...... اتنی عام کہ دوسری نظر ہی نہ ڈالی جائے۔

''وہ میری امی کی نشانی ہے حسن۔''

''تو کیا ہوا، ابو اور چچا کا سوشل سرکل بہت وسیع ہے...... ایزیلی زویا کے لیے رشتہ مل جائے گا۔''

''میں اپنی امی کی نشانی، یتیم نواسی کو غیروں کے حوالے کر دوں...... کلیجے پر ہاتھ سا پڑتا ہے۔''

''مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں دادی...... میں زویا کو کسی بھی صورت اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے سکتا......'' اس کے لیے جیسے میں چھوت تھی...... تب وہ اتنا میرے خلاف تھا شاید مجھے ایک نظر بھی گوارا نہ کرنے والا آج کیسے مان گیا تھا...... حیرت صد حیرت...... یقیناً کسی دباؤ کے تحت ہی اس نے ہامی بھری تھی ورنہ وہ کون سا مجھے پسند کرتا تھا جو ہامی بھرتا......'' ہاں تو زویا اکرام تم بے وقعت ہو تمہاری کوئی وقعت ہی نہیں......''

نانی چلی گئیں تو جیسے رنگ محل سناٹوں کی زد میں آ گیا تھا......زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی۔

اور اب مجھے سمجھ آیا تھا کہ نانی واقعی سچ کہتی تھیں وقت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا...... ہر دکھ، درد اتنی آسانی سے بھلا دیتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی اور پتا بھی نہیں چلتا۔

نانی کے وجود سے خالی پڑے تخت پر نظر پڑتی تو ایک بہت بڑی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کمی جو کبھی بھرتی ہی نہیں ہمارے ساتھ، ساتھ رہتی ہے......بس اس کی شدت کو یادیں کسی حد تک کم کر دیتی ہیں......تب تھوڑا ہنس لیا جاتا ہے اور تھوڑا رو لیا جاتا ہے۔ اب بھی معمولات وہی تھے...... وہی شام کو لان میں چائے کا منظر، صبح ناشتے کی پکار......

وہ ایک سرد شام کا منظر تھا......وہ شام دھند سے خالی تھی......رنگ محل کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ہم تینوں ٹیرس پر بیٹھے تھے......سامنے رکھی ٹیبل پر کافی کے تین مگ رکھے تھے۔

''دادی کے جانے کے بعد لگتا ہے رنگ محل کی رونقیں ہی ختم ہو گئی ہوں۔'' فضا نے جیسے سناٹے کو توڑا تھا۔

''سچ کہتی ہو......اب لگتا ہے ہر طرف خالی پن ہو......'' میں نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

اریبہ غائب دماغی کی کیفیت میں لگ رہی تھی جیسے وہ ہم میں بیٹھی ہی نہیں تھی۔

''آر یو او کے......؟'' فضا نے اس کے کاندھے پر رکھا تھا۔ وہ جیسے چونکی تھی۔

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں......تم دونوں کیا کہہ رہی تھیں؟'' وہ ہم سے پوچھ رہی تھی۔

فضا نے مجھے دیکھا تھا اور ہم دونوں مسکرا دیے۔

''ہم دونوں دادی کو یاد کر رہے تھے۔''

''ہاں فضا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ناں...... ہر بات میں مشورہ دیتی تھیں...... ہر مسئلے کا حل ان کے پاس ہوتا تھا......اب تو مانو ہمارا ناصح ہی گزر گیا۔''

جیسے ہر طرف اداسی پھیل گئی ہو......

☆☆☆

میں اکیلی سنگی بینچ پر بیٹھی تھی وہ دونوں اپنا آخری چکر مکمل کرنے گئی ہوئی تھیں......نیم کے درختوں کے زرد پتوں کی کھٹی باس پھیلی ہوئی تھی...... ٹیولپ کے پھولوں کا گلابی پن دہک رہا تھا۔

''ہیلو دوست...... کیسی ہو......؟'' تبھی وہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔

''اچھی ہوں۔'' ٹینس شوز اور آنکھوں پر گاگلز چڑھائے وہ میرے سامنے موجود تھا۔

''وہ تو مجھے پتا ہے......'' وہ ہنسا تھا......اور بینچ پر پڑی پانی کی بوتل اٹھالی تھی۔

''یہ تم اپنا پانی کیوں نہیں لاتے...... ہر روز ہمارا ختم کر جاتے ہو......'' میں نے جھلا کر کہا تھا۔

''لڑکی...... پانی پلانے سے ثواب ملتا ہے۔''

''یہ ثواب کبھی تم بھی کما لیا کرو......''

''تو پھر کہو تو نکڑ پر جو دکان ہے وہاں سے جوس لے آؤں......؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں...... یہ زحمت مت کرو......'' وہ ریلیکس ہو کر بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا تھا۔ ہلکی ہوا سے چنبیلی کی دھیمی، دھیمی خوشبو پھیلنے لگی تھی...... لائینز یا کے پھولوں پر بھونروں کی بہتات تھی......

''زویا......تم نے اس سے بات کی تھی......؟'' وہ اصل مدعے کی طرف آیا تھا۔

''تم خود کیوں نہیں کہہ دیتے اس سے؟'' میں نے جوابی سوال کر دیا تھا۔

''جانے کیوں میری ہمت ہی نہیں پڑتی......ڈر سا لگتا ہے کہ کہیں اس نے میرا پرپوزل ریجیکٹ کر دیا تو کیا ہو گا زویا......'' وہ اس پل مجھے کافی بے بس سا لگا تھا۔

''میں اس سے جلد ہی بات کروں گی......تم فکر مت کرو......'' میں نے اسے تسلی دی تھی۔

''تھینک یو یار...... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں چکا پاؤں گا......'' وہ میرا ممنون نظر آتا تھا۔

''اٹس او کے......تم نے بھی میری اتنی ہیلپ کی ہے۔'' میں قریب آتی اریبہ اور فضا کو دیکھ رہی تھی۔

''میرا فرض تھا، سمجھیں؟'' وہ دھونس جمانے لگا تو میں مسکرا دی تھی۔

''کن فرائض کی بات ہو رہی ہے؟'' فضا نے اس کی بات سن لی تھی اور ہنس کر بولی تھی۔ وہ بھی ہنس دیا تھا۔

''یہ تو میرا اور زویا کا secret ہے۔'' میں نے اریبہ کی طرف دیکھا تھا وہ لاتعلق نظر آتی تھی اور دور کہیں

دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''میں جانتی ہوں کہ تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو بلکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ زویا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔'' میرے ہاتھ سے پین چھوٹ کر کارپٹ پر جا گرا تھا۔ اریبہ مجھ پر سات آسمان توڑ کر کھڑکی کے پاس کھڑی باہر کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی اور بہت بڑی ہوئی تھی۔

''تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو اریبہ......'' اسٹڈی روم میں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

''نہیں زویا...... آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں ہوتا۔'' جانے کیوں مجھے اس کی آواز بھیگی ہوئی سی لگی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تھی۔

''ہر بار آنکھوں دیکھا سچ بھی نہیں ہوتا۔'' وہ مڑی اور میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی...... آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''میں جانتی ہوں زویا کہ تمہارے دل میں حسن بھائی نہیں بلکہ حماد اصغر ہے۔'' اور وہ یہ کہتے ہوئے کانپ رہی تھی...... مجھے غصہ آیا تھا۔

"how can you say that...?you are absolutely worng" میں نے زبردست انداز میں اس کی بات کی تردید کی تھی...... وہ حیرت سے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''حماد اصغر صرف اور صرف میرا دوست ہے اریبہ...... اس نے مجھے اس وقت سپورٹ کیا جب میں خود کو بہت تنہا اور اکیلا سمجھ رہی تھی...... میرے لیے ماضی بھلانا آسان نہیں تھا مگر حماد نے یہ ممکن کیا...... میں نے اپنا ہر پرابلم اس سے شیئر کیا ہے اور اس نے اس پر مجھے مشورے دینے کے بجائے پرابلم کا حل میرے سامنے رکھا ہے۔ اس نے میرے دل میں جگہ بنالی ہے، میں نے وہ سب اس سے شیئر کیا جو میں کبھی رنگ محل کے کسی فرد سے نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دونوں میں انڈراسٹینڈنگ ہے...... تم ہماری دوستی کو محبت کا نام نہ دو...... اور رہی بات محبت کی تو حماد اصغر کسی اور سے محبت کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اریبہ کو دیکھا اور مجھے لگا جیسے اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہو...... وہ مجھے کسی ٹوٹی ہوئی عمارت کے مانند لگی تھی...... جو بکھرنے کو ہے۔

''وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے......'' وہ جیسے بڑبڑائی تھی۔

پھر وہ آہستہ قدموں سے چلتی میری طرف آئی تھی...... اس کا دوپٹا گر گیا تھا۔

''زویا...... بتاؤ مجھے...... وہ کس سے محبت کرتا ہے؟'' اس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سوال میں امید، آس، تڑپ اور بہت کچھ تھا...... اور کہیں مر جانے کے جیسی کیفیت بھی تھی وہ مجھے اس پل بڑی ہاری ہوئی...... مات کھائی ہوئی سی لگی تھی۔

''وہ کس سے محبت کرتا ہے؟'' وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی...... آنکھوں سے چمکدار موتی سے آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر کارپٹ میں جذب ہونے لگے ہیں۔

میں نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر کہہ دیا تھا۔ ''وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' وہ بے یقین نظروں سے مجھے دیکھتی رہی...... دیکھتی رہی...... میں کھڑکی کی طرف بڑھی اور کھڑکی کو کھول دیا تھا...... ہلکی ہلکی دھوپ اسٹڈی روم میں چلی آئی۔

''حماد اصغر تم سے محبت کرتا ہے اریبہ......'' میں نے دوبارہ دہرایا تھا...... اور محبت کی خوشبو رنگ محل کے گرد ہجوم ڈالنے لگی...... اور پھر کہیں...... سازِ محبت بج رہا ہے...... عمر خیال کی رباعی جیسا...... مقدس......

☆☆☆

وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جا رہا تھا...... نانی کو گزرے ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے...... اور وہ شاید اب یاد بن چکی تھیں۔ ایک بھولی بسری سی یاد جو کبھی، کبھی ہی یاد آتی ہے...... شاید یہی زندگی کا چلن ہے۔ وہ ایک دھند میں لپٹی صبح تھی جو رنگ محل کے وجود کو اپنی دھند میں کسی حد تک غائب کر چکی تھی...... میں الماری کی سیٹنگ کر رہی تھی جبھی وہ کمرے میں داخل ہوا تھا...... ڈریس پینٹ میں ملبوس تیکھے نقوش...... صاف پتا لگتا تھا کہ وہ اس وقت غصے کی حالت میں ہے...... وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کول واٹر کی سحر انگیز کرتی خوشبو پورے کمرے میں بکھر گئی تھی۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ مجھ سے

مخاطب تھا...... میں نے اس کے لہجے پر غور نہیں کیا تھا۔
''جی...... آپ بات کریں، میں سن رہی ہوں۔''
میں نے جواباً کہا تھا...... وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے ملائے شاید کوئی تمہید باندھنے کی سوچ رہا تھا...... میں نے الماری صاف کرنے کا اپنا کام بدستور جاری رکھا تھا۔
''شاید تم نہیں جانتیں کہ میں نے زندگی ایک organized طریقے سے گزاری ہے اور آگے بھی میرا یہی ارادہ ہے...... زندگی کا ہر فیصلہ بچپن سے میں خود لیتا آیا ہوں چاہے جو بھی ہو...... اور میں یہ بھی کسی حد تک سمجھتا ہوں کہ مجھ میں اچھے فیصلے کرنے کی صلاحیت موجود ہے...... تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟'' وہ بات روک کر مجھ سے پوچھنے لگا تھا...... کمرے میں جیسے دھند چھانے لگی تھی...... میں واقعی سمجھ رہی تھی۔
''جی میں سمجھ سکتی ہوں۔''
''ویل...... میں نے اپنی زندگی کے فیصلوں کا اختیار اپنے ہاتھوں میں رکھا، وہ سارے فیصلے جو ایک انسان اپنے کیریئر کے حوالے سے یا پھر اور کسی بھی حوالے سے لیتا ہے...... میری اپنی زندگی ہے اور اسے میں اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک سوشل سرکل ہے......'' وہ بول رہا تھا...... میں سن رہی تھی اور سن ہو رہی تھی۔
''دادی کے بیمار ہونے پر اور ان کی آخری خواہش کے پورا کرنے کے لیے ابو اور چچا نے مجھے بہت فورس کیا کہ میرا نکاح تم سے کر دیا جائے اور مجبوری میں ایسا کرنا پڑا...... مگر اب جب میں چار سال کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں تو تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رشتے میں میری مرضی ایک پرسنٹ بھی نہیں۔'' وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی...... کتنا آسان تھا اور کتنا آسان ہوتا ہے ناں کسی دوسرے کو زندہ درگور کر دینا...... کاش...... کوئی سمجھ سکے...... ٹھنڈے پہر کا سناٹا مجھے جامد کر گیا۔
''میں نہیں چاہتا کہ اس relation کو لے کر تم مجھ سے کوئی امید باندھو...... یہ ہماری مشرقی لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے ناں...... سو میں تمہیں پہلے ہی بتا رہا ہوں...... کہ تم ایسی کوئی بھی امید نہ باندھنا......'' ایک آنسو میری پلکوں کا گھیرا توڑ کر میرے ہاتھوں پر گرا تھا...... ٹھنڈی صبح کے مانند ٹھنڈا آنسو۔
''میرا آئیڈیل تم جیسی شائی اور دبو قسم کی لڑکیاں نہیں ہیں...... اور سوری اگر تمہیں برا لگا ہو یہ سب کچھ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے۔''
میں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر حسن علی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا...... وہاں ''سب'' کچھ تو تھا مگر ایک ''افسوس'' ہی تو نہیں تھا...... کاش یہ ہوتا...... کمرے کی گھٹن بڑھ گئی ہے...... کھڑکیاں بند ہیں......
''میرے آئیڈیل جیسی کوئی دو خصوصیات بھی تم میں ہوتیں تو میں سوچ سکتا تھا...... مگر زویا سوری ٹو سے تم میرے معیار پر پورا نہیں اترتی ہو۔''
مجھے اس لفظ ''معیار'' سے خوف آیا تھا...... ہر کسی کو آتا ہے۔
''اور میں یہی بتانے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں...... تم سمجھ گئی ہو ناں؟'' وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ تہ کر کے رکھا ہوا کپڑوں کا ڈھیر بکھر گیا تھا۔
''تم رو رہی ہو......؟'' وہ متفکر سا پوچھنے لگا...... میں ہنسی تھی...... اور کس دل سے ہنسی تھی مجھے پتا تھا۔
''نہیں شاید آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔'' میں نے وہ بہانا بنایا جو اکثر ہارے ہوئے، مات کھائے لوگ بناتے ہیں...... وہ ٹشو باکس سے ٹشو نکالتا میرے قریب آیا۔
"take it" میں نے اس کے ہاتھ سے ٹشو لے لیا تھا۔
''زویا...... مجھے تم سے ایک فیور چاہیے......''
میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا اور قریب ہوا تھا...... ''میں چاہتا ہوں کہ جب چار سال بعد میں واپس لوٹوں تو تم اس سے پہلے ہی اس رشتے سے انکار کر دینا...... ابو اور چچا تک اپنا انکار پہنچا دینا...... میں نہیں چاہتا واپسی پر مجھے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے...... تم ایسا کرو گی ناں زویا......؟'' وہ سوال تھا اگر تو جان لیوا تھا مگر میں اس کو سہہ گئی...... کبھی کبھی سوال پل صراط ہو جاتے ہیں پار کرنا مشکل اور ناممکن ہوتا ہے۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا...... جیسے سفید چادر تن گئی ہو۔
میں کسی اندھے گڑھے میں گر گئی تھی...... ہر طرف

اندھیرا...... بڑا کٹھن لمحہ تھا...... اور میں نے اپنے چہرے پر کھوکھلی ہنسی سجانے کی کوشش کی...... ایک، دو، تین اور چوتھی کوشش میں، میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''ٹھیک ہے حسن علی......'' میں نے ہامی بھری تھی اور کس دل سے بھری تھی صرف مجھے پتا تھا...... مجھے خبر تھی اور شاید رنگ محل پر اتری دھند کو پتا تھا۔

اور اس شام جب وہ چلا گیا تو میں سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی...... اکیلی...... اور روتے ہوئے اختیار کے دائرے سے باہر کی باتیں کہی جاتی ہیں ناں...... اور میں بے اختیار اسے بددعا دے بیٹھی تھی۔

''اللہ کرے...... حسن علی کو مجھ سے محبت ہو جائے۔'' اور وقت کے بھید بھرے لمحوں نے یہ سرگوشی پھیلادی...... دور تک...... بہت دور تک...... اور آج جب زویا اکرام اس بددعا کو مکمل طور پر بھول چکی ہے بددعا میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے...... قبول ہوئی...... قبولیت کے درجے طے کرتی ہوئی۔

''کبھی، کبھی کچھ بددعاؤں میں دعاؤں جیسے رنگ ہوتے ہیں جو اتنے پکے ہوتے ہیں کہ کبھی کچے نہیں پڑتے...... باقی رہتے ہیں۔''

☆☆☆

فلیٹ روڈ کی اونچی نیچی سڑک پر وہ بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہیں۔ سہ پہر کا گلابی پہر ہر طرف چھا چکا ہے...... ہوا میں خنکی سی ہے...... وہ دونوں ساتھ، ساتھ چل رہے تھے...... اریبہ کے ہاتھ میں چپس کا پیکٹ تھا...... جو وہ اور حماد شیئر کر رہے تھے...... سڑک کے کنارے لگے درختوں کے خزاں رسیدہ زرد پتے ہلکی ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر سڑک پر گرتے...... سڑک پر ان زرد پتوں کی ہلکی سی چادر بن چکی تھی۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' یہ اریبہ کا سوال تھا...... وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''آسمان پر تاروں کے جتنی۔''

''سچی......؟'' حیرت......

''مچی......'' تصدیق۔

''پتا ہے میں کبھی، کبھی بہت شرمندہ ہو جاتی ہوں کہ میں نے کتنا غلط سوچا تم اور زویا......'' زرد پتے ان کے پیروں تلے آکر چرمرا رہے ہیں...... لمبی ہوا کے

جھونکے پتوں کو جانے کہاں سے کہاں اڑا دیتے تھے۔

''تم نے غلط سوچا تھا...... تمہیں missunder standing ہوئی تھی اریبہ...... زویا اور میرا رشتہ صرف اور صرف دوستی کا ہے...... میں نے اسے پہلی بار ٹیرس کے جھولے پر روتے ہوئے دیکھا تھا...... وہ مجھے بہت اداس اور اکیلی سی لگی تھی...... تبھی میں نے اسے اس phase سے نکالنے کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا...... وہ بہت اچھی لڑکی ہے......'' حماد نے رسان سے کہتے ہوئے سامنے پڑے پتھر کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑایا تھا۔ پتھر کی آواز بازگشت بن گئی۔

''تمہیں مجھ سے کب محبت ہوئی......؟'' دلچسپ سوال......

''شاید محبت ہونے کا وقت نہیں ہوتا...... مگر پھر بھی شاید اس وقت ہوئی ہوگی جب تم دو چوٹیاں باندھتی تھیں اور ہم ساتھ کھیلتے تھے...... ہمارا بچپن' ہماری محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے......'' وہ مسکرایا تھا۔ وہ رکی اور سڑک کے بیچوں بیچ ہاتھ باندھے کھڑی ہوگئی۔

''پھر تم نے اظہار میں دیر کیوں کی؟'' تفتیشی انداز۔

''مجھے لگا شاید تم میری محبت کو قبول ہی نہیں کرو...... ایک ڈر سا لگا رہا تبھی خاموش رہا...... ہاں...... میں نے زویا سے یہ بات شیئر کی تھی۔'' مدافعتی انداز۔

گلابی پھول سر اٹھائے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہیں اور پھر سر جھکا لیتے ہیں......

''میں بہت بے یقین ہوئی کیونکہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو...... تم اور زویا شاید یہی سب ڈسکس کرتے ہوئے لان میں بینچ پر بیٹھے روز قہقہے لگاتے تھے اور میں سلگتی رہتی تھی۔''

''تو تم نہ سلگتیں ناں...... ہمیں جوائن کرلیتیں۔''

''تم نے آفر کی تھی؟''

''تم ویسے ہی آجاتیں......''

''جی نہیں......''

اور وہ ٹھٹکتے ہیں...... رکتے ہیں...... وائلن کی آواز...... فلیٹ روڈ پر کوئی وائلن بجا رہا ہے...... اریبہ نے خالی چپس کا پیکٹ ہوا کے سپرد کیا تھا۔

وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

''کتنا پیارا موسم ہے ناں آج......''

''تم جو ساتھ ہو تبھی پیارا لگ رہا ہے......'' وہ مسکرایا تھا۔ خوب صورت مسکراہٹ......

''ڈائیلاگ بول رہے ہو؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں ڈائیلاگ لگ رہا ہے؟'' وہ سنجیدہ ہوا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''محبتوں میں یقین نہ ہو تو بے جان لگتی ہیں۔''

''اور اگر محبتوں میں جھگڑے ہوں تو......؟'' وہ شوخ ہوئی تھی۔

''تب محبتوں کو جاندار تصور کیا جاتا ہے......'' وہ بھی شوخی سے مسکرادیا تھا۔ وہ واپس پلٹ رہے تھے...... ہلکی ہوا زرد پتوں کو اڑا لے گئی تھی...... فلیٹ روڈ کی سڑک خالی تھی۔

''میں ایک بات سوچ رہی تھی......'' وہ حماد کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کون سی بات......؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''جانے کیوں مجھے لگتا ہے زویا اور حسن بھائی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں...... مگر پھر ایک بات سمجھ نہیں آتی۔''

''کون سی بات......؟''

''یہی کہ زویا نے اس رشتے سے انکار کردیا مگر کیوں......؟ اس نے ابو اور چچا سے نکاح توڑنے اور طلاق کا مطالبہ کیا ہے...... جانے کیوں......؟''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ حسن اس رشتے کے خلاف تھا...... تو جب ایک فریق کی مرضی نہ ہو تو زبردستی کے بندھن کا کیا فائدہ......'' حماد نے کہا تھا...... خنک ہوا گلابی پھولوں کی خوشبو سے بھر گئی ہے...... پرندوں کی آوازیں سناٹے میں مخل ہوتی ہیں۔

''مجھے لگتا ہے حسن بھائی، زویا کے اس فیصلے سے ڈسٹرب ہیں۔''

''مگر کیسے......؟'' یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی...... چار سال پہلے کے حالات سے وہ واقف تھا مگر اب حسن کیوں ڈسٹرب تھا۔

اور اب زویا اکرام وہی چار سال پہلے والی زویا نہیں تھی...... چار سالوں نے اسے تراش کر ہیرا بنادیا تھا۔ گریس فل اور باوقار سی زویا اب بڑی خاص تھی......

مزاج میں ایسی تمکنت تھی کہ مخاطب مسحور ہو جاتا تھا......
پُرارادی نظریں، ارادی بن کر پلٹتی تھیں۔

اب وہ لیکچرار زویا اکرام تھی......جس کے اسٹوڈنٹس اس کے مداح تھے......وہ واحد لیکچرار تھی پورے کالج کی جس کی کلاس کی حاضری یقینی ہوتی تھی۔

اس نے بڑی محنت اور ریاضت سے وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنا سیکھا تھا......وقت لگا تھا......مشکل بھی ہوئی تھی مگر آخر کار وہ سیکھ ہی گئی تھی۔ اور رنگ محل کے در و دیوار اس کی تنہائیوں اور خود کو دی جانے والی کھوکھلی تسلیوں سے بخوبی واقف تھے......وقت نے اسے کندن کر دیا تھا۔

☆☆☆

رنگ محل پر بارش برس رہی تھی......ہلکی، ہلکی سی اور بارش کی ہر بوند، ہر قطرے میں خوشبو تھی...... وہ میرے ساتھ ہی بینچ کے دوسرے سرے پر آن بیٹھا ہے، وہ بارش میں بھیگ رہا ہے......مگر اسے کوئی پروا نہیں......
سے مجھے نہیں......

وہ خاموش بیٹھا ہے، بالکل چپ چاپ......حماد اور اریبہ کی شادی کی تقریب اختتام پزیر ہو چکی تھی۔

اور ساری تقریب کے دوران وہ مجھے اپنی طرف ہی متوجہ نظر آیا تھا...... مجھے حیرت ہوئی تھی اور بار، بار ہوئی تھی۔ اب یہ توجہ کیا معنی رکھتی تھی؟

سارے سلسلوں کے اختتام کے بعد یہ نیا آغاز کیسا؟

مجھے الجھن ہوئی تھی ان نظروں سے جن نظروں سے مجھے دیکھا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ میرے قریب چلا آیا تھا......
چار سال بعد کی پہلی ملاقات......اور چار سال پہلے کی آخری ملاقات...... بلیک اور وائٹ ڈریس پینٹ میں وہ اتنا ہی شاندار تھا جتنا چار سال پہلے تھا......وہی تیکھے نقوش؟ وہی لب......اور......ہاں......اور وہی مسکراہٹ......

''کیسی ہو زویا......؟'' میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا تھا اور پھر اسے......

''میں ٹھیک ہوں......تم کیسے ہو......؟'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمہیں کیسا لگ رہا ہوں......؟'' وہ مسکرایا تھا۔ اور میں اسے پرکھنے لگی تھی۔

''بالکل ویسے ہی جیسے چار سال پہلے تھے......'' میں نے کمال اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ مجھے حیران، حیران سا لگا۔

''کیا واقعی میں نہیں بدلا؟''

''کیا یہ سوال غیر ضروری نہیں؟'' میں باوقار انداز میں دوپٹا ٹھیک کرتی مسکرائی تھی۔

''ہر وہ سوال جس میں میرا ذکر ہو......تمہیں اب غیر ضروری لگتا ہے کیا؟''

فانوسوں کی جگر، جگر کرتی روشنیوں میں ہم آمنے سامنے کھڑے تھے...... ہر طرف خوشبو سی تھی۔ باوردی ویٹر گھوم پھر رہے تھے۔

''تم نے خود ضروری لگنے کا جواز چھینا تھا......'' میں اس بار بڑی دقت سے مسکرائی تھی۔

''اگر میں دوبارہ جواز دے دوں تو......؟'' وہ آس سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''ٹوٹے شیشوں میں دراڑیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں...... ناممکن ہے اب......'' میں نے مڑ کر ٹیبل سے ٹشو اٹھایا تھا......وہ پھیکی ہنسی ہنستا اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا رہا۔

''سارے راستے بند ہیں......کوئی کھڑکی نہیں کھلی ہوئی؟'' حسن علی کی آواز میں جیسے چار سال کا سفر سمٹ آیا تھا......میں نے نظر چرائی تھی۔

''ساری کھڑکیاں بند ہیں اب حسن۔'' روشنیاں جلنے بجھنے لگی تھیں۔

''میں بار، بار دستک دیتا رہوں گا۔''

''تھک جاؤ گے۔''

''نہیں ......مر جاؤں گا۔'' کیا تھا اس کے لہجے میں...... میں ہول گئی۔

میں چپ کھڑی رہ گئی...... ماضی بھلانے کی سکت مجھ میں نہیں تھی۔ شاید کسی میں بھی نہیں ہوتی......کاش ہوتی...... اور تبھی مجھے لگا کوئی وائلن بجا رہا ہو......ایسی دھن جو محبتوں کے عالم میں بجائی جاتی ہے۔ فلیٹ روڈ کا وائلن بج رہا ہے۔ جیسے چاروں طرف گلاب گر رہے ہوں......سرخ، نارنجی۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں زویا......'' وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔

اور وائلن کی دھن نہیں تھم رہی......محبت کا گلابی پہر وارد ہونے کو ہے۔

☆☆☆

''پتا ہے تمہیں زویا......ان چار سالوں میں کوئی دن

ایسا نہیں گزرا جب میں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو...... مجھے بہت حیرت ہوئی تھی کہ میں اسے یاد کررہا تھا جو میرے نزدیک عام سی تھی...... میری ایک یتیم کزن...... پھر مجھے یہ پتا چلا تو میں ساکت ہوگیا کہ یہ جو دل ہوتا ہے یہ کسی ''عام'' کو کیسے ''خاص'' کے دائرے میں رکھتا ہے......'' وہ برستی بارش میں مجھے گزرے چار سالوں کا احوال سنا رہا تھا۔

اور میں رنگ محل کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے سن رہی تھی۔

''یہ جو محبت ہوتی ہے ناں یہ آپ کو...... ''آپ'' نہیں رہنے دیتی...... ''تم'' کردیتی ہے......اور پہلے دن سے مجھے تم سے خوف محسوس ہوا تھا جیسے تم مجھے ''مجھ'' سے چھین لوگی......اور میں ٹھیک سوچتا تھا۔تم نے یہ کردکھایا۔''

گہری رات اور آسمان پر ٹہلتے تارے وہ سب سن رہے تھے۔

''زندگی کے ان چار سالوں نے مجھے یہ اچھی طرح بتادیا تھا کہ عام لوگ کبھی عام نہیں ہوتے...... ہر انسان اسپیشل ہے، خاص ہے......اور ہر انسان ہر انسان کے لیے خاص نہیں ہوتا بلکہ کوئی کسی ایک کے لیے ہوتا ہے۔''

سحر زدہ لمحوں میں سحر زدہ وقت آن ٹھہرا تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہا تھا...... مسکراتی آنکھیں...... ہاں...... آنکھیں بھی مسکراتی ہیں۔

"you are special for me" ہلکی بارش سے رات بھیگ رہی تھی......رفتہ، رفتہ ہولے، ہولے۔

''معاف کرنا آسان نہیں ہوتا حسن...... یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اور یہ مشکل کام میں نے بڑے صبر سے کیا ہے......دل کی بند کھڑکیاں کھولنا آسان نہیں ہوتا۔''

میری آواز بارش میں بھیگ رہی تھی۔

''اگر آج تم مجھے معاف نہ کرتیں تو میں بھی کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کرپاتا۔'' وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔

بارش میں بھیگا ہوا...... ماتھے پر بکھرے بال......

''کوئی بات نہیں...... میں نے تمہیں معاف کیا۔''

''شکریہ زویا......'' وہ مسکرایا تھا۔

اس بھیگی رات میں ایک اعتراف بڑے چپکے سے میرے دل نے کیا تھا۔

''حسن علی کی مسکراہٹ زویا اکرام کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔''

خنک ہوا نے میرے بالوں کو اڑایا۔

''کہیں چلیں؟'' وہ میری طرف جھکا تھا۔

''کہاں......؟''

''فلیٹ روڈ واک کرنے......''

''اس وقت؟'' میں حیرت زدہ ہوئی۔

''ہاں......'' وہ میری طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا......

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

بارش تھم چکی ہے......فلیٹ روڈ کے گلابی پھول سر اٹھا کر دیکھتے ہیں...... جھک جاتے ہیں۔

''شکریہ......'' وہ رک کر میرے سامنے آن کھڑا تھا۔

''کس لیے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''اس فیور کے لیے جو تم نے مجھے دیا......''

''تمہیں خالی ہاتھ لوٹانے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں......'' میں نے اڑتے ہوئے بال سمیٹے تھے۔

''میں اسے اظہارِ محبت سمجھوں......؟''

''ہاں......سمجھ سکتے ہو......''

وہ میرے سامنے کھڑا تھا......اس نے میرے ہاتھ تھامے تھے۔

''میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری محبت سے نوازا۔''

میں ہنسی......اور ہنستی چلی گئی۔

فلیٹ روڈ کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے ہم خوش ہیں...... بہت......

''زندگی میں سچی محبتوں کے لیے کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھنی چاہئیں، کبھی کبھار دستک دینے والوں کی زندگی میں شام آجاتی ہے......اس شام سے انہیں بچا کر رکھنا چاہیے۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے جارہے ہیں۔

اور فلیٹ روڈ کا واکلن اور میری ڈائری میں تحریر ایک غزل اس خنک رات کے سناٹے کو توڑتی ہے۔

کچھ دور ہمارے ساتھ چلو ہم دل کی کہانی کہہ دیں گے
سمجھے نہ جسے تم آنکھوں سے وہ بات زبانی کہہ دیں گے
پھولوں کی طرح جب ہونٹوں پر اِک شوخ تبسم بکھرے گا
دھیرے سے تمہارے کانوں میں اِک بات پرانی کہہ دیں گے
اظہارِ وفا تم کیا سمجھو،اقرار وفا تم کیا جانو
ہم ذکر کریں گے غیروں کا اور اپنی کہانی کہہ دیں گے۔

گرما گرم برگرز بڑے سے خوب صورت پلیٹر
اپنی بہار دکھا رہے تھے.....خستہ، خستہ چکن نگٹس کی
خوشبو سے کچن مہک رہا تھا اور اب بسمہ جلدی، جلدی فرنچ
فرائز بنانے میں لگی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً گھڑی پر بھی نظر دوڑا
رہی تھی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت بس ہوا ہی
چاہتا تھا اور سات سالہ شان اور نو سالہ ایمان اسکول سے
آتے ہی بھوک، بھوک کا شور مچا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیتے
تھے۔ اور آج تو خصوصی طور پر بسمہ نے ان کی پسند کا لنچ
بنایا تھا۔ بچوں کی خوشی کا سوچ کر ہی بسمہ بھی خوش تھی۔
ابھی اس نے فرائز کی آخری کھیپ نکالی ساتھ ہی کال بیل
بھی بج اٹھی۔ وہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے کچن سے نکلی۔
گیٹ کھولتے ہی دونوں بچوں نے سلام کے بعد پہلا نعرہ
سب توقع بھوک کا ہی لگایا۔ بسمہ نے مسکراتے ہوئے
ان کے بیگ تھامے اور دونوں کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

جب تک بچے یونیفارم تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل تک پہنچے۔ بسمہ تمام چیزیں ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ دونوں بچوں کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔

''ماما! کولڈ ڈرنک بھول گئیں آپ؟'' ایمان نے چھوٹی سی ناک چڑھاتے ہوئے کہا تو بسمہ فوراً فریج کی طرف دوڑی۔

دونوں بچے کھانے میں مصروف ہوگئے ساتھ ہی ماما کو پورے دن کی رُوداد بھی سنائی جانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ برگرز، فرائز اور نگٹس پر خوب ہاتھ صاف کیے جا رہے تھے۔ تبھی بیل دوبارہ بج اٹھی۔ بچوں کی باتوں میں منہمک بسمہ چونک اٹھی۔ گیٹ کھولنے پر معلوم ہوا کہ کچرا اٹھانے والی بچی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے

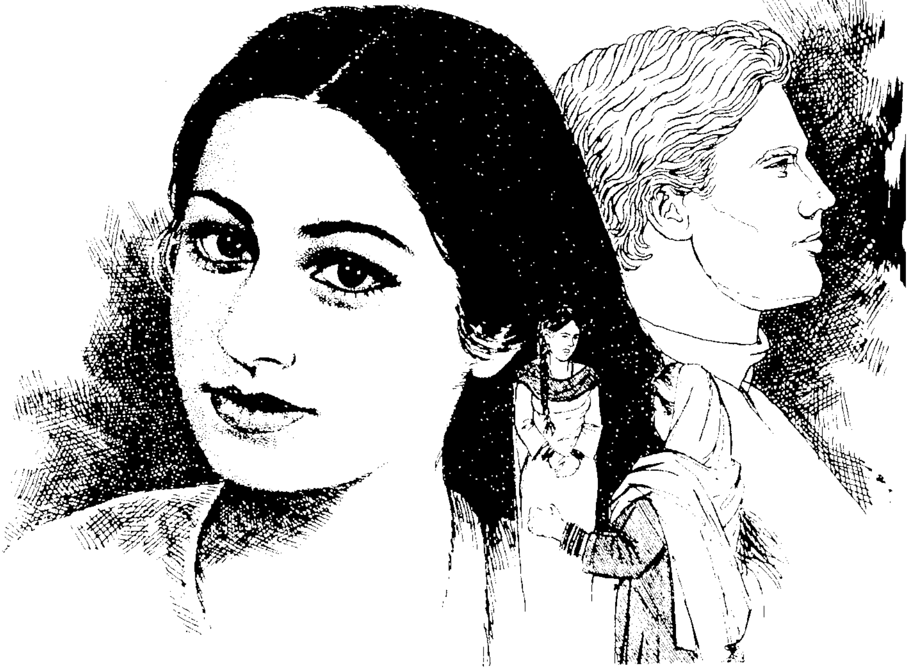
ہالہ احمد



''آجاؤ کچن سے ڈسٹ بن خالی کرلو۔''بسمہ اندر آئی تو دونوں بچے کھانے سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔
''ماما......!بس۔''ایمان نے ماں کو دیکھتے ہی نو مور کا بورڈ لگا دیا۔
''ماما بس اور دل نہیں چاہ رہا، ہم نے بریک میں چکن رول بھی کھائے تھے ناں......''شان نے بھی بہن کی تقلید کی۔بسمہ نے ایک نگاہ ٹیبل پر ڈالی۔
''ارے شان! ایمان! تھوڑا سا تو اور کھاؤ بیٹا، ماما نے اتنی محنت سے بنایا ہے۔''
''بھئی ماما کھالیا ناں بس اور نہیں کھایا جا رہا اب۔'' دونوں نے کورا جواب دیا۔
''اچھا چلو تھوڑا ٹھہر کے یا شام میں کھا لینا...... اوکے؟''بسمہ نے مسکراتے ہوئے برگرز کا پلیٹر اٹھایا۔اتنے میں وہ کچرے والی بچی بھی ڈسٹ بن خالی کر چکی تھی۔
''کیا بات ہے؟''بسمہ نے اسے ہنوز کھڑے دیکھا تو پوچھا۔
''باجی کوئی کھانے کی چیز ہے تو دے دو بھوک لگی ہے۔''اس نے ملتجی نظروں سے بسمہ کی طرف دیکھا۔
''نہیں بھئی روٹی وغیرہ تو آج بنی نہیں کچھ اور بھی ایسا نہیں جو تمہیں دے سکوں۔''بسمہ نے نگٹس اور فرائز ائر ٹائٹ ڈبے میں رکھتے ہوئے معروف سے انداز میں جواب دیا۔بچی نے عجیب سی نظروں سے ڈبے کو فریج میں منتقل ہوتے دیکھا اور خاموشی سے کچرا اٹھا کر باہر نکل گئی۔
شام کو دونوں بچے سو کر اٹھے۔نہا دھو کر ہوم ورک لے کر بیٹھ گئے۔پڑھتے، پڑھتے انہیں کچھ کھانے کی طلب ہوئی۔بسمہ فوراً اٹھی۔''چلو میں تم لوگوں کو نگٹس اور فرائز گرم کر کے لا دوں۔''
''نہیں ماما نگٹس اور فرائز نہیں کچھ اور......''شان نے نخرہ دکھایا۔
''ماما برگرز بھی نہیں اب کچھ اور دل چاہ رہا ہے۔''ایمان کیوں پیچھے رہتی۔
''اچھا کچھ اور کیا بھئی؟''بسمہ نے ان کی طرف دیکھا۔
''ماما ہاٹ ڈوگ سینڈوچ آرڈر کر دیں۔''
''یس! میں بھی کھاؤں گی ماما۔''نئی فرمائشیں...... بسمہ نے انہیں مصنوعی غصے سے گھورا اور پھر موبائل فون اٹھا لیا۔آرڈر ہو گیا۔کچھ ہی دیر بعد پارسل دروازے پر تھا۔بچوں نے مزے، مزے سے کھایا۔دوپہر والے برگرز، فرائز اور نگٹس کے ڈبے جوں کے توں فریج میں رکھے رہ گئے۔
رات کو پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے بچوں نے کچھ نہیں کھایا صرف دودھ کا ایک، ایک گلاس پی کر سو گئے۔صبح اسکول جاتے ہوئے دونوں نے بریک میں کھانے کے لیے فرنچ ٹوسٹ کی فرمائش کر دی۔یوں لنچ بکس فرنچ ٹوسٹ سے بھر کر دونوں کے ساتھ روانہ کر دیے گئے۔
بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد بسمہ نے میاں کو دفتر روانہ کیا۔خود بچوں کا بچا ہوا ناشتا لے کر ٹی وی کے آگے آ بیٹھی۔ناشتا مکمل کر کے وہ کچن کی طرف آ گئی۔برتن دھو کر ریک میں رکھے۔ساتھ ہی فریج کی صفائی کا بھی خیال آ گیا۔''خاصا بھر گیا ہے فالتو کے سامان سے آج کچھ ہلکا کر لینا چاہیے۔''اس خیال کے آتے ہی فریج کھولا۔دوسری بہت سی بیکار نظر آنے والی چیزوں کے ساتھ وہ ڈبے بھی نظر آئے جن میں نگٹس وغیرہ تھے۔کھول کر دیکھا پھر سوچنے لگی۔
''اب کہاں بچوں نے یہ سب کھانا ہے۔ویسے بھی فاسٹ فوڈ اتنا باسی تو ہرگز بھی بچوں کو نہیں دینا چاہیے۔''خواہ مخواہ چیزوں کو سونگھا۔''اونہوں...... ماما کی تو عجیب سی اسمیل آ رہی ہے......اور یہ فرائز بھی کتنے سخت ہو گئے ہیں......برگرز تو بالکل بھی صحیح نہیں لگ رہے مجھے......انہیں کیوں سنبھال کے رکھوں...... بچوں نے کھانا ہوگا تو فریش بنا دوں گی سب کچھ...... یہ سب کھا کے خدانخواستہ بیمار نہ پڑ جائیں......اُف اللہ نہ کرے۔''سوچ کر ہی بسمہ کو جھرجھری آ گئی۔اس نے سب چیزیں ایک شاپر میں پلٹیں اور شاپر کی گرہ لگاتے ہوئے سوچا......''آج کچرا لینے والی بچی آئے گی تو اس کے مانگنے سے پہلے ہی اسے دے دوں گی.....خوش ہو جائے گی بیچاری۔''

غلطی

مریم شہزاد



''یا اللہ خیر، آج بہو بیگم نے صبح ہی صبح کیسے یاد کرلیا؟'' شائستہ بیگم نے فون کی چمکتی ہوئی اسکرین کو دیکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی، 12 بج رہے تھے اور یقیناً افشین کی تو ابھی صبح ہی ہوئی ہوگی، انھوں نے فون اٹھایا اور ہیلو کہنا ہی چاہا تھا کہ ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی افشین نان اسٹاپ شروع ہوگئی۔

''ہائے امی، آپ ہی کوئی ماسی بھیج دیں، قسم سے کچن کو دیکھ، دیکھ کر ہول اٹھ رہے ہیں، سمجھ ہی نہیں آرہا کہ کیا کروں، ہفتہ اور اتوار ہم نے باہر سے کھانا منگوالیا تھا مگر پھر بھی اتنے سارے برتن جمع ہوگئے۔ میں تو آج بھی آپ کے ہاں آرہی تھی۔ مگر پتا نہیں، انھوں نے کیوں منع کردیا.... الگ ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ساس بن جاتے ہیں یہ بھی پوری...... یہاں جاؤ..... وہاں نہ جاؤ، یہ نہ کرو، اچھا چھوڑیں......اب بتائیں کیا کروں......آپ ماسی بھیج رہی ہیں ناں...... میرا تو بی پی شوٹ کررہا ہے، کچن الگ گندا، استری والی بھی نہیں آئی۔ جھاڑو والی صبح، صبح حساب کرکے چلتی بنی، ای ماسی......'' اچانک فون بند ہوگیا، شاید بیٹری لو تھی، ورنہ لگتا تو یہ تھا کہ وہ ابھی بات کرتے، کرتے رو ہی دے گی۔

اس کے اس انداز پر شائستہ بیگم کو ہنسی روکنا مشکل ہوگیا تھا کہ افشین نے اپنی امی کی جگہ شوہر کی اماں کو فون کردیا تھا۔ فون بند ہوتے ہی وہ کھل کر ہنس دیں مگر پھر

سنجیدگی سے سوچنے لگیں۔
''اگر بہو کے بجائے میری اپنی بیٹی کا فون ہوتا تو میں کیا کرتی؟'' انہوں نے جیسے اپنے دل کو ٹٹولا مگر اپنے کسی جواب سے مطمئن نہ ہوئیں۔''میں شاید یوں کرتی...... شاید سمجھاتی۔ مگر اب کیا کروں......'' کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا، وہ خود تو نہیں چاہتی تھیں کہ روایتی ساس بنیں جو بہو میں ہر وقت کیڑے نکالتی ہیں...... مگر وائے قسمت کہ افشین نے روایتی بہو بننا پسند کیا اور یہی وجہ تھی کہ اتنے بڑے گھر کو چھوڑ کر اب وہ نزدیک ہی وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی دنیا بسائے بیٹھی تھی، آخر انہوں نے وضو کیا دو نفل پڑھے اور دعا مانگی اور فوراً ہی ان کی سمجھ آ گیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنی کام والی لڑکی کے ساتھ افشین کے دروازے پر تھیں۔

اُدھر افشین فون چارجنگ پر لگا کر آرام سے ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی کہ امی، ماسی بھیج ہی رہی ہوں گی ایک ہی دفعہ اٹھوں گی اب کہ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔

''ارے واہ......جیو امی......'' وہ کہتی ہوئی اٹھی جلدی سے دروازہ کھولا اور سامنے ہی ساس پر نظر پڑی تو ہکا بکا رہ گئی۔ منہ سے کوئی لفظ ہی نہیں نکل سکا۔ بس نظروں میں گھر کا نقشہ گھوم رہا تھا۔

''اندر نہیں بلاؤ گی۔'' ساس کی آواز پر اس نے جلدی سے ایک طرف ہو کر ان کو راستہ دیا۔

گھر کی حالت قابلِ دید تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ گھر کو الٹی ہوگئی ہے۔ شائستہ بیگم نے گھر کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا کہ گندگی ان کی برداشت سے باہر تھی۔ بہ مشکل اپنے لہجے کو نارمل بناتے ہوئے بولیں۔

''افشین، بیٹا ہماری ماسی بتا رہی تھی کہ تمہارے ہاں کام والی کوئی نہیں ہے آج کل تو میں نے سوچا کہ (اپنی کام والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں) اس کو لے آئی مل جل کر تمہارا کام ہوجائے گا، تم اسے کچن دکھا دو۔'' افشین کی تو وہ حالت کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ خاموشی سے لڑکی کو کچن دکھایا اور پھر شائستہ بیگم نے اس سے باتیں کرنی شروع کردیں اور ساتھ، ساتھ چیزیں بھی جگہ پر رکھواتی گئیں۔ چار و ناچار افشین بھی ساتھ ہی لگ گئی۔ سب چیزیں جگہ پر ہوئیں تو اتنی دیر میں کچن صاف ہوگیا انہوں نے لڑکی سے کہا۔

''تم جھاڑو لگاؤ اور پھر گاڑی سے کھانا نکال لاؤ۔''

افشین نے دل میں سوچا۔ وہی سبزی گوشت ہوگا، میری ڈائٹنگ کا ستیاناس......

مگر اتنی دیر میں شائستہ بیگم کی آواز آئی۔

''افشین، یہ کھانا رات کے لیے رکھ دینا، ابھی بتاؤ کیا آرڈر کریں، پزا یا برگر؟''

''پزا۔'' افشین نے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

کام تقریباً ختم ہو چکا تھا، انہوں نے افشین سے کہا۔

''تم نہا کر کپڑے بدل لو، شوہر کے دل میں رہنے کے لیے خود بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے اور گھر بھی چمکتا رہنا چاہیے۔'' افشین تابعداری سے اٹھ گئی وہ ویسے بھی بہت تھک گئی تھی، جب تک وہ تیار ہو کر آئی پزا آچکا تھا اور اس کی ساس جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

''اماں رک جائیں رات کو کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا کر جایئے گا۔'' اس نے پہلی دفعہ کہا۔

''نہیں بیٹا......اس لڑکی کو بھی بہت دیر ہوگئی ہے، اب تم بھی آرام کرو، ریحان کے ابو بھی آنے والے ہوں گے اور تم کو تو پتا ہے، ان کے آنے سے پہلے میں گھر میں موجود نہ ہوں تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔'' شائستہ بیگم نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کی طرف چل دی۔ افشین نے ان کے جانے کے بعد سوچا، ایسی بھی ہوتی ہیں ساسیں، بلکہ مجھے شرمندہ کیے کیسے سارے کام کروا دیے پزا کھاتے، کھاتے اس نے موبائل آن کیا کہ امی سے پوچھے تو سہی کہ انہوں نے ماسی بھیجی کیوں نہیں؟ تو اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس سے کیا غلطی ہوگئی تھی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے گرتے، گرتے بچا اور وہ مسکرا اٹھی اور دل ہی دل میں بولی۔

''سنا ہی تھا۔ ساس بھی کبھی، کبھی امی بن جاتی ہیں اور آج دیکھ بھی لیا۔''



رازِ الفت

بشریٰ سیال

مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ بادل آسمان پر روئی کے گالوں کی صورت میں اِدھر سے اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ چلتے، چلتے اس نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''لگتا ہے آج تو بارش ضرور ہوگی۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں فائل کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا اور تیز، تیز قدم اٹھانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا اٹھی اور پورے آسمان پر چھا گئی۔ ''الٰہی خیر۔''

اس نے ہوا کے دوش پر بے قابو ہوتے اپنے دوپٹے کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ہوا رفتہ، رفتہ تیز ہو رہی تھی۔ ''کیا کروں خدایا؟'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھا۔

سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ کر اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال ابھرا اور اس نے جھٹ عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ اس نے ہاتھ سے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی، وہ ایک ہاتھ سے دوپٹا اور دوسرے سے فائل سنبھالتی دوڑ کر گاڑی کے قریب آئی۔

''پلیز آپ کو زحمت نہ ہو تو برائے مہربانی مجھے اسٹاپ پر ڈراپ کر دیں۔'' اس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور فوراً سے بیشتر فرنٹ ڈور کھول دیا۔ اس کی کالونی کا مین گیٹ خاصا دور تھا اور وہ دیر ہونے سے بچنے کے لیے لفٹ مانگ بیٹھی تھی۔ اس کالونی میں بڑے، بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے جبکہ ایک طرف فلیٹس کی قطار تھی۔ گاڑی کسی بنگلے سے نکلی تھی۔

''تھینکس!'' اس نے بیٹھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔

''دراصل میرا آج انٹرویو ہے، ایک تو امی نے موڈ خراب کر دیا اوپر سے یہ موسم...... پتا نہیں وقت پر پہنچ بھی پاؤں گی یا نہیں۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ایڈریس بتائیں، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اس نے جذبۂ ہمدردی سے مغلوب ہو کر آفر کر ڈالی۔

''خوامخواہ آپ کو زحمت ہوگی، آفس بہت دور ہے، پتا نہیں کیا شوق چراتا ہے جو شہر کے دوسرے کونے میں ویرانے میں جا کر آفس بنا لیتے ہیں۔ آپ بس مجھے گیٹ سے باہر بس اسٹاپ پر ڈراپ کر دیں، میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے آف موڈ سے کہا۔

''آپ ایڈریس تو بتائیں، ہوسکتا ہے مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہو۔'' اس نے استفسار کیا۔ بالآخر اس نے ایڈریس بتا دیا۔

''اوکے، میں ڈراپ کر دیتا ہوں آپ کو ڈونٹ وری۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''مجھے بھی اُدھر ہی کی طرف جانا ہے۔''

''شکریہ......'' اس نے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھا۔

''انٹرویو کس چیز کا ہے، آئی مین کس پوسٹ کے لیے؟'' اس نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''سیکرٹری کی پوسٹ مگر انٹرویو ایسے کریں گے جیسے صدر یا وزیراعظم اپائنٹ کرنے لگے ہیں۔'' اس نے جل کر کہا۔ اس کی بات پر وہ زیرلب مسکرا دیا۔

''کیا کوالیفیکیشن ہے آپ کی؟'' وہ مزید گویا ہوا۔

''مر کر گریجویشن۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''مر کر......؟'' اس نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اور کیا...... اس سے آگے امی نے ایڈمیشن نہیں لینے دیا۔ ہر وقت فیوچر ہزبینڈ اور ساس سے ڈراتی رہتی ہیں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''آپ کا نام......؟'' اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''آپ کو میرے نام سے کیا دلچسپی؟'' اس نے مڑ کر اسے گھورا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ''مجبوری میں آپ سے لفٹ لے لی تو آپ تو فرینک ہی ہونے لگے! حد میں رہیں اپنی۔'' وہ تیکھے سے لہجے میں بولی۔

''سوری! آپ کو برا لگا تو...... میرا مقصد......''

''بس، بس بہت اچھی طرح جانتی ہوں آپ کے مقصد کو۔'' اس نے رعب سے کہا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

''ایک تو آپ کو اپنی ہی کالونی کا جان کر سے ہمدردی کی ہے اور آپ میرے ساتھ بدتمیزی کر رہی ہیں۔'' وہ کسی قدر غصے سے بولا۔

''ہمدردی کی ہے تو بدلے میں کیا میں آپ کو شجرۂ نسب بتا دوں۔ گاڑی چلائیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ورنہ میں یہیں اتر جاتی ہوں۔'' اس نے واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔

''مس مجھے بھی وہیں جانا ہے اس لیے آپ کو لے جا رہا ہوں ورنہ کسی کی بھی اتنی بدتمیزی برداشت

کرتا......'' اتنا کہہ کر گاڑی اس نے آگے بڑھالی۔
''آگے پتا نہیں کس خبیث سے پالا پڑنے والا ہے، دل تو کرتا ہے انٹرویو والے کو کھری کھری سناؤں مگر یہی ایک جگہ ہوتی ہے جہاں میری بولتی بند ہوجاتی ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ''لے گئے اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔'' اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی۔

☆☆☆

''خالہ جان......!'' ولید انہیں آوازیں دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ ''خالہ جان......!'' اس نے پھر آواز لگائی۔
''بیٹے میں اِدھر ہوں، کچن میں۔'' ان کی آواز پر وہ ان کے پاس کچن میں ہی آگیا۔
''کیا کررہی ہیں آپ؟'' وہ ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔
''کھانا بنارہی ہوں، تم سناؤ کیسے ہو؟ بہت دنوں بعد چکر لگایا۔'' انہوں نے ہنڈیا میں چمچ چلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''جی، بس کچھ بزی تھا، یہ معصومہ نظر نہیں آرہی۔'' اس نے استفسار کیا۔
''انٹرویو دینے گئی ہوئی ہے۔'' ان کے بتانے پر وہ زیرِلب مسکرادیا۔
''یہ نوکری کا شوق کب سے چرایا۔'' اس نے ٹوکری میں سے مٹر کے دانے نکال کر منہ میں ڈالے۔
''تمہیں تو پتا ہے اس کا، چین سے بیٹھنے والی طرح نہیں ہے اس کی آگے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی ضد کررہی تھی۔ میں نے منع کیا تو خفا ہوکر جاب کے لیے چل پڑی۔''
''ارے آپ پڑھنے دیتیں اسے شاید اسی طرح وہ تھوڑی میچور اور ذمے دار ہوجائے۔'' وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔
''وہ بہت سادہ اور معصوم ہے۔ زمانہ بہت خراب ہے، مجھے بہت ڈر لگتا ہے، میں تو بس جلد از جلد اسے رخصت کرنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے چمچ ہٹا کر ہنڈیا پر ڈھکن رکھا اور اس کی طرف مڑیں۔
''چائے پیو گے؟''
''آپ رہنے دیں میں بنالیتا ہوں، ہم دونوں کے لیے۔'' کہتے ہوئے وہ ساس پین میں پانی ڈالنے لگا۔
''نہیں بیٹا، میں بناتی ہوں، تم رہنے دو۔'' انہوں نے ساس پین اس کے ہاتھ سے پکڑلیا۔
''امی آپ کو یاد کررہی تھیں۔'' اچانک یاد آنے پر اس نے کہا۔
''کسی دن ملوانے لے آؤ، میرا تو تمہیں پتا ہے جب سے معصومہ کے ابو باہر گئے ہیں کہیں آنا جانا ہی مشکل ہوگیا ہے۔''
''ویسے معصومہ کو جاب نہیں کرنی چاہیے، گھر پر رہے، آپ کا ہاتھ بٹائے، کیا کرے گی جاب کرکے۔'' اس نے ایک بار پھر سے کہا۔
''تمہیں پتا ہے اس کا، زیادہ دن ایک کام نہیں کرسکتی، کچھ ہی دن بعد خود ہی چھوڑ دے گی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا جواب میں اس نے بھی صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

☆☆☆

شکر ہے کہ وہ لیٹ نہیں ہوئی تھی۔ گیٹ پر ہی گاڑی سے اتر کر وہ تیز، تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔ انٹرویو اسٹارٹ ہوچکے تھے، وہ اپنی باری کا انتظار کررہی تھی۔ اس کی باری آئی تو وہ فائل کو سینے سے لگائے بیگ کندھے پر لٹکائے بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتی اندر آفس کی جانب بڑھی۔
''السلام علیکم......!'' اس نے اندر داخل ہوکر سلام کیا۔
''وعلیکم السلام......!'' اس نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی۔ اسے سلام کا جواب دینے والا نظر نہیں آیا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔ ریوالونگ چیئر کا منہ دیوار کی جانب کیے بیٹھے آدمی نے شاید اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔
''تشریف رکھیں۔'' اس نے منہ اب بھی اِدھر نہیں کیا تھا۔ کچھ الجھتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔
آفس کی گلاس وال سے باہر دیکھتے ہوئے وہ کسی

گہری سوچ میں گم تھا۔
''سر انٹرویو شروع کریں۔'' بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔
''اس کی فی الحال ضرورت نہیں ہے، ہاں آپ کھری، کھری سنانے کا شوق پورا کر سکتی ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے چیئر کو گھمایا اور رخ پھیر کر اس کی طرف منہ کیا۔
''آ......پ؟'' کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق وہ لب نیم وا کیے اسے دیکھ رہی تھی۔
''یس اس آفس کا خبیث باس میں ہی ہوں۔''
اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔
''مم......میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ فوراً نگاہیں جھکا گئیں۔
''اب جو کچھ سنانا چاہتی ہیں، سنا دیں۔ ورنہ بعد میں ہمیں بد دعائیں دیتی پھریں گی۔'' اس نے محظوظ ہوتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔
''آئی ایم سوری سر۔'' مارے خفت کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
''اٹس او کے! ویسے اگر آپ کو برا نہ لگے تو اپنا نام بتا سکتی ہیں؟''
اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
''وہ......ویسے آپ نے سی وی میں پڑھا نہیں کیا؟''
''آں......ایک منٹ۔'' اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ بولتی، اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔
''صرف اپنا نام پورا شجرۂ نسب نہیں۔'' وہ شاید بدلہ لینے کے موڈ میں تھا۔ اس سے پلکیں اٹھانا مشکل ہو گیا۔
''معصومہ شیراز۔'' اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ جانتی تھی وہ ریجیکٹ ہو چکی ہے مگر فی الوقت وہاں سے اٹھ کر جانا بھی ناممکن تھا۔
''فائل دیجیے......'' اس نے خاموشی سے فائل میز پر اس کی طرف کھسکا دی۔ وہ کھول کر دیکھنے لگا۔ حالانکہ اس کے سی وی کی کاپی اس کی میز پر موجود تھی۔
''ویل مس معصومہ ٹھیک، ہم آپ کو کال کریں گے۔'' اس پورے عرصے میں اس نے یہ بات بغیر طنز کے اور سنجیدگی سے کہی تھی۔ وہ فائل اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ ولید آج اپنی امی کو لے کر ان کے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ولید اس کے پاس کچن میں آ کھڑا ہوا۔
''یہ تمہیں جاب کا شوق کب سے ہو گیا؟'' اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔
''بس ہو گیا ہے شوق، کیوں؟'' وہ کباب فرائی کرتے ہوئے بولی۔
''کیا ضرورت ہے آخر......تم گھر پر رہو، خالہ کا ہاتھ بٹاؤ کام کاج میں۔'' اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔
''میں کوئی کام والی ماسی تھوڑی ہوں کہ ہر وقت کام ہی کرتی رہوں۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
''اچھی لڑکیاں اپنے گھر کا کام خود کرتی ہیں۔'' اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔
''چلو، اب بور نہ کرنا امی کی طرح نصیحتیں کر کے، متوقع سسرال سے ڈرا کے۔'' اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ ہنس دیا۔
''تمہیں سسرال سے کیا ڈرانا، ہاں تمہارے ان لا کو تو تم سے ڈرنا پڑے گا۔'' وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔
''کیوں؟'' اس نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔
''نہیں، بس۔ ویسے ہی۔'' وہ ہنستے ہوئے کچن سے باہر آ گیا تھا۔

☆☆☆

''آج اسے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ کتنی دیر بے یقینی سے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ شخص اسے ہرگز اپنے آفس میں جگہ نہیں دے گا۔
آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ تک سک سے تیار ہو کر وہ مقررہ وقت تک آفس پہنچ گئی تھی۔
''مس معصومہ میرے روم میں آئیں۔'' اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔
''مے آئی کم ان سر؟'' وہ اٹھ کر آفس میں آئی
''یس......'' وہ اپنے لیپ ٹاپ کو بیگ میں سے نکال کر ٹیبل پر رکھ کر آن کرتے ہوئے بولا۔ اسے کام سمجھاتے ہوئے وہ بہت تیزی سے لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ اور وہ پورے دھیان سے اس

سن رہی تھی۔
''جی سمجھ آ گیا؟'' انٹرویو والے دن کی نسبت آج وہ خاصا سنجیدہ تھا۔
''ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا سر۔'' اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔
''واٹ......؟'' وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا...... ہاتھ میں پیپر ویٹ تھامے وہ اسے گھور رہا تھا۔ ''عجیب بےوقوف لڑکی ہو۔'' وہ جھنجلایا۔
''مائنڈ یور لینگویج سر۔'' اسے اس کی بات سخت بری لگی۔
''تو کیا آپ کو کچھ کہنے کے لیے پہلے آپ سے اجازت لی جائے؟'' وہ قدرے ترش لہجے میں بولا۔ آپ جانتی تھیں کہ آپ سیکرٹری کی جاب کے لیے اپلائی کر رہی ہیں تو کام کی نوعیت کا بھی آپ کو اندازہ ہوگا۔'' وہ زچ ہوا۔
''سر غلطی میری نہیں، آپ کی ہے۔'' وہ نہایت سکون سے بولی۔ ''آپ نے اپنی مرضی سے مجھے اپائنٹ کیا ہے، میں نے آپ سے کوئی ریکوئیسٹ نہیں کی تھی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بےخوفی سے بولی۔
''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، غلطی تو میری ہی ہے۔'' اس نے سر جھٹکا۔
''اور اب مجھے اس غلطی کو بیچ کرنا ہوگا۔'' اس نے انٹرکام اٹھایا۔ دو منٹ بات کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔
''صفدر صاحب کے ساتھ کمپیوٹر سیکشن میں چلی جائیں، وہ آپ کو کام سمجھا دیں گے۔'' اس پر ایک نظر ڈال کر وہ فائل دیکھنے لگا۔
''مے آئی کم اِن سر؟'' وہ صفدر صاحب تھے۔
''یس......'' اس نے فائل بند کر دی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ریلیکس انداز میں بیٹھ گیا۔
''یہ مس معصومہ ہیں، ان کو لے جائیں اور کام سمجھا دیں۔'' وہ اس سے مخاطب تھا۔
''اوکے سر......!'' اس نے مؤدب انداز میں کہا۔
''جایئے محترمہ......!'' اس نے معصومہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆☆

خالہ جان کی طبیعت ناساز تھی...... آفس سے واپسی پر وہ امی کو ساتھ لے کر ان کی طرف آ گئی تھی۔
''کیا خالہ آپ بالکل اچھی نہیں لگ رہیں ایسے لیٹے ہوئے۔ اٹھیں ناں۔'' اس نے کمبل ان کے اوپر سے اتارنا چاہا۔
''معصومہ، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ولید نے آگے بڑھ کر کمبل ان کے اوپر دوبارہ درست کیا۔
''میری بیٹی میرے پاس آ گئی ہے ناں تو اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولیں۔
''خالہ جان ایک کام کرتے ہیں۔'' وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ''آپ ولید امی کو دے دیں اور مجھے اپنی بیٹی بنا لیں، سچ میں مزے ہو جائیں گے، امی تو ہر وقت مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔'' اس نے آخر میں برا سا منہ بنایا۔
''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' وہ پھیکے پن سے مسکرا دیں۔ ولید کچن میں چلا گیا تھا وہ بھی اس کے پیچھے آ گئی۔
''کیا کر رہے ہو؟ چائے بنا رہے ہو؟'' اس نے آگے بڑھ کر ساس پین اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔
''رہنے دو، میں بنا لوں گا۔'' اس نے انکار کیا۔
''جب میں موجود ہوں تو بھلا تم کیوں بناؤ گے، ہٹو میں بناتی ہوں۔'' اس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا، اب کی بار اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
''خالہ جان بالکل ٹھیک ہیں، ڈونٹ وری...... اتنی طبیعت خراب نہیں ہے، ایسے منہ لٹکا کر مت پھرو کہ وہ تمہیں دیکھ کر گھبرا جائیں۔'' اس نے مدبرانہ انداز میں نصیحت کی۔
''معصومہ...... امی کے بغیر میں ایک لمحہ بھی نہیں جی سکتا۔'' اس کی آواز بھاری ہونے لگی۔ وہ تیزی سے مڑی...... اس نے دیکھا کہ شدتِ ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''ڈونٹ بی سلی ولید، یہ کیسی باتیں کررہے ہو۔'' اس نے ولید کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہلایا۔ ''کچھ بھی فضول سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اسے بھی پریشان کردیا تھا۔

☆☆☆

اسے آفس جوائن کیے ہوئے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوا...... وہ کافی حد تک ایڈجسٹ ہوگئی تھی۔

''محترمہ ذرا آفس میں تشریف لائیں۔'' انٹرکام پر سرشارم کی آواز سنتے ہی وہ جو ریلیکس بیٹھی تھی۔ ایک دم الرٹ ہوگئی۔

''یس سر......!'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مے آئی کم ان سر......؟'' اس نے دروازے میں کھڑے ہوکر اجازت طلب کی۔

''یس......!'' وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔'' وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''سر کہنا چاہیے تھا ناں آپ کو...... یہ بات مینرز کے خلاف ہے کہ......''

''مس خاموش ہوجائیں۔'' وہ زور سے بولا۔ اس کی فراٹے سے چلتی زبان کو فوراً بریک لگ گئے۔

''آپ کو کچھ امپورٹنٹ ڈاکومنٹس کے پرنٹس نکالنے کے لیے کہا تھا۔''

''سر میں نے ابھی نکال کر بھیجے ہیں آپ کو۔'' اس نے فوراً کہا۔

''یہ ان کی بات کررہی ہیں آپ؟'' اس نے میز کے کونے میں پڑے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے رکھے۔

''جی یہی......'' اس نے کاغذات اٹھائے اور دیکھنے لگی۔ ''مائی گڈنیس۔'' اس نے سر اٹھا کر شارم کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں غیظ و غضب اسے صاف نظر آرہا تھا۔ وہ دوبارہ کاغذات کی جانب متوجہ ہوگئی۔ پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔

''گرتے بالوں کی روک تھام، بالوں کو خوب صورت بنانے، لمبا کرنے اور سیاہ کرنے کے لیے ان نسخوں کو ایک مرتبہ ضرور آزمائیں۔'' اس کے نیچے لکھے ہوئے تھے...... اس نے جلدی سے کاغذ پلٹا۔

''اگر آپ کا رنگ گورا نہیں ہے تو۔''

''میرا خیال ہے کچھ مینرز جاب کے لیے ہوتے ہیں مگر آپ ان سے ٹوٹلی ناواقف ہیں۔'' اس کی آواز پر اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔

''وہ سر ایکچوئلی میں نے......''

''آپ صرف ایک بات بتادیں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔ ''آپ یہ جاب کرنا چاہتی ہیں یا نہیں......؟'' اس کی اس بات سے معصومہ کے اوسان خطا ہوگئے۔

''سر پلیز یہ ظلم نہیں کریں، میرے چھوٹے، چھوٹے بہن، بھائی بھوک سے مرجائیں گے، میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوگئی، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ رونے لگی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا مس معصومہ......'' شارم کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ''پلیز چپ ہوجائیں۔'' اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ پانی پی لیں۔'' اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کرے۔

''دیکھیں مجھے کسی روتے ہوئے انسان اسپیشلی کسی لڑکی کو چپ کروانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے...... آپ پلیز چپ ہوجائیں۔'' اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر جھوٹ موٹ کے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ مبادا شارم اس کی شکل دیکھ کر اس کی اداکاری کو بھانپ نہ لے۔

''یہ اپنے ٹوٹکے لیتی جائیں۔'' اس نے پیچھے سے ہانک لگائی مگر اس نے ان سنی کرکے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ اس نے واپس آکر سیٹ پر بیٹھتے ہی دیکھا جو کاغذ سر کو بھیجنے تھے وہ وہیں پڑے تھے۔

''باپ رے آج تو مشکل سے بچے۔'' اس نے ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کی اور کام کی طرف متوجہ

ہوگئی۔

☆☆☆

''معصومہ یہ میری شرٹ پریس کردو گی؟'' وہ اپنے کل کے لیے کپڑے پریس کررہی تھی جب ولید ہاتھ میں شرٹ پکڑے اس کے پاس آیا تھا۔ خالہ کی طبیعت کی وجہ سے وہ اور امی کچھ دن کے لیے اِدھر ہی ٹھہر گئی تھیں۔

''کیوں نہیں ضرور......'' اس نے شرٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اپنے کپڑے پریس کر کے وہ اس کی شرٹ پریس کرنے لگی۔ ''اوہ میں نے تو دودھ چولھے پر رکھا تھا۔'' وہ کچن کی طرف بھاگی۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ دودھ ابل کر چولھے کے علاوہ پورے شیلف اور نیچے فرش پر گر چکا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' ولید اندر آیا......اس نے معصومہ کے ہاتھوں کچن کی درگت بنتے دیکھی تو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''دودھ بوائل ہونے کے لیے رکھا تھا، میرے ذہن سے نکل گیا اور کپڑے پریس کرنے لگ گئی۔'' اس نے چولھا بند کیا۔

''کپڑے......'' اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''شرٹ......'' وہ اندر کی طرف بھاگی استری اٹھائی مگر بے سود، شرٹ بری طرح جل چکی تھی۔ ''اوہ مائی گاڈ......'' وہ مڑی۔ ولید سامنے ہی کھڑا تھا اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

''وہ ولید......''

''شٹ اپ معصومہ......!'' وہ غصے سے پھنکارا۔ ''کوئی ڈھنگ کا کام کرنا بھی آتا ہے تمہیں۔ غلطی میری ہے، جو تمہیں کہہ دیا۔ ان فیکٹ تم کو کام کہنے سے بہتر ہے بندہ خود کرلے۔'' اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ شدید غصے سے سر جھٹکتے پاؤں پٹختے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ شرٹ سامنے رکھے ایک کے بعد دوسری شرٹ نکلوارہی تھی مگر کوئی شرٹ بھی ویسی نہیں تھی جیسی کہ ولید کی تھی۔

''یہ دیکھیں، یہ ٹھیک ہے۔'' سیلز مین نے ایک شرٹ اس کے سامنے رکھی۔

''یہ بھی صحیح نہیں ہے۔'' اس نے تنقیدی نظروں سے شرٹ کا جائزہ لیا۔

''دیکھیں میم same ویسی چیز دوبارہ ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' سیلز مین بھی اب تنگ آگیا تھا۔

''ہیلو......'' آواز سن کر وہ چونکی۔

''سر آپ......'' وہ تھوڑا سا گڑبڑائی۔ ''السلام علیکم......'' اس نے فوراً سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے شرٹ اٹھائی، اسے پلٹا۔

''سر یہ مجھے دے دیں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر شرٹ لینا چاہی۔ مگر تب تک وہ دیکھ چکا تھا۔ بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوگئی۔

''یہ حادثہ کب پیش آیا؟'' اس نے معصومہ کے شرمندہ چہرے کی طرف دیکھا......اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کھڑی لب کچلتی رہی۔

''آئیں میں آپ کو ایک شاپ دکھاتا ہوں وہاں سے سیم ایسی شرٹ مل جائے گی۔'' وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑا تھا......شاید اس کا مسئلہ جان گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔

''ویسے یہ شرٹ ہے کس کی ہے؟'' شارم نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''میرے کزن کی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ویسے یہ کس طرح جلی؟'' وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے تمام واقعہ بتادیا۔

''ہاہاہا......'' وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ دونوں شاپ میں داخل ہو چکے تھے۔ شارم نے شرٹ دیکھنے میں اس کی مدد کی۔ تھوڑی تگ و دو کے بعد انہیں بالکل اسی طرح کی شرٹ مل گئی تھی۔

''آپ کی فیملی کے لوگوں کو تو عادی ہونا چاہیے اس چیز کا، آپ کے کزن نے نئی شرٹ کا مطالبہ کر دیا؟'' وہ شاپ سے باہر آگئے۔

''اس نے نئی شرٹ کا مطالبہ نہیں کیا سر، اس نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ ایک شرٹ ہی تو تھی پھر میں نے

سوری بھی کہہ دیا تھا۔'' وہ سادگی سے بولی۔
''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے اس سے اتفاق کیا...... ''لنچ ٹائم اوور ہونے والا ہے، کیا خیال ہے لنچ میں آپ مجھے جوائن کرسکتی ہیں؟'' اس کی پیشکش پر اسے اچنبھا ہوا تھا۔
"sorry sir, but this is impossible for me"
اس نے دوٹوک جواب دیا۔
"why?" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''میں کس حیثیت سے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں؟'' اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔
''جس حیثیت سے آپ نے مجھ سے لفٹ لی تھی اور جس حیثیت سے ابھی میرے ساتھ ہیں۔''
''آپ جانتے ہیں میں نے لفٹ انتہائی مجبوری کی حالت میں لی تھی اور ابھی آپ نے اپنی مرضی سے میری ہیلپ کی ہے۔'' اس کی بات معصومہ کو سخت بری محسوس ہوئی تھی۔
''ویری گڈ......'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔
''عام حالات میں جو چیز آپ کے لیے ناجائز ہے وہ مشکل وقت میں جائز ہوجاتی ہے، اچھے اصول ہیں آپ کے...... بٹ اینی ویز، ایز یو وش۔'' وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا اس سے دور ہوتا گیا جبکہ وہ...... پتھر کا بت بنی وہیں کھڑی رہی۔
☆☆☆
وہ شرٹ لے کر ولید کے کمرے میں آئی تھی۔
''معصومہ اس کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ شرٹ دیکھ کر شرمندہ ہوا تھا۔ ''میں نے کیا تم سے کہا تھا کہ مجھے نئی شرٹ لاکر دو۔''
''تم نے نہیں کہا تھا مگر مجھ سے تمہارا نقصان ہوا میں نے ضروری سمجھا اسے پورا کردوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔
''آئی ایم سوری معصومہ...... شاید میں زیادہ ہی ہارش ہوگیا تھا مگر معصومہ بات شرٹ کی نہیں تھی۔'' وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ ''مجھے غصہ تمہاری بے پروائی پر آیا تھا۔ شرٹ اور دوسری چیزوں کا نقصان تو پورا ہوجاتا ہے مگر کبھی، کبھی ہماری بے پروائی اور غفلت ہمارا بہت بڑا ناقابلِ تلافی نقصان بھی کردیتی ہے۔'' اس نے اپنائیت سے کہا۔
''جانتی ہوں، میں بہت بری اور بے وقوف ہوں۔'' وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔
''کم آن معصومہ...... اب یہ ایموشنل بلیک میلنگ چھوڑ و اور ریڈی ہوجاؤ ہم آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔'' اس نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ بھی زیادہ دیر انکار نہیں کرسکتی تھی، تیار ہونے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے ساتھ باہر جارہی تھی۔
''بہت مزے کی ہے آئس کریم۔'' وہ اردگرد سے بے پروا بڑے سکون سے کھارہی تھی۔
''اب گھر چلیں؟'' آخرکار ولید کو کہنا پڑا۔
''ابھی نہیں......'' ولید نے سر پکڑلیا۔
''ہیلو......'' آواز سن کر ولید نے سر اٹھایا۔
''السلام علیکم......'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مصافحہ کرنے لگا وہ جو بڑے سکون سے آئس کریم کھارہی تھی پل بھر کو نظریں اٹھائیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئی۔
''کیسے ہیں آپ؟'' ولید نے دریافت کیا۔
''یس آئی ایم فائن......'' وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔
''ہاؤ آر یو......'' وہ سر جھٹک کر دوبارہ آئس کریم کھانے میں مصروف ہوچکی تھی۔
''یہ کون ہیں؟'' اب وہ ولید سے پوچھ رہا تھا۔
''اونہہ، ڈرامے باز......'' وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ ''ایکٹنگ ایسے کررہا ہے جیسے مجھے جانتا ہی نہیں۔'' وہ دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئی...... مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔
''یہ......'' ولید نے اس کی طرف دیکھا...... اردگرد سے بے نیاز وہ آئس کریم کھارہی تھی۔ انداز بالکل بچوں جیسا تھا۔ ''میری کزن ہے۔'' اس نے بدقت تمام کہا...... شارم کے سامنے اسے سبکی کا احساس ہوا۔
''اوکے انجوائے یور سیلف، سی یو......'' اسے ہاتھ ہلا کر وہ چلا گیا۔ ولید بیٹھ گیا۔

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" اس کے جاتے ہی معصومہ نے جھٹ پوچھا۔

"ایک سیمنار میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت اچھا انسان ہے۔" ولید نے تعریف کی۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

"ہیلو...... السلام علیکم ابو...... کیسے ہیں آپ؟ اب طبیعت کیسی ہے؟ امی بتا رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ آپ واپس آجائیں بس، میں آپ کو اتنا مس کرتی ہوں۔ ویسے آپ کب آرہے ہیں؟" اس نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال کر ڈالے۔

"ارے لڑکی ذرا چھری تلے دم تو لو۔" امی نے اسے گھر کا۔

"اور ابو امی ہر وقت مجھے ڈانتی رہتی ہیں، سارا دن گھر کا کام کرواتی ہیں۔" اس نے شرارت سے امی کی طرف دیکھا۔

"توبہ ہے خدا کی پناہ تم سے۔" امی اس کی شرارت کو بھانپتے ہوئے مسکرادیں۔ جبکہ ولید بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے پروائی سے شانے پر جھولتا دوپٹا، بکھرے بالوں کو کیچر میں قید کیے، چہرے پر سارے جہان کی معصومیت، آواز میں شرارت اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک کے ساتھ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف نظر آرہی تھی۔

خالہ جان بھی اس کی شرارت پر مسکراتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں وہ بے حد پیاری لگتی تھی۔

☆☆☆

"آہ......!" وہ تیزی سے آفس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب بے خیالی میں سامنے سے آتے وجود سے بری طرح ٹکرا گئی۔ اس کا سر مقابل کے چوڑے سینے سے ٹکرایا اور خوشبو کو جھونکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا۔

"نظر نہیں آتا آپ کو۔" وہ درشتی سے بولی اور سر اوپر اٹھایا۔ "اوہ سر آپ......" وہ اپنی پیشانی سہلانے لگی۔

خوب صورت کلام

☆ایک لمحے کا انصاف ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔ (حضرت محمدؐ)

☆جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جان لے کہ ایمان سے اس کا دل خالی ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ہر شے کا ایک حسن ہوتا ہے اور نیکی کا حسن یہ ہے کہ فوراً کی جائے (حضرت عمر فاروقؓ)

☆جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے مگر انسان اپنے رب کو نہیں پہچانتا۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

علم حاصل کرنے کے لیے خود کو شمع کی طرح پگھلاؤ۔ (حضرت علی المرتضیٰؓ)

مرسلہ: عائشہ سجاد، ڈی آئی خان

قابل غور

☆لوگوں کو معاف کرنا سیکھو...... ہمارا پروردگار تو پل، پل ہمیں معاف کر دیتا ہے مگر ہم اپنے جیسے انسان کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

☆دوسروں کے حصے کا کام انہی کے لیے رہنے دیں، آپ اپنی ذمّے داری اپنے فرائض نیک نیتی سے پورے کریں، ہم اپنی خوبیاں اور دوسروں کے عیب گنواتے نہیں تھکتے۔

☆تجسس، ٹوہ اور آنا کانی سے بچیں، اس سے دل خراب رنجشوں میں اضافہ اور بداعتمادی کی فضا فروغ پاتی ہے۔

☆گر کی بات یہ ہے جو آپ اپنے لیے چاہتے ہیں، وہی بانٹنا شروع کر دیں، لوٹ کے وہی چیز آپ کے پاس ضرور آئے گی۔ کبھی غور کیا کہ غصہ کریں گے، دوسرے کی بے عزتی کریں گے تو یہی چیز بالآخر پلٹ کر بھی ملتی ہے۔

☆دوسروں کو بدلنے کے بجائے خود کو بدلیں...... پوری دنیا بدل جائے گی۔ فکر و نظر میں وسعت پیدا کریں، تنگ نظری اور کوتاہ فکری تعلقات اور رشتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

از: نورین شہزاد، کراچی

''مجھے تو بالکل صحیح نظر آتا ہے مگر آپ ہی ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہیں۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولا۔

''سوری......'' وہ ایک طرف سے ہو کر اوپر چلی گئی...... چند ثانیے وہیں کھڑا وہ اسے جاتا دیکھتا رہا مگر اگلے ہی پل سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی جب ملازم نے بتایا۔ ''آپ کو سر نے آفس میں بلایا ہے۔'' چند ثانیے بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''مس یہ ایک میل ہے اسے تین بجے تک فیاض گروپ آف انڈسٹریز کو فارورڈ کر دیجیے گا۔'' اس کی نظریں اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

''جی بہتر سر......'' اس نے سر ہلایا۔

''آپ کے کزن کو شرٹ پسند آ گئی؟'' اس نے ایک دم سوال کیا۔ وہ اس اچانک افتاد کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

''جی سر......!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ویسے یہ وہی کزن ہیں ناں جن کے ساتھ کل شام آپ آئس کریم نوش فرما رہی تھیں۔'' اس نے پل بھر کے لیے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی......'' اسے کہتے ہی بنی۔

''آپ نے تو بتایا تھا کہ آپ بے حد غریب ہیں جبکہ میں جہاں تک ولید کو جانتا ہوں وہ کافی ویل آف ہے پھر آپ......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بس اپنی، اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے سر، ہمارے سب ہی رشتے دار بہت امیر ہیں۔'' وہ چکرا کر رہ گئی۔

''تو کیا آپ لوگوں کو سپورٹ نہیں کرتے؟'' اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کہاں سر، آج کل خون سفید ہو گیا ہے اپنوں کا۔'' وہ چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے میرے ساتھ لنچ کرنا آپ کو۔ غلط لگ رہا تھا۔ اپنے کزن کے ساتھ بیٹھی کتنے مزے سے آئس کریم کھا رہی تھیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گیا۔

''سر وہ...... میرا کزن ہے۔'' وہ حیران ہوئی۔

''اینی ویز...... میں نے تو courtesy میں آپ کو آفر کی تھی۔ میرے تمام ایمپلائز میرے لیے قابلِ احترام ہیں۔ میں نے یہ سوچا کہ لنچ ٹائم ہے، میں اکیلا لنچ کروں یہ اچھی بات نہیں ہے مگر آپ نے مجھے اچھی خاصی سنا ڈالیں۔''

''سر میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''شاید آپ کو میرے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہوئی، میں میرڈ ہوں اور اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

''سر......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔'' یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بہت رسپیکٹ کرتی ہوں...... ایسا کچھ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ پھر بھی آپ کو کوئی بات بری لگی تو آئی ایم رئیلی سوری......'' وہ ایک آخری نظر اس پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

آج سر شارم نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ وہ شاکڈ ہو گئی تھی۔

''سر نے ایسا کیوں کہا؟'' وہ الجھنے لگی...... بہت سوچا مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

☆☆☆

تھکے، تھکے قدم اٹھاتی وہ خالہ کے روم کی جانب چل دی۔ امی بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ''پلیز امی سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ولید کی دبی، دبی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''سمجھنے کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے۔'' خالہ جان کی خفگی سے بھرپور آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''امی پلیز......'' اس نے دبا، دبا احتجاج کیا۔

''معصومہ کے علاوہ کوئی بھی...... مگر سچ کہہ رہا ہوں میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ جو واپس پلٹنے ہی والی تھی اپنا نام سن کر رک گئی۔

اسے لگا چھت اس کے اوپر آ رہی ہو۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔

''میں تمہاری شادی کروں گی تو صرف اس سے

ہی سمجھے۔'' انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
''میرا اور اس کا مزاج نہیں ملتا۔'' وہ ہارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔
''شادی سے پہلے کسی کا نہیں ملتا۔'' ان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔
''امی مجھے ایسی لڑکیاں نہیں پسند جنہیں اپنے لڑکی ہونے کا ہی خیال نہ ہو، ہر ایک کے ساتھ فری ہونے والی، بے ترتیب اودھم مچانے والی، نان سینس......'' وہ حقارت سے بولا۔ ''مجھے ٹھہری ہوئی شخصیت کی مالک بیوی چاہیے......'' کتنے سکون سے وہ اس کی ذات کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ اس سے زیادہ وہ سن نہیں سکتی تھی۔ بہ مشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر آ گئی۔
اس شام وہ اور امی گھر واپس آ گئی تھیں۔ خالہ جان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔
''معصومہ......!'' وہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی، جب امی اس کے پاس آئیں۔
''جی امی......!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''طبیعت ٹھیک ہے بیٹا؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے استفسار کیا۔
''سر میں ہلکا سا درد ہے امی......'' اس نے بہانہ کیا۔
''یہ آفس کا کیا جھنجٹ پال لیا ہے تم نے۔'' اس کے پاس بیٹھ کر وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔
''امی مصروفیت اچھی ہوتی ہے۔'' ان سے باتیں کرتے، کرتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر وہ تمام رات پریشان رہیں۔

☆☆☆

ولید نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا...... وہ بچپن سے خالہ جان کی اپنے لیے پسندیدگی سے واقف تھی۔ اس طرح ولید سے جذباتی لگاؤ ایک فطری بات تھی مگر اس کے خیالات اپنے بارے میں جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔
بہت بوجھل دل کے ساتھ وہ آفس آئی تھی...... آتے ہی اسے شارم کا میسج ملا...... ''فوراً آفس میں آئیں۔'' طوعاً وکرہاً وہ اٹھ کر ان کے روم کی طرف چل دی۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ اجازت طلب کر کے اندر داخل ہو گئی تھی۔
''میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی جب میں نے آپ کو اپائنٹ کیا۔'' وہ بے چینی میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا، اسے دیکھ کر رک گیا۔ اس نے کچھ نا سمجھی کے عالم میں شارم کے بگڑے موڈ کو دیکھا۔
''آپ جیسی بے وقوف لڑکی جاب نہیں کر سکتی، گھر بیٹھ کر کچن سنبھالیں۔'' اس کی بات سے چھن سے کچھ اس کے اندر ٹوٹا تھا۔ ''کل تین بجے آپ کو ایک mail forward کرنی تھی۔'' غصے سے کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسی وقت اسے یاد آیا مگر کل شارم کے عجیب سے رویے کی وجہ سے وہ پریشانی میں بھول گئی۔ ''آپ کو پتا ہے آپ کی اس.... بے پروائی سے کمپنی کو لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔'' وہ غصے سے بولے جا رہا تھا مگر وہ آج مکمل خاموش تھی۔ ''آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کے لیے تو زندگی ایک مذاق ہے، آپ کبھی سیریس ہو ہی نہیں سکتیں۔ میں آج اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ......'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا وہ تیزی سے مڑی اور باہر نکل گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ دیوار پر دے مارا۔
وہ آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ بہ مشکل بس اسٹینڈ تک پہنچی تھی۔
''امی......'' گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔
''کیا ہوا میری جان......؟'' ان کی تو جان پر ہی بن آئی تھی۔ کیونکہ وہ تو اس طرح کبھی نہیں روئی تھی۔
''آپ نے مجھے کیوں نہیں ڈانٹا...... کیوں نہیں حماقتوں اور بے وقوفیوں پر روکا اور ٹوکا۔'' وہ روئے جا رہی تھی۔
''مگر ہوا کیا؟'' انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔
''کل ولید نے خالہ جان سے کہا کہ میں معصومہ جیسی بے وقوف لڑکی سے شادی نہیں کروں گا اور آج......'' وہ دوبارہ رونے لگی۔
''ایسا کہا ولید نے؟'' وہ ششدر رہ

گئیں۔ ''میں ولید کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔'' اسے روتا دیکھ کر اُن کا دل کٹنے لگا۔
''نہیں تو نہ سہی...... میری بیٹی کے لیے اللہ نے اس سے زیادہ اچھا سبب بنا دینا ہے۔ وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔'' وہ اس کا سر سہلانے لگیں۔
''آج میرے باس نے بھی کہہ دیا کہ آپ ایک بے وقوف لڑکی ہیں، امی کیا واقعی میں احمق ہوں؟'' اس نے اچانک سر اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔
''دفع کرو باس کو اور سب کو...... یہ دنیا تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتی میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ معصوم اور صاف شفاف طبیعت کی مالک، دوسری لڑکیوں کی طرح چالاک اور دھوکے باز نہیں ہے۔'' انہوں نے اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ''اور اب آفس جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' اور خود اس کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

غصے میں آ کر اس کو اتنا کچھ سنا ڈالا تھا اور پھر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے خود کو مصروف کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا خیال ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔
''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟'' وہ آفس کی گلاس وال کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ ''وہ بالکل خاموش تھی، کچھ نہیں کہا، ورنہ عام طور پر چپ ہوتی نہیں ہے۔'' آخر کار اس سے رہا نہیں گیا اسے بلوا بھیجا۔
''سر مس معصومہ آفس سے جا چکی ہیں۔'' ملازم الٹے قدموں واپس آیا۔
''جا چکی ہیں؟'' وہ تیزی سے پلٹا تھا۔ ''مگر کب؟ اور کہاں؟'' اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا
''بتا کر نہیں گئیں۔'' وہ باہر نکل گیا۔ اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا اور یہ پریشانی اس وقت اور بڑھ گئی جب وہ اگلے دن بھی نہیں آئی اور اس طرح پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔

☆☆☆

''بہت مایوس کیا ہے تم نے مجھے ولید......'' وہ شام کو گھر آیا تو امی نے پھر وہی موضوع شروع کر دیا۔
''امی مجھے معاف کر دیں، میں اس معاملے میں خود کو مجبور پاتا ہوں۔ عمر بھر کی بات ہے، میں......''
''زمانے کی چالاکی اور ہوشیاری سے انجان وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔'' انہوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر بے سود......
''میں یہ سب باتیں کئی بار سن چکا ہوں...... پلیز ان کو دُہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ وہ خفگی سے اس کی پشت کو گھور کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''تمہیں پتا ہے اگلے ہفتے تمہارے ابو آ رہے ہیں۔'' وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ایک دم سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔
''سچ امی......؟'' وہ بے حد خوش تھی، ابو دو سال بعد واپس آ رہے تھے۔
''بالکل سچ......'' اسے خوش دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیں۔
''بس اب میں ابو کو واپس جانے نہیں دوں گی۔'' اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔
پھر وہ ابو کے آنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی...... سارے گھر کی خوب صفائیاں کیں...... امی کے ساتھ مل کر شاپنگ کر کے آئی جس دن انہوں نے آنا تھا امی کے ساتھ مل کر کھانا بنوایا۔
''ابو'' رات دو بجے کے قریب وہ گھر پہنچے تھے۔ وہ ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ بھاگ کر ان کے سینے سے جا لگی۔
''کیسی ہے میری بیٹی؟'' انہوں نے اس کا سر چوما تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اندر تک سرشار ہو گئے تھے۔
''آپ کے لیے بہت اداس تھی۔'' وہ لوگ اندر کمرے میں جا بیٹھے تھے۔
''سفر ٹھیک رہا؟'' امی ان کا بیگ اٹھا لائیں۔

''ہاں الحمدللہ......''

''میں کھانا گرم کرتی ہوں، آپ فریش ہو جائیں۔''
کچھ دیر باتوں کے بعد امی نے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

''ہاں بہت زور کی بھوک لگی ہے، معصومہ نے خاص ہدایت کی تھی کہ کھانا گھر پر ہی کھانا ہے۔ اس لیے میں نے راستے میں کچھ نہیں کھایا۔''

''ابو آپ کتنے اچھے ہیں۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ابو، کس کا ہوں......'' انہوں نے پیار سے چپت اس کے سر پر رسید کی پھر دونوں ہنس دیے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ ٹیرس پر کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

''میں نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا تھا، جس کی تم یہ سزا دے گئی۔'' چشم تصور میں وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ہوا کی سرسراہٹ اور خشک پتوں کی کھنکھناہٹ بھی اس کی محویت میں مخل نہ ہو سکے۔

''مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کب تم میرے لیے اتنی اہم ہو گئیں۔ تمہیں کھو دینے کے بعد تمہاری اہمیت کا اندازہ ہوا۔'' اس نے ایک طویل سانس فضا کے سپرد کی۔

''کیا کروں، کہاں سے ڈھونڈوں تمہیں؟''
چاند کی دودھیا روشنی کی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل بری طرح سے اداس تھا۔

☆☆☆

امی، ابو کی خفیہ میٹنگز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ کچھ الجھی مگر ظاہر نہ کیا۔ وہ ابو کے آ جانے سے بہت خوش تھی۔ جلد ہی ان کی میٹنگز کا رزلٹ اس کے سامنے آ گیا۔

''امی مجھے شادی وادی نہیں کرنی۔'' وہ منہ پھلا کر نروٹھے پن سے بولی۔

''دیکھو معصومہ فضول کی ضد مت کرو پھر کیا تم ولید کی وجہ سے۔''

''امی......'' اس نے سخت شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔''

وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

''تو پھر مان لو بات، یہی تمہارے ابو کی بھی خواہش ہے۔'' انہوں نے ملتجی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''بھئی کیا بات منوائی جا رہی ہے ہماری بیٹی سے؟'' ابو بولتے ہوئے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔

''آپ ہی سمجھائیں اپنی لاڈلی کو۔ محترمہ فرماتی ہیں شادی نہیں کروں گی۔'' امی کچھ ناراض سی باہر نکل گئیں۔

''ارے نہیں، میری بیٹی تو بہت سمجھدار ہے۔'' ابو اس کے پاس بیٹھ گئے، اس نے مارے شرم کے سر جھکا لیا۔

''مجھے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا ہے ابو......'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے ان سے کہا۔

''کیا اپنے ابو کی بات بھی نہ مانو گی؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

''میں نے اس رشتے کے لیے تقریباً ہاں کہہ دی ہے، میرا مان نہ توڑنا بیٹا...... ہمارا یہ فیصلہ تمہارے لیے بہت اچھا ثابت ہوگا۔'' اس نے تیزی سے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی تیرنے لگی۔ ''لیکن اگر تم راضی نہیں تو میں مجبور نہیں کروں گا۔'' وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

اس نے ہاں کر دی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ابو کو مایوس کرتی...... اسے مان رکھنا آتا تھا۔

☆☆☆

وہ سر جھکائے خیالوں میں محو بیٹھی تھی کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے خیالوں کی دنیا سے موڑ کاٹا اور حال میں لوٹ آئی۔

''السلام علیکم......'' کارپٹ پر دبے قدموں چلتا ہوا وہ اس کے سامنے سے گزر کر شاید کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔

''کیسی ہیں آپ......؟'' چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا مگر جواب ندارد......

''آپ کو پتا ہے آپ پچھلے تین منٹ اور 37 سیکنڈز سے خاموش ہیں۔'' وہ جو اتنی دیر سے اس کی آواز پر غور کر رہی تھی، چونک کر سر اوپر اٹھایا اس کے ہاتھوں کے

طوطے اُڑ گئے۔''اور میرا خیال ہے یہ آپ کی زندگی کی پہلی طویل خاموشی ہے، آئی مین......'' بولتے، بولتے وہ اس کے سامنے آبیٹھا۔

''آپ؟'' اس کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو کر وہ اسے گھور رہی تھی۔'' آپ یہاں کر رہے ہیں؟'' وہ اسے سامنے دیکھ کر اچھل پڑی۔

''خاصا دلچسپ سوال ہے۔'' شارم دلکشی سے مسکرادیا۔''میں وہی کر رہا ہوں جو آپ یہاں کر رہی ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے بولا۔

''میں اپنے شوہر کو بتادوں گی، وہ آپ کا بھرکس بنادیں گے، چلے جائیں یہاں سے۔'' اس نے ڈراوا دیا، مقابل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''ہاہا......'' وہ ہنس دیا۔'' کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ خود اکیلی ہی بہت کچھ کر سکتی ہیں...... بنادیں جو بھی بنانا ہے۔'' وہ ریلیکس انداز میں بیٹھ گیا۔

''دیکھیں آپ یہاں سے چلے جائیں، ورنہ میں......'' اس نے خوفزدہ نظروں سے بیڈ روم کے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

''بھئی آپ کی ہمت کی داد دینی پڑے گی، ہمارے ہی گھر میں بیٹھ کر ہمیں نکل جانے کا آرڈر دے رہی ہیں۔ ہم تو آپ کی صلاحیتوں کے پہلے ہی معترف تھے، اب تو سلیوٹ کرتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اسے باقاعدہ سلیوٹ کیا...... اس پر گویا ساتوں آسمان ایک ساتھ گر پڑے تھے۔ نکاح کے وقت وہ نام سن کر چونکی تھی مگر خاموش رہی۔

''آپ......'' اس کے لب بولنے کی خواہش میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

''مائی گاڈ......'' اس نے زاویۂ نگاہ بدل لیا۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

''کیسا لگا سرپرائز......؟'' وہ مسکرادیا۔

''آپ اتنے بڑے دھوکے باز اور فریبی انسان ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میرے معصوم والدین کو باتوں میں لگا کر مجھ سے شادی کر لی، کل میں سب کو آپ کی اصلیت بتادوں گی۔'' مارے غصے کے اس کا برا حال تھا۔

''دنیا میں سب سے زیادہ چالاک تو آپ ہیں ناں...... باقی سب تو معصوم ہیں۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''آپ کو شرم نہیں آتی، آپ میرڈ ہیں۔'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''یس! آئے ایم میرڈ......'' اس کے سکون میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

''اور آپ اپنی بیوی سے محبت بھی کرتے تھے۔'' اس نے کچھ یاد دلایا۔

''تھا نہیں بلکہ اب بھی کرتا ہوں اور شدید کرتا ہوں۔'' وہ آرام سے بولا۔

''میں آپ جیسے جھوٹے انسان کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر حقارت سے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اسے پتا نہ چلا اور اس کا پاؤں دوپٹے میں الجھ گیا اور وہ بیڈ پر اوندھی جا گری۔

''ہاہاہا......'' شارم نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ''تو آپ ویسی کی ویسی ہیں۔ کوئی فرق نہیں آیا۔'' اسے چڑانے میں مزہ آرہا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے آیا۔

''بات سنیں معصومہ۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' وہ غصے سے پھنکاری......

''آپ نے مجھے جتنا بے وقوف سمجھا ہے میں اتنی ہرگز نہیں ہوں۔ میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ آپ کی دولت، اسٹیٹس میں کسی چیز سے امپریس ہونے والی نہیں ہوں۔'' وہ پھنکاری۔

''آپ کی انہی اداؤں نے تو ہمیں آپ کا گرویدہ بنایا ہے۔'' وہ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔ جواب میں وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''یہاں بیٹھیں۔'' وہ اسے ساتھ لے کر بیڈ تک

آیا۔ اسے بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔
''میں نے کبھی آپ کو بے وقوف نہیں سمجھا، ہاں آفس میں ایک بار غصے میں کہہ دیا، جس کی اتنی بڑی سزا دی آپ نے کہ بغیر بتائے وہاں سے چلی گئیں...... کہاں، کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے آپ کو......'' وہ سنجیدگی سے بولتا اسے حیران کر رہا تھا۔ ''بہت پریشان رہا میں۔ رفتہ، رفتہ مایوس ہونے لگا، آپ کو کھو دینے کا احساس ہر احساس پر اس شدت سے حاوی ہو گیا کہ آفس بھی اگنور ہونے لگا'' رفتہ، رفتہ ہر راز سے پردہ اٹھتا گیا۔ ''جب میں مکمل طور پر نا امید ہو گیا ایسے میں ولید کا خیال اندھیرے میں جگنو کے مانند تھا۔'' وہ دم سادھے بیٹھی اس کو بغور سن رہی تھی...... اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔

''آپ رو رہی ہیں؟'' وہ گھبرا اٹھا۔
''میں بہت احمق لڑکی ہوں، آپ نے مجھے اتنی اہمیت کیوں دی؟'' بہت سے زخم تازہ ہونے لگے تھے۔
''آپ کی سادگی اور معصومیت کے ساتھ، ساتھ بے ریا شخصیت نے مجھے اول روز سے ہی متاثر کیا۔ جب میں نے آپ کو کام سمجھایا اور آپ نے صاف کہہ دیا سمجھ نہیں آئی۔ پھر آپ میری کسی بات سے متاثر نہیں تھیں۔ آپ کی جگہ میں کسی اور لڑکی کو لنچ کی آفر کرتا تو وہ بخوشی قبول کرتی، آپ کا انکار وقتی طور پر مجھے برا لگا مگر ریکی بعد میں غور کرنے پر مجھے اچھا لگا۔''
''میں بالکل ویسی نہیں ہوں جیسا آپ مجھے سمجھتے ہیں، میں ایک منہ پھٹ اور پھوہڑ لڑکی ہوں، مجھ سے بہت نقصان ہوتے ہیں، چیزیں توڑ دیتی ہوں، جلا دیتی ہوں۔'' وہ گویا اعترافِ جرم کر رہی تھی۔
''آپ کو اجازت ہے اس گھر میں کھلے دل سے نقصان کرنے کے لیے میری شرٹس جلائیں، برتن توڑیں یا کچھ بھی۔ مگر ایک وعدہ کریں۔'' اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔
''کیا؟'' اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی۔
''مجھے چھوڑ دینے کی بات کبھی نہیں کریں گی۔'' وہ آس بھری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں ابھی کے ابھی یہاں سے چلی جاؤں گی، مجھے ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی، نہ ہی کسی کا گھر خراب کر کے اپنا بنانا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
''کیا فرق پڑتا ہے یار، بندہ اتنا کماتا ہو تو دو، تین بیویاں رکھنے میں کیا حرج ہے۔'' وہ شرارت آمیز سنجیدگی سے گویا ہوا۔
''دو، تین؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔
''بھئی میں مذاق کر رہا تھا آپ سے پہلے میری ایک بھی شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہا۔ معصومہ نے بھی اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی۔
''اتنا سیریس مذاق......'' وہ اب بھی ناراض تھی۔
''یار روایتی دلہنوں کی طرح تھوڑا شرما ہی لو کیسے آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر مجھے گھور رہی ہو۔''
''میں کیوں شرماؤں، جب آپ پورے شہر میں مجنوں بن کر مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے تب آپ کو شرم آئی تھی؟'' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چڑانے والے انداز میں بولی تو وہ ہنس دیا۔
''آپ کو یہ بات بتا کر میں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا جبکہ وہ ہنس دی۔ شارم بھی اس کے ساتھ مل کر ہنس پڑا تھا۔ ''آپ کو اپنے لڑکی ہونے کا کوئی کمپلیکس نہیں، آپ بہت کانفیڈنٹ ہیں I appreciate you'' وہ اسے سراہ رہا تھا۔ اس کا مان بڑھا تھا۔ ولید کے انکار نے جو تکلیف پہنچائی اور کمپلیکس میں مبتلا کیا وہ لمحوں میں ختم ہو گیا تھا۔
''ہمیشہ ایسی ہی رہنا۔'' شارم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے تھام لیا تھا۔ شارم کی آنکھوں میں جگمگاتے چاہت کے رنگ آنے والے خوشگوار موسم کی نوید دے رہے تھے۔

بدلتے رشتے

غزالہ عزیز



ماواں ٹھنڈ یاں چھاواں...... ماؤں کو ٹھنڈی چھاؤں کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے اور جنت کا احساس ہی ٹھنڈک و راحت بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف باپ بھی اولاد کے لیے تپتی دھوپ میں محفوظ سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ باپ کا درجہ بھی کسی طور ماں سے کم نہیں ہوتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ماں، باپ دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد کے لیے آسمانی تحفہ ہوتے ہیں۔ جن کا وجود اولاد کے لیے زندگی اور وقت کی کڑی آزمائشوں میں سائبان کے مانند ہوتا ہے جو انہیں زمانے کے سرد و گرم سے بچا کر تحفظ دیتا ہے...... انہیں اپنے نرم ہاتھوں میں پروان چڑھا کے اتنا مضبوط بنا دیتا ہے کہ ایک دن اولاد خود اپنے ،ساتھ ماں، باپ کی محافظ بھی بن جاتی ہے۔ ماں، باپ کے وجود کی قدر و اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ اولاد چاہے عمر اور ترقی کے کتنے ہی زینے عبور کر لے مگر والدین کی ضرورت اسے ہمیشہ رہتی ہے اور یہ ضرورت



اس وقت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے جب یہ نعمت بدقسمتی سے اولاد سے چھن جاتی ہے۔تب احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں انسان جتنے بھی رشتے بناتا ہے وہ اکثر ناپائدار ثابت ہوتے ہیں۔بس ایک ماں، باپ کا ہی رشتہ ایسا ہوتا ہے جو کسی بھی غرض و مفاد سے پاک، خالص، سچا اور کھرا ہوتا ہے اور جو کسی بھی دولت سے کم نہیں...... جو اگر کوئی اس نعمت سے محروم ہو جائے تو وہ صحیح معنوں میں کنگال ہو جاتا ہے اور زمانے کے بازار میں یہ انمول دولت کبھی کمائی بھی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ یہ صرف عطا ہوتی ہے۔بسمہ سے جب یہ عطا چھن گئی تو وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ، خالی دامن اور خالی دل کے ساتھ ویران ہی نہیں یتیم اور بے آسرا بھی ہوگئی۔اتنی بڑی دنیا میں اس کے پاس صرف چند ہی خونی رشتے بچے تھے۔جن میں ایک بڑی بہن، ماموں اور ایک پھوپی...... ماں، باپ قضائے الٰہی سے دنیا سے رخصت ہوگئے اور بڑی بہن پرائی ہوگئی۔اور ماں، باپ نے جو رشتہ اس کے لیے ڈھونڈا تھا اس نے بھی طلاق کا داغ لگا کر چند ماہ میں ہی اسے واپس گھر بھیج دیا تھا۔ایک روحانی رشتہ آمنہ بی بی کا رہ گیا جو بہت سالوں سے اس کی رہنما واستاد تھیں۔

استاد بچوں کے روحانی ماں، باپ ہوتے ہیں۔ بسمہ کے لیے اس کے بچے کھچے خونی رشتے زندگی اور وقت کی آزمائش میں ناکام ہو کر بسمہ کو بھری دنیا میں تنہا کر گئے۔جس کے بعد آمنہ بی بی ہی اس کی رہنما' چارہ گر اور غم گسار تھیں۔وہ اصل میں اس کی مالک مکان تھیں۔اب صرف تیئس سالہ طلاق یافتہ بسمہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ ان ہی کے مکان کے نچلے پورشن میں بطور کرایے دار رہ رہی تھی۔آمنہ بی بی شاہینہ اور بسمہ کی اسکول اور ٹیوشن ٹیچر تھیں مگر وہ اسے حوصلہ اور رہنمائی ہی دے سکتی تھیں۔سہارا اور تحفظ نہیں......اور بسمہ کو تو دونوں چیزیں چاہیے تھیں۔سال بھر پہلے ماں کو شوگر اور بلڈ پریشر کے مرض نے موت کا اژدھا بن کر نگل لیا تھا۔اور سال بھر بعد ناتواں باپ نے بھی ان ہی موذی بیماریوں کے ہاتھوں جان دے دی تھی۔صبح وہ اچھے بھلے گھر سے پنشن لینے نکلے تھے اور واپسی چار کاندھوں پر ہوئی تھی۔

جانے بدنصیب بشیر احمد کے ساتھ آناً فاناً کیا ہوا تھا۔دل کے دغا دینے پر نبضیں ڈوبنے لگی تھیں، شوگر لیول بڑھی تھی یا پھر بلڈ پریشر کی اونچائی نے بلندی پر جا کر ان کی زندگی کی ڈور کو لمحوں میں کاٹ ڈالا تھا۔تب روح کے جسم سے آزاد ہوتے ہی کسی ذی روح کو رحم آیا تھا۔اور اس نے بشیر احمد کے چمڑے کے ہینڈ بیگ میں گھسا ہوا بدرنگ سیل فون نکال کر گھر پر فون کر دیا تھا۔ چھوٹے سے دل کی مالک بسمہ پر یہ خبر سن کر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

وہ تو شکر تھا کہ اس وقت آمنہ بی بی گھر پر موجود تھیں جنہوں نے اسے حوصلہ دیا تھا۔اور اسے لے کر بتائے گئے پتے پر پہنچی تھیں۔انہوں نے گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بڑی بہن شاہینہ کو بھی فون کر دیا تھا۔مگر بسمہ اور آمنہ بی بی نے دیر کر دی تھی۔وہ بشیر احمد کے پاس پہنچیں تو چند لمحوں پہلے ہی بشیر احمد کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ان کے گرد لوگوں کا ہجوم اکھٹا تھا۔اس دوران کسی نے ایمبولینس کو فون کر دیا تھا۔بسمہ پر تو سکتہ طاری ہوگیا تھا۔وہ گنگ رہ گئی تھی۔ آمنہ بی بی نے اپنے بیٹے کو فون کر کے فوری طور پر اسے وہاں ہی بلایا تھا۔اور اس کے پہنچتے ہی ایمبولینس بھی پہنچی تھی۔تب وہ قریبی اسپتال لے جا کر بشیر احمد کی موت کی تصدیق کے بعد گھر لے آئے...... جہاں شاہینہ اور اس کے شوہر کے ساتھ دیگر قریبی و دور کے رشتے دار اور محلے والے اکھٹا ہو چکے تھے۔آمنہ بی بی کے بیٹے نے اسپتال سے گھر فون کر دیا تھا۔اور اس وقت صحن میں رکھی تیار میت کے گرد محلے کے افراد کے علاوہ کچھ قریبی رشتے دار ماموں، ممانی اور شاہینہ کے سسرال والے موجود تھے۔دونوں بہنیں ایک طرف سوگوار بیٹھی تھیں۔بسمہ کا سکتہ بھی صحن میں رکھی باپ کی میت پر بین کرتی بہن کی چیخوں سے ہی ٹوٹا تھا۔اور پھر

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے گلے لگ کر خوب دھاڑیں مار، مار کر روئی تھیں۔

ماں کے بعد اس کے لیے باپ کا ہی واحد سہارا تھا۔ جس کے سائے میں وہ زندگی گزار رہی تھی۔ اب وہ سہارا بھی قضائے اجل نے چھین لیا تھا...... اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ باپ کا سائبان چھننے کے بعد کھلے آسمان تلے آگئی ہے۔ کیونکہ باپ کی میت اٹھنے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا فیصلہ بھی ہونا تھا۔ اب وہ کس کے ساتھ یا کس کے پاس رہے گی۔ اور پھر میت اٹھنے کے بعد گھر میں موجود نفوس بھی ایک، ایک کر کے اٹھنے لگے تھے۔ دوپہر سے شام ہوئی پھر مغرب کی اذانوں تک سارا گھر خالی ہوگیا۔ صرف اس کے ماموں، ممانی اور بہن، بہنوئی ہی گھر میں موجود تھے۔ جن کے درمیان بیٹھ کر آمنہ بی بی نے بسمہ کی ذات کے حوالے سے ان کے سامنے سوال رکھا تھا کہ اب بسمہ کو اس گھر سے اپنی ذمّے داری بنا کر کون لے جائے گا۔ کیونکہ باپ کی موت کے بعد جوان جہان لڑکی بہر حال اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس ذمّے داری کو اب پیچھے بچ جانے والے خونی رشتوں نے ہی اٹھانا تھا۔ آمنہ بیوہ عورت تھیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں مناسب نہیں لگا تھا کہ بسمہ اب اس گھر میں رہے۔ مگر آمنہ بی بی کو اپنے سوال کا جواب دینے والے چاروں چہروں پر سناٹا دکھائی دے رہا تھا۔ جو وہاں موجود ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگے تھے۔ شاہینہ بڑی بہن ہو کر بھی متذبذب نظر آرہی تھی تو ماموں، ممانی کے ہونٹوں پر بھی گہری چپ لکھی تھی۔ جسے پڑھنے میں آمنہ بی بی کو دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انہیں اپنے سوال کا جواب ہر حال میں چاہیے تھا۔ لہٰذا اس طویل خاموشی کو آمنہ بی بی کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

''میرے خیال میں آپ لوگ خود اطمینان سے آپس میں بات کر کے باہمی مشورے سے اس بارے میں فیصلہ کرلیں تو مناسب رہے گا۔ تب تک میں آپ لوگوں کے قیام وطعام کا بندوبست دیکھتی ہوں۔''

آمنہ بی بی کمرے کے ایک کونے میں سوگوار بیٹھی بسمہ پر ایک تاسف بھری نگاہ ڈال کر اٹھنے لگی تھیں۔ تب ہی شاہینہ کے ساتھ بیٹھے اس کے شوہر عامر نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو اشارہ کیا تھا جس کا مفہوم سمجھتے ہوئے شاہینہ نے فوراً ہی آمنہ بی بی کے سوال کا جواب دینے کا فیصلہ کرلیا۔

''معاف کیجیے گا استانی جی...... میں تو بسمہ کی ذمّے داری اٹھانے سے قاصر ہوں۔ میں تو خود دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پزیر ہوں، اب بچوں کے ساتھ بسمہ کو کیسے اپنے ساتھ رکھ سکوں گی۔ میرے خیال میں بسمہ اب ماموں، ممانی کے ساتھ رہے تو زیادہ مناسب رہے گا۔'' وہ جوان بہن کا بھاری بوجھ اٹھانے سے صاف معذرت کر چکی تھی۔ جس کی شاید ایک سے زیادہ وجوہات ہوں گی۔

مگر شاہینہ کی بات نے صوفے پر ساتھ ہی بیٹھی ممانی صاحبہ کے ماتھے پر بے ساختہ پڑنے والی ناگواری کی سلوٹوں میں اضافہ کردیا تھا۔ وہ بھی شاہینہ کی طرح اس ذمّے داری کو اپنے سر لینے کو ہرگز تیار نہیں تھیں بلکہ وہ تو گھر سے ہی دل میں فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ انہیں اس معاملے پر کیا دلائل دے کر انکار بلکہ معذرت کر کے اپنا دامن بچانا ہے۔ لہٰذا شاہینہ کا عذر سن کر وہ.... بے ساختہ بولی تھیں۔

''تمہاری بات معقول ہے شاہینہ...... لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ میں اور تمہارے ماموں بچوں کے ساتھ حیدرآباد شفٹ ہو رہے ہیں، تمہارے ماموں کا حیدرآباد ٹرانسفر ہوگیا ہے اور ابھی ہم اپنے بھائی کے گھر رہائش رکھیں گے۔ لہٰذا ہم بسمہ کو فی الحال اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے...... اس لیے ابھی کچھ عرصے کے لیے تو تم ہی بسمہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مگر حیدرآباد پہنچ کر اپنی رہائش کا بندوبست ہوتے ہی ہم جلد ہی بسمہ کو بلانے کا بندوبست کرلیں گے۔'' نورین بیگم نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا تھا۔ اور کسی کو اعتراض کرنے

کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ جبکہ ان کے شوہر نامداریوں خاموش بیٹھے تھے جیسے بیوی کا کہا پتھر کی لکیر ہو۔

اور یوں بسمہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ممانی صاحبہ نے بڑی چالا کی سے شاہینہ کے لیے مزید کسی بہانے کا عذر ہی نہیں چھوڑا تھا اور ہوا بھی یہی تھا۔ شاہینہ چالاک ممانی کی ہوشیاری بھانپ کر منہ بناتے ہوئے وہیں سوئے بچے کو اٹھا کر انہیں ملامتی نگاہوں سے دیکھتی بچے کو دوسرے کمرے میں سلانے کا کہہ کر چلی گئی۔ ممانی نے بھی شوہر کو آنکھ کے اشارے سے اٹھنے کو کہا۔ اور آمنہ بی بی... دونوں طرف کی معذرت سننے کے بعد کمرے کے ایک کونے میں سوگوار بیٹھی بسمہ کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یہی سوچنے لگیں کہ واقعی ماں، باپ کا مضبوط سائبان اولاد کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا ہے لیکن اگر یہ سایہ بدقسمتی سے چھن جائے تو اولاد صحیح معنوں میں زمانے کی ٹھوکروں پر آجاتی ہے۔ وہ اس کے لیے بہت دکھی اور افسردہ تھیں لیکن چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ خود جوان بیٹے کی ماں تھیں۔ اور جوان لڑکی کی ذمّے داری چاہ کر بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ بھلا ان کا رشتہ ہی کیا تھا، بسمہ کے سگے خونی رشتوں کے سامنے...... وہ اس کی استانی اور مالک مکان تھیں۔ اس لیے مجبوراً خاموش رہیں۔

نورین ممانی نے تو شوہر کو یتیم بھانجی کے سر پر حوصلے کی تلقین کے لیے ہاتھ رکھنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ہاں جاتے، جاتے انہوں نے بسمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر مغموم لہجے میں چند تسلی و حوصلے کے روایتی بول بولے تھے اور جلدی سے باہر نکل گئیں۔

بسمہ تو بس سوگوار چہرے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ رشتوں کے بے حس رویّوں نے شاید اس کے وجود کو بھی سن (بے جان) کر دیا تھا۔ اور پھر عامر بھی اٹھ کر ممانی کے پیچھے کمرے سے باہر نکل کر دوسرے کمرے میں اپنی بیوی شاہینہ کے پاس چلا گیا تا کہ اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر سکے...... مگر آمنہ بی بی کو بسمہ کی حالت اور ان حالات پر بڑا تاسف ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر جانے کے بجائے بسمہ کے پاس وہیں فرش پر بچھی سبز دری پر بیٹھ گئیں۔ انہیں لگا تھا شاید بسمہ کو ان کی ضرورت ہے۔ اپنی نہ ہو کر بھی ان کا ساتھ اپنائیت کا باعث تھا۔ لٰہذا بسمہ نے بھی وقتی طور پر اس سہارے کو تھام لیا تھا۔

☆☆☆

''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے عامر...... ماموں اور مامی نے تو بڑی چالا کی سے صاف بہانہ بنا کر اپنا دامن بچا لیا ہے۔ اب ہمیں ہی بسمہ کو اپنے ساتھ لے جانا پڑے گا۔''

شاہینہ نے بیڈ پر قریب سوئے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا تھا جو پہلے ہی ناگوار موڈ میں یہاں آ کر بیٹھا تھا۔

''مگر میں اتنی بڑی ذمّے داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' وہ بڑی بیزاری سے بولا تھا۔ عامر کے برجستہ انکار پر وہ شوہر کو اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ جو سارے حالات جانتے ہوئے بھی معاملے کی حساسیت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حالانکہ چاہتی تو وہ بھی نہیں تھی لیکن کیا کرتی...... اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اب ایک سگی بہن کے ہوتے ہوئے بسمہ کو اکیلے استانی جی کے گھر تو نہیں چھوڑ سکتی تھی اسی لیے اس نے شوہر کو سمجھانے کی ایک کوشش کی۔

''تو پھر بسمہ کہاں جائے گی...... ماموں اور ہمارے سوا اس کا اور ہے کون...... وہ کس کے پاس رہے گی...... اگر ہم نے بھی اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ ماں، باپ کے مرنے کے بعد بڑی بہن نے یتیم بہن کو بے سہارا چھوڑ دیا۔''

شاہینہ نے شوہر کو دنیا داری کے حوالے سے ڈرانا چاہا۔ اپنی مجبوری بیان کی تھی۔ صرف دنیا والوں کے ڈر سے...... بہن کی محبت اور فکر میں نہیں...... اسے بہن سے ہمدردی ضروری تھی مگر وہ فطرتاً خود غرض اور مطلب پرست واقع ہوئی تھی...... جو رشتوں کو وقت پڑنے پر ضرورتاً استعمال تو کرتے ہیں مگر ان ہی رشتوں کو اپنی

زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اب چاہے یہ رشتے خون کے ہوں یا بنائے ہوئے۔ ایسے لوگوں کو صرف اپنے مفاد اور غرض سے مطلب ہوتا ہے۔ شاہینہ نے بھی اپنے بچوں کی پیدائش پر سوا مہینے تک بسمہ کو گھر بلا کر اپنی اور نومولود بچے کی خدمتیں کروائی تھیں اور آج اسے بسمہ کو اپنے گھر لے جانا مشکل فیصلہ لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب بات چند دنوں یا چند ماہ کی نہیں تھی۔ بسمہ کی پوری ذمّے داری اٹھانے کا معاملہ تھا۔ جس سے ہر خونی رشتہ اپنا دامن بچانا چاہ رہا تھا۔ مگر اب گلے میں پڑے ڈھول کو بجانا شاہینہ کی مجبوری تھی۔ اسی لیے شوہر کو رام کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن شوہر کے بگڑے تیور دیکھ کر وہ مزید کچھ بولنے کے بجائے خاموش ہوگئی۔ جانتی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں آمنہ بی بی اور بسمہ موجود ہیں۔ البتہ عامر چپ نہیں رہا...... اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ بسمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطلب کیا ہے؟ ساری عمر کے لیے اس کی ذمّے داری اٹھانا۔ یعنی اس کی شادی بیاہ کا خرچ بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ آخر ہم اسے ہمیشہ گھر بٹھا کے تو نہیں رکھ سکتے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ طلاق لے کر میکے آکر بیٹھنے کے بجائے وہیں سسرال میں گزارہ کرتی مگر تم عورتوں کو تو سسرال والوں کی پابندیاں برداشت کہاں ہوتی ہیں۔ بس آزادی چاہیے ہوتی ہے۔''

اور شوہر کے اس بے بنیاد الزام پر شاہینہ نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سارے حالات سے باخبر تھا۔ پھر بھی بے قصور بسمہ پر الزام لگا رہا تھا اور تب وہ چپ نہیں رہی تھی۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بسمہ کی طلاق میں نے کرائی ہو تم اچھی طرح جانتے ہو...... بسمہ کا گھر اس کی چنڈال ساس، نندوں نے بسنے نہیں دیا اور اس کمبخت ماجد نے بہنوں کی باتوں میں آکر بسمہ کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بیچاری تو بے قصور تھی۔ اس نے تھوڑی طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا...... تم بسمہ کو سمجھا دو...... اس کا ماموں، ممانی کے ساتھ رہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ اگر... تم نے اسی وقت اپنی مامی کو جواب دے دیا ہوتا تو یہ مصیبت ہمارے گلے نہ پڑتی۔'' عامر نے ... بے مروتی کی حد کردی تھی...... وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ یہ وہی بسمہ ہے جو شاہینہ کی شادی کے بعد بہن، بہنوئی کے گھر آنے پر بھاگ، بھاگ کر ان کے لیے چائے، ناشتے اور کھانے کا بندوبست کرتی تھی۔ پھر ان کے دونوں بچوں کو بھی بسمہ نے گودوں کھلایا تھا، ان کے لاڈ اٹھاتی رہی تھی...... اور آج عامر سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ شاید سگے بھائی اور بہنوئی میں یہی فرق ہوتا ہے بسمہ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس نے بہنوئی کو ہی بھائی سمجھا تھا۔ اور آج وہی بھائی، خود غرض بہنوئی بن کر سالی کو بوجھ سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے بیوی پر سارا غصہ نکال رہا تھا لیکن شاہینہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو بلاوجہ کے شوہر کے طعنوں سے دبتی ہیں۔ اس نے عامر کی ملامت کے جواب میں ممانی کو ہی الزام دھرا تھا۔

''ہاں تو میں نے بھی تو ماموں پر ہی یہ ذمّے داری ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم تو جانتے ہو ہماری مامی کو...... کتنی تیز ہیں وہ...... کس صفائی سے معذرت کر کے اپنا دامن بچا کر چلتی بنیں...... اور ماموں بھی سدا کے جورو کے غلام، بیوی کی ایک آواز پر ہاتھ باندھ کر ان کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔''

ممانی کا صاف انکار اسے ابھی تک غصہ دلا رہا تھا۔

''ارے...... ابھی تو ابا کی قبر کی گیلی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی اور ماموں نے آنکھیں پھیرلیں۔ مرگ والے گھر میں ایک رات ٹھہر کے یتیم بھانجیوں کو دلاسا' تسلی دینے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اور اصولاً تو بسمہ کو اپنے ساتھ ماموں کو ہی لے جانا تھا۔ امی، ابو کے بعد اب ان کے سوا ہمارے یہاں ہے ہی کون......''

شاہینہ کو بھی اب اچانک ہی اپنے یتیم ہونے کا

خیال آیا تھا اور غصے میں بیوی کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے والے ماموں کو بھی ملامت کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جو دبنگ بیوی کے سامنے دم مارنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور بیوی کی لعنت ملامت سنتے ہوئے عامر نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

''بس کرو، تمہارے ننھیالی رشتے داروں کو میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ آج کی رات ہم یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ صبح بسمہ کو ساتھ لے جا کر تمہارے ماموں کے گھر چھوڑ آئیں گے۔ پھر وہ جانیں اور ان کا کام...... وہ اپنے فرض سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتے۔''

شاہینہ جیسی بیوی کی صحبت میں رہ کر اسے بھی گھریلو سیاست کا خاصا تجربہ ہوگیا۔ اسی لیے وہ کسی گھاگ عورت کی طرح بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔

شاہینہ نے شوہر کی تجویز سن کر اطمینان بھرے انداز سے سکون کی سانس لی کیونکہ اس وقت رات کو سوئے بچوں کو اکٹھا کر کے گھر روانہ ہونے کا اس کا بھی موڈ نہیں تھا اس لیے شوہر کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

''بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے ...... مامی کی چالبازی کا جواب اسی طرح دینا ہوگا۔ بسمہ کی تم فکر مت کرو، اسے میں اپنی مجبوری بتا کر سمجھا دوں گی۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ماموں، ممانی، شام میں ہی حیدرآباد کی گاڑی پکڑلیں۔''

شاہینہ نے بھی شوہر کی سمجھداری کو سراہتے ہوئے مطمئن لہجے میں آگے کی پلاننگ بتادی تھی...... اور عامر نے پُرسکون ہو کر وہیں بیڈ پر اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے پیر پسار کر تکیہ اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔

''ٹھیک ہے...... استانی جی جی کھانا لگادیں تو مجھے اٹھادینا...... تب تک میں کچھ دیر آرام کرلیتا ہوں۔ صبح سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اب تھکن ہورہی ہے۔''

اور عامر کے بچوں کے پاس لیٹتے ہی شاہینہ آہستگی سے بچوں کی نیند خراب نہ ہونے کے ڈر سے بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تا کہ بہن کو ساری بات سمجھا سکے۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ شاہینہ کو باپ کی اچانک موت کا دکھ نہیں تھا۔ یا بہن سے بالکل ہمدردی نہیں تھی۔ مگر بسمہ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ واقعی خود غرض بن گئی تھی اور جوان بہن کو ساتھ رکھنے میں متذبذب تھی کیونکہ عامر لاکھ اچھا سہی مگر تھا تو بہنوئی...... کل کو ایک گھر میں رہتے ہوئے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو وہ کیا کرے گی...... وہ اپنی اچھی بھلی گرہستی کو اندیشوں کی نذر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اب شوہر اور بہن کو تو یہ سب کچھ سمجھا نہیں سکتی تھی۔ وہ کون سا بہن سے رشتہ توڑ رہی تھی۔ ماموں کے گھر رہتے وہ بہن کی خبر گیری کرسکتی تھی۔ وہ اپنے دل کو تسلی دے کر بسمہ کو سمجھانے کے بعد واپس بچوں کے پاس چل دی تھی۔

☆☆☆

بشیر احمد کا تعلق پنجاب کے شہر گجرات کے نواحی علاقے کنجاہ سے تھا۔ وہ دو ہی بہن بھائی تھے، بڑی بہن زینب بی بی سولہ سال کی عمر میں وہیں کنجاہ میں ہی بیاہی گئی تھیں...... اور بشیر احمد انٹر ڈپلومہ کرنے کے بعد کراچی شہر میں آئل ریفائنری میں اچھی جاب کررہے تھے۔ نذیر احمد (بشیر کے والد) کی اپنی کچھ زمینیں تھیں...... جبکہ بشیر احمد کو بچپن سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ وہ میٹرک پاس کر کے کراچی شہر مزید پڑھنے آگئے تھے۔ اور پھر یہیں شادی بھی اپنی پسند سے کرلی تھی۔ امجد ان کا دوست تھا۔ جس کے گھر بشیر احمد کا آنا جانا تھا...... سکینہ کو انہوں نے وہیں دیکھا تھا۔ اور پہلی نظر میں ہی وہ اس کی معصومیت اور خوب صورتی کے اسیر ہوگئے تھے۔ جس کے بعد سکینہ سے شادی کرنے کا انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اور خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی اچھی نوکری بھی مل گئی تھی۔ اس لیے انہیں پورا یقین تھا کہ امجد اور اس کے گھر والے ان کے رشتے کے لیے انکار نہیں کریں گے۔ حالانکہ گھر والے ان کی شادی اپنے

رشتے داروں میں کرانا چاہتے تھے۔بشیر احمد کی بہن زینب نے تو اپنی چھوٹی نند سے بشیر احمد کے بیاہ کا سوچ بھی رکھا تھا......مگر بشیر احمد کی خواہش اور ضد کے آگے کسی کی نہیں چلی تھی اور پھر بشیر احمد نے ماں باپ کو منانے کے لیے بڑی منتیں کی تھیں۔ وہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے لہٰذا بیٹے کی خوشی کی خاطر انہیں بالآخر سکینہ کو بہو منانے کے لیے راضی ہونا پڑا تھا البتہ زینب چھوٹے بھائی سے بری طرح ناراض ہوگئی تھیں۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کی شادی کے کیسے، کیسے ارمان دل میں پالے تھے۔ کیا کچھ سوچ رکھا تھا۔ لیکن بشیر احمد نے بقول زینب کے شہر میں چاند چڑھالیا تھا......وہ سسرال میں اپنی سُبکی کے باعث غصے میں بشیر احمد کی شادی میں شریک بھی نہیں ہوئی تھیں۔

بہرحال بشیر احمد کے والدین تو بیٹے کی شادی میں شریک ہوئے۔ اور پھر شہر میں ہی بشیر احمد کے کرایے کے گھر میں اپنی بہو سکینہ کے ساتھ کچھ دن رہ کر واپس کنجاہ چلے گئے تھے۔ کیونکہ بشیر احمد نے بیوی کو شہر میں اپنے ساتھ ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو ماں، باپ کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ دونوں نی ذات برادری اور آبائی علاقے کو چھوڑنے کے حق ں نہیں تھے۔ اس لیے بشیر احمد کے اصرار کے باوجود پس لوٹ گئے تھے۔ البتہ کچھ ہفتوں بعد بشیر احمد بیوی لے کر کنجاہ روٹھی بہن کو منانے گئے تھے مگر زینب وع سے بڑی ضدی اور اکھڑ مزاج کی مالک تھیں۔ ں شروع سے گھر میں اپنی بات منوانے کی عادت تھی بشیر احمد نے اُن کی نند سے شادی کرنے سے انکار کیا لہٰذا زینب نے بھی اپنی پکی ضد کے باعث ناراضی ہیں کی......آخر سسرال میں انہیں بھی اپنی عزت کا رکھنا تھا۔ چھوٹے بھائی کی وجہ سے پہلے ہی ان کی ل میں خاصی سُبکی ہوئی تھی۔ لہٰذا مجبوراً بشیر احمد کے ساتھ واپس شہر آگئے۔ اس کے بعد یکے بعد ں، باپ کی فوتگی کے بعد بشیر احمد نے مکمل طور پر ہر جانا ترک کر دیا۔ اور یوں دونوں بہن، بھائی

کا رابطہ اور تعلق وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ، رفتہ واجبی سا بھی نہیں رہا۔ بشیر احمد اپنے ترکے کی زمینیں بھی فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے کراچی جیسے بڑے شہر میں بس گئے۔

وہ اپنی چھوٹی سی جنت میں بیوی، بچوں کے ساتھ مگن ہو چکے تھے۔ شادی کے سال بھر بعد شاہینہ رحمت بن کر ان کی جنت کی نئی مکین بنی تھی۔ اور پھر دو سال بعد بسمہ ان کی زندگی میں رونق بڑھانے چلی آئی۔ جس کی پیدائش کے بعد کچھ پیچیدگیوں کے باعث سکینہ مزید بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئیں۔ حالانکہ بشیر احمد نے بہت اچھے اسپتال سے ان کا علاج بھی کروایا تھا۔ لیکن دل میں اولادِ نرینہ کی شدید خواہش کے باوجود سکینہ اس نعمت سے محروم ہی رہیں۔ جس کا انہیں بہت قلق تھا کہ وہ جان سے عزیز شوہر کو ان کے بڑھاپے کا کوئی مضبوط سہارا دینے میں ناکام رہی ہیں۔ تب بشیر احمد نے ہی انہیں سمجھایا تھا کہ انہیں اللہ کی رضا میں راضی ہونا چاہیے......کیونکہ اللہ پاک کی رضا میں حکمت و مصلحت ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس تک بندے کی سوچ کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اللہ کی دی ہوئی رحمتوں پر شکر ادا کر کے راضی بہ رضا ہوں گی تو اللہ پاک بھی ان سے راضی ہوگا۔ اولاد رحمت ہو یا نعمت دونوں صورتوں میں رب کی طرف سے بندے کے لیے انمول دولت ہوتی ہے۔ اور بشیر احمد اس دولت کو پا کر خوش و مطمئن تھے تو سکینہ نے بھی رفتہ، رفتہ پاگل دل کو سمجھا لیا۔ ان کا ملال تو بشیر احمد کی سوچ جان کر ہی کم ہوگیا تھا کہ ان کے نزدیک لڑکے یا لڑکی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ بندے کو ہر مشکل گھڑی میں سہارا دینے والی ذات صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ جس کے لیے بیٹے کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ تب سکینہ شوہر کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

یوں بشیر احمد کے خوب صورت ساتھ کے سائے تلے دونوں بچیوں کی پرورش میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اب بسمہ میٹرک اور شاہینہ انٹر

کررہی تھی۔ جوان ہوکر شاہینہ نے بڑا رنگ روپ نکالا تھا۔ سروقد ہونے کے ساتھ گوری چمکتی رنگت نے اسے خود پسند اور مغرور بنادیا۔ جبکہ شاہینہ کے مقابلے میں بسمہ کی رنگت دبتی ہوئی گندمی مائل تھی۔ قد بھی اس سے دبتا ہوا تھا۔ مگر چہرے پر معصومیت اور بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں کی چمک اور خوش مزاجی کی صفت نے اسے بڑی بہن کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش بنایا تھا۔ البتہ مزاجاً وہ کچھ خود سے بے پروا اور ملنگ ٹائپ تھی۔ جو مل گیا اسے ہنسی خوشی قبول کرلیا۔ ضد نہیں باندھی۔ نہ ماں، باپ سے اور نہ نصیب سے..... جبکہ شائستہ بچپن سے اپنی ضدیں منواتی چلی آئی تھی۔ اچھا لگنا اور اچھا پہننا، اوڑھنا اس کا شوق تھا۔ اور چونکہ بشیر احمد کی پکی نوکری تھی، وہ اچھا کما رہے تھے۔ اس لیے شاہینہ کو ہمیشہ سے کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کی عادت تھی۔ خود بشیر احمد نے بھی اپنے ماں، باپ کے زیر سرپرستی ٹھاٹ باٹ والی زندگی گزاری تھی، اس لیے بیٹی کے نت نئے شوق اور خرچوں پر انہیں کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وہ اولاد پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کی تھی یہاں تک کہ شادی کے لیے بھی اس نے اپنی پسند کا اظہار کرلیا تھا۔

عامر اس کی دوست ثمرہ کا کزن تھا اور ثمرہ کے گھر میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی..... جو پہلی نظر کی محبت ثابت ہوئی۔ عامر نے ثمرہ سے شاہینہ کا سیل نمبر لیا تھا۔ اور یوں عامر کی پسندیدگی کی سند پا کر شاہینہ محبت کی خوشنما شاہراہ پر عامر کی سنگت میں قدم سے قدم ملاتی دور تک چلی گئی۔

دونوں رات کو گھنٹوں موبائل پر ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ مستقبل کے منصوبے بناتے اور ایک دن شاہینہ نے بسمہ کو اپنی محبت کا راز دار بنا کر ماں تک پیغام پہنچادیا کہ وہ ثمرہ کے کزن عامر سے شادی کرنا چاہتی ہے حالانکہ عامر کے گھر والے اس رشتے کے خلاف تھے لیکن عامر کے دل کی حالت بھی شاہینہ سے مختلف نہیں تھی۔ جذبات کی ندی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ جس میں بہہ کر وہ دونوں سارے جہان کی مخالفت لے کر بھی ایک دوسرے کو ہر قیمت پر پانا چاہتے تھے۔ حالانکہ بسمہ نے چھوٹی ہونے کے باوجود شاہینہ کو سمجھایا بھی تھا کہ جس فیصلے میں بزرگوں کی مرضی اور خوشی شامل نہ ہو، وہ ساری عمر من کی خوشی پا کر بھی کسک میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر شاہینہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹے گی اور نہ ہی کبھی اپنے فیصلے پر پچھتائے گی۔ یہ سوچے بغیر کہ جب وقت اپنا فیصلہ سناتا ہے تو بڑے، بڑے فیصلہ سازوں کو ان کی لمحاتی غلطیوں کا ادراک کرواکے عمر بھر کی پشیمانی میں بدل دیتا ہے۔

اگرچہ عامر کے والدین اور بہن، بھائی ہرگز اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھے۔ وہ اس کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب جوان اولاد اپنی من مانی کی ٹھان لے تو اس منہ زور جذبے کے آگے بڑی سے بڑی مضبوط چٹان کو بھی اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ عامر کے گھر والوں کو بھی عامر کی ضد کے سامنے ہار ماننی پڑی تھی۔ اور انہوں نے بڑی بے دلی سے شاہینہ کو بہو بنا کر لانے کی عامر کی ضد مان لی تھی۔

☆☆☆

دوسری جانب بسمہ کی زبانی شاہینہ کی خواہش جاننے کے بعد سکینہ دم بخود رہ گئی تھیں۔ ماں ہوکر بھی انہیں اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ بیٹی انجانے میں کس راستے پر چل پڑی ہے۔ کہیں یہ مکافاتِ عمل تو نہیں...... ان کی شادی بھی تو بشیر احمد سے ان کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف مجبوراً ہوئی تھی۔ لیکن اس میں سکینہ بی بی کا قصور صرف اتنا تھا کہ بشیر احمد نے اپنے دوست کے گھر ایک دن سکینہ کو دیکھا اور اسی دن سے ان سے شادی کا فیصلہ کر کے اپنے دوست کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ آگے کے مرحلے سکینہ کے ماں باپ اور بھائی نے بشیر احمد کے ساتھ مل کر طے کیے تھے۔ سکینہ نے اپنی طرف سے کوئی ضد نہیں کی تھی بلکہ بشیر احمد کی محبت اور خواہش جاننے کے بعد ماں، باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ پھر اتنے سال

بعد وقت نے انہیں کیسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بسمہ کی زبانی سب کچھ جاننے کے بعد انہوں نے شاہینہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھا کر اسے اس راہ پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ جان چکی تھیں کہ بزرگوں کی مرضی اور خوشی کو نظر انداز کر کے کیے جانے والے فیصلے بظاہر کتنے بھی پائیدار ثابت ہوں مگر وقت گزرنے کے بعد سود و زیاں اور خسارے کا احساس ضرور رلا دیتے ہیں۔ بشیر احمد کی ضد اور فیصلے کے سامنے سالوں پہلے اگرچہ ان کی ماں نے بیٹے کی خوشی کی خاطر سکینہ کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن بشیر احمد کی بڑی بہن نے اکلوتے بھائی کی ضد کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے کیونکہ وہ خود ضد کی بڑی پکی تھیں۔لہٰذا بھائی کی من مانی کے بعد انہوں نے چھوٹے بھائی سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور یہ بشیر احمد کے لیے بڑا جذباتی دھچکا تھا۔ بڑی بہن نے بچپن سے ان کے بڑے لاڈ اٹھائے تھے۔ اور جوان ہو کر وہ اسی بہن کو ناراض کر بیٹھے تھے۔ اور یہ ناراضی بہن کی ضد کی طرح پکی نکلی تھی جو سالوں پر محیط ہو چکی تھی۔ بس یہی خسارہ بشیر احمد اور سکینہ کو اکثر ملول کر دیتا تھا۔ سکینہ یہ سوچ کر ملول رہتی تھیں کہ ان کی وجہ سے بشیر احمد کا بڑی بہن سے خونی اٹوٹ رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور شاید یہ اسی کی سزا ہے جو آج سالوں بعد شاہینہ کی ضد کی صورت میں سامنے آ کر سکینہ کو احساس دلا گئی کہ کسی بھی ضد کے نتیجے میں بالآخر کوئی نہ کوئی خسارہ ضرور آتا ہے۔

اور اب یہ جاننے کے بعد کہ عامر کے گھر والے اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ انہیں شدید دھچکا لگا تھا۔ اسی لیے وہ بیٹی کو سمجھانا چاہتی تھیں تاکہ وہ اپنی ضد سے باز آ جائے مگر اس کی منہ زور خواہش کے آگے انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ شاہینہ، عامر کے سوا کسی سے شادی کے لیے تیار نہیں تھی...... لہٰذا مجبوراً انہیں شرط رکھنی پڑی تھی کہ جب تک عامر کے ماں، باپ باقاعدہ رشتہ لے کر نہیں آئیں گے...... وہ شاہینہ کی شادی عامر سے طے نہیں کریں گی۔ اور عامر نے شاہینہ کی بھی اسی شرط کو سن کر بالآخر سارے جذباتی حربے استعمال کر کے ماں، باپ کو منا لیا تھا۔ اب باقی رہا کہ شوہر سے سکینہ نے کس طرح بات کرنی ہے اس کا بیٹی کو یقین تھا کہ ماں اپنی سمجھداری سے معاملے کو اچھی طرح سنبھال لیں گی۔ اور واقعی سکینہ بی بی نے اپنی فہم و فراست سے کام لے کر ایسا ہی کیا تھا۔ شوہر کو یہی بتایا تھا کہ ان کی کسی جاننے والی کے توسط سے شاہینہ کے لیے رشتہ آ رہا ہے۔ اور بشیر احمد تو کچھ اور سمجھنے کے بجائے اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ان کے آنگن میں کھیلنے والی بچیاں دیکھتے، دیکھتے آج اتنی بڑی ہو گئیں کہ ان کی رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے اور اب انہیں بابل کے گھر سے پیا دیس بھیجنا پڑے گا...... ساتھ ہی یہ فکر بھی لاحق تھی کہ دونوں بیٹیاں باری، باری بیاہ کر چلی جائیں گی تو وہ دونوں میاں، بیوی اکیلے کس کے سہارے زندگی جئیں گے۔ تب اتنے عرصے بعد ان کے دل میں بھی اس خواہش کی ہوک اٹھی تھی کہ کاش دو بیٹیوں کے ساتھ اللہ پاک انہیں ایک بیٹے کی نعمت بھی عطا کر دیتا تو آج وہ خود کو اتنا کمزور محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اس ہوک کو دل میں ہی دبا لیا تھا۔ اگر سکینہ سے اس کا اظہار کر دیتے تو سکینہ بیچاری کا دل بھی اپنی اس کم مائیگی کے احساس سے بوجھل ہو جاتا۔ انہوں نے بھی تو بیٹے کی کتنی خواہش دل میں پالی تھی۔ ڈاکٹروں، حکیموں سے علاج کرایا تھا۔ مزاروں پر جا کر منت بھی مانگی تھی۔ لیکن خدا کی مرضی اور مصلحت کے آگے بندہ بشر کیا کر سکتا ہے، وہ بے بس بے اختیار ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے اپنے رب کی بڑائی کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ عاجزی کے ساتھ بندگی اختیار کرتا ہے۔ بہرحال بشیر احمد نے بوجھل دل کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا تھا کہ بیٹیاں ماں، باپ کے گھر پرائی امانت ہوتی ہیں اور وقت آنے پر انہیں پرائے دیس کو اپنا بنانے کے لیے خوشی، خوشی رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی دستورِ زمانہ بھی ہے۔ یوں سکینہ بی بی کی فراست کے باعث شاہینہ کا بھرم باپ کی نظروں میں قائم رہ گیا تھا۔ وہ اصل

معاملے سے فی الوقت بے خبر ہی رہے تھے۔ پھر سب کچھ جلدی، جلدی میں طے ہوا تھا۔ عامر کے گھر والوں نے انہیں صرف ایک ماہ کی مہلت دی تھی اس پر بشیر احمد پریشان ہو اٹھے کہ اتنی جلدی سب انتظامات کیسے ہوں گے لیکن سکینہ بی بی نے انہیں یہ کہہ کر سمجھالیا تھا کہ جوان بیٹی کو زیادہ دیر گھر میں بٹھا کر نہیں رکھنا چاہیے۔ لہٰذا سیدھے سادے مزاج کے مالک بشیر احمد نے مزید کوئی اعتراضی نکتہ اٹھانے کے بجائے شادی کی تیاری شروع کردی۔ انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر دھوم دھام سے بیٹی کو رخصت کیا تھا۔

شادی کے صرف ایک ماہ بعد ہی عامر کو صرف اپنی پسند کی شادی کی پاداش میں شاہینہ کے ساتھ کرایے کے گھر میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔ جس کے بعد شاہینہ کو جن آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک لمبی کہانی تھی۔ لیکن اس نے صحیح معنوں میں شاہینہ کو زندگی کے سبق کے ساتھ یہ بھی سکھادیا کہ جو رشتے بزرگوں کی خوشی اور خواہش کے برخلاف بنائے جاتے ہیں ان کی بنیاد اکثر کمزور اور کھوکھلی ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال دونوں نے اپنی محبت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے زندگی کی آزمائشوں اور کٹھن امتحانوں سے لڑتے، لڑکھڑاتے سنبھل کر بالآخر چند سالوں میں اکیلے جینا سیکھ لیا تھا۔

اُدھر بشیر احمد اور سکینہ بی بی کو زندگی نے نئے امتحان سے دوچار کردیا تھا۔ سکینہ نے اپنے دور کے رشتے داروں میں بسمہ کا رشتہ طے کردیا تو اچانک ہی بشیر احمد کے من میں کیا سمائی کہ اپنی پکی نوکری کو ختم کر کے اپنا کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ سکینہ نے سمجھا بھی دیا تھا لیکن بیوی سے زیادہ بشیر احمد کا دوست سیانا نکلا تھا۔ اس نے جانے کیسے سیدھے سادے بشیر احمد کو شیشے میں اتارا۔ جس کے بعد بشیر احمد نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر پارٹنر شپ پر پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا بزنس شروع کردیا۔ جس میں اپنی عمر بھر کی پونجی لگادی۔ لیکن جانے دوشِ قسمت کی ستم ظریفی کا تھا یا پھر بشیر احمد کی سادگی کا، رشید خان ایک نہایت شاطر اور گھاگ آدمی نکلا کہ جس کی دوستی پر بشیر احمد نے آنکھ بند کر کے بھروسا کر کے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا تھا۔ انہیں رشید خان کی نیت کے فتور کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو دوستی پر اعتماد کر کے جوا کھیلا تھا۔ لیکن رشید خان نے اسی اعتماد کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بازی خود جیت لی۔ اس نے پہلے دھوکے سے بشیر احمد کو کاروبار سے الگ کیا۔ پھر چالاکی سے ان کے سر کا سائبان بھی گروی رکھوا کر کاروبار میں انویسٹ کرادیا۔ اور پھر اچانک کاروبار میں خسارہ دکھا کر بشیر احمد کو چند ہزار دے کر کاروبار سے مکمل طور پر ہی بے دخل کردیا...... کیونکہ اگر بشیر احمد کو دوست کی نیت کے کھوٹ کا علم ہوجاتا تو قانونی کاغذوں پر پکے کام کرواتے مگر وہ تو بے خبری میں لٹ گئے تھے۔ رشید خان نے ان کا گھر اور کاروبار دونوں نہایت چالاکی سے ہتھیا لیے اور بشیر احمد اس خسارے کے سودے میں اعتماد و بھروسا ہی نہیں ہارے تھے اپنا دل بھی ہار گئے تھے...... عمر بھر کی جمع پونجی اور ماں، باپ کی دی جائداد کے ساتھ سر چھپانے کا آسرا بھی چھن گیا۔ اس صدمے نے دل کی دیواروں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا تھا۔ اور انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ صدمہ تو سکینہ کو بھی بہت تھا بڑھاپے میں جوان بیٹی کے ساتھ وہ بے گھر ہوگئے۔ بشیر احمد نوکری تو پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ اب آگے زندگی جینے کا آسرا بھی نہیں رہا تھا۔ بسمہ کی شادی بھی کرنی تھی۔ دن رات کی سوچوں اور تفکرات نے انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ بنادیا۔ بشیر احمد تو پہلے ہی شوگر پیشنٹ تھے۔ اب دل نے بھی دغا دے دی تھی۔ وہ پہلے دوستی کا بھرم اور بھروسا ٹوٹنے پر صدمے سے نڈھال تھے۔ اوپر سے بیوی، بیٹی کو بے سہارا کردینے کی شرمندگی اور پچھتاوا اندر ہی اندر دیمک بن کر چاٹنے لگا۔ ایسے میں سکینہ کے بھائی امجد نے اس وقت ان کی مدد کی تھی۔ اور وہ ایک چھوٹے سے کرایے کے مکان میں شفٹ ہوگئے۔

زندگی کا، کارواں پھر سے آگے بڑھنا شروع

ہوگیا۔مگر وہ ایک ہی جھٹکے میں عرش سے فرش پر آ گئے۔
یہ صدمہ اور پشیمانی کا بوجھ ان کے دل و دماغ سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔حالانکہ سکینہ نے تو ہر پل یہی سمجھایا کہ وہ سب کچھ خدا کی رضا اور آزمائش سمجھ کر صبر کرلیں۔خود کو مجرم اور قصوروار نہ ٹھہرائیں۔لیکن رشید خان نے دوستی کا بھروسا ہی نہیں توڑا بلکہ بشیر احمد جیسے مضبوط آدمی کو بھی توڑ دیا تھا۔جن کا کمزور وجود اب کسی کو سہارا دینے سے قاصر تھا۔ایسے میں سکینہ نے خود کو مضبوط بنا کر اپنے جہیز کا زیور بیچ کر بسمہ کی رخصتی کا سادگی سے انتظام کیا......اور کچھ امجد نے ماموں ہونے کی حیثیت سے بسمہ کو میکے سے عزت سے رخصت کرنے میں بہن کی مدد کی۔ بڑی بیٹی اور داماد سے تو امید رکھنا فضول تھا۔
یوں بسمہ بیاہ کر سسرال سدھاری تھی اور اس کے بعد امجد کی مدد سے ہی بشیر احمد کو نیا روزگار ملا تھا۔امجد نے اپنی ذمّے داری پر انہیں اپنے دوست کے ٹرانسپورٹ کے چھوٹے موٹے کاروبار سے کرایے کا رکشا دلوادیا۔
کیونکہ اب اس عمر میں وہ کوئی نئی ملازمت نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ لہٰذا جیسے تیسے زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔جس پر شاہینہ نے سسرال میں اپنی سُبکی ہونے کے خیال سے بہت برا منایا تھا۔حالانکہ سسرال والوں سے بنتی بھی نہ تھی مگر باپ کے رکشا ڈرائیور بننے پر سسرال کیا شوہر کے سامنے اسے کتنی خفت اٹھانی پڑے گی اس بات سے وہ پریشان تھی۔تب بسمہ نے ہی اسے اس کی بے حسی کا احساس دلایا کہ اسے صرف اپنی عزت کا خیال ہے، بوڑھے ماں، باپ کی مجبوری، لاچاری سے کوئی سروکار نہیں۔ ایسی بات تھی تو پہلے ہی باپ کا ساتھ دینا تھا۔چھوٹی بہن کی باتوں نے شاہینہ کو شرمسار کرنے کے بجائے الٹا متنفر کردیا۔ اس نے سسرال والوں اور عامر کی تنقید اور طعنوں بھری ملامتوں سے تنگ آ کر میکے آنا ہی چھوڑ دیا۔
حالانکہ طعنے تو بسمہ کو بھی سسرال میں مل رہے تھے کیونکہ جب اس کا رشتہ طے ہوا تھا تو وہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کی رخصتی جس کسمپرسی کے حالات میں ہوئی۔اس کا بھرم جلد ہی اس کے سسرال والوں کے سامنے کھل گیا۔دوسرے اس کی ساس نے شادی کے ڈیڑھ سال بعد بھی بسمہ کی طرف سے کوئی خوش خبری نہ ملنے پر اسے بے اولادی کے طعنے دینے شروع کردیے۔جبکہ شاہینہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔شاہینہ یہاں بھی قسمت کی دھنی نکلی تھی......مگر بسمہ صبر وشکر سے سسرال کے دکھ درد برداشت کررہی تھی۔
وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ماں باپ جو پہلے ہی صدموں سے نڈھال ہیں، وہ بیٹی کے دکھ میں زندگی کے ایک اور کڑے امتحان میں مبتلا ہوجائیں۔لیکن انسان کے چاہنے سے اگر سب کچھ حسبِ منشا ہوجائے تو دنیا میں کوئی نامراد و ناشاد نہ رہے۔بسمہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس کی ساس نے جو بیٹیوں کے زیرِ اثر زیادہ

خدائے ذو الجلال والاکرام کے حضور اظہارِ تشکر

رحمٰن نے رحم سے نواز رکھا ہے
کریم نے کرم سے نواز رکھا ہے
قدوس کی قدوسیاں پاک کرگئیں
وہاب نے بھرم سے نواز رکھا ہے
رزاق نے غیب کے در وا کیے
غفار نے عزم سے نواز رکھا ہے
خبیر جانتا ہے میرے دل کا حال سب
عطاؤں کے قلم سے نواز رکھا ہے
ضآر نے بچایا مجھے ہلاکتوں سے
مجیب نے کرم سے نواز رکھا ہے
حمید نے غلاظتوں سے دور کردیا
مجید نے مرہم سے نواز رکھا ہے
سلام نے سلامتی کی راہ کھول دی
توّاب نے شرم سے نواز رکھا ہے

کاوش: کوثر خالد، جڑانوالہ

تھی۔صرف چند ماہ اور انتظار کیا۔اس کے بعد بسمہ کے ماتھے پر بے اولادی کا ٹھپا لگا کر اس کے میکے روانہ کر دیا تھا۔اور اس بار یہ صدمہ کمزور دل کے ساتھ بشیر احمد نے تو سہار لیا لیکن سکینہ کے ناتواں کاندھوں بلکہ ذہن پر آنے والے بھاری بوجھ نے اسے چند دنوں میں بستر سے لگا دیا اور صحت گرتی چلی گئی۔اور ایک دن جوان بیٹی کے اجڑنے کی بربادی کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے بشیر احمد کا عمر بھر کا ساتھ چھوڑ دیا۔کیا کرتی موت، زندگی سے زیادہ آسان تھی۔

یہ صدمہ بشیر احمد کے ساتھ بسمہ کے لیے بھی بہت بڑا جذباتی دھچکا تھا اور خلافِ توقع جوان بیٹی کی خاطر بشیر احمد نے خود کو مضبوط کر کے جھیل لیا۔اب وہی تو بسمہ کا واحد سہارا رہ گئے تھے، چاہے کمزور ہی سہی......بسمہ کے لیے ان کا دم ہی غنیمت تھا۔بیٹی' داماد اور سالے اور اس کی بیوی نورین نے سکینہ کے انتقال پر ان کا ہر ممکن ساتھ دیا تھا۔پھر کچھ دن بعد واپس اپنے، اپنے گھروں کو رختِ سفر باندھ کر اپنی، اپنی زندگی میں مگن ہو گئے......اب صرف بشیر احمد اور بسمہ ہی پیچھے کھڑے رہ گئے۔جن کی زندگی کا سفر سکینہ کے جانے کے بعد آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ٹھہر گیا تھا۔بسمہ، باپ کی ڈھارس بندھاتی مگر وہ بیٹی کی فکر میں زندگی کی کمزور سی ڈور کو مضبوطی سے پکڑے رہے مگر کام پر جانے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے بسمہ کو قریبی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرنی پڑی۔وہ تو شکر تھا کہ ان کے مالک مکان اچھے لوگ تھے۔آمنہ بی بی بیوہ عورت تھیں۔اور اپنے جوان بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں جو نہایت ملنسار، ہمدرد اور شفیق تھیں۔شاہینہ اور بسمہ نے ان سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی...... لہٰذا وہ ان کی استانی بھی تھیں۔اور ان کے گھر کے سارے حالات سے باخبر بھی۔انہی کے کہنے پر بسمہ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے کا سوچا تھا۔میٹرک کے بعد تو اس کی شادی ہو گئی تھی۔

بشیر احمد کی پہلی والی گورنمنٹ جاب تھی۔اس لیے انہیں کم از کم پنشن تو مل ہی رہی تھی۔سکینہ کی موت کے بعد نوکری جاری نہ رکھ سکے تھے۔بس کسی نہ کسی طرح پنشن لینے بینک چلے جاتے کہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔پنشنرز چاہے اسپتال کے بستر پر بھی پڑا ہو تو بینک والے اس کے آنے کا اصرار کرتے ہیں، وہ الگ بات کہ کہہ سن کر انہیں راضی کر لیا جائے مگر یہاں کون بشیر احمد کا ساتھ دیتا سو خود ہی مرتے کھپتے جاتے تھے۔بیٹی کو نوکری پر جاتا دیکھ کر ان کے دل میں ملال اٹھتا......ایک تو بیچاری کا گھر اجڑ گیا تھا، دوسرے اب باپ کی.......... دیکھ بھال کی ذمے داری بھی وہ پوری کر رہی تھی۔جب وہ زیادہ پریشان ہوتے تو بسمہ ان کا کمزور ہاتھ تھام کر تسلی دیتی۔

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں ابا...... میں ہوں ناں...... اور میرے ہوتے ہوئے آپ کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ اپنے ذہن پر کسی بات کا بوجھ نہ ڈالا کریں۔“ بسمہ کی باتیں چند لمحوں کے لیے انہیں پُرسکون کر دیتی تھیں۔

”جیتی رہو بیٹا......تم تو اس کڑے وقت میں ہمت سے کام لے کر ایک بیٹے کی کمی پوری کر رہی ہو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے آمین......“

بسمہ نے جواباً ان کے جھریوں بھرے ہاتھ کو عقیدت سے چوما تھا۔

”حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے ابا......ہر آزمائش اور امتحان کے بعد انعام بھی ملتا ہے۔اور وہ صرف اور صرف صبر و شکر کرنے والوں کے حصے میں آتا ہے۔آپ بھی پریشان ہونا چھوڑ دیں۔کیونکہ میں اب آپ کا بیٹا ہی ہوں۔“

بسمہ کے جواب پر بشیر احمد کے لبوں پر ہلکی سی پُرسکون مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

”اچھا میں اب چلتی ہوں ابا......اسکول سے دیر ہو رہی ہے، آپ آرام کریں۔“ بسمہ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔پیچھے بشیر احمد بڑی عقیدت و محبت سے جاتی بیٹی کو دیکھتے رہے تھے۔اور سوچ رہے تھے کہ

ہلت گواہ ہے اکثر کڑے وقت میں بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں ہی بوڑھے ماں، باپ کا سہارا بن کر ان کی خدمت کرتی ہیں۔ انہوں نے دل میں بسمہ کی خوشیوں اور اچھے نصیب کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں...... اب یہی دعائیں تو ان کے بس میں تھیں جو وہ...... اپنی بیٹی کو دے سکتے تھے۔

اگلے روز بشیر احمد کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ اس لیے وہ بسمہ کے منع کرنے کے باوجود اپنی ماہانہ پنشن لینے بے شک صبح، صبح ہی روانہ ہوگئے تھے مگر انہیں کیا پتا تھا کہ واپسی کے راستے پر قضا گھات لگائے بیٹھی ملے گی۔

اور اب بشیر احمد کے اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچنے کے بعد بسمہ صحیح معنوں میں بے سہارا و یتیم ہو کر بدلتے رشتوں کی بے حسی و خود غرضی کی دھول میں رُل گئی۔

☆☆☆

ماموں، ممانی اور بہن، بہنوئی کے بدلے ہوئے تیور اور کترائے ہوئے رویّوں کے بارے میں بسمہ رات بھر سوچتی رہی تھی۔ ماں، باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے خونی رشتوں نے کس طرح اس سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ کوئی بھی اس کی ذمّے داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں...... اب صحیح معنوں میں اسے لگ رہا تھا کہ واقعی وہ یتیم و بے سہارا ہونے کے ساتھ، ساتھ لاوارث بھی ہوگئی ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا کہ ماں، باپ کے سائے کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ کتنی مضبوط و محفوظ تھی۔ اب تو چند گھنٹوں میں لوگوں کے بے حس رویّوں نے اسے اتنا کمزور بنا دیا تھا۔ جتنا نا مساعد حالات نے بھی نہ بنایا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے کہاں جائے، کس سے سہارا مانگے...... اپنوں نے تو کڑا وقت پڑنے پر منہ پھیر لیا۔ وہ رات تک بھوکی بیٹھی رہی۔ شاہینہ اور ممانی کو اس کی بھوک، پیاس کا خیال تک نہیں آیا۔ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ مصروف رہی تھیں۔ صرف استانی جی (آمنہ بی بی) ہی تھیں۔ جنہوں نے اسے بار، بار کھانا کھلانے کی کوشش کی لیکن صدمے اور دکھ سے گنگ کیفیت میں اس سے رات کچھ بھی کھایا نہیں گیا۔ البتہ اگلی صبح آمنہ بی بی نے ہی زبردستی اصرار کر کے اسے تھوڑا سا ناشتا کرایا۔ اور اس سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیکن ان کے خلوص و ہمدردی پر اس کا دل ضرور بھر آیا تھا اور وہ کچن میں ان کے پاس بیٹھی بغیر سوچے، سمجھے ہی ان سے تقاضا کر بیٹھی۔

’’استانی جی...... کیا آپ مجھے یہاں اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں؟ میں آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں‘ مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا ہے۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گی۔‘‘ بسمہ نے بہت لجاجت سے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا تو آمنہ بی بی کا دل بھی پسیج گیا۔ مگر وہ مجبور تھیں پرائی اولاد کی ذمّے داری اٹھانا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی کچھ دن بعد ان کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی گھر میں بہو آ جاتی تو پھر جانے وہ غیر جوان جہان لڑکی کو اپنے گھر میں پسند کرتی نہ کرتی...... اس کے علاوہ بھی اور بہت سے خدشات تھے جو انہیں روک رہے تھے۔ وہ زمانہ شناس اور جہاندیدہ عورت تھیں۔ جانتی تھیں کہ مرد کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا...... وہ کسی غیر عورت کو کبھی اپنی سگی ماں، بہن یا بیٹی کی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ اسی خیال نے ان کے دل و دماغ کو زنجیر کر دیا۔ کل کلاں کو کچھ ہوگیا تو یہی نام نہاد رشتے دار انہیں ہی الزام دینے آ جائیں گے۔ اس لیے وہ بسمہ کو نرمی سے سمجھانے لگیں۔

’’بیٹا...... میں اکیلی ہوتی تو کبھی تمہیں اپنے ساتھ رکھنے سے منع نہ کرتی...... لیکن اب یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ میں چاہ کر بھی تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ البتہ بہن، بہنوئی سے زیادہ تمہارا ماموں، ممانی کے ساتھ رہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں شاہینہ سے اس کے بارے میں بات کروں گی۔ وہ تمہارے ماموں کو ضرور راضی کر لے گی۔‘‘ آمنہ بی بی نے اسے بڑے پتے کی بات سمجھا دی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ بسمہ کے مایوس چہرے کو مزید...... دیکھ کر دکھی ہوتیں۔ وہ ناشتے کی ٹرے لے کر اس کے سر پر

نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کچن سے باہر چلی گئیں۔
عمران کو آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے بسمہ کی سنے بغیر کچن سے باہر جا چکی تھیں اور بسمہ سوچنے لگی کہ جانے اب اس کی قسمت کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں جائے گا۔ ماموں، ممانی یا پھر بہن، بہنوئی......
اور جب وہ اپنی سوچوں کے سفر سے واپس لوٹی تو گھر کی بیٹھک سے کسی عورت کے زور، زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید ان ہی آوازوں نے اس کی گہری سوچوں کا ارتکاز توڑا تھا۔ وہ چونک کر کچن سے باہر آ گئی تھی۔
''ارے...... میں کوئی پردیس میں تھوڑی بیٹھی تھی جو تم لوگوں نے میرے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ کوئی غیر نہیں، میرا اکلوتا چھوٹا بھائی تھا۔ مجھ بدنصیب کو مرے ہوئے بھائی کا منہ بھی تم ظالموں نے دیکھنے نہیں دیا۔ بڑا ظلم کیا ہے تم لوگوں نے مجھ پر...... اللہ تم لوگوں کو پوچھے گا۔''
بسمہ صحن سے گزرتی ہوئی بیٹھک کے دروازے تک آ کر باہر ٹھہر گئی تھی۔ اندر بیٹھک میں موجود چہرے کے ناک، نقش جانے پہچانے سے تھے۔ اب ان کی پوری بات سن کر یقین بھی ہو گیا کہ اندر بیٹھی دبنگ سی خاتون اس کے باپ کی بڑی بہن ہیں۔
''ہائے...... میرا اکلوتا ویر......'' زینب بی بی کا دکھ، ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ قصور ان کا اپنا بھی تھا۔ انہوں نے خود ہی دیر کر دی تھی۔ ورنہ زندگی میں تو بشیر احمد نے روٹھی بہن کو منانے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ وہ ہی ضد کی پکی نکلی تھیں۔ پھر اب پچھتاوا کس بات کا تھا۔ شاہینہ اور عامر سب کچھ جانتے تھے۔ اس لیے سامنے بیٹھی عورت کے واویلے سے قطعی بھی متاثر نظر آنے کے بجائے ملامتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
زینب بی بی کا واویلا ختم ہی نہیں ہو رہا تھا یا شاید ان کا پچھتاوا اور پشیمانی ان دونوں کو ڈراما لگ رہا تھا۔ لیکن زینب بی بی واقعی دکھی تھیں۔ اسی لیے سامنے بیٹھی ان دونوں شاہینہ اور عامر کو ملامت کر رہی تھیں۔ جنہوں نے بشیر احمد کے انتقال کی خبر (اطلاع) پھوپی کو نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ بھی کیا کرتے انہیں تو یہی پتا تھا کہ پھوپی زینب اپنے بھائی سے ناراض تھی۔ اور یہ ناراضی برسوں پر محیط ہوتی چلی گئی۔
جب بشیر احمد کنجاہ (گجرات) سے چلے آئے تھے۔ اس کے بعد سارے رابطے، تعلق خود بخود ختم ہوتے چلے گئے۔ نہ بشیر احمد نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کی خبر لی اور نہ بھائی سے روٹھی زینب بی بی نے بھائی کو معاف کیا۔ ایک چھوٹی سی بات بڑھ کر بڑی رنجش کا سبب بن گئی تھی۔ کیونکہ بشیر احمد نے بڑی بہن کی نند سے بیاہ کرنے سے انکار کر کے اپنی پسند سے سکینہ سے شادی کر لی تھی۔ لہٰذا زینب بی بی نے اپنا مان ٹوٹنے پر بھائی سے ہر رشتہ، تعلق توڑ دیا۔ آج برسوں بعد جب ایک دوسرے کے بچے بھی جوان ہو چکے تھے بھائی کی ناگہانی موت کی خبر سن کر زینب بی بی کا سخت دل پسیج کر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ روتی، پیٹتی تیز رفتار بس سروس کے ذریعے کراچی آج صبح ہی پہنچی تھیں۔ جب پتا چلا کہ ان کے بھائی کو تو اس کی آخری آرام گاہ تک بھی پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ اپنا غم و غصہ بھتیجی اور اس کے شوہر پر نکال رہی تھیں۔ جبکہ ان کے ساتھ بیٹھا ان کا بیٹا جاذب سلطان بالکل خاموشی سے ماں اور کزن کے ساتھ بہنوئی کے چہرے تک رہا تھا۔ جیسے اتنی دور سے اس شہر میں یہی کرنے آیا ہو مگر جب زینب بی بی کا واویلا کم نہ ہوا تو شاہینہ کو بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر زبان کھولنی ہی پڑی۔ جس کے بعد زینب بی بی کی بولتی یکلخت ہی بند ہو گئی۔
''بس کریں پھوپی...... یہ اتنا واویلا کس بات کا ہے، جب آپ نے ابا کی زندگی میں ان سے سارے تعلق توڑ لیے تھے پھر اب شکایت کس بات کی...... اگر آپ کو اپنے بھائی سے واقعی محبت ہوتی تو ان کا چھوٹا سا قصور معاف کر کے بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتیں۔ مگر آپ کو تو اپنی ضد اور نام نہاد انا عزیز تھی۔ ہمیں تو آپ نے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ پھر ہم کس رشتے سے آپ کو

کے مرنے کی اطلاع دیتے۔'' شاہینہ نے پھوپی زینب کو بھی لاجواب کر دیا۔ باقی وہاں موجود تمام افراد تو جیسے دم سادھے بیٹھے تھے۔ اور بسمہ بیٹھک کی دہلیز کے پار گم صم سوگوار کھڑی سب کچھ گونگے بہروں کی طرح دیکھ اور سن رہی تھی۔ مگر شاہینہ کے آئینہ دکھانے پر زینب بی بی شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا بھڑک اٹھیں۔

''ارے تو بشیر احمد نے کون سا بڑی بہن کو منانے کے لیے وہاں رکنے کی کوشش کی۔ وہ تو نئی نویلی بیوی کے ساتھ ماں، باپ کو چھوڑ کے شہر میں آ کر بس گیا۔ تمہاری ماں نے اسے ہم سے جدا کر دیا۔ اگر وہ چاہتی تو بہن، بھائی میں صلح کروا سکتی تھی لیکن وہ تو خوش ہوئی کہ سسرالی بلا سے جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔''

زینب بی بی غصے میں کچھ سوچے سمجھے بغیر بولیں تو شاہینہ کو ماں کے ذکر پر مزید تاؤ آیا تھا۔ پھوپی اب اس کی مری ہوئی ماں کو الزام دے رہی تھیں۔ اس لیے اس سے برداشت نہیں ہوا تو پھوپی کو دوٹوک لہجے میں مزید بولنے سے روک دیا۔

''خبردار پھوپی...... آپ میری مری ہوئی ماں پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتیں۔ نہ ہی میں مزید اپنے ماں، باپ کے خلاف کوئی بات سنوں گی۔ آپ ابا کی تعزیت کے لیے آئی تھیں کر لی ہے تو یہاں سے رخصت لیں۔ ہمیں بھی اپنے گھر جانا ہے۔ ابا کے بعد ویسے بھی اب ہمارا آپ سے کوئی تعلق، رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔''

شاہینہ کی کھری، کھری باتوں نے زینب بی بی کو لاجواب کر دیا تھا۔

ان کے بیٹے جاذب کو غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ میت والے گھر کا لحاظ کر کے ضبط کر رہا تھا۔ شاہینہ کی باتیں تلخ ضرور تھیں پر سچی تھیں۔ زینب بی بی کی ضد نے آج پچھتاوے اور پشیمانی کے دکھ ان کی جھولی میں ڈالے تھے۔

''چلو عامر...... ہمیں چلنے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ بسمہ، تم بھی اپنی تیاری کر لو، تمہیں ماموں کے گھر والے اپنے گھر جائیں گے۔ اب بھلا تم یہاں اکیلی رہ کر کیا کرو گی...... اور ہمیں اجازت دیں۔ اگر آپ لوگوں کو یہاں مزید بیٹھنا ہے تو شوق سے بیٹھیں۔'' شاہینہ نے بیٹھک کی دہلیز کے پار کھڑی بسمہ کو مخاطب کر کے کہا اور آخری جملہ زینب بی بی کی طرف دیکھ کر مکمل کیا تھا اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کی یہ حرکت زینب بی بی کے ساتھ جاذب کو بھی تاؤ دلا گئی۔ مگر شاہینہ کی اس درجہ بدلحاظی پر زینب بی بی ... جو برہم ہوئیں وہ الگ...... لیکن جاذب کو اب مزید وہاں بیٹھنا اپنی اور اپنی ماں کی توہین لگا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سچ تو یہی تھا کہ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ٹھنڈے مزاج کے مالک جاذب سلطان سے اپنی اور اپنی ماں کی اس درجہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی۔

''ہمیں بھی اب یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جس کے حوالے سے یہاں آئے تھے وہ اب دنیا سے منہ موڑ چکا ہے۔ اور رہی بات تمہاری...... تو لگتا ہے کہ تمہارا خون سفید ہو چکا ہے۔ اسی لیے اپنی ماں کی عمر کی پھوپی کے ساتھ اس طرح دوبدو گستاخی کرتی چلی جا رہی ہو۔ یہ میت کا گھر نہ ہوتا تو میں تمہیں ضرور جواب دیتا...... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کے آپس کے معاملات تھے جس میں ہم بچوں کا بولنا مناسب نہیں...... مگر تمہارا اتنا بولنا ہم نے بہت برداشت کر لیا اب اور نہیں...... چلو اٹھو اماں...... ہم بھی یہاں ڈیرے ڈالنے نہیں آئے ہیں۔''

بسمہ نے اتنی دیر سے ضبط سے بیٹھے جاذب سلطان کے سرخ وسفید چہرے پر برہمی کے آثار دیکھے تو احساس ہوا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ بہن کو ٹوکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ جبکہ جاذب سلطان نے شاہینہ کو ملامت کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ماں کو حتمی انداز میں دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بس ابھی رختِ سفر باندھ لو۔ اور زینب بی بی بھی شاہینہ کو ناگواری سے گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں مگر فیصلہ کر کے...... بسمہ کو ماموں کے حوالے کرنے پر انہیں اعتراض تھا۔ لہٰذا انہوں نے وہیں اپنا قطعی اور حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے غیروں کے گھر بیٹھ کر بھائی کی اولاد سے اپنی بے عزتی کرانے کا...... تمہیں تو بڑے، چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں...... مگر بسمہ کو میں کسی کے ساتھ جانے نہیں دوں گی...... یہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

اور ان کا فیصلہ سن کر بسمہ ہی نہیں جاذب نے بھی ماں کے آناً فاناً فیصلے کو چونک کر سنا تھا۔ جبکہ شاہینہ اور عامر کے چہرے جذبات و تاثرات سے عاری بالکل سپاٹ نظر آرہے تھے۔

"جب تمہاری ماں سے ہم نے کوئی رشتہ نہیں رکھا تو پھر اس کے بھائی کے گھر اپنی بھتیجی کیوں چھوڑ دوں گی۔ چل بسمہ دھی......! تو اپنا سامان باندھ لے...... اب تو ہمارے ساتھ رہے گی۔" انہوں نے بسمہ کی طرف دیکھ کر کہا جو گم صم کھڑی تھی۔ جیسے مٹی کا بت ہو...... جبکہ جاذب ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ بھلا وہ بسمہ کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتی ہیں؟ لیکن ماں کے غصے کے ڈر سے خاموش رہا...... البتہ عامر اور شاہینہ کے چہروں پر اب کچھ دیر بعد سکون در آیا تھا۔ جیسے کوئی ناپسندیدہ بوجھ شانوں سے خود بخود اتر گیا ہو۔ انہیں پتا تھا۔ ماموں اور ممانی پہلے ہی بسمہ کی ذمے داری لینے سے اپنی جان چھڑا کے جا چکے تھے۔ اب اگر وہ پھوپی کے فیصلے پر اعتراض اٹھاتی تو بسمہ کو اپنے ساتھ گھر لے جانا پڑتا...... لہٰذا "جان بچی سو لاکھوں پائے" کے مصداق اس نے جلدی سے ہامی بھر لی۔ کہیں بسمہ خود پھوپی کے ساتھ اتنی دور دوسرے شہر جانے سے انکار نہ کر دے۔

"ٹھیک ہے پھوپی...... اس معاملے میں ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ کیونکہ ماموں کے بعد اب آپ ہی خاندان کی بڑی بزرگ ہیں۔ آپ کا فیصلہ ہمیں منظور ہے۔" شاہینہ نے جھٹ سے لہجے اور رویّے کے اتار چڑھاؤ کو نرمی و حلاوت میں ڈھال کر پھوپی سے کہا تو وہ اور جاذب بھی اس کے خلافِ توقع جواب پر چند لمحوں کے لیے چپ رہ گئے تھے جبکہ بسمہ کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو اس امید پر بڑی بہن کو دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ چھوٹی بہن کو خود سے اتنی دور جانے نہیں دے گی۔ اعتراض کرے گی...... لیکن شاہینہ کے اقرار نے بسمہ کی خوش فہمی کا بھرم بڑی بے دردی سے توڑا تھا۔ وہ بس خاموشی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور تب جاذب نے پہلی بار غور سے بیٹھک کی دہلیز کے پار کھڑی مایوس و دکھی لڑکی کی آنکھوں میں تیرتے عجیب سے تاثر کو دیکھا تھا۔ اسے بس لمحے بھر کے لیے اس لڑکی پر ترس آیا تھا۔ پھر اس کے جاتے ہی وہ ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور زینب بی بی پہلی بار پُرسکون نظر آئیں۔ وہ بھی شاہینہ کی بات سننے کے بعد...... یہ واقعی حیرانی کی بات تھی۔ جبکہ آمنہ بی بی خونی رشتوں کی اس ناقدری پر بس دل ہی دل میں تاسف ہی کر سکی تھیں، کر کیا سکتی تھیں۔ وہ کچھ کہنے کا حق بھی کہاں رکھتی تھیں۔ البتہ دل میں بسمہ کی بھلائی اور بہتری کے لیے دعا ضرور کی کہ زینب بی بی کا فیصلہ بسمہ کی بھلائی کے لیے ہو۔

اور زینب بی بی کے دل کا حال تو خدا ہی جانتا تھا یا پھر وہ خود...... جنہوں نے بسمہ کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا...... بھلا کیوں......؟ اس سوال کا جواب شاید آگے جا کر وقت نے دینا تھا۔ اس لیے آمنہ بی بی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ تاکہ بسمہ کو دلاسے، تسلی کے ساتھ سمجھا سکیں جبکہ شاہینہ اور عامر تھوڑی دیر پہلے پھوپی زینب کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھ کر ملامت کر رہے تھے۔ اب شیر و شکر لہجے میں ان کی خوشامدیں کر رہے تھے۔

شاہینہ نے تو ان سے اپنے رویّے کی معذرت کر لی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ اپنا فیصلہ اس کے نامناسب رویّے کی وجہ سے بدل ہی نہ لیں...... لیکن زینب بی بی بھی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ لوگوں کے لہجوں، رویّوں سے انسان کی پہچان کرنا جانتی تھیں...... اس لیے انہوں نے شاہینہ کو زیادہ منہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس

اب کو انہوں نے فوراً بسمہ کا ٹکٹ کرانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اپنے تو واپسی کے ٹکٹ کرا کر آئی تھیں کہ قل کے بعد یہ لوگ نکل جائیں گے۔ رسم قل کے بعد آمنہ بی بی سے مل کر اس گھر اور شہر سے رخصت ہوتے ہوئے بسمہ بالکل کسی بت کے مانند زینب بی بی کے ہمراہ چل رہی تھی۔ بہن نے بھی اپنی مجبوری کے قصے سنا کر بسمہ کے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کر کے رخصت کیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ بسمہ کا خونی رشتوں پر سے اعتماد، بھرم اور مان سب کچھ ٹوٹ چکا ہے۔

☆☆☆

وہ تینوں اب اپنی منزل کی جانب محوِ سفر تھے...... زینب بی بی تو مغرب کا اندھیرا پھیلتے ہی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند چکی تھیں۔ بسمہ اور جاذب اپنی اپنی جگہ خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دونوں میں سے کون جانتا تھا کہ زینب بی بی کی بند آنکھوں اور دل کے اندر پچھتاوے اور دکھ کے کالے بادل برس رہے تھے۔ وہ جیتے جی بھائی کا چہرہ نہ دیکھنے کا قصد کر کے مرنے کے بعد بھی بھائی کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھیں۔ ان کی ضد عمر بھر کا پچھتاوا بن گئی۔ وقت اور قسمت دونوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا یا پھر قدرت نے ہی انہیں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا دی تھی کہ وہ مردہ بھائی کا چہرہ بھی قبر میں اترنے سے پہلے آخری بار نہیں دیکھ سکیں۔

یہ عمر بھر کا پچھتاوا اور ملال تھا جو شاید اب ان کے ساتھ قبر تک جانا تھا...... کسی اور کے سامنے نہ سہی مگر اپنے دل میں وہ یہ تسلیم کر چکی تھیں کہ غلطی ان کی اپنی تھی۔ بلاوجہ کی ضد اور ناراضی باندھ کر سگے بھائی اور اپنے خون کو خود سے جدا کر دیا۔ ورنہ بشیر احمد نے تو بہن کو منانے کے لیے معافیاں تک مانگ لی تھیں۔ حالانکہ مرضی اور پسند سے شادی کرنا اتنا بڑا قصور نہیں تھا...... لیکن اس وقت غصے نے زینب بی بی کی عقل سلب کر لی تھی...... وہ سنگدل بن گئی تھیں۔ اور اب وہ دل ہی دل میں اپنا محاسبہ کر رہی تھیں کہ کیا تھا جو وہ بشیر احمد کی پسند پر راضی خوشی سکینہ کو بھاوج کے روپ میں قبول کر لیتیں۔ یہی سوچ کر کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بشیر احمد اور سکینہ کا بھی بن چکا تھا۔ یہ خدائی اختیار ہے پھر انہوں نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیوں کرنا چاہی تھی۔

تاریک رات کے ساتھ سفر کرتی لگژری بس بڑی تیزی سے منزل کی جانب اپنا سفر طے کر رہی تھی...... سب مسافر بھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اب خود پر چادریں ڈالے پاؤں پسارے لیٹ چکے تھے۔ سوائے جاذب اور بسمہ کے۔ دونوں ہی .... بے چین و فکر مند...... جاذب پیچھے گھر والوں کے لیے تو بسمہ آگے آنے والی زندگی کا سوچ کر...... جاذب نے کئی بار اسے دیکھا تھا۔ جو چپ کی بکل اوڑھے ونڈو والی سیٹ پر بیٹھی شیشے کے پار اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے مناظر میں گم تھی۔ جانے کیوں...... جاذب کو اس کے دکھ ہی نہیں حالات پر بھی اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ شاہینہ سے تو وہ خاصا بدگمان ہو چکا تھا۔ بسمہ پھوپی کی ہمدردی پا کر ان کے ساتھ لگی بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ وہ اس سے بشیر احمد کے بچپن ولڑکپن کی باتیں اور قصے یاد کر کے خود بھی آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ جاذب تب بھی خاموش رہا تھا۔ اس طرح تو اس نے شاہینہ کو بھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ جانے کیا بات تھی، رشتوں سے انجان ہو کر بھی اسے بسمہ کے لیے افسوس ہو رہا تھا۔

اسے دیکھ کر صبح سے اب تک وہ یہی اندازہ لگا پایا تھا کہ واقعی ایک ماں، باپ کی اولادیں مختلف مزاج اور عادات کی مالک ہو سکتی ہیں۔ ایک شاہینہ تھی، جس نے میت والے گھر میں ماں جیسی پھوپی کی عزت کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ دوسری بسمہ تھی جو سارا وقت چپ اور صبر کی بکل میں دبی بیٹھی رہی۔ اور اب بنا کسی اعتراض اور تردد کے ان کے ساتھ اپنے گھر اور اپنوں سے اتنی دور جا رہی تھی۔ یا تو وہ مجبور تھی یا پھر خونی رشتے کے حوالے سے اس نے باپ کی سگی بہن پر بھروسا کر لیا

تھا۔ حالانکہ اتنے برس کی لاتعلقی کے بعد وہ اس کے لیے اجنبی ہی تو تھے۔ اگرچہ جاذب اس کی سوچیں تو نہیں پڑھ سکا تھا۔ مگر اسے اس لڑکی کے دکھ اور نقصان کا پورا احساس تھا۔

''وہاں اندھیرے میں کیا دیکھ رہی ہو۔'' اسے مسلسل کھڑکی کی سمت دیکھتے پا کر وہ بالآخر وہ بول پڑا تھا اور جاذب کی آواز پر بسمہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دو والی سیٹ پر بسمہ اور پھوپی بیٹھی تھیں۔ بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں کی لمبی جھالریں جاذب کی آواز پر وا ہوئی تھیں۔ اسے جاذب کے پکارنے پر حیرانی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ بس جاذب کی طرف ایک نظر دیکھ کر خاموش نگاہیں جھکا چکی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ جاذب کو کیا جواب دے۔ اور جاذب اس کی دلی کیفیت کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی ماں، باپ سے جدائی صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان دیگر رشتوں سے بھی بے سہارا ہوجائے بسمہ کی طرح تو یہ صدمہ کٹھن آزمائش بن جاتا ہے۔ بسمہ بھی اسی اذیت سے گزر رہی تھی اور جاذب نے اس کے دکھ کو پورے دل سے محسوس کرتے ہوئے تسلی وحوصلے کے چند بول سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔

''کیا ہوا...... نیند نہیں آرہی ہے کیا؟'' اس نے دھیمے لہجے میں مزید سوال کیا تو اس بار بسمہ کو اثبات میں جواب سر ہلا کر دینا پڑا۔

''آئے گی بھی کیسے...... اماں کہتی ہیں کہ خالی پیٹ نیند نہیں آتی ہے اور تم نے تو دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ کھالو تو نیند ضرور آجائے گی۔'' اسے اندازہ تھا کہ وہ شاید کل سے ہی بھوکی ہوگی اور اس کی بات سن کر بسمہ کی بڑی، بڑی سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ بھلا اسے کیسے پتا کہ بسمہ نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ البتہ جاذب نے کھانے کی چیزوں والی باسکٹ میں سے بسمہ کے حصے کے کباب پراٹھے والا باکس نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔

''اب یہ مت کہنا کہ تمہیں بھوک نہیں ہے۔ ورنہ صبح تک یوں ہی کھڑکی کے پار آسمان کے تارے گنتی رہوگی۔'' جاذب کے لہجے میں اپنائیت ہی نہیں شگفتگی بھی تھی۔ اور بسمہ سے اس بار انکار نہیں کیا گیا...... اور بھوک بھی لگ رہی تھی، کیا کرتی، زندہ انسان کے لیے زندہ رہنے کے لیے پیٹ کی آگ بجھانا ضروری ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ مرنے والوں کے دکھ میں ساری عمر جلتا رہے۔ لیکن جب تک زندگی کی سانسیں چل رہی ہیں، انسان کو جینا پڑتا ہے۔ اس لیے بسمہ نے ٹفن باکس جاذب کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پھر منرل واٹر کی چھوٹی بوتل نکال کر جاذب نے اسے پکڑائی تھی۔ جسے اس نے لے کر سیاہ لمبی ریشمی جھالروں (پلکوں) کو جھکالیا۔ اور کھانے لگی۔ مگر جاذب کی نگاہیں ان ریشمی جھالروں میں کہیں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ وہ چند لمحوں تک اس کے سوگوار چہرے کو دیکھتا رہا پھر کچھ دیر بعد اپنی سیٹ سے اٹھ کر پچھلی خالی سیٹوں کی جانب چلا گیا۔ جاذب نے ایک نظر اسے پلٹ کر دیکھا...... پھر اسے ریلیکس ہوکر کھاتا دیکھ کر اطمینان بھری سانس بھرتے آگے بڑھ گیا۔ نیند تو اسے بھی نہیں آرہی تھی۔ اسی لیے پچھلی خالی سیٹوں میں سے ایک پر جا بیٹھا...... اسے سگریٹ پینے کی عادت تھی مگر بند شیشوں والی لگژری بس میں اس کی ممانعت تھی وہ کسی قریبی اسٹاپ اوور کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

شاید یہ واحد بری عادت تھی جو جاذب سلطان نے جانے کب اور کہاں سے لگالی تھی۔ وہ کبھی کبھار اسموکنگ کرتا تھا وہ بھی گھر والوں سے چھپ کر۔ اور یہ عادت بھی اسے پچھلے کچھ سالوں سے ہی پڑی تھی۔ باہر زوروں کی سردی تھی تو اندر کے گرم ماحول میں جاذب نے گرم چادر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے سیٹ کی بیک سے ٹیک لگالی۔

بس اپنی منزل کی طرف آگے بڑھی رہی تھی اور جاذب کی سوچوں نے کچھ سال پیچھے کا سفر شروع کردیا تھا۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیں

محبت مانگ میں تارا

شمائلہ دلعباد



افروز کو حیرت ہوئی شہزادی پچھلے آدھے گھنٹے سے رسالے میں سر دیے بیٹھی تھی اس سے پہلے کہ وہ اس سے پوچھتی ''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' شہزادی نے رسالہ اٹھا کر اس کے بیڈ پر پٹخ دیا۔

''ہر ہیروئن چندے آفتاب و چندے ماہتاب، پتا نہیں یہ رائٹرز مس ورلڈ سے نیچے اتر کر ہم جیسی عام سی لڑکیوں کو ہیروئن کب دکھائیں گی جو بھی اسٹوری کھولی آنکھوں سے لے کر پیروں تک ہیروئن کو حسن میں

ڈوبے پایا ہونہہ.....‘‘

’’یار دل پر کیوں لیتی ہو، رائٹرز فکشن لکھتی ہیں ویسے بھی تم پتا نہیں اس کامپلیکس سے کب نکلوگی ہزار بار تمہیں بتایا ہے، تم اچھی ہو، اچھی لگتی ہو اور ہنستی ہوئی تو بہت ہی اچھی لگتی ہو۔‘‘

’’بس، بس بکواس بند کرو...... پہلے ہی رسالے کھنگال کر میرا موڈ آف ہے اور اوپر سے تم جھوٹ بولے جا رہی ہو۔‘‘ شہزادی واقعی بیزار ہو رہی تھی۔ وہ اسی لیے رسالے نہیں پڑھتی تھی۔

ساڑھے چار فٹ قد کے ساتھ خاصی دبتی ہوئی رنگت متضاد نام شہزادی...... حقیقت میں شہزادی کو مذاق اڑاتا ہوا لگتا تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا ماں اور نانی سے یہی سنا تھا۔ ’’ہائے، ہائے یہ کالی کلوٹی باپ پر کیوں چلی گئی، کیسے بیاہیں گے اسے؟‘‘ پھر ان کے بعد چچا بیگم ایسی بیاہ لائے جو اندھیرے میں بیٹھیں تو گویا روشنی کر دیں، ایسے میں اماں اسے اور خود سے دور کر دیتیں، واحد ابا کا سہارا تھا انہوں نے نام بھی شہزادی رکھا تھا اسے پال پوس بھی شہزادی جیسا رہے تھے پر وہ اپنی عمر بڑی تھوڑی لائے تھے محض سات برس کی شہزادی باپ کے سائے سے محروم ہوگئی۔ پھر نانی اور ماموؤں نے اماں کی دوسری شادی کر دی، سوتیلے رشتے ایسے تنگ دل نکلے کہ اسے پناہ چچا کے ہاں ہی ملی تھی، شائستہ چچی کی زبان نہایت غیر شائستہ تھی اوپر سے تنگ دلی بھی پائی جاتی تھی لیکن پھر بھی وہ شہزادی کو اپنی ممانیوں سے اچھی ہی لگتی تھیں شوق تو شہزادی کو ڈاکٹر بننے کا تھا مگر باپ کے ساتھ جیسے باقی شوق اور کھیل ادھورے رہ گئے تھے وہاں یہ بھی رہ گیا اور شہزادی بیگم بن گئیں نرس، آسمانی صحیفوں جیسا مقدس مسیحائی کا یہ پیشہ اسے بڑا عزیز تھا دل و جان کی طرح، دل و جاں تھوڑا غلط ہو گیا کیونکہ دل اس کے پاس تھا ہی نہیں پچھلے کئی سالوں سے۔

☆☆☆

آج کل افروز اور شہزادی کی نائٹ ڈیوٹی تھی افروز نیند پوری کرنے کے بعد حسب معمول رسالے میں سر گھسیڑے ہوئے تھی جبکہ شہزادی میڈیم سائز کا پزا ہڑپ کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ افروز کی نظر اب اس پر پڑی تھی تو وہ بیڈ سے چھلانگ لگا کر اتری تھی۔

’’بھوکی، ندیدی، پیٹو...... میں نے کیا وارڈ میں جا کر گلوکوز لگوانا ہے جو خود سارا ہڑپ کر رہی ہو۔‘‘

آج کینٹین میں ماش کی دال کے نام پر عجیب ملغوبہ تھا جسے چھوڑ کر وہ باہر سے پزا منگوا کر عیاشی کر رہی تھیں۔

’’روزی آج وہ بہت یاد آ رہے ہیں، دل بہت دکھا ہوا ہے۔‘‘ وہ پزا کا بڑا سا بائٹ لے کر بولی تو افروز نے بے اختیار دانت کچکچائے۔

’’بدتمیز تجھے یاد آنے پر اتنی بھوک لگ رہی ہے، اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو قریب، قریب سارا پزا اور ہاف لیٹر ڈرنک ڈکار گئی ہو، نہ یاد آنے پر پتا نہیں کیا کرو گی۔‘‘

’’تجھے بھی ہضم کر جاؤں گی وہ بھی ہڈیوں سمیت اور بی بی روزی اس سے پہلے کہ اسپتال کا گیٹ بند ہو یا سسٹر ریٹا سے درگت بنے جلدی سے یونیفارم پہنو، آٹھ بجنے میں صرف سات منٹ ہیں۔‘‘ پھر جو انہوں نے ریس لگائی تو وارڈ نمبر تین کے کاؤنٹر پر ہی جا کر رکیں۔ سسٹر ریٹا نے عینک کے اوپر سے ان کی پھولی سانسوں کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے بی پی لیتی جا رہی تھی، ساتھ ساتھ معمول کے سوالات تھے۔ اس کے نرم رویے پر مریض اور لواحقین اسے بہت دعائیں دیتے تھے ابھی وہ تین دن پہلے ایڈمٹ ہونے والی اماں جی کی ٹانگ کی پٹی بدل رہی تھی، شوگر کی وجہ سے ان کی ٹانگ کا زخم بہت خراب ہونے پر ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔

’’اب کیسا حال ہے اماں جی؟‘‘

’’پتر بہوں درد ہے برداشت ای کے نئیں تھیندا۔‘‘ (بیٹا بہت درد ہے برداشت نہیں ہو رہا) اماں جی نرم سے سرائیکی لہجے میں بولیں۔

’’گھبراؤ نہیں اماں جی میں درد کا انجیکشن دے

دیتی ہوں۔آپ کو نیند بھی آجائے گی۔''
''آپ ڈاکٹر عثمان سے پھر سے بات کریں، ہوسکے تو باہر کی میڈیسن بھی لکھوالیں اماں جی کے لیے۔'' وہ ان کے بیٹے کو ہدایت دے رہی تھی۔
''ہمیں بھی کوئی ایسا ٹیکا لگادیں ساری عمر کو قرار آجائے۔'' بیڈ نمبر انیس کے منچلے نے دانت نکوسے تو بیس والا بھی بول پڑا۔
''اجی ہماری ایسی قسمت کہاں...... ان کا التفات تو بابے بڈھوں کے لیے ہی ہے۔''
شہزادی نے بے اختیار گھور کر دیکھا اور ٹرالی دھکیلتی ہوئی بیڈ نمبر اکیس پر پہنچ گئی۔
''بشیر بھائی، بیڈ نمبر انیس، بیس کو کسی پین کلر کی ضرورت نہیں ہے، وہ بالکل فٹ ہیں، اگلے چار گھنٹے تک نو پین کلر نو انجکشن' اوکے......'' وارڈ بوائے وارڈ میں داخل ہوا تو اس نے تنبیہاً کہا وہ ان دونوں مریضوں کی منچلی طبیعت سے عاجز تھی۔
''ٹھیک ہے جی، ویسے بھی باجی مجھے یہ دونوں ضرورت سے زیادہ ٹھیک لگ رہے ہیں، صبح ڈسچارج کروا دیتے ہیں۔'' بشیر غور سے انہیں دیکھ رہا تھا وہ سات سال سے ایک دوسرے کے ساتھ بہاول وکٹوریہ میں کام کر رہے تھے، ایک دوسرے کے رمز شناس تھے سو اب بھی وہ سمجھ گیا تھا اور باقی مریضوں کی ڈریپس بدلنے میں ہیلپ کررہا تھا۔ جبھی بیڈ انیس والا بول پڑا۔
''پلیز سسٹر لگادیں درد والا ٹیکا، مجھے درد ہو رہا ہے۔''
''تیرے درد سے دل آباد رہا کچھ بھول گئے کچھ یاد رہا، یاد رہا؟'' وارڈ بوائے بشیر زور سے گنگنایا تھا۔
دوسری طرف سے افروز نے سراہ کر حوصلہ افزائی کی تو صفائی کرتا مائیکل بھی بول پڑا تھا۔
''بشیر بھائی میں تو آپ کا فین ہوں۔'' جبکہ دونوں مریض شرمندہ ہوکر معافی طلب کررہے تھے۔
''بشیر بھائی ان کو بھی دے دیں انجکشن۔'' وہ ٹھہری سدا کی نرم دل......اسے یاد تھا جب اس نے نرسنگ میں ایڈمیشن لینے کی بات کی تھی تو اس کی ماں

اور سوتیلے باپ دونوں نے انکار کردیا تھا۔ چچا بھی ہرگز اس کے نرس بننے پر راضی نہیں تھے۔
''چچا جان وہاں سے ٹریننگ کے ساتھ، ساتھ سیلری بھی ملے گی۔'' اس نے ترپ کا پتا پھینک دیا تھا۔
''لیکن بیٹا نرسوں کے ساتھ بہت بدتمیزی ہوتی ہے اب تم ہی بتاؤ۔''
''لو بھلا بدتمیزی اور وہ بھی اپنی شہزادی سے۔''
چچی نے سر سے پیر تک اسے حقارت سے دیکھ ڈالا تھا۔
''بیہ کے ابا آپ بھی کمال کرتے ہیں، اس بیچاری جبشن سے کسی نے کیا لینا، الٹا اسے تنخواہ ہی ملے گی چلو خود کا داج (جہیز) ہی لمبا چوڑا بنالے گی۔ کیا پتا کوئی نوکری و سامان کے لالچ میں پھنس جائے۔ ہمارے پاس وڈے داج کے پیسے کہاں۔'' چچی بیگم نے ایک ہی سانس میں مکمل تجزیہ دیا تو چچا پر ہی نہ مار سکے۔

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے جب وہ کافی کی طلب میں سسٹر ریٹا کے پاس چلی آئی تھی۔ سسٹر ریٹا کے لیے اسٹرانگ اور اپنے لیے سپر اسٹرانگ کپ تھامے وہ کاؤنٹر کے بیک پر رکھے صوفے میں دھنس گئی۔
''تم نے پھر تیز کافی بنائی ہے ناں...... اتنی کڑوی خوشبو......؟''
''ارے نہیں ریٹا سسٹر سیم آپ کے والی ہے۔''
اس نے شرارت سے کپ کو چیئرز کے انداز میں لہرایا۔
''رنگ کالا ہوجائے گا۔''
''کالے کا کیا کالا ہونا ہے۔'' وہ مسکرائی۔
''بہت بری بات بچے، ناشکری نہیں کرتے خداوند ناراض ہوتا ہے، سب اسٹاف سے لے کر ڈاکٹرز تک اتنی سی عمر میں تمہاری اتنی عزت کرتے ہیں تم ہو کہ اب بھی رنگوں میں الجھی ہو۔ انسان کو بلند تو کردار کیا کرتا ہے رنگ تو فقط خوشنما دکھایا کرتے ہیں......''
'' اور اگر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوجائیں تو......؟'' وہ سوالیہ ہوئی۔ پتلیوں پر ڈاکٹر متین کا عکس محبت بن کر پھیلا تھا۔ دل نے خون کی جگہ محبت کو پیروں

کے ناخن تک سپلائی کیا تھا، انٹر کام کی گھنٹی نے اسے حصارِ محبت سے وارڈ کے کاؤنٹر تک پہنچایا تو وہ پھر سے بول اٹھی۔

''سسٹر آپ نے جواب نہیں دیا۔''

''جو تیرے پاس ہے اس پر شکر کر۔'' وہ ناصح ہوئیں۔

''آپ نہ ملتیں تو شاید یہ بھی نہ ہوتا۔''

اسے ان کے پہلے دن کے الفاظ ہمیشہ یاد رہتے تھے۔ سارا ہال فرسٹ ائیر کی لڑکیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، گلابی آنچل کسی کے گلے میں، کسی کے کندھے پر تو کوئی مضبوطی سے شہزادی کی طرح سر پر جمائے ہوئے تھی۔

''دیکھو لڑکیوں...... باس، سیکرٹری اور ڈاکٹر، نرس کا رشتہ جتنا پرانا ہے، تاریخ بتاتی ہے اتنا بدنام بھی ہے جبکہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ رشتے سب مقدس ہوتے ہیں انسان اپنی کم علمی اور... بے شعوری سے ان کو بدنام بناتا ہے۔ تم جب تک اپنی حدود و قیود اور اپنے دائروں میں رہوگی محفوظ رہوگی جب بھی ان سے نکلوگی خود کو گم کردوگی میری بچیوں...... اپنا راستہ سیدھا رکھنا چاہے لاکھ پکارنے والے ملیں، وہ محض فریب دیں گے اور تم خود کسی کو فریب نہ دینا یہی میری نصیحت ہے اس پر عمل کروگی تو ایک دن جب میری طرح تیس سالہ سروس کے ساتھ یہاں کھڑے ہو کر اپنے ضمیر اور باقی لوگوں کے سامنے بھی سر اٹھا کر نصیحت کر پاؤگی تو اپنی ذات کا غرور اپنے ساتھ پاؤگی۔ پھر یہاں بھی اور وہاں بھی معزز ہی رہوگی۔''

ان کا اشارہ آسمان کی طرف تھا۔ اور کسی کا تو پتا نہیں لیکن شہزادی نے ان کی باتیں گرہ سے کس کر باندھ لیں، وہ جیسی تھی ویسی ہی رہی بس سسٹر ریٹا سے ہر گزرتے دن کے ساتھ تعلقات مضبوط ہوتے گئے، احمد پور جیسے چھوٹے سے شہر سے تو بہاول پور کہیں بڑا تھا۔ ہزار بار وہ وارڈز بھولتی، او، ٹی میں جانا ہوتو وہ ہال میں جانکلتی، ڈاکٹر عثمان کے وارڈ میں جانا ہوتا تو سامنے ڈاکٹر ذکیہ کا وارڈ آجاتا ہے۔ وہ اس نئی دنیا میں گھبرائی، گھبرائی رہی۔ سرنج اٹھاتی تو انجیکشن توڑتا نہ آتا اور انجیکشن ٹوٹ جاتا تو وہ ڈرپ لگانا بھول جاتی لیکن وہ شہزادی تھی حوصلوں کی، اس نے دل مضبوط کیے رکھا اور بالآخر چار سال بعد بہترین نمبروں سے نرسنگ کر کے (بہاول پور وکٹوریہ اسپتال) بی، وی، ایچ ہی میں سرکاری نوکری سے سرفراز ہوگئی۔ اس سفر میں جہاں افروز اور سسٹر ریٹا ساتھ تھیں وہیں ڈاکٹر متین بھی قلبی طور پر اس کے ہم سفر رہے۔ وہ جو کسی کے ہم سفر بننے کے قائل نہ رہے تھے وہ چپکے سے انہیں اپنا بنا بیٹھی، پتا نہیں کیسے اور پتا نہیں کیوں وہ جب بھی سوچتی بس لفظ ''کیوں؟'' تک ہی رہتی۔

☆☆☆

تین ماہ ہوگئے تھے نرسنگ ہاسٹل میں رہتے اور ٹریننگ لیتے، اب دوائیوں کی ناگوار بُو سے ابکائی آتی تھی نہ ہی خون دیکھ کر ہاتھ پیر کانپتے تھے، انجیکشن پر بھی اس کا ہلکا ہی ہاتھ تھا۔ لیکن سینئرز اب بھی اسے ڈراتی تھیں۔

''ڈاکٹر متین مصطفیٰ کا وارڈ، وہ بھی نائٹ ڈیوٹی کے ساتھ، تو یہ ڈاکٹر متین کی وارڈ ڈیوٹی...... خیر مناؤ کھڑوس ہے پورا کلف زدہ سڑیل، اُلو کہیں کا۔''

شہزادی کی پسلیوں میں دل مزید سکڑا تھا اسے تو ابھی تک ڈاکٹر بشریٰ اور ڈاکٹر افتخار کی ڈانٹ نہ بھولی تھی اب پھر سے...... بس ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''آپی کیا بہت ٹھرکی ہے؟ مطلب نائٹ ڈیوٹی......'' افروز تھوک نگلتے ہوئے بات کو دوسرے زاویے سے لے رہی تھی۔

''ٹھرکی......؟'' دونوں سینئرز نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور خراماں، خراماں چل دیں۔ ان کے قہقہوں کی آواز کے پیچھے یہ دونوں بھی چل پڑیں ان کی دوڑ بس سسٹر ریٹا تک ہی تھی باقی بھلے ان سب سے ڈرتی تھیں مگر شہزادی اور افروز، سسٹر ریٹا، سے گائڈنس لیا کرتی تھیں۔

''ڈاکٹر متین بہت قابل اور باکردار ہیں بس اصول ذرا پکے رکھے ہوئے ہیں ڈیوٹی میں کوتاہی نہ کام میں کبھی، کبھی تو نائٹ ڈیوٹی پر ساری، ساری رات وارڈ میں ہی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی وہ وقفے، وقفے

سے راؤنڈ لیتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ڈیوٹی میں سو نہیں سکتے، فضول مذاق اور فضول گفتگو نہیں چلے گی نہ خودفری ہوتے ہیں اور نہ کسی کو ہونے دیتے ہیں۔ باقی بہت نرم دل و مشفق ہیں تم کون سا کام چور ہو جو ڈر رہی ہو۔'' سسٹر ریٹا نے بڑی تفصیل سے ان کے بارے میں بتایا۔

''سسٹر، بات، بات پر ہائپر تو نہیں ہوتے سر......؟'' شہزادی منمنائی۔

''ارے نہیں بچے ایسی کوئی بات نہیں، ایسے ہی وہ کمبختیں تمہیں ڈرا گئیں۔ ان کے ساتھ ٹھٹھے بازی جو نہیں ہوتی اس لیے۔ جب سے ان کی بیوی کی وفات ہوئی تب سے وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہیں اصل میں موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے ناں ڈاکٹر متین نے...... ایکسیڈنٹ بہت شدید تھا بیگم تو ان کی موقع پر ہی مرگئی تھیں۔ جبکہ بیٹی اور یہ خود معجزانہ طور پر بچ گئے تب سے ذرا مذہبی اور سنجیدہ ہو گئے ہیں۔''

بات دکھ کی تھی مگر ان دونوں کو قدرے اطمینان ہوا تھا کہ یہ اصل کہانی ہے۔ پھر وہ وارڈ چلی آئیں۔ بشیر دوسری بار رگڑ، رگڑ کر صفائی کر رہا تھا وہ اپنے کام میں جتی رہیں حالانکہ شہزادی کا دل کر رہا تھا ایک بار جا کر چائے کا کپ لے آئے سردی بھی تو غضب کی تھی لیکن جرأت نہیں ہو رہی تھی اور بالآخر تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔

بلیک پینٹ کے ساتھ سی گرین شرٹ اور سردی کی وجہ سے ساتھ بلیک ہی جیکٹ پہن رکھی تھی صاف رنگت، کھڑے نقوش، چہرے پر داڑھی، وہ بلاشبہ مردانہ وجاہت کا جاندار نمونہ لگ رہے تھے۔ دائیں، بائیں کھڑے ینگ ڈاکٹرز میں وہ سب سے ممتاز سب سے الگ اپنی نرم و مشفق آواز میں بیڈ نمبر ایک کے مریض سے حال چال پوچھ رہے تھے۔ وہ دونوں بھی میڈیکل ٹرالی چھوڑ کر بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچی تھیں اور بیک وقت سلام جھاڑا تھا۔

''سسٹرز آپ جا کر اپنا کام کریں۔''

''جی سر......!''

''ہائے اتنا سوہنا، شہزادی یہ تو بالکل شہزادہ ہے۔'' جوش میں افروز نے اس کے پہلو میں کچھ زیادہ ہی زور سے کہنی مار ڈالی۔

''بیڑا غرق...... اپنا کام کر دھیان سے ورنہ اس شہزادے نے منٹوں میں جلاد بن جانا ہے۔''

بڑی مترنم رنگ ٹون تھی، سیل یقیناً ان کے ساتھ کھڑے قافلے میں سے کسی کا تھا۔ وہ جو بڑے دھیان سے مریض کو چیک کر رہے تھے۔ سینے کے مختلف حصوں پر دباؤ ڈال، ڈال کر جونیئرز کو لیکچر بھی رہے تھے یک دم چونکے پھر مریض کی شرٹ بھی اپنے ہاتھ سے برابر کر ڈالی اب وہ جیکٹ کی پاکٹوں میں ہاتھ ڈالے بالکل سیدھے کھڑے تھے پورے قد کے ساتھ، چہرے پر واضح طور پر غصے کی سرخی لیے۔

''اب میں یہ کہوں کہ اپنے سیل فون گھر پر رکھ کر آیا کریں؟ شرم آنی چاہیے۔''

''س سوری سر......'' ینگ ڈاکٹر منمنا رہی تھی۔

شہزادی نے جھرجھری لے کر اپنا سیل پھر سے چیک کیا تو افروز نے بھی تقلید کی تھی۔

''بشیر وارڈ میں اتنی ٹھنڈ کیوں ہے؟''

''سر ایک ہیٹر کام نہیں کر رہا اس لیے۔''

اب وہ ہیٹر کے پاس کھڑے اسے ٹھونک بجا کر دیکھ رہے تھے بالآخر نیچے بیٹھ کر ہیٹر کو ایک دھپ رسید کر کے بھی دیکھا۔ سارا قافلہ جز بز کھڑا وہ نیچے بیٹھے ہیٹر سیٹ کرتے بولے۔

''بس یہ تو جواب دے گیا ہے بشیر میرے کمرے سے ہیٹر لا کر ادھر لگا دو۔'' بشیر نے حکم کی تعمیل میں دوڑ لگا دی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر متین کے وارڈ میں ڈیوٹی کا یہ تیسرا ہفتہ تھا، اب وہ دونوں عادی...... ہو گئی تھیں، افروز مٹر گشتی کا وقت بھی نکال لیتی تھی لیکن وہ اب بھی رات کے ڈھائی بجے مستعد کھڑی وارڈ پر طائرانہ نظر ڈال رہی تھی جب

تین ہاؤس جابرز داخل ہوئے تھے دو لیڈی ڈاکٹر اور ایک میل ڈاکٹر وہ اپنا پریکٹیکل لیتے رہے، وہ وہیں کھڑی رہی۔

''بیڈ نمبر سات کو ابھی چھوڑ دیں ڈاکٹرز۔''

''کیوں......؟''

''بہت sensitive بچہ ہے پہلے ہی بڑی مشکل سے سویا ہے۔''

''تو کیا اپنا کام چھوڑ دیں؟''

''میرا مطلب یہ نہیں ہے ڈاکٹر دراصل وہ پھر سے تکلیف سے روئے گا دوسرے پیشنٹ بھی ڈسٹرب ہوں گے ابھی تو پین کلر دیا ہے پھر نیند کے لیے انجکشن دینا پڑے گا سر نے منع کیا ہے۔''

''تمہیں ہم سے زیادہ پتا ہے۔'' بھوری آنکھوں والی ڈاکٹر کو شاید بہت برا لگا تھا اس کا لیکچر......

''انجکشن لگانا آیا نہیں اور شروع ہوگئی ہو ڈاکٹرز کو لیکچر جھاڑنے، اوقات کیا ہے تمہاری۔'' وہ حقارت سے اس کے گلابی ربن (فرسٹ ائیر) کو دیکھ کر بولی۔

''ڈاکٹر آپ مس بی ہیو کر رہی ہیں۔'' شہزادی کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

''تو آپ بھی اپنی لمٹ میں رہیں ناں سسٹر......!'' اب تو میل ڈاکٹر نے بھی آئی فون سے سر اٹھالیا تھا۔

''لمٹ تو آپ لوگ کراس کر رہے ہیں جبکہ بات اتنی بڑی نہیں ہے۔'' اب کے شہزادی کا میٹر پکا گھوم گیا تھا اس نے بھی دو بدو جواب دینے کا سوچ لیا۔ اسے پتا تھا سینئر نرسز تو ان ینگ ڈاکٹرز کو کسی کھاتے میں نہیں رکھتی تھیں۔ تھیوری پڑھنے کے بعد پریکٹس کے لیے جوائن کرتے تھے لیکن ریسپیکٹ پروفیسرز جتنی مانگا کرتے خاص طور پر نرسز کو ہٹ کرنا تو ان کا مشغلہ بن جاتا تھا سب ایسے نہیں ہوتے لیکن کچھ میں تو ڈاکٹر ہونے کا غرور کوٹ، کوٹ کر سمایا ہوتا ہے شہزادی کا واسطہ بھی شاید ایسی ہی ٹولی سے پڑ گیا تھا۔

''سر آرہے ہیں، سر آرہے ہیں۔'' بشیر ہانپتا ہوا آیا تھا۔

''اب بتاتے ہیں سر کو۔'' وہ تینوں مانو خوش ہی ہوگئے تھے۔ شہزادی نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا، وہ اب ان ڈاکٹرز کے سامنے اپنی درگت بنوانے کے لیے تیار تھی۔

ڈاکٹر متین وارڈ اور انہیں بس ایک نظر دیکھ کر واپس ہولیے تو پیچھے، پیچھے ینگ ڈاکٹرز چل دیے۔

اس نے اسٹاف اسٹیشن پر آکر کافی کا پہلا سپ لیا ہی تھا جب بشیر بلانے چلا آیا۔

''بشیر بھائی کیا سر کا موڈ زیادہ خراب ہے؟''

''ان ڈاکٹروں کو تو اللہ ہی پوچھے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تو وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی کاؤنٹر کے قریب آگئی تھی۔

''آپ بتاؤ بچے کیا بات ہوئی تھی؟'' وہ اپنی نیند کے خمار میں ڈوبی سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑھ کر بولے تھے۔ (چھوٹے قد اور دبلے پتلے وجود کے ساتھ شہزادی میٹرک میں پڑھتی بچی ہی معلوم ہوتی تھی) پھر جو ہوا وہ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا سر نے ان تینوں کو خاصا لیکچر دے کر رخصت کیا تھا اور اسے شاباشی کے ساتھ اپنا کام عبادت سمجھ کر کرنے کی تلقین کردی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ کیمل کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر گرم شال رکھے رف سے حلیے میں بھی عجب شانِ بے نیازی سے کھڑے تھے۔

شہزادی کو لگا کہیں دور بہت دور کسی تنہا جزیرے پر کوئی کشتی لنگر انداز ہوئی ہے جسے جنگلی پھولوں کی باس نے مرحبا، مرحبا کر کے گلے لگایا ہے۔ وہ شب کے طلسماتی پل تھے جب دینے والا بھی پکارتا ہے کہ۔ ''آؤ مانگو جو مانگنا ہے میں لٹانے آیا ہوں۔'' وہ تو خاموش کھڑی تھی کچھ نہ مانگنے پر بھی اس نے سب کچھ دے دیا تھا۔ کچی عمر میں اس پر بڑی پکی واردات گزر گئی تھی۔

محبت معجزہ ہے جو خاص، خاص دلوں پر ودیعت ہوتا ہے
وگرنہ دل تو کائنات کے ہر ذی نفس کے پاس ہے۔
محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

☆☆☆

چچا، چچی اور بیہ وغیرہ کے لیے گرم سوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر وہ ہائی ایس میں آبیٹھی۔ دوماہ بعد وہ ہفتے بھر کے لیے احمد پور جارہی تھی، ماں کی ممتا کو اس نے آزما کر کبھی شرمندہ نہیں کیا تھا بلکہ اب تو اس کا دل کرتا تھا کبھی سامنا نہ ہو۔

ماں نے خود کے بنا اسے رہنے کی ایسی عادت ڈالی تھی کہ وہ ممتا جیسے جذبے کو ہی بھول گئی تھی جب ساتھ والی لڑکیاں گھر والوں کے لیے شاپنگ کرتیں تو وہ بھی چچا کی فیملی کے لیے کرلیا کرتی تھی اور اسی شاپنگ کی وجہ سے چچی اسے سرآنکھوں پر بٹھا کر کچھ نئی فرمائشیں بھی جڑ دیا کرتی تھیں۔ اب بھی موسم بدل رہا تھا نومبر کے وسط میں ہی دن ٹھنڈے رہنے لگے تھے تو اس نے سردیوں والے لباس خرید ڈالے تھے۔

''بڑی تو شہزادی تھی پھر تم نے پہلے بیہ کی منگنی کیوں کردی؟'' یہ ان کے محلے کی خاتون تھیں اور خوش قسمتی سے شہزادی کی خیر خواہ بھی تھیں۔ سو وہ چچی کو بات لگانے سے باز نہ آئیں دراصل گھر آکر شہزادی کو پتا چلا تھا کہ بیہ کا رشتہ طے کردیا گیا ہے اور دو دن بعد منگنی تھی سو گھر کے صحن کو صاف ستھرا کرکے ایک دیوار کے ساتھ صوفہ رکھ کر اسٹیج بنالیا گیا تھا، شہزادی گرے اور ریڈ کے کنٹراسٹ سوٹ میں بڑے، بڑے آویزے پہنے معمول سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی جونہی وہ بیہ کے برابر بیٹھی محلے والیوں نے چہ مگوئیاں شروع کردیں۔

''بہن بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں تو پتا ہے آج کل لڑکے والے تو خوب صورت کے سوا کسی کو دیکھتے نہیں، شہزادی کے چھوٹے قد اور سانولی رنگت کی وجہ سے ہمیں مشکل ہورہی تھی جو دیکھتا بیہ کو مانگ لیتا اب یہی سوچا ہے بیہ اور دیا کی اکٹھے شادی کرکے پھر شہزادی کی طرف ہوجائیں گے تب تک اس کے پاس پیسہ بھی کافی ہوجائے گا، قسم لے لو جو کبھی روپیہ بھی لیا اس سے، بس یہی کہتی ہوں بیٹی جوڑ لو ہمارے جیتے

جی، نصیب کا کیا پتا؟ اب۔'' چچی نے آبدیدہ ہونے کی مکمل اداکاری شروع کردی تو اس نے پہلو بدل کر سوچا اور جو ہر تیسرے مہینے وہ ان کی فرمائشی لسٹ کی شاپنگ کرتی ہے تو وہ کس کھاتے میں؟ اسے پیسے دینے پر اعتراض نہیں تھا اسے جھوٹ اور پرایا بنائے جانے پر ہمیشہ دکھ ہوتا تھا۔

☆☆☆

اس کے بار، بار کروٹیں بدلنے پر بیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپی کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہوں، ٹھیک ہے۔''

بیہ نے لائٹ جلا کر بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ بہت مخلص تھیں۔ ماں کی باتوں میں نہیں آتی تھیں۔

''آپی، امی کی باتوں کا دکھ ہے؟''

''نہیں تو...... انہوں نے کون سا کچھ غلط کہا۔''

''آپی میں خود ابھی منگنی، شادی کے حق میں نہیں پر امی بھلا کب کسی کی سنتی ہیں وہ تو بس آپ سے چیزیں منگوا کر اور خود بھی دھڑا دھڑ خرید، خرید کر ہمارا جہیز بنائے جارہی ہیں...... پھر آپ سے کہہ دیں گی کہ ہم نے تو ٹیڈی پیسہ نہیں لیا بس اس نے کوئی چیز گفٹ کردی تو ہی رکھی ہے۔ آپ کا کبھی احسان نہیں مانیں گی۔'' وہ بھی ماں کی رگ، رگ سے واقف تھیں اور کڑھتی بھی تھیں۔

''آپی اب آپ کوئی چیز نہ لایا کریں، اپنے پیسے سیو کریں بس۔''

''پگلی ہو تم، میں کون سا ان کے لیے لاتی ہوں سب چیزیں تمہاری تو ہیں۔'' شہزادی نے نمی کو پلکوں کے پیچھے روکنے کی جدوجہد کی تھی۔

''آپی دیکھنا وہ بہت اچھا ہوگا جو آپ کو ملے گا ساری، دنیا سے اچھا۔'' بیہ نے اسے گلے لگایا تھا۔

''برا بھی پتا نہیں ملتا ہے کہ نہیں، سرکاری نرس اور اوپر سے کوجی بھی۔ لوگ گھروں میں بیٹھی لڑکیوں کو ریجیکٹ کررہے ہیں، میرا تو پروفیشن بھی پسند نہیں

کرتے۔'' اس نے مسکرانے کے انداز میں ہونٹ پھیلائے تھے۔

''اُووف......آپی ایسا نہ سوچا کریں، اچھا ایک بات بتائیں۔''

''بولو کیا؟''

''وہ کون ہے؟'' بیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''مطلب......؟'' وہ خشک ہوئی تھی۔

''وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔'' وہ حیران رہ گئی' سات سالوں میں بیہ دوسرا انسان تھی جو اس کی پتلیوں پار رہتے ہوئے شخص کے بارے میں استفسار کر رہی تھی اس کی آنکھوں کے پار جھانکتے ہوئے حالانکہ یہ سچ تو اس نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا، بیہ اس سے پانچ سال چھوٹی تھی پھر بھی جان گئی تھی افروز تو اس کی سکھی بھی تھی ہم عمر بھی تو اس کے لیے سمجھ جانا چنداں مشکل نہ ہوا تھا۔

''کولیگ ہے؟''

''نہیں، پروفیسر ڈاکٹر ہے۔''

''بڈھا ہے کیا؟'' بیہ کو فوراً فکر لاحق ہوئی۔

''نہیں تو......'' وہ بے ساختہ مسکرائی، سر متین کا باوقار جاذب نظر روپ ابھر، ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ محبت نور کا ہالہ بن کر اس کے گرد چکرانے لگی، افروز کے بعد بیہ سے وہ اس طرح کھلے ڈلے انداز میں ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ جیسے خود بھی ان کے ذکر کو انجوائے کرنے لگی تھی۔

''ڈاکٹر متین کو پتا ہے کہ آپ......؟'' بیہ پوچھ رہی تھی۔

''نہیں۔'' پھر پتا نہیں کیوں خیال آیا جیسے انہیں خود ہی پتا چل گیا ہو، بیہ کرید، کرید کر تفصیل پوچھ رہی تھی۔

''بیوی کی ڈیتھ ہوگئی ہے، ایک بیٹی ہے آٹھ، نو سال کی، دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتے، اپنے کام کو ہی عبادت سمجھتے ہیں' بڑی حد تک مذہبی رجحان ہو گیا ہے۔''

''مطلب مولوی یعنی اللہ والے......'' بیہ نے شرارت سے آنکھ بند کی۔

''بری بات کسی لفظ کو مذاق میں بھی برا نہیں کہتے اور مولوی کو تو بالکل نہیں، رہی ان کی بات وہ ایک باعمل مسلمان ہیں بس یہ بات ہے۔''

''اوکے، اوکے۔'' وہ پھر سے سنجیدہ ہوئی۔

''آپی پھر یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی۔''

''یہ چڑھ ہی نہیں سکتی۔'' بے رحم انداز تھا اس کا۔

''اس لیے کہ آپ نرس اور وہ ڈاکٹر ہیں؟''

''نہیں اور بھی تو باتیں ہیں بیہ۔''

''یہی باتیں ہیں ناں لوگ، اسٹیٹس، ذات برادری وغیرہ، وغیرہ کوئی شرعی عذر تو نہیں۔ پھر آپ کیوں مایوس ہیں۔ ویسے آپی کوئی جگاڑ کر کے انہیں بتا دیں آخرا کیلے، اکیلے گلنے سڑنے کا کیا فائدہ۔''

''بکواس بند اور اب سو جاؤ۔ فضول ڈرامے دیکھ، دیکھ کر آزاد خیالی کی انتہا ہوگئی ہے۔'' شہزادی نے لتاڑا تھا۔

''لو بھلا محبت کر لی خود نے اور ہم اظہار کا کہہ کر ہی آزاد خیال بنا دیے گئے۔'' شہزادی نے جواب کے بجائے کمبل سر تک اوڑھ لیا۔

''میرے رب میری آپی کو سدا خوش رکھنا، ہماری خوشیاں بھی انہیں دے، دے اللہ پاک میری آپی کو سب کچھ دے، دے۔'' بیہ زور، زور سے دعا کر رہی تھی شہزادی نے نم آنکھوں کے ساتھ اس وقت دل میں آمین کہا تھا۔

☆☆☆

وقت آج بھی وہی تھا سات سال پہلے والا معبود کے قرب کے پہر چل رہے تھے بس انسان ہی بے خبر رہتا ہے۔

''سر متین کے وارڈ میں ڈیوٹی تھی ناں۔'' افروز پوچھ رہی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ بولی صم بکم بنی رہی۔

''یہ بھی ممکن ہے عشق تجھے ولایت دے دے
یہ بھی ممکن ہے تیرے ہوش ٹھکانے آجائیں''

''دونوں ہی کام ناممکن لگ رہے ہیں کاش کہ ہوش

ہی ٹھکانے آجائیں۔‘‘شہزادی کا لہجہ عجب یاس بھرا تھا۔

’’ان کے وارڈ میں ڈیوٹی لگنے سے سر زیادہ یاد آرہے ہیں ناں......‘‘افروز کا انداز بڑا ہی ہمدردانہ تھا۔جواباً وہ بالآخر بول ہی اٹھی۔

’’کہ عشقِ دوست ہر ساعت درونِ ناری رقصم
گاہے برخاک ی غلتم گاہے برخاری رقصم
سراپا بر سراپائے خودم از بیخودی قرباں
بگردِ مرکزِ خود صورت پرکاری رقصم‘‘

(عشق کا دوست تو ہر گھڑی آگ میں ناچتا ہے میں بھی کبھی خاک میں غلطاں ہوتا ہوں کبھی کانٹوں پر ناچتا ہوں......سر سے پیر تک اپنی ہی بے خودی پر قربان ہو جاؤں پرکار کی طرح اپنے ہی گرد ناچتا ہوں)

لعل شہباز کا فارسی کلام سن کر افروز تو سچ مچ جھوم اٹھی۔

’’سبحان اللہ......سبحان اللہ......میں تو تمہیں بہت بدذوق سمجھتی تھی۔‘‘

’’وہ تو میں ہوں۔‘‘

’’تو پھر یہ......؟‘‘افروز نے ابرو اچکائے۔

’’ابا پڑھا کرتے تھے، بچپن سے ہی حفظ ہے معانی بس اب سمجھ آئے ہیں۔‘‘

’’اچھا اب موڈ چینج کرو چلو چلتے ہیں۔‘‘

’’کہاں......؟‘‘تجاہل ضروری تھا۔

’’سر کے گھر اور کہاں۔‘‘اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

’’دماغ کا علاج کرا لڑکی......‘‘شہزادی نے گھما کر تکیہ مارا تھا۔

’’یار تیری ’’یاد‘‘ کا دورہ کم کرنے کے لیے ایک راؤنڈ ضروری ہے۔دوسری بات یہ کہ سر کی دختر نیک اختر اور والدہ ماجدہ کو پٹانے کے لیے بھی ایسے چکر چلانے، مطلب لگانے ضروری ہیں......اب اٹھ جاؤ، اچھا سا تیار ہو جاؤ اور میں گندا، گندا سا......‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’مطلب یہ محترمہ کہ تم اچھی لگو میں گندی......‘‘

شہزادی اس کے جواب پر بے ساختہ کھلکھلا اٹھی تھی۔

’’کب تک پاکستان آئیں گے سر؟‘‘

''ابھی تو تین ماہ باقی ہیں۔'' اس نے گہری سانس کھینچ کر بتایا تھا۔ ڈاکٹر متین ایک سال کے لیے سرکاری طور پر مڈل ایسٹ میں تعینات تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر متین میڈیکل کالونی ہی میں رہ رہے تھے ہاسٹل سے نکل کر وہ دونوں خراماں، خراماں ان کے گھر کی طرف چل رہی تھیں۔ جب شہزادی کی ہی نظر پڑی تھی گندے سے حلیے والا آدمی زبردستی بچی کو کھینچ کر گھر کے باہر بنی ہوئی پودوں کی باڑ کے اندر کررہا تھا۔ شہزادی نے لمحوں میں پہچانا تھا، وہ فاطمہ تھی۔

''ڈاکٹر متین کی بیٹی؟'' شہزادی نے یکا یک اس طرف دوڑ لگادی پیچھے افروز بھی تھی۔

''اے چھوڑو اسے۔'' وہ چیخ بھی رہی تھی، آدمی نے انہیں دیکھتے ہی دوڑ لگادی...... افروز نے پاس پڑا پتھر اٹھا کر پھر بھی پیچھے سے مارا تھا۔

''بیٹا آپ گھر سے اتنی دور یہاں کیا کررہے ہو؟''

وہ اسے خود سے لپٹائے، بار، بار منہ سر چوم رہی تھی...... فاطمہ بچی تھی جلد ہی اتنی بڑی بات کے اثر سے نکل کر اس سے گپ شپ کرنے لگی، وہ اپنے بابا کے ساتھ اسپتال آتی رہتی تھی اس لیے ان لوگوں سے واقف تھی۔

''بے بی بولو بھی' آپ یہاں کیا کررہے تھے اکیلے......؟'' وہ اب ان کی اسٹریٹ میں داخل ہورہی تھی افروز نے سائیکل پکڑرکھی تھی۔

''میں تو برگر لینے جارہی تھی۔'' اس نے مٹھی میں دبایا پانچ ہزار کا نوٹ آگے کردیا۔ شہزادی نے خاموشی سے لے لیا۔

''آپ نے شمیم سے کیوں نہیں کہا وہ لے آتی۔''

''وہ تو گھر پر نہیں اور مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔''

''آپ کچھ اور کھالیتے ناں، ایسے اکیلے گھر سے دور تھوڑی نہ جاتے ہیں جب بے بی اکیلے جاتے ہیں تو گندے والے انکل بچوں سے بہت بدتمیزی کرتے ہیں۔'' شہزادی نے ہاتھ میں پکڑا اس کا روئی جیسا نرم ہاتھ چوما تھا جواباً اس نے ہاتھ چھڑا کر منہ پر انگلی رکھ کر خاموشی کا سائن بنادیا۔

''دادو سورہی ہیں نوشاؤٹ......'' وہ کان میں بتانے لگی۔ افروز خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی جبکہ شہزادی نے منہ ہاتھ دھلا کر اس کے مٹی سے لتھڑے کپڑے بدلے، بال بنائے اور اسے لے کر کچن میں آگئی۔ وہ اس کی فرمائش پر لزانیہ بنارہی تھی چیزیں اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مل گئی تھیں۔ جبھی سرخ سفید رنگت پر سفید ہی بالوں والی خاتون کچن میں داخل ہوگئیں۔ شہزادی نے لزانیہ ٹرے اوون میں رکھ دی۔

اب وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی، افروز ان سے ملنے کے بعد فاطمہ کو لے کر کچن میں آگئی۔ شہزادی نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی، وہ فاطمہ کے آنے سے پہلے، پہلے پوری بات بتادینا چاہتی تھی۔ اس نے پانچ ہزار کا نوٹ ان کی طرف بڑھادیا۔

''ہائے میں مرگئی، میں بڈھی نے سوتے رہ جانا تھا اور......'' وہ زارو قطار رونے لگیں تو شہزادی نے پاس بیٹھ کر انہیں ساتھ لگالیا خود اس کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

''بیٹی سردی نے جوڑوں کے ساتھ، ساتھ سر میں بھی درد کردیا تھا۔ میں نے دوائی کھائی اور لیٹ گئی۔ فاطمہ اسکول سے آئی تو اسے لنچ پسند نہیں آیا۔ عجیب، عجیب کھانوں کی فرمائشیں کرتی ہے جو نہ مجھے بنانے آتے ہیں نہ شمیم کو (میڈ) میں نے کہا ابھی میرے ساتھ لیٹ جاؤ شام کو برگر منگوادوں گی۔ میرے ساتھ لیٹی تھی پھر میں تو سوگئی، مجھے کچھ نہیں پتا بیٹا، شمیم کب گئی اور فاطمہ باہر کیسے نکلی۔''

''آنٹی وہ برگر ہی لینے گئی تھی۔''

''ارے بیٹا ہم نے کبھی اسے پیسے نہیں دیے بس چیز ہی لے کردیتے ہیں اس لیے اسے کم زیادہ پیسوں کی سمجھ نہیں آئی جو نوٹ میری الماری کی دراز سے ہاتھ لگا وہی لے گئی۔''

''آنٹی آپ سر کی شادی کیوں نہیں کروا دیتیں؟'' افروز کب تک چپ رہ سکتی تھی، شہزادی نے گھور کر دیکھا اس نے آرام سے روئے سخن آنٹی کی

طرف پھیر لیا۔

آنٹی کا سمجھو پسندیدہ ٹاپک شروع ہوگیا تھا۔

''ارے میری سنتا نہیں، نہ بچی کو کسی کے پاس چھوڑنے پر راضی، نہ شادی پر...... ہزار بار سمجھایا ساری سوتیلی مائیں بری نہیں ہوتیں خود اکیلے بیٹی کی تربیت کیسے کرو گے۔''

افروز نے آج کے لیے اتنا کافی سمجھ کر اٹھنے کا اشارہ کیا تھا فاطمہ نے بھی ساتھ جانے کی ضد پکڑ لی۔

''ہم کل پھر آئیں گے بیٹا، اوکے......'' افروز نے اسے آنکھ مار کر بچی کے گال تھپتھپائے تو دادی نے کل پھر آنے کا وعدہ لے لیا۔

☆☆☆

''ڈاکٹر متین آپ چائے لیں گے؟'' سسٹر مالتی نے ان کے روم میں جھانکا تھا۔

''کافی ہو جائے تو زیادہ بہتر نہیں رہے گا۔'' وہ ہلکا سا مسکرائے۔

''اوکے میں لاتی ہوں۔''

''اماں جی اس وقت کال......؟'' اس نے کال اٹھاتے ہی کہا۔

''اب بھی وقت دیکھتی رہی تو وقت ہاتھ سے اور آگے نکل جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں اماں جی۔''

''دیکھ متین تو ڈاکٹر ہوگا اسپتال میں، میرا تو، تو بیٹا ہے، اب کے تجھے میری بات ماننا ہی پڑے گی، قہر خدا کا، قیامت آتے، آتے رہی ہے۔ مجھے تو اس بھلی مانس بچی نے کہا بھی تھا سر کو نہ بتانا، ہفتہ ہوگیا مانو پیٹ میں غم کا گولہ لیے گھوم رہی ہوں اب اور کب تک نہ بتاؤں۔''

''اماں جی! آپ بتا دیں، میں پہیلیاں نہیں بوجھ سکتا۔'' وہ تحمل سے گویا ہوئے۔

انہوں نے آدھی ادھوری کر کے توڑ مروڑ کر بات کو نسبتاً کم خطرناک کر کے بتایا تھا کہ فاطمہ سے کسی نے پیسے چھیننے کی کوشش کی تھی مگر وہ باپ تھے اور زمانہ شناس بھی لمحوں میں تہ تک پہنچے تھے، آنچیں جذبات پورے بدن میں پھیلے تو لگا جیسے وہ بم بن کر پھٹ جائیں گے۔

''اماں جی آپ نے پوچھا نہیں کون تھا وہ، کالونی کا یا......''

''ارے دفع کرو، وہ جہنمی تو بھاگ کھڑا ہوا تھا، تم شکر کرو کہ سوہنے رب نے ہمیں کسی امتحان میں نہ ڈالا، میں نے بکرا منگوا کر فاطمہ کا صدقہ بھی دے دیا تھا۔ وہ بچیاں ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ہی بنی بس۔''

ان کی بات پر ڈاکٹر متین کا دل بھی سجدہ ریز ہوا تھا روم، روم میں شکر کیف بن کر دوڑا تو اماں کی اگلی بات پر وہ سیدھے ہو کر بیٹھنے پر مجبور ہوئے تھے۔

''اماں جی کیسی باتیں کرتی ہیں شہزادی ایک نرس ہے، میرے ساتھ کام کرتی رہی ہے۔ ہاں اچھی لڑکی ہے اب اور کیا معلومات دوں وہ کون سا پھوپی کی بیٹی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہلکا سا برہم ہو ہی گئے تھے۔

وہ بھی بیٹے کی لیے دیے رہنے والی عادت سے واقف تھیں سو کھل کر بول پڑیں۔

''پورے چار دن وہ بچی ہمارے گھر آتی رہی ہے، دو دن سہیلی کے ساتھ دو دن اکیلی، ان چار دنوں میں ہی مجھے پتا چل گیا وہ تیرے لیے بڑے نیک جذبے رکھتی ہے۔ بن ماں، باپ کے پلی ہے، ہماری فاطمہ کو سنبھال سکتی ہے، تمہیں گھر کا سکھ دے سکتی ہے۔ یہ میرا تجربہ کہہ رہا ہے بیٹا، بال دھوپ میں سفید نہیں کیے اب تو ویسے بھی چل چلاؤ کا وقت ہے، تجھے ہنستا بستا دیکھ لوں، بس یہی خواہش ہے یہی دعا ہے۔''

''لیکن اماں جی......''

''ارے کیا لیکن ویکن...... اب تو شکل صورت کی بات کرے گا، ہر چیز میں خوب صورتی ہے بس دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے۔''

''لاحول ولا اماں......! آپ بھی حد کر رہی ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں، مجھے سوچنے دیں۔''

''سات سال اسی سوچ میں گزار لیے اب اور کوئی سوچ نہیں میں بس کل جا رہی ہوں اسپتال، اس کا پتا ڈھونڈنے۔''

''ماں جی سب لوگ کیا کہیں گے اچھا نہیں لگتا۔ اسکینڈلائز ہوتا۔''

''بچے تو، تو ایسے بول رہا ہے جیسے اسپتال والے تجھے جانتے نہیں، ویسے بھی میں کام ہی ایسے طریقے سے کرنے کا سوچ رہی ہوں کہ تیرا اور بیچاری بچی کا نام نہ آئے۔''

''کیا سوچ رہی ہیں اماں جی آپ؟''

''ارے کچھ بھی سوچوں تجھے کیا اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو تیری پھوپیوں سے چالاکیاں تو سیکھ ہی لیں ہم نے۔'' وہ جل کر بولی تھی۔ اماں فل فارم میں تھیں اس لیے اب فون بند کرنا مناسب سمجھا تھا۔ اماں کی بات پر وہ مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

کوٹ بازو پر لٹکا کر وہ گھر کے لیے نکلے تو کاؤنٹر پر سسٹر مالتی نظر آئی تھی وہ اس کے پاس چل دیے۔

''سسٹر بڑی اچھی کافی تھی۔''

''اوہ سوسوری ڈاکٹر، ایکچوئلی منگلا کے ساتھ ایمرجنسی چلی گئی تھی ابھی آئی تو آپ نے یاد کروایا ہے۔'' وہ پیپر دراز میں رکھنے کے لیے ذرا سا جھکی تھی وہ جو عین کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے انہیں اس کی سیدھی مانگ نظر آئی تھی وہ بے ساختہ اس کی مانگ دیکھتے رہے، دل ابھی تک اماں سے کی گئی باتوں کے ٹرانس میں تھا لگ بھگ دس ماہ سے وہ جو پزل حل کر رہے تھے لمحوں میں حل ہوا تھا۔

سسٹر مالتی کیرالن تھی (انڈین اسٹیٹ کیرالہ سے) سانولی رنگت نارمل سی قامت کے ساتھ وہ جب بھی ان کے سامنے آتی انہیں کوئی یاد آتا تھا کون یہ سمجھا نہیں آج اور ابھی آئی تھی۔

''شہزادی......'' وہ ہلکے سے بڑبڑائے۔

گاڑی میں بیٹھے لیکن فلیٹ پر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت دیر بیٹھے قابوس اسپتال (عمان) کو تکتے رہے پھر جیسے تھک کر گاڑی ٹرن کی تھی اب وہ شارع ابوبکرؓ سے ہوتے ہوئے ساحلی پٹی پر نکل آئے تھے۔ صحار غلف کے خوب صورت ترین ساحلوں میں سے ایک ساحل زیرِ زمین دبی ہوئی روشنیاں، خوب صورت پتھر سے مزین واکنگ ٹریک، سر پر نصب خیمے اور تا حدِ نگاہ پھیلا نیلگوں سمندر......وہ سنگی بینچ پر بیٹھ کر آتی جاتی لہریں گنتے رہے فرار آخر کب تک؟ دنیا کے سارے کونوں سے آئے ہوئے بے شمار لوگ اپنے حال میں مست تھے، وہ اپنے ماضی میں گم ہونے لگے۔

''وابستگی کا ایک، الگ گداز ہوا کرتا ہے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ فریقِ ثانی کی حیثیت سے ان تک نہ پہنچتا وہ جب، جب محبت سے لبریز آنکھ اٹھاتی تھی، وہ لہریں ان تک پہنچا کرتی تھیں۔ پہلے پہل وہ کچی عمر میں نادانی سمجھتے رہے پھر عام مروجہ اصول کے مطابق اسٹیٹس تبدیل کرنے کی چاہ سمجھ کر ٹالتے رہے جیسے باقی مایوس ہوئیں یہ بھی ہوجائے گی لیکن وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی وہ چاہتے تھے کوئی موقع ملے اور وہ اسے دل کھول ڈانٹ ڈپٹ کرلیں اس نے آج تک وہ بھی نہ دیا تھا۔ وہ مضبوط کردار کی مالک تھی، آس پاس کے سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ اس بات سے بھی باخبر تھے مگر شادی کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ آج اماں جی نے کہہ کر عجب مخمصے میں ڈال دیا تھا بالآخر انہوں نے اس سیدھی مانگ والی لڑکی کے حق میں فیصلہ کر ہی ڈالا تھا بڑے دل سے یا پھر شاید دل کے اندر کہیں بہت دور اس کی محبت سرنگ پہلے ہی بنا چکی تھی۔ جبھی تو ایک بار مانگ پر نظر پڑی تھی جو برسوں بعد بھی یاد تھی۔ وہ فاطمہ کے لیے بہت اچھی ماں ثابت ہوگی۔ مجھ سے وابستہ چیزوں کو چھپا کر رکھنے والی میری بیٹی کو کیونکر نظر انداز کرسکتی ہے، انہیں اپنی وہ ٹوٹی ہوئی ٹائی پن یاد آئی جو اُن کے پھینکنے پر اس نے اٹھا کر اپنے کوٹ میں چھپالی تھی وہ چوری کر رہی تھی لیکن ونڈو کے کھلے شیشے کی بدولت وہ عینی شاہد بن گئے تھے۔

''سلی گرل......'' لب آپوں آپ مسکرا اٹھے تھے۔

☆☆☆

نکاح کے بعد اب سب لوگ پُر تکلف کھانے

سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ان کی رضامندی کے بعد اماں نے باقی مرحلے اس قدر تیزی سے طے کیے تھے کہ وہ اش اش کرا ٹھے۔

ہفتہ پورا وہ بیمار سے کہیں زیادہ بیمار بن کر مع فاطمہ اسپتال جاتی رہیں وہاں دوا کم اور رشتے اور ان کی شادی اور فاطمہ کی باتیں زیادہ کرتی رہی تھیں، ہر بات کا اختتام وہ کچھ یوں کرتیں۔

''بس لڑکی سادہ سی ہو جو والدین سے محروم ہو تا کہ میری فاطمہ سے محبت کرے، اسے اپنی طرح محروم نہ رکھے'' بالآخر پانچویں دن انہوں نے شہزادی کا نام تجویز کر کے ڈاکٹرز کی ونگ کے سامنے رکھ دیا اور رائے طلب کر ڈالی۔ وہ بھی بقلم خود مطلب بہ نفس نفیس خود گو کہ بہت ساری متحمل ڈاکٹرز کو اعتراض بھی تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے شہزادی کی کیا ضرورت مگر...

بہرحال ان کے منہ پر کہنے کا رسک کسی نے نہ لیا تھا۔ پھر کمال سادگی سے ان کے دوستوں سے کہا تھا کہ وہ بھی متین پر زور ڈالیں تا کہ وہ شادی کر لے اور یوں ان کی شادی بالآخر مسماۃ شہزادی سے وقوع پزیر ہوگئی تھی۔ یہ ساری تفصیلات ان تک پروفیسر یوسفی سے پہنچی تھیں۔

جواب اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کر رہے تھے۔ میسج ٹون پر انہوں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا تھا۔ سفید لباس میں پری بن کر بیٹھی فاطمہ نے مہندی سے رنگین ہاتھ بڑے ذوق شوق سے پکڑ رکھا تھا انہوں نے زوم کر لیا ہتھیلی کے عین درمیان میں گل بوٹوں کے بیچ ان کا اور فاطمہ کا نام لکھا ہوا تھا اب شک کی گنجائش نہیں رہی تھی وہ شہزادی کا ہی ہاتھ تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر جہاں پدرانہ شفقت ابھری تھی وہیں ہتھیلی پر سجے اپنے نام نے دل کو نئی آنے والی خوشیوں پر عجیب لے میں دھڑکتا محسوس کیا۔

پھر انہوں نے اس خوب صورت واٹس ایپ کے جواب میں کال ملا ہی ڈالی تھی تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

وہ اپنے چائے کا کپ اٹھا کر غیر محسوس طور پر باقی لوگوں سے علیحدہ ہوئے تھے۔

''ہیلو بابا جانی۔'' فاطمہ کی چہکتی آواز تھی۔

''بابا کی جان، شہزادی آنٹی سے بات کرواؤ۔''

''شی از ناٹ آنٹی اینی مور......شی از مائی ماما......'' وہ خفا ہوئی۔

''ماما بات کریں۔'' انہیں اسپیکر سے سنائی دیا۔

''شہزادی ......'' وہ بڑے نرم گرم سے لہجے میں مخاطب تھے۔

''میں کہاں کی شہزادی......؟'' وہ متبسم ہوئی۔

''میرے دل کی سلطنت کی۔'' وہ برجستہ تھے۔

''ہاہاہا......ویسے تو ہو نہیں سکتی ناں......''

''کس نے کہا؟''

''مجھے خود پتا ہے۔''

''غلط پتا ہے، میں بتا رہا ہوں ناں......نہ تم شہزادی ہو۔''

''سچی سر جی......'' وہ ہنوز بے یقین تھی۔

''نو سر، ناؤ جسٹ متین۔''

''وہ تو میں جان بوجھ کر نہیں کہتی۔''

''کیوں......؟'' تھوڑی حیرانی در آئی۔

''آپ اسم با مسمیٰ، میں اسم متضاد...... ہاہاہا۔'' (بلند قہقہہ)

''آئی تھنک میں پروفیسر یوسفی سے ٹائم لے ہی لوں۔''

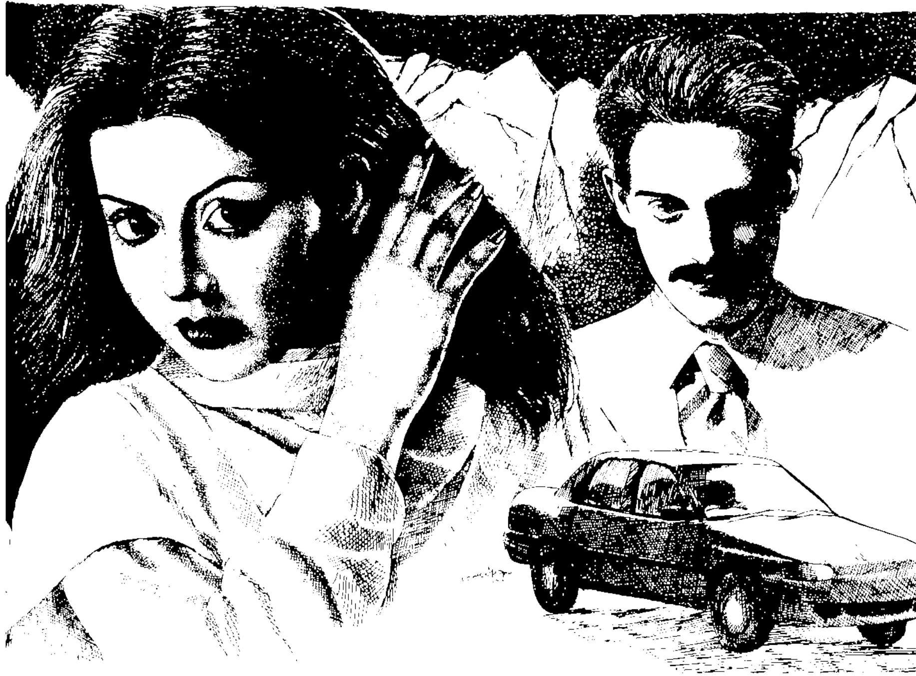
''کس کے لیے؟''

''تمہارے لیے؟'' پروفیسر یوسفی شعبۂ نفسیات کے ہیڈ تھے، وہ بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

''آپ مل گئے تو میں نے مان لیا میں شہزادی ہوں قسمت کی۔'' وہ طمانیت سے بول اٹھی تھی۔

''متین اب فون سوئچ آف کر دو، رخصتی کراتے ہیں بہت دیر ہوگئی یار......'' بڑے بھیا پاس آتے جا رہے تھے۔

''ساری باتیں فون پر کرنی ہے تو رخصتی رہنے دیتے ہیں۔'' اسپیکر سے بیہ کی غصیلی آواز سن کر انہوں نے جلدی سے لال نشان پر پچ کیا تھا محبت سرخرو ہو کر مسکرائی تھی۔



میرے خواب چھین لو

عقیلہ حق

لگتا تھا عدالت کے باہر سارا شہر جمع ہو گیا ہے۔ میڈیا والے ایک دوسرے کو دھکے دے کر آگے سے آگے کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے، یہ وہ کیس نہیں تھا جس کی رپورٹنگ نہ کرنے پر سیاسی محاذوں پر بازپُرس ہو سکتی تھی۔

یہ ایک غریب لڑکی کا مقدمہ تھا۔

لیکن ملزمان کی لسٹ میں اتنے بڑے، بڑے نام تھے۔ ایسے، ایسے خوب صورت چہرے تھے، ایسے، ایسے لوگ تھے کہ مقدمہ اہم نہیں...... بہت اہم ہو گیا تھا۔

گھر میں بیٹھی اسّی فیصد آبادی ٹی وی کھولے مقدمے کی کارروائی کی تفصیلات سننے کو بے چین تھی۔

عدالت کے باہر رش اور چہ مگوئیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ لوگوں کی نظریں اس خوب صورت خاتون وکیل پر ٹھہر سی گئیں جو اس غریب جھریّوں زدہ چہرے والے بوڑھے کے ساتھ گاڑی سے اتری تھی...... یہ اس لڑکی کی وکیل تھی جو چند دنوں پہلے اس فضا میں سانس لیتی لیکن اب......

☆☆☆

''چل اٹھ، تیرا ابا آنے والا ہے جلدی سے آٹا گوندھ کر رکھ دے پھر اس کے آنے کے بعد روٹی ڈال لیجیو...... سارا دن بیچارہ محنت مزدوری کر کے گھر لوٹے تو کم از کم باسی سالن کے ساتھ روٹی تو تازہ اور گرم ملے۔'' مختاراں بی بی نے سولہ انچ کے ٹی وی پر پُرشوق نظریں گاڑے بیٹھی شمسہ کو آواز لگائی جو اس نے حسبِ عادت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔

''تو سن رہی ہے یا لگاؤں دو جوتیاں......'' مختاراں بی بی پیچھے سے چلاّئی۔ ہلکا گلابی ہواؤں سے نازک سوٹ پہنے، کھلے بالوں میں گلابی پھول لگائے، ہوا میں لہراتا پھولدار جالی کا خوب صورت دوپٹا قدم سے قدم ملا کر مسکراتی نظروں سے دیکھتا وہ وجیہہ نوجوان کسی بات پر مسکرایا تو اس کو ایسا لگا جیسے اس کا وجود ہواؤں میں اڑنے لگا......

''اری کیا ہوگیا ہے تو کیا پتھر کی ہوگئی ہے؟'' وہ جو ٹی وی پر چلتے اشتہار میں، اس نوجوان کے قدم بہ قدم چل رہی تھی مختاراں کی پھینکی گئی چپل پر جو اس کی کمر پر بڑی زور سے لگی تھی، بلبلا اٹھی۔

چھوٹا سا ٹین کی چادر والا کمرا جس میں ٹمٹماتا ساٹھ واٹ کا بلب دیواروں کا اکھڑا پلستر...... ''حقیقت کتنی بھیانک ہے...... توبہ......!'' شمسہ نے ٹی وی بند کر کے صحن کے کونے میں رکھے چولھے کو جلاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆☆

مختاراں کچی آبادی سے ملحق کوٹھیوں میں جھاڑو برتن کرتی تھی...... عبد القدوس روز صبح اپنا سامان لے کر سارے مزدوروں کے ساتھ اس فٹ پاتھ پر جا بیٹھتا، جہاں سے ٹھیکیدار اور کبھی، کبھی صاحب لوگ مزدور لینے آتے، کبھی دیہاڑی لگ جاتی اور کبھی سارا دن ادھار چائے پی کر وہ گھر آ جاتا......

''باجی آپ یہ ٹی وی نہیں دیکھتیں؟'' مختاراں نے اسٹور صاف کرتے ہوئے، چھوٹے سے ٹی وی کو کپڑے سے پونچھتے ہوئے بڑے شوق سے پوچھا تھا۔

''ارے بھئی اب ٹی وی کا زمانہ کب رہا ہے اب تو ایل ای ڈی کا زمانہ ہے اور یہ تو میں نے اپنے ڈرائیور کو دلوایا تھا اب اس کو بڑا دلوا دیا تم کو چاہیے کیا؟''

''جی، جی باجی دراصل وہ میری بیٹی ہے ناں شمسہ اسے بہت شوق ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہوگئی ہے۔ محلے کے گھروں میں بیٹھی رہتی ہے، یہ گھر میں ہوگا تو کم از کم گھر میں تو ٹکے گی ناں......'' مختاراں کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں اور وہ اسے دھمکائے جارہی تھی۔

''تم لے لو......'' باجی نے بے پروائی سے کہا اور اسٹور سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

''اُف اللہ حمیدہ، میں تجھے بتا نہیں سکتی کتنا اچھا لگتا ہے رنگین ٹی وی ہے ناں تو ہر چیز اتنی خوب صورت لگتی ہے۔ اتنے پیارے، پیارے سوٹ پہنے لڑکیاں اشتہاروں میں آتی ہیں، میری اماں تو اتوار بازار میں سے پرانے کپڑوں میں سے بھی جو سب سے سستا ہو وہ میرے لیے لے آتی ہے۔ وہ بھی چار، چھ مہینے میں ایک۔ یقین کر کتنی بھی کوشش کرلوں، فٹنگ ہوتی ہی نہیں پہلے تو بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی دیکھتی تھی لیکن جب سے کلر ٹی وی دیکھا ہے تو دل چاہتا ہے سارے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر آگ لگا دوں، ایک سے بڑھ کر ایک ڈیزائنز اور ایک سے بڑھ کر ایک حسین سوٹ...... میں تو اب ہر نماز میں دعا کرتی ہوں اللہ میاں مجھے بھی ایسے کپڑے دے دے۔'' شمسہ نے پھولی، پھولی سانسوں کے ساتھ اپنی پکی سہیلی حمیدہ کو بتایا۔

''ہاں یار زندگی تو ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہماری کوئی زندگی ہے، کتنے خوب صورت گھر ہوتے ہیں۔ ڈراموں میں دیکھو، گھر کم محل زیادہ لگتے ہیں، ایک ہمارے گھر ہیں، کبھی ایک کمرے میں دو بلب بھی نہیں جلتے اور ان کے تو زینوں پر بھی اتنے بڑے، بڑے فانوس جلتے ہیں میرا تو دل چاہتا ہے۔ سب چھوڑ چھاڑ کر ٹی وی کی دنیا میں چلی جاؤں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''ارے ہمارے ایسے نصیب کہاں؟'' شمسہ کا لہجہ رویا۔

☆☆☆

''بس کیا کریں اللہ کو یہی منظور تھا۔'' مختاراں بی بی نے ململ کے ملگجے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے ... عبدالقدوس کی کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے ہوئے کہا...... آنسو بہاتے عبدالقدوس کو تسلی دی۔

عبدالقدوس چند دن پہلے کام پر گیا تو راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور جان تو بچ گئی لیکن ڈاکٹر کو ٹانگ کاٹنی پڑی۔

بیٹا کوئی تھا نہیں...... مختاراں بی بی آج کل کام پر بھی نہیں جا پا رہی تھی جبکہ اس کی باجی کئی دفعہ بلوا چکی تھیں لیکن شوہر کو اس حال میں چھوڑ کر گھر سے نکلنا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''تم کرو گی کام؟'' سرخ و سفید رنگت، خوب صورت کتابی چہرہ، سبز آنکھیں بغیر کنگھا کیے بندھی لمبی سی چوٹی، چہرے پر بلا کی معصومیت اور الھڑ پن...... بیگم شیراز نے سر سے پیر تک اس لڑکی کا جائزہ لیا جسے اس کی ماں چھوڑ کر گئی تھی۔

''جی باجی جی......'' آواز تھی یا کسی نے ساز چھیڑ دیا تھا۔

''گدڑی میں لعل......'' شیراز صاحب نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سراہا۔

''نہیں یہ نہیں چلے گی اس قدر خوب صورت لڑکی...... چلو جب تک کوئی اور نہیں ملتی اسی سے کام چلاتی ہوں۔'' مسز شیراز نے گھبرائے ہوئے دل کو سمجھایا۔

''چلو منہ کیا تک رہی ہو اور آپ کیوں نہیں اٹھ رہے، جائیں آفس کے لیے تیار ہوں اور چلو لڑکی میں تم کو کام سمجھا دوں۔'' مسز شیراز نے تڑختے ہوئے لہجے میں شیراز صاحب کو ڈانٹا اور پھر شمسہ کو لے کر کچن کی طرف چل دیں۔

''ارے میری موٹی بھدی بیگم، گھر میں موتیا کا پھول مہک رہا ہے، کس کا دل چاہے گا دفتر جانے کا۔'' ان کے دل نے دہائی دی۔

☆☆☆

''حمیدہ میں تجھ کو بتا نہیں سکتی کتنا بڑا بنگلا ہے اور رہنے والے بس چار...... ایک باجی، ایک ان کے میاں اور دو بچے...... سارا گھر ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے، چکنے فرش،، قیمتی فرنیچر، بالکل ڈراموں جیسا گھر ہے...... اور وہ جو باجی کی بیٹی ہیں ناں حنا باجی...... ایک سے ایک کپڑے پہنتی ہیں، میرے خیال سے کوئی سوٹ دوبارہ نہیں پہنتیں، پتا ہے خود باجی بھی دس، دس ہزار کے لان کے سوٹ پہنتی ہیں۔ اللہ سچ میرا بھی بڑا دل چاہتا ہے، میں بھی بڑی، بڑی شیشوں کے دروازوں والی دکان سے کپڑے خریدوں، میک اپ لوں اور پھر بالکل ڈراموں جیسے گھر میں رہوں۔'' شمسہ آنکھیں بند کیے بولے جا رہی تھی۔

''لیکن ہمارے ایسے نصیب کہاں...... ایسے خواب ہی کیوں دیکھتی ہے۔ جس کی تعبیر ناممکن ہو......'' حمیدہ کا لہجہ رو رہا تھا آج ہی اس کا رشتہ اس کے خالہ زاد کے ساتھ طے ہوا تھا جو موسم کے پھلوں کا ٹھیلا لگاتا تھا...... بس نصیب میں اتنا فرق آنا تھا کہ ٹین کی چادروں والے گھر سے وہ سیمنٹ کی چادروں والے گھر میں جا رہی تھی۔

''کیوں؟ کیوں خواب کیوں نہ دیکھوں، اری حمیدہ یہ بڑی، بڑی گاڑیوں میں پھرنے والیاں، یہ اداکارائیں بالکل بھی خوب صورت نہیں ہوتیں، بس میک اپ، قیمتی، قیمتی کپڑے اور شاندار زیورات ان کو خوب صورت بنا دیتے ہیں...... میں تو ویسے ہی بہت خوب صورت ہوں۔''

''تم کو پتا ہے کہ تم کتنی خوب صورت ہو، تم کو تو کسی محل میں رانی کی طرح رہنا چاہیے۔'' شمسہ کے کانوں میں شیراز صاحب کی سرگوشی سرسرائی جو انہوں نے اس کو موبائل تھماتے ہوئے اس کے کانوں میں کی اور ہلکی سی موبائل کی قسط بھی وصول کر لی۔ جسے ادا کرتے وقت شمسہ کو بالکل برا نہیں لگا۔

☆☆☆

''لاؤ میں اس میں ڈاؤن لوڈ کر دوں......''

حنا باجی نے whatsapp, fb اور دوسرے apps اس کے فون میں ڈاؤن لوڈ کر دیے۔ ''بس باجی مجھ کو تو بہت شوق ہے میں نے بیسی ڈال کر فون لیا ہے۔'' حنا باجی کے پوچھے بغیر شمسہ کے دل کے چور نے جھوٹ بولا۔

باجی، جی کے گھر میں وائی فائی کی سہولت موجود تھی، وہ سارا دن بہت ساری چیزیں جس میں نوے فیصد ڈیزائنرسوٹ اور ریپلکا کی پکچرز ہوتیں ڈاؤن لوڈ کرتی اور پھر جب وہ گھر آتی تو بستر پر لیٹ کر وہ سارے کپڑے اورزیورات دیکھتے، دیکھتے سوجاتی۔

☆☆☆

''ام......آج میرا بالکل دل نہیں ہے گھر میں کھانا کھانے کا۔'' اس نے بہت ناز سے ہینڈسم سے اس مرد سے کہا جواس کا شوہر تھا۔

''تو کوئی بات نہیں میری جان! نہ کھاؤ......چلو باہر چلتے ہیں لانگ ڈرائیو پر اور پھر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ سے کھانا بھی کھالیں گے......'' ڈاکٹر علی نے محبت سے اس کے ہاتھ کو چوما۔

خوب صورت لان کا ڈیزائنر... ایمبرائڈرڈ بلیک سوٹ شولڈر پر میرون اور سیاہ باریک کڑھائی کی شال۔ ستواں ناک میں جگمگاتی ہیرے کی لونگ، گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کا لاکٹ، شانوں تک کا خوب صورت ہیئر کٹ جن کو بینڈ میں جکڑنے کی کوشش کے باوجود شہد آگیں لٹیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اس نے پرفیوم کا اسپرے کرتے ہوئے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی، سفید شرٹ اور بلیو جینز میں مسکراتے محبت برساتی آنکھوں سے دیکھتے ڈاکٹر علی کے عکس کو آئینے میں دیکھا تو ایک عجیب سے سحر انگیز سرور میں اس کا وجود لہرانے لگا۔

ڈاکٹر علی، جو ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ماڈلنگ بھی کرتا تھا وہ اس کا تھا، اس کا دیوانہ تھا، اس کا شوہر تھا۔

''میرا موڈ چائنیز کھانے کا ہے۔'' ٹھنڈی یخ v.8 میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ناز بھرے نخریلے لہجے میں اس نے کہا۔

''جو حکم بیگم صاحبہ......ہمارا کیا ہے؟ ہم تو بس آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔''

علی نے میوزک تیز کیا اور گاڑی میں مدھر آواز سحر پھیلانے لگی۔ علی پر مدھوشی طاری ہونے لگی، روڈ پر برستی دھواں دھار بارش، پُرآسائش گاڑی، خوب صورت میوزک اور پہلو میں بیٹھی حسین من چاہی بیوی......

''دیکھ کر علی......'' وہ ایک دم چیخی۔

علی کی گستاخیوں سے گھبرا کر اس نے علی کی توجہ سڑک پر مرکوز کروائی۔

''اری کیا ہوگیا، کس علی کو روک رہی ہے، پاگل تو نہیں ہوگئی، ایک تو ویسے ساری رات کمبخت مچھروں اور کھٹملوں کی وجہ سے نیند نہیں آتی اور پھر اس کے دورے۔'' مختاراں نے اپنے پلنگ سے اٹھ کر کس کے ایک ہاتھ اس کی کمر پر مارا۔

ٹین کی چادر والا کمرا جس کی دیواریں پلستر سے بے نیاز تھیں، بان کی چارپائی پر روئی کا میلا سا گدا، برابر میں سوئی ماں اور ذرا سا ہٹ کر چارپائی پر لیٹا بیمار باپ......ایک لمحے میں شمسہ آسمان سے زمین پر آگری۔

''اُف خدا......کتنا حسین خواب تھا......لیکن ان خوابوں کی تعبیر مجھے کیسے ملے گی؟'' شمسہ نے کمر سہلاتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا......وہ جانتی تھی کچھ سوالوں کے جواب خود ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور وہ سوالوں کے جوابات ڈھونڈنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

بعض اوقات کوئی بات، کوئی چیز کسی کے لیے بالکل غیر اہم اور وہی کسی دوسرے انسان کے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ چیزیں جو باجی اور ان کی بیٹی ڈسٹ بن میں ڈال دیتیں، استعمال شدہ لپ اسٹک، ہیئر برش، بچے کھچے لوشن والی بوتلیں اور بہت کچھ وہ سمیٹ کر گھر لے آتی۔ لیکن اسے اب استعمال شدہ چیزوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ تو وہ حمیدہ کو دے دیتی۔

اسے اپنے حسن کی قیمت کا اندازہ ہو چکا تھا...... بڑے صاحب، چھوٹے صاحب سے لے کر ڈرائیور اور خانساماں سب کی عنایتیں اس پر جاری تھیں......اور یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ان عنایتوں کے عوض وہ کس چیز کی ادائیگی کرتی تھی۔

☆☆☆

''یہ جوڑا، یہ کہاں سے آیا؟'' آج جب کام پر جاتے ہوئے اس نے بلیک شرٹ، فان شلوار اور میرون سلک کے دوپٹے والا جوڑا پہن کر اپنی گہری سبز آنکھوں میں سیاہ کاجل لگایا تو مختاراں بی بی کا جانے کیوں دل کانپا۔

''اس کمبخت غفورے درزی سے کہا بھی تھا اتنا کس،

کس کرناپ لے رہا تھا۔ ناپ تو لے، لے لیکن سیئو ذرا ڈھیلا...... آپ اماں کو ہو گیا ناں شک......''

''حنا باجی کا سوٹ ہے اماں......'' اس نے نظریں چرائیں۔

''تو کمبخت ایسا خوب صورت جوڑا جہیز میں رکھ دیتی ناں...... تو بھی چڑھا کر کھڑی ہو گئی۔'' وہ اس سوٹ میں کس حد تک حسین لگ رہی تھی مختاراں بی بی ماں تھی اور ماں کے دل کو اللہ جانے کیسے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے......

اس کے دل و دماغ میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں...... لیکن ہائے مجبوری...... بیمار شوہر...... گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں کام پر کس کو بھیجے......

''چل تو گھر بیٹھ، ابا کا خیال رکھ، آج سے میں جاؤں گی۔'' مختاراں نے سر پر چادر جمائی اور شیشے کے آگے کھڑی شمسہ کو ہق دق چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

گلی کے نکڑ پر کھڑا وہ لڑکا، جنرل اسٹور والا، جہاں وہ روز بیٹھ کر کوک پیتی تھی، انتظار میں کھڑا ورزی جو تقریباً روز خالی دکان میں اس کا انتظار کرتا، کبھی کوئی سوٹ دے دیتا اور کبھی اس کے خرچے کے لیے پیسے، وہ حلوائی جس کی دکان سے اکثر وہ گلاب جامن اٹھاتی تو شیرا حلوائی کے بیٹے کے ہونٹوں سے ٹپکتا...... جسے پونچھنے کی کبھی وہ اجازت دے دیتی کبھی اسے کلستا ہوا چھوڑ جاتی۔

سب حیران تھے مختاراں بی بی کو دیکھ کر سب ہی کے چہرے مرجھا گئے اور گھر میں بیٹھی شمسہ اس طرح زاروقطار رو رہی تھی۔ جیسے کسی کا جنازہ اٹھا ہو۔

جنازہ اٹھا تو تھا، اس کی آزادی کا...... اس کے پر نکل آئے تھے، پنجرے میں وہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بستر پر لیٹے باپ اور بس میں جاتی ماں کو پتا نہیں تھا اب پر کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

کاش......!

☆☆☆

''نہیں بھئی اب تم سے کام نہیں ہوتا تم اپنی بیٹی کو ہی بھیجو، دیکھو تم تو کپڑوں پر برش بھی نہیں لگا پا رہی ہو۔'' باجی جی قمیص کا کالر دکھاتے ہوئے مختاراں بی بی پر برس ہی تو پڑیں۔

اور پھر دوسرے دن سے شمسہ پھر کام پر روانہ...... کسی کو مسکرا کر سلام کیا تو کسی کی شرارت پر کہنی ماری...... ڈراموں میں بھی تو لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔

''وہ میرے جیسے کسی گھر کی لڑکی ہی تو تھی، جواب شہرت کی بلندیوں پر کھڑی ہے۔ ہائے کیا اسٹائل ہے اس کا......''

اب وہ بہت سی باتیں صرف اپنے آپ سے کرتی...... حمیدہ سے بھی چھپاتی، بہت جلدی اس کو راز اور بات میں فرق سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

''لے لوں......'' اس نے خرم سے پوچھا جو کئی دنوں تک موٹر سائیکل پر اس کا پیچھا کرتا رہا اور پھر بات چل ہی نکلی، ویسے بھی بڑی سی توند والے شیراز صاحب سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کے تو منہ کو خون لگ گیا تھا، نئی، نئی دوستیاں اسے اچھی لگتیں۔

''ویسے فلمی اداکارائیں بھی تو ایسا ہی کرتی ہیں، سارے زمانے سے دوستیاں رکھتی ہیں اور پھر شادی بھی کسی امیر کبیر سے کر لیتی ہیں اور میں کیا کسی اداکارہ سے کم ہوں......'' اس نے روز کی طرح اپنے آپ کو باور کرایا اب تو غفورے، شکورے ٹائپ لڑکے اسے اچھے بھی نہیں لگتے تھے۔ اس کا معیار بہت تیزی سے بدل رہا تھا۔

لیکن اب وہ سمجھدار ہو گئی تھی، تحائف بہت خاموشی سے ٹرنک میں چھپا دیتی، گھر سے چادر اوڑھ کر نکلتی اور پھر جب موقع ملتا تو ان تحائف کو استعمال کرتی، اب تو اسے کافی بھی اچھی لگنے لگی تھی، چائے اسے غریبوں کا مشروب لگتی۔

جب اس کی فیورٹ ماڈل نے خوب صورت سا سوٹ پہن کر منہ ٹیڑھا کر کے کافی کی تعریف کی تھی اس کے لیے یہی کافی تھا۔ اب اسے ڈیزائنر کے نام اور ریسٹورنٹ میں آرڈر دینا بھی آ گیا تھا۔

اور جو کبھی، کوئی دیر تک روک لیتا تو وہ جا کر مزے سے مختاراں کے ہاتھ پر پانچ سو رکھتی اور کہتی باجی کے گھر مہمان آئے تھے ناں انہوں نے روک لیا تھا، یہ پیسے دیے ہیں اور اپنی گاڑی میں چھڑوا دیا ہے۔

مختاراں ہاتھ اٹھا کر باجی کو دعا دیتی اور پھر شمی کو (شمسہ اب اپنے آپ کو شمی کہلواتی تھی) سینے سے لگا کر

پیار کرتی، اس کی چھوٹی سی بیٹی نے، بیٹوں کی طرح گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

''اب وہ دو گھروں میں کام کرتی ہے اسی لیے اسے اکثر دیر ہو جاتی ہے تو پریشان نہ ہوا کر۔''

مختاراں میاں کو سمجھاتی، وہ باپ تھا مرد تھا، چل نہیں سکتا تھا لیکن سوچ تو سکتا تھا ناں......

گھر میں آسودگی آنے لگی تھی، شمی اکثر کھانا باجی کے گھر سے کھا کر آتی۔

''نمی باجی بہت اچھی ہے ہر دو چار دن بعد 1000,500 دے دیتی ہے۔ شمی کو کہتی ہے اپنے ابا کے لیے فروٹ لے جانا۔''

مختاراں نے سیب کی قاشیں کاٹ کر میاں کو کھلاتے ہوئے عقیدت واحترام سے بتایا۔

☆☆☆

''ہاں...... یار لے لو......'' جب شمی نے خرم کو بتایا کہ اسے شیشے والی دکانوں سے ڈیزائنر کے اصلی سلے سلائے سوٹ خریدنے کا بہت شوق ہے تو خرم اسے ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں لے آیا، یہ دنیا کون سی ہے یہاں پر خریداری کرنے والی عورتیں کیا اسی زمین پر رہتی ہیں، خوشبو سے مہکتی، لمبی، لمبی گاڑیوں سے اترتی ..... بے دریغ شاپنگ کرتی، کہیں پانچ سو کی گڈی ہاتھ میں پکڑی بل ادا کرتی اور کہیں کریڈٹ کارڈ دیتی خواتین کو دیکھ کر اس نے ایک حسرت سے سوچا......

اسے بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سوٹ پسند کر رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے ہاتھ باندھے سیلز مین چل رہا تھا، وہ جس سوٹ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی، سیلز مین لپک کر سوٹ اٹھا کر اسے دکھاتا۔ پھر اس کو ایک سوٹ پسند آ ہی گیا۔

آج خرم اسے اپنی ماں سے ملوانے لے کر جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ ضرور پسند کر لی جائے گی۔ جب حمیدہ نے اس سے کہا کہ ایسا ناممکن ہے تو اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تو، تو ساری زندگی کنویں کا مینڈک ہی رہے گی۔ میں نے بہت ساری فلمیں دیکھی ہیں اور ڈرامے بھی...... محبتوں کے آگے سب ہار مان جاتے ہیں، خرم کی

تو کئی فیکٹریاں ہیں، اس نے اپنے گھر والوں کو منالیا ہے' موٹر سائیکل تو وہ شوقیہ چلاتا ہے، ورنہ اس کے پاس چار، چار لمبی، لمبی گاڑیاں ہیں۔''

''تو نے دیکھی ہیں؟'' حمیدہ کے سوال نے ایک لمحے کے لیے اسے چپ سا کروا دیا۔

اماں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ '' آج اسے دیر ہو جائے گی اور ہوسکتا ہے وہ باجی کے گھر ہی رک جائے کیونکہ وہاں بہت بڑی دعوت ہے، باجی کہہ رہی تھی کہ اگر رات کو روکا تو الگ سے پیسے دے دوں گی۔''

مختاراں خاموش رہی، اب اکثر باجی اسے رات کو روک لیتی تھیں۔ لیکن اتنے پیسے وہ ضرور لے آتی تھی کہ ہفتہ بھر کے لیے پھل اور دوائیاں آجاتی تھیں۔

☆☆☆

''واہ! تم تو بالکل بدل گئیں۔'' جب وہ ڈیزائنر سوٹ اور نئی چپل پہنے ایک بہت بڑے پارلر سے پارٹی میک اپ کروا کر باہر آئی تو خرم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

واقعی آج...... اسے اپنی حیثیت اور خوب صورتی کا احساس ہوا۔ جب پارلر کے قدِ آدم آئینے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو اس کے دل سے بڑی باجی کے لیے دعائیں نکلیں نہ وہ اماں کو رنگین ٹی وی دیتیں اور نہ ہی اس کی دنیا رنگین ہوتی...... کیا اس کی زندگی رنگین ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''کچرا کنڈی میں کسی لڑکی کی کٹی پھٹی لاش پڑی ہے۔'' رات کے اندھیرے میں شور مچ گیا تھا۔ موذن صاحب اذان دینے مسجد جارہے تھے کہ ان کا پیر کچرا کنڈی کے قریب پڑی اس لاش پر پڑا تھا جو پھٹے پُرانے کپڑوں میں برہنہ تھی۔ جس کے جسم پر سگریٹوں کے داغ تھے...... غریبوں کا محلہ، دروازے سے دروازہ ملا، چند لمحوں میں پورا محلہ جاگ گیا، کوئی بھاگ کر ٹارچ لے آیا...... اور پھر جیسے سارے محلے کو سانپ سونگھ گیا۔ اور مختاراں بی بی چادر لینے کے لیے بے ساختہ اپنے گھر کی طرف دوڑی......

☆☆☆

''میں آپ کے لیے انصاف مانگوں گی، میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی نہیں یہ ایک عورت کا نہیں ساری انسانیت کا قتل ہے۔'' وہ ایک فلاحی ادارے سے وابستہ وکیل تھی۔ اس نے نفرت سے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لیے مجرموں کو دیکھا اور پھر سسکتے ہوئے اس مرد کو تسلی دی جو اکیلا تھا، جو آج اپنی بیوی کو دفنا کر آیا تھا، جو بیمار تھا، جو لاچار تھا، جو حسرت اور خوف سے مجرموں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر کی ٹین کی چھت اتنی کمزور تھی اور وہ بے خبر تھا......

☆☆☆

بے خبر تو وہ بھی تھی......

''اتنی بڑی کوٹھی......اتنے کمرے......لیکن گھر میں کوئی نظر نہیں آرہا......'' وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ میری جان......'' خرم اسے گیسٹ روم میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھے جارہی تھی۔ خرم کمرے میں واپس آکر اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا کہ وہ اتنے قریب کھڑا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اسے خرم سے عجیب سا خوف محسوس ہوا......

''تمہاری امی اور بہنیں کہاں ہیں؟ کوئی نظر نہیں آرہا؟''

''ارے سب یہی ہیں، یہ کوئی ایک کمرے کا کوارٹر تھوڑی ہے کہ سب ایک دوسرے پر چڑھے بیٹھے ہوں، یہ دو ہزار گز کی کوٹھی ہے میڈم جس کا ایک کمرا مشرق میں ہے تو دوسرا مغرب میں......بس سب آنے ہی والے ہیں۔'' اس کی گرفت ذرا سخت ہوئی......اس کے منہ سے گھٹی، گھٹی آواز میں نکلا۔

''نہیں خرم......'' اور پھر جیسے اس کے وجود کے ساتھ، ساتھ اس کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں...... اور وہ بے ہوش ہو کر خرم کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ نشے میں دھت، بے ہنگم قہقہے لگاتے اوباش نوجوان اسے نوچ رہے تھے......رات کا کون سا پہر تھا جب آنکھ کھلی، شاید اسے کوئی نشہ آور چیز کھلائی گئی تھی۔

''گینگ ریپ؟''

اس کے اندر کوئی چیخا، اس نے اٹھنا چاہا۔

☆☆☆

ساری الماری برانڈڈ سوٹوں، شوز سے بھری پڑی تھی۔ اس نے ایک مہنگی برانڈ کے پرفیوم کی حسین بوتل کو

اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جلدی سے اپنے اندر سے اٹھتی سڑانڈ سے گھبرا کر وہ بوتل اس طرح الماری میں پھینکی جیسے وہ کوئی سانپ ہو، خوب صورت بیگوں سے جھانکتے رنگ، برنگے کپڑے اسے پھنکارتے ناگ لگے...... جو اس کے سارے وجود کو ڈس گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر کمرے کی سیلن زدہ دیواروں کو دیکھا تو اس کا دل چاہا ان سیلن زدہ دیواروں سے لپٹ، لپٹ کر روئے جو ہمیشہ سے اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹے حفاظت کیا کرتی تھیں۔ پھر اس نے کمرے میں موجود واحد دھندلے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور...... اور سفید چہرے پر سرمئی جھائیاں یہ اس کا چہرہ تو نہیں تھا یہ تو کسی بیمار، لاغر، بوڑھی سی عورت کا چہرہ تھا۔

''بیٹا کپڑے بدل لے، ڈاکٹر اٹھ جائے گا۔'' اس کی اماں نے دوسری دفعہ کمرے میں جھانک کر اس سے کہا۔

اس کی ماں، کتنی فکر مند تھی...... اس نے پلٹ کر میلے دوپٹے کے پلو کو کھول کر نوٹ گنتی ماں کو دیکھا اور پھر...... قطرہ، قطرہ آنسو اس کے دل پر گرنے لگے......

ایک دم اسے اپنے وجود میں کسی اور وجود کی سرسراہٹ محسوس ہوئی تو وہ لرز کر رہ گئی...... اس نے گھبرا کر ماں کو دیکھا اور پھر جلدی سے الماری کے دروازے کی آڑ میں ہو کر اپنے اندر کلبلاتے وجود کو جیسے اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کی۔

''آئی اماں......''

☆☆☆

''جج صاحبہ ...... یہ ایک لڑکی کی خودکشی کا معاملہ نہیں ہے، یہ ایک معصوم لڑکی کا قتل ہے، بہت سارے قتل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس میں نہ مقتول کے خون سے قاتل کے ہاتھ رنگتے ہیں، نہ گولی چلتی ہے، نہ سینے میں چاقو اترتا ہے لیکن قتل ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ایک قتل ہے...... یہ ایک بیمار...... لاچار...... باپ اور گھر، گھر برتن مانجھتی ماں کی خوب صورت، نوجوان، ارمانوں سے بھری بیٹی کا قتل ہے اور آپ جانتے ہیں قاتل کون ہے...... جناب عالیہ......''

وہ رکی۔ ''قاتل ہیں وہ ڈیزائنر جو ماڈل کو پیرس اور لندن لے جا کر مہنگے ترین ملبوسات پہنا کر ایک بناوٹی دنیا سجا کر...... ان غریب لڑکیوں کے دلوں میں حسرتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا جس ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتا ہو، جہاں فی کس آمدنی 1800 روپے سے بھی کم ہو وہاں 12000 کا لان کا سوٹ......؟ جو ایک مخصوص کلاس ہی افورڈ کر سکتی ہے...... سارے شہر میں پوسٹر اور بل بورڈز کیوں لگائے جاتے ہیں، ایک غریب ملک میں جہاں ایک مجبور عورت دو سو روپے میں یا صرف دس کلو آٹے کے تھیلے کے لیے اپنی عزت بیچنے پر تیار ہو جائے ...... جہاں دس سالہ بچہ کچرے میں سے کھانا چن کر کھاتے ہوئے شیشہ نگل جائے، جہاں ایسے بھی لوگ بستے ہوں جو بڑھاپے کی دہلیز پر آ جانے تک بھی صرف جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹانگیں پھیلا کر اپنی جھونپڑیوں تک میں کبھی نہ سوئے ہوں، وہاں حسین محلات نما گھروں میں ڈرامے فلمائے جاتے ہیں۔ جہاں حقیقت سے دور کہانیاں فلمائی جاتی ہوں، ارے جناب...... اب تو بہن، بھائی بھی اسٹیٹس کے حساب سے چلتے ہیں، اس معاشرے میں ایک رائٹر یہ لکھ رہی ہے کہ غریب ملازم کی بیٹی کو گھر کے مالکان عزت سے اس کے کچے گھر سے محل میں بیاہ لائے ہیں...... تو جناب کچے گھروں کی لڑکیاں خواب بھلا کیوں نہیں دیکھیں گی...... خوب صورت، مالدار...... تعلیم یافتہ، شریف شہزادے کے لیے وہ اپنے کچے گھروں کی دیواریں کیوں نہیں پھلانگیں گی......

''جن گھروں میں ملازمین گھر کے ریفریجریٹر کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ان گھروں میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک یتیم لڑکی ایک ریاست کی رانی بن گئی...... تو مجھ سمیت ہر لڑکی رانی کیوں نہیں بننا چاہے گی...... لیکن معزز جج صاحبہ ایسا اگر ہوتا ہے تو صدیوں میں کبھی ایک بار ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے، یہ مہنگے ملبوسات کے اشتہارات، یہ سڑکوں پر برانڈڈ کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں کے بل بورڈ، یہ مہنگے فون سیٹ کا شوق، خوب صورت لمبی، لمبی گاڑیوں کے دکھاوے......'' لیڈی وکیل نے کچھ لمحہ توقف کیا پھر جج صاحبہ کو مخاطب کیا۔

''می لارڈ...... یہ سب...... یہ سب ہماری نئی نسل کو ذہنی مریض بنا رہے ہیں، چیزوں کی طلب، ہوس میں بدل رہی ہے۔ ہماری نوجوان نسل اعلیٰ تعلیم، خاندانی اقدار،

اعتدال پسندی، صبر و قناعت، محنت، کوشش اور تہذیب کو بھول کر ان مادی چیزوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ اور پھر......اور پھر جنابِ عالیہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ شریف گھروں کے لڑکے، تعلیم یافتہ مہذب لڑکے گن لے کر روڈوں پر جا کھڑے ہوتے ہیں جو ناتجربہ کار ہوتے ہیں، وہ دھر لیے جاتے ہیں... مشتعل عوام انہیں زندہ جلا دیتی ہے۔ میں کہتی ہوں ڈاکو وہ نہیں بلکہ یہ لوگ ہیں جو ان کی آنکھوں میں خواب بھر دیتے ہیں......خواب دیکھنا اچھی بات ہے لیکن زندگی کو جتنا آسان اور گلیمرائز کر کے یہ میڈیا پیش کرتا ہے، زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ ......خوب صورت مالدار لڑکے کے ساتھ، مہنگے ترین مالز میں شاپنگ کرتی کالج یونیفارم میں لڑکی دکھاتے ہوئے، وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے گھر میں بھی بیٹی موجود ہے، جنابِ عالیہ میری گزارش ہے آج کٹہرے میں، ان تمام رائٹرز......پروڈیوسرز......اور ڈیزائنرز کو بلایا جائے اور پھر شمسہ کے قتل کا مقدمہ چلا جائے۔ شکریہ جنابِ اعلیٰ......! مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔''

نوجوان وکیل نائلہ نے اپنی بات مکمل کی......اور ان چاروں لڑکوں کو گھورتی اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔

''تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہ چاروں لڑکے جنہوں نے شمسہ بی بی بنت کرم دین کا گینگ ریپ کیا......اور بالآخر اسے خودکشی کرنی پڑی۔ یہ بے قصور ہیں۔'' جج بھی ایک خاتون ہی تھیں، طنزیہ مسکراہٹ سے انہوں نے ایڈووکیٹ نائلہ سے سوال کیا۔

''نہیں جنابِ عالیہ......!'' ایڈووکیٹ نائلہ اپنی کرسی سے کھڑی ہوئی۔

''یہ تو مقدمے کے ہتھیار ہیں، یہ تو خنجر ہیں، یہ تو پستول ہیں جو قتل میں استعمال ہوئے......میں عرض کر رہی ہوں اصل مجرموں کو کٹہرے میں لایا جائے، یہ چاروں تو آلۂ قتل ہیں، میں عرض کر رہی ہوں ان ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جائیں جنہوں نے آلۂ قتل استعمال کیا۔ ہم ایک موبائل چور کو پکڑتے ہیں تو اسے زندہ جلا دیتے ہیں لیکن وہ لوگ، جو ہماری نسلوں کو تباہ کر رہے ہیں جو لڑکیوں کو خودکشی اور لڑکوں کو گن لے کر سڑک پر کھڑا کر دینے کے ذمے دار ہیں، میں ان مجرموں کی بات کر رہی ہوں، میں شمسہ کے اصل قاتلوں کی بات کر رہی ہوں۔'' می لارڈ!'' بولتے، بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

عدالت میں بیٹھے لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کس قسم کا مقدمہ تھا۔

☆☆☆

''ارے تمہارے اس کیس کا کیا ہوا تھا؟ جس نے سارے شہر کو ہلا کر رکھا تھا۔ ہر ٹاک شو، ہر اخبار میں اسی کی ہی بات ہو رہی تھی......مجھے کینیڈا جانا پڑ گیا تھا۔ میں وہاں مصروف ہو گئی اب لوٹی ہوں تو سوچا تم سے معلوم تو کروں فیصلہ کیا ہوا تھا؟''

ایڈووکیٹ ندا نے چائے کا سپ بھرتے ہوئے اپنی کالج کی سہیلی ایڈووکیٹ نائلہ سے پوچھا تھا جو اب پریکٹس چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ ندا سال بھر کے بعد وطن لوٹی تھی۔ اس دوران نائلہ سے رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ آج ملاقات پر اسے مشہور زمانہ کیس یاد آیا تھا۔

''فیصلہ؟ فیصلہ کیا ہونا تھا جس قوم میں ظالموں کی پشت پناہی کی جائے وہاں بے گناہ یونہی بے دردی سے مارے جاتے رہیں گے۔ ہونا کیا تھا ایک دفعہ پھر کلاس کا فرق درمیان میں آ گیا؟ غریب کی بیٹی بے مول ٹھہری اور انصاف بک گیا، قانون اندھا ہوتا ہے، یہ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں لیکن یہاں قانون، اندھا، گونگا اور بہرہ بھی ہے۔ یہ مجھے اب پتا چلا۔''

''اس کا حل کیا ہوگا؟'' ندا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کیا اسی طرح ہر روز کسی نہ کسی گھر میں کوئی نہ کوئی شمسہ گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرے گی اور اس کے قاتل وکٹری کا نشان بناتے ہوئے پروٹوکول میں اپنے گھر چلے جائیں گے؟ اس کی ماں پاگل ہو کر سڑکوں پر گھومتی پھرے گی اور اس کا معذور عزت دار باپ بھیک مانگے گا؟''

''ہاں یہی تو ہوگا......یہی ہوتا ہے اور یہی تو ہوتا آیا ہے۔'' کہتے، کہتے نائلہ دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی اور پھر آنسوؤں میں ایڈووکیٹ ندا کے ساتھ اپنی کچی قبر میں سوئی شمسہ کے آنسو بھی شامل ہو گئے......





اِنتقام

شہلا جمال

”امی، میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔“ فرح نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں کو مخاطب کیا۔ درد کے آثار اس کے چہرے پر واضح نظر آ رہے تھے۔

”بیٹا ایسا ہو جاتا ہے، سونے میں تم نے غلط کروٹ لے لی ہوگی۔“ رابعہ بیگم نے تسلی دی۔

”نہیں امی، یہ درد مجھے کئی دن سے ہو رہا ہے مگر آج ذرا زیادہ لگ رہا ہے بس آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں، اسی لیے میں نے آج آفس سے چھٹی بھی کی ہے۔“ فرح نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے چلو ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ رابعہ بیگم فوراً تیار ہو گئیں۔

”بیٹا تم آفس سے دو دن کی چھٹی لے لو تاکہ یہ تمام ٹیسٹ ہو سکیں جو ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیے

ہیں۔'' رابعہ بیگم نے چیک اپ کے بعد فرح کو تاکید کی۔
''امی آفس میں بہت کام ہے۔ اگلے ہفتے کوشش کر کے چھٹی لے لوں گی۔''
''نہیں بیٹا، جان سے بڑھ کر قیمتی کچھ نہیں ہوتا تم آج ہی چھٹی کے لیے بات کرو۔ ورنہ میں خود بات کروں تمہارے باس سے۔'' رابعہ بیگم بیٹی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھیں۔
''اچھا امی میں چھٹی لے لوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔'' فرح نے آخر ہار مان لی۔ دونوں گھر آ گئی تھیں۔
''کیا کہا ڈاکٹر صاحبہ نے۔'' سرمد کو پتا چلا تو اس کی خیریت معلوم کرنے لگا۔ سرمد اس کا شوہر جس سے ابھی صرف نکاح ہوا تھا۔
''ڈاکٹر صاحبہ نے دوائیں دی ہیں، ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ اور مختلف ٹیسٹ کرانے کو کہا ہے دو دن میں دواؤں سے درد میں کمی تو ہوئی ہے۔'' فرح نے جواب دیا۔
''دیکھو تم پریشان مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا اور یہ سارے ٹیسٹ جلد سے جلد کرا لو۔'' سرمد نے اسے تاکید کی۔

☆☆☆

ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹ آنے میں تین دن لگ گئے پھر اس کے بعد ڈاکٹر صاحبہ کو دکھانے کا مرحلہ تھا۔ آج وہ پھر رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس آئی تھیں۔
''دیکھیں رابعہ بیگم فکر کی کوئی بات نہیں۔ دراصل الٹرا ساؤنڈ اور دیگر ٹیسٹ میں فرح کو چھاتی کا کینسر تشخیص ہوا ہے۔ اس کا واحد علاج آپریشن ہے جو ہمیں جلد سے جلد کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے رابعہ بیگم کو آگاہ کیا۔
''ڈاکٹر صاحبہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی تو بالکل صحت مند ہے بچپن میں بھی اسے کوئی ایسی بڑی بیماری نہیں ہوئی اور کینسر تو ہمارے خاندان میں آج تک کسی کو نہیں ہوا۔'' رابعہ بیگم روہانسی ہو گئیں۔
''کینسر مرض ہی ایسا ہے جس کی وجوہات کا مکمل تعین ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ اور یہ کوئی موروثی بیماری نہیں ہے جو نسل در نسل چلے۔ فرح کا کیس کافی پیچیدہ ہو چکا ہے۔ آپریشن کر کے ایک چھاتی علیحدہ کرنی پڑے گی۔ تاکہ یہ باقی جسم میں سرائیت نہ کر سکے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے جواب دیا۔ ''ویسے ہو سکتا ہے ایسا نہ بھی ہو مگر آپ کو سب بتانا ضروری ہے۔''
''مگر ڈاکٹر صاحبہ اس کا نکاح ہو چکا ہے چند مہینے بعد رخصتی ہے، وہ کیسے نارمل زندگی گزارے گی۔'' رابعہ بیگم بے حد پریشان ہو گئیں۔
''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپریشن کے بعد وہ ایک نارمل زندگی گزار سکے گی، اس مرض کا علاج وقت طلب ہے۔ آپ فرح کی شادی ضرور کیجیے گا مگر مکمل علاج کے بعد...... وہ شادی کے بعد ماں بنے گی' ایک نارمل زندگی گزارے گی۔ آپریشن کا مقصد کینسر کو مزید سرائیت کرنے سے روکنا ہے۔ آپ ماں ہیں، آپ کو فرح کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہے اور بہت حوصلے سے کام لینا ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی بات مکمل کی۔
''جی ڈاکٹر صاحبہ میں پوری کوشش کروں گی۔'' یہ کہہ کر رابعہ بیگم نے رخصت لی۔ ان کا دل جانتا تھا کہ بیٹی کی بیماری کا سن کر انہیں کتنا صدمہ ہوا ہے مگر وہ بہت ہمت والی تھیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی تو فرح کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔
وقت نے انہیں مضبوط بنا دیا تھا۔ پچھلے سال ہی سرمد اور فرح کا نکاح ہوا تھا۔ وہ تو اب شادی کی تیاریاں شروع کرنے والی تھیں کہ یہ ناگہانی بیماری اچانک نمودار ہو گئی۔
''میں کیسے فرح کو آپریشن کے لیے راضی کروں۔'' یہ سوچ کر ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
فرح نے دو دن سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ رابعہ بیگم نے جب سے اسے آپریشن کی بات بتائی تھی وہ صدمے میں آ گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی بیماری اس کے جسم میں پل رہی تھی۔
''بیٹا تم ہی اسے سمجھاؤ، ہم سب گھر والے کب سے اسے سمجھا رہے ہیں۔ آپریشن میں ہی اس کی بہتری ہے۔'' رابعہ بیگم نے سرمد سے کہا۔

''جی آنٹی، میں اسے سمجھاتا ہوں۔'' سرمد نے جواب دیا۔

''دیکھو فرح آپریشن کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

''لیکن سرمد یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں؟ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی بیماری مجھے ہوجائے گی۔ تم نہیں سمجھ سکتے جو مجھ پر بیت رہی ہے۔ میں کیسے خود کو راضی کروں۔''

''فرح بیماری کسی کو نہیں دیکھتی۔ بے شک ایسی بیماری قبول کرنا تمہارے لیے بہت مشکل کام ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' سرمد نے اس کی ہمت بندھائی۔

''سرمد میرے کچھ خواب ہیں، میرا کیریئر ہے ہماری شادی اور ہمارا مستقبل...... اس بیچ یہ بیماری کہاں سے آگئی۔''

''فرح ہوسکتا ہے کہ اسی میں اللہ کی کوئی مصلحت ہو ہم نہیں جانتے آگے کیا ہونے والا ہے۔ تم پریشان نہ ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''سرمد بھائی میں اندر آسکتی ہوں۔'' ثنا نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں، دیکھو میں اسے سمجھا رہا تھا اب تم بھی کوشش کرو۔ مجھے کچھ کام ہے، میں چلتا ہوں۔''

''کیسی ہے میری دوست کچھ کھایا پیا۔'' ثنا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ اللہ کرے میں ہی مرجاؤں تاکہ اس بیماری سے نجات ملے۔'' یہ کہہ کر فرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ایسا نہیں کہتے فرح...... زندگی قدرت کا حسین تحفہ ہے۔ اس میں اگر آزمائش آجائے تو دل نہیں ہارتے۔'' ثنا نے اسے گلے لگالیا۔

''میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ یہ اچانک اتنی بڑی بیماری۔''

''سچ ہے موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اسی طرح بیماریاں بھی بنا دستک کے آتی ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم اس قابل ہو کہ اس بیماری کا اچھا سا علاج کرا سکو۔''

''میرا دل کسی بات کو قبول نہیں کرتا' میں کیا کروں۔'' فرح بہت بے چین تھی۔

''تم وہی کرو جو ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ہے۔ تم آپریشن کے بعد بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔ فرح اپنا نہیں تو اپنی امی کا خیال کرو، وہ کتنی ہمت سے کام لے رہی ہیں تاکہ تمہیں ہمت دلاسکیں۔ تمہارے دونوں بھائی تمہاری بیماری کا سن کر باہر سے فوراً آگئے ہیں۔ دیکھو سرمد تمہارے ساتھ ہے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پرسوں تمہارا آپریشن ہے، تم اللہ سے دعا کرو' اللہ نے یہ مشکل دی ہے تو وہی اس سے نکالے گا۔''

☆☆☆

آپریشن کے بعد کا مرحلہ بہت مشکل تھا۔ فرح ہوش میں آنے کے بعد گم صم تھی۔ کئی دن بعد اسپتال سے چھٹی ملی۔ اس دوران اس کی پیاری سہیلی ثنا اس کے ساتھ، ساتھ تھی۔ فرح کی امی اور دونوں بھائی دن رات اسی کوشش میں تھے کہ فرح کا علاج بہترین طریقے سے ہو۔ ابو کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں نے فرح کو کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور اب اس بیماری کا علاج بھی بہترین اسپتال میں کرایا۔

''یہ وقت اور زیادہ مشکل ہے، اس میں مریض آپریشن کے بعد ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر مایوسی اور ناامیدی میں گھر جاتا ہے۔ ایسی کیفیت علاج میں رکاوٹ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اسی لیے آپ فرح کو مایوسی اور ناامیدی سے بچایئے گا۔ اور اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھیے گا۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے رابعہ بیگم کو تاکید کی۔

☆☆☆

''سنو میرے آپریشن کو پندرہ دن ہوگئے ہیں سرمد نہیں آیا؟'' فرح نے آج ثنا سے پوچھا تھا۔

''وہ جس دن تمہارا آپریشن تھا ناں تو اس دن سرمد بھائی اسپتال آئے تھے' وہ بہت پریشان تھے تمہارے لیے۔ دراصل ان کا ٹرانسفر ہوگیا ہے......

اسلام آباد... اسی ہفتے ہیں چلے گئے کہہ رہے تھے فون کریں گے۔ ویسے انہوں نے مجھ سے تمہاری خیریت پوچھی تھی۔''

''سرمد نے اپنا ٹرانسفر کیوں کرایا؟ ہم نے تو طے کیا تھا کہ کراچی میں ہی رہیں گے۔ میری جاب بھی یہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ خود نہ چاہتے ہوں اور ٹرانسفر ہوگیا ہو اب تمہیں فون کریں گے تو پوچھ لینا۔'' ثنا نے اسے تسلی دی۔ جب سرمد کا فون آیا تو فرح کو ہوش ہی کہاں تھا کچھ پوچھنے کا، وہ صرف روتی رہی اور سرمد جلدی آنے کی تسلیاں دیتا رہا۔

☆☆☆

روز و شب ایسے ہی گزرتے رہے موسم گرما رخصت ہوا اور سردیاں شروع ہوگئیں اب فرح کی کافی طبیعت بہتر ہو چلی تھی۔ ڈاکٹر نے اطمینان کا اظہار کیا تھا اب اس نے آفس جانا شروع کردیا تھا۔

''ثنا دیکھو میرے بال کتنے گھنے اور لمبے تھے اب سارے جھڑ گئے ہیں، میں تو بالکل جیسے گنجی سی ہوگئی ہوں۔ میری بھویں بھی جھڑ گئی ہیں۔ جلد کی رنگت بھی کتنی سیاہ پڑ گئی ہے اور میرے ناخن تو بالکل بدرنگ ہو چکے ہیں آخر اللہ نے مجھے کس بات کی سزا دی ہے۔'' فرح روہانسی ہوگئی۔

''بھئی اس بیماری میں علاج کے دوران ایسا ہی ہوتا ہے میری خالہ جان کو بھی بریسٹ کینسر ہوگیا تھا اس لیے مجھے ان تمام باتوں کا علم ہے۔ سب آہستہ، آہستہ نارمل ہوجائے گا۔ شکر کرو میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب اس مرض کے علاج میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔'' ثنا نے تسلی دی۔

''ثنا ہر کوئی مجھ سے اظہارِ افسوس کرتا ہے اور طرح، طرح کے سوالات پوچھتا ہے۔ سب عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ میں کیا کروں۔''

''دیکھو غلط نہ سمجھو فرح، سب تمہاری پروا کرتے ہیں، اس لیے افسوس کا اظہار کرتے ہیں ورنہ کوئی غیروں سے تو خیریت نہیں پوچھتا ناں...... سب اپنوں کے بارے میں ہی فکر مند ہوتے ہیں اس فکر مندی اور اظہارِ افسوس میں محبت کا جذبہ پنہاں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہر ایک کا اپنا الگ انداز ہوتا ہے تم ان باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔'' اس نے فرح کے ہاتھ بڑی نرمی سے پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ثنا تم میری کتنی اچھی دوست ہو۔ تم نے میرا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور اس بیماری میں تو بہت زیادہ، میں جانتی ہوں، امی، بھائی اور تم مجھے ہر وقت منفی خیالات سے نکالنے کی کوشش کرتے ہو اور ہر بات میں مثبت پہلو تلاش کرتے ہو تا کہ میں ناامیدی اور مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ میں تمہاری بہت احسان مند ہوں۔'' فرح کی آنکھیں نم تھیں۔

''احسان مندی کیسی؟ تم میری صرف دوست ہی نہیں بلکہ بہن ہو اور ہم سب ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ کہہ کر ثنا نے فرح کو گلے لگالیا۔ اتنے میں رابعہ بیگم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''بیٹا تمہاری سرمد سے بات ہوئی ہے کیا؟'' انہوں نے ٹرے ایک طرف رکھ کر فرح سے پوچھا۔

''جی امی، دو دن پہلے ہی بات ہوئی ہے۔ آج کل وہ بہت مصروف ہے، ابھی تو ٹرانسفر ہوا ہے اس کے گھر والے بھی اسلام آباد شفٹ ہوگئے ہیں۔ اور ہاں نمرا کی شادی ہونے والی ہے۔'' فرح نے سرمد کی بہن کے متعلق بھی بتادیا۔

''حیرت ہے، نمرا کی شادی ہونے والی ہے اور ہمیں علم ہی نہیں۔ ہماری ان سے رشتے داری بھی ہے اور تمہاری رخصتی بھی تو تمہاری نند کے ساتھ ہی ہونی تھی۔ ان لوگوں نے ہمیں آگاہ ہی نہیں کیا۔'' رابعہ بیگم نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا۔

''امی میری سرمد سے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں مکمل صحت یاب ہوجاؤں تو پھر شادی کی بات کریں گے وہ لوگ، آپ پریشان نہ ہوں وہ جلد ہی کراچی آنے والا ہے۔'' فرح نے ماں کو تسلی دی۔

☆☆☆

آہستہ، آہستہ چیزیں اپنی اصل حالت میں آنے لگیں۔ فرح اپنے آپ میں تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی۔ ناخن اور جلد کی رنگت سب بہتر ہونے لگا۔ یہ اچھے علاج اور گھر والوں کی توجہ و محبت سے ممکن ہوا تھا۔ اب فرح بھی اپنے آپ پر مکمل توجہ دے رہی تھی تاکہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو اور سرمد کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرے۔ دونوں کے نکاح کو دو سال ہو چکے تھے، یہ رشتہ دونوں کی پسند سے طے پایا تھا۔ دونوں نے ساتھ تعلیم حاصل کی رشتے کے وقت دونوں کے گھر والوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پہلے نکاح ہوا اور رخصتی چھ ماہ بعد رکھی گئی تھی مگر فرح کی بیماری کی وجہ سے تاخیر ہوتی چلی گئی۔

''ماشاء اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہو بالکل پہلے والی فرح، میری بہت پیاری بہن اور دوست۔'' ثنا نے فرح کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور گلے سے لگالیا۔ وہ سلونی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''ہاں ثنا، یہ سب تمہاری اور میرے گھر والوں کی مدد اور محبت کی وجہ سے ممکن ہوا...... زندگی اپنی خوب صورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ، ساتھ ہی چلتی چلی جاتی ہے اس لیے اس کے ساتھ، ساتھ چلنا ہی چاہیے۔ نہ جانے کون سا خوب صورت موڑ ہمارا منتظر ہو۔'' فرح نے خوش دلی سے کہا۔

''اتنی مثبت سوچ یہ تم ہو فرح؟'' ثنا نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''ہاں اس مثبت سوچ میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ ہے میری پیاری دوست اور اچھی بہن......'' فرح نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

''اچھا یہ بتاؤ آج کیا سرپرائز ہے جو مجھے یوں اچانک بلایا ہے؟'' ثنا نے پوچھا۔

''پتا ہے آج سرمد اور اس کے گھر والے آرہے ہیں اسی لیے اتنا اہتمام کیا ہے اور جب تم میرے ہر دکھ میں میرے ساتھ ہو تو سکھ میں بھی میرے ساتھ شامل ہو۔'' فرح نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا جی...... یہ سارا اہتمام سرمد بھائی کی آمد کے سلسلے میں ہے اور جناب یہ کوفتے، مچھلی، پلاؤ، پسندے، تکے، شامی کباب، کھیر، لب شیریں جانے کیا، کیا یہ سب تم نے خود بنایا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی بڑے ہوٹل میں آگئی ہوں۔'' ثنا اب اس کے ساتھ کچن میں تھی اور ڈشوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

''ہاں جناب، یہ سب میں نے اور امی نے مل کر بنایا ہے اور تم یہ بتاؤ کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ سرمد اور اس کے گھر والے اتنے دن بعد آرہے ہیں تو ان کی خوب خاطر مدارات ہو۔''

''سب کچھ بہت عمدہ ہے تم پریشان مت ہو۔''

اتنے میں ڈور بیل ہوئی۔ رابعہ بیگم گیٹ کی جانب بڑھیں اور یہ دونوں ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب۔

''ارے یہ کیا سرمد، تم اکیلے آئے ہو باقی گھر والے کہاں ہیں؟'' رابعہ بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''آنٹی دراصل گھر والے چھوٹی بہن کی سسرال گئے ہیں۔ چلیں وہ پھر کبھی آجائیں گے۔'' سرمد نے مدھم انداز میں جواب دیا۔ وہ اسے لیے اندر آگئیں۔

''اچھا تم آؤ بیٹھو، میں فرح کو بلاتی ہوں۔''

رابعہ بیگم نے سرمد کو اکیلے دیکھا تو ایک دھڑکا سا لگا۔ ثنا اور فرح ڈرائنگ روم میں ہی تھیں۔ سرمد کو دیکھ کر دونوں نے سلام کیا۔

''فرح مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' سرمد کچھ پریشان سا تھا۔ جبھی اس نے سلام کا جواب دیے بغیر فرح کو مخاطب کیا۔ ثنا اور رابعہ بیگم ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر باہر لاؤنج میں آگئی تھیں۔

''ہاں، ہاں کہو سرمد میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ اس کا لہجہ محسوس نہ کرسکی تھی۔ ''تمہیں نہیں معلوم سرمد کہ میں تمہیں یہاں اپنے پاس دیکھ کر کس قدر خوش ہوں۔''

''فرح میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا، تم ابھی اتنی بڑی بیماری سے نبرد آزما ہوئی ہو مگر جو حقیقت ہے...... اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔'' وہ اٹک، اٹک کر بات کررہا تھا۔

''سرمد اس بیماری نے مجھے بہت بہادر بنادیا

ہے، تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔'' فرح جیسے کچھ بھی سننے کو تیار تھی۔

''فرح...... وہ دراصل...... میں تم سے شادی نہیں کرسکتا...... میرے گھر والے تمہاری بیماری کی وجہ سے اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے میرے لیے......'' وہ کچھ لمحے رکا۔ ''انہوں نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کرلی ہے...... اور تمہیں طلاق کے کاغذات جلد مل جائیں گے۔'' یہ کہہ کر سرمد نے نظریں جھکالیں۔

''اور تمہاری کیا مرضی ہے؟'' فرح نے بالکل سیدھے بیٹھے ہوئے گردن اٹھا کر مضبوط انداز میں اس سے سوال کیا تھا۔

''فرح...... وہ، میں تمہیں، تمہاری اس بیماری کے ساتھ قبول نہیں کرسکتا...... دراصل مجھے مکمل عورت چاہیے...... وہ......'' سرمد نے کچھ اور کہنا چاہا مگر فرح نے بات کاٹ دی تھی۔

''ٹھیک ہے سرمد، تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔ اور الحمدللہ میں اپنی بیماری اور ادھورے پن کے ساتھ بہت مطمئن ہوں۔ اب تم جاسکتے ہو۔ آج مجھے سمجھ میں آیا کہ اللہ نے مجھے اتنی بڑی بیماری اس لیے دی تھی کہ تم جیسے شخص کی اصلیت سامنے آجائے۔ اگر شادی کے بعد مجھے یہ بیماری ہوجاتی تو سرمد تب تم مجھے چھوڑ دیتے۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی اور سرمد ایک لفظ بھی کہے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔

''سرمد کی محبت اتنی کمزور تھی کہ ایک بیماری نے اسے ختم کردیا...... میرا اور اس کا ساتھ بس یہاں تک ہی تھا جو ہوا اچھا ہوا۔'' یہ سوچ کر فرح نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں۔ سرمد کے یوں واپس چلے جانے سے امی بغیر کہے سنے ہی سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ فرح نے سرمد سے جدائی کے صدمے کو اپنے اندر چھپالیا۔ رابعہ بیگم، بیٹی کی بیماری سے اتنا نڈھال نہیں ہوئی تھیں جتنا سرمد کے فیصلے سے۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کسی بھی پریشانی سے زیادہ دکھ کا باعث ہوتی ہے مگر اس دکھ، درد میں [illegible] فرح کے گھر والے اس کے ساتھ تھے۔

''چلو اب زندگی اکیلے ہی گزارنی ہے۔ نا[illegible] عورت کو بھلا کون قبول کرتا ہے۔ مجھے اب اکیلے [illegible] سلیقہ آچکا ہے اور میں اکیلی کہاں ہوں، میرے [illegible] والے اور میری عزیز از جان دوست ثنا میرے سا[illegible] ہے۔ اس بیماری نے مجھے بہت مضبوط بنادیا ہے [illegible] اب میں ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔''

''میڈم، آپ کو سر نے بلایا ہے۔'' چپراسی کی آواز پر فرح اپنے خیالات سے چونکی تھی۔

''جی سر...... آپ نے مجھے بلایا؟'' فرح نے اپنے نئے باس سلمان صاحب کے کمرے میں داخل ہ[illegible] کر کہا۔

''جی مس فرح، آپ کی فائل دیکھ رہا تھا آپ ا[illegible] مہلک بیماری سے جنگ جیت کر آئی ہیں اور پھر ا[illegible] ذمے داریاں دوبارہ سنبھال لیں۔ آپ کی ہمت [illegible] میں بہت متاثر ہوا ہوں۔'' سر سلمان کے سامنے اس کی فائل میں موجود میڈیکل رپورٹس سامنے کھلی تھیں جس کی بنا پر اسے نوکری میں کچھ مراعات حاصل ہوگئی تھیں۔

''سر اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ نے ہم[illegible] دی اور گھر والوں نے ساتھ دیا اور آپ کے دفتر والا[illegible] نے بھی تو پھر ہی ممکن ہوسکا۔'' فرح نے جواب دیا۔

''میری امی اس بیماری کا شکار ہوکر پانچ سال پہلے ہی موت کی وادی میں چلی گئیں۔'' سلمان صاحب نے دکھ سے کہا۔

''سر مجھے بہت افسوس ہوا۔'' فرح اور کیا کہہ سک[illegible] تھی۔ کچھ دو چار رسمی باتیں کرکے وہ اپنی سیٹ پر واپ[illegible] آچکی تھی۔

☆☆☆

فرح نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو دیکھا لا[illegible] میں خزاں سے درخت کے سارے پتے جھڑ چکے ہیں۔ بہار کی آمد میں ابھی کافی وقت تھا۔ ثنا پچھلے مہینے شادی [illegible] ہوکر باہر چلی گئی۔ فرح کے دونوں بھائی باہر ہی ر[illegible] تھے اب گھر میں صرف فرح اور رابعہ بیگم ہی تھے۔ وق[illegible]

...ایک سا نہیں رہتا، آگے بڑھتا جاتا ہے جہاں خوشی
...رنگ وقت کے ساتھ، ساتھ پھیکا پڑتا جاتا ہے
...غم کی شدت بھی مدھم ہوتی جاتی ہے۔

''کیا میں سرمد کو بھول چکی ہوں۔ اس روز خزاں کے اداس موسم میں وہ باہر ٹیرس پر کرسی ڈالے اپنی سوچوں میں گم تھی۔

''نہیں بلکہ سرمد سے جدائی کو میں نے اپنے اندر ...لیا۔ یہ سچ ہے کہ میں سرمد کو ابھی تک بھلا نہیں پائی، اس نے مجھے ایسے وقت چھوڑا جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جب اسے میری زندگی میں رہنا ہی نہیں تھا تو وہ مجھے ملا ہی کیوں تھا۔ کیا صرف مجھے دکھ دینے کے لیے۔'' یہ وہ سوال تھا جس کا جواب فرح کے لیے ابھی تک حل طلب تھا۔

''بیٹا تمہاری خالہ جان نے ایک رشتہ بتایا ہے پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بچے جوان اور شادی شدہ ہیں۔ انہیں اولاد نہیں چاہیے۔ تم کہو تو میں بات کروں۔'' رابعہ بیگم نے اس سے پوچھا۔

''امی، میں اور آپ بہت پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور اب میں نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ میں اکیلے ہی بہت خوش اور مطمئن ہوں۔'' فرح نے جواب دیا۔

''بیٹا میں ماں ہوں اور چاہتی ہوں تم بھی گھر بسا لو۔ بھائی تمہارے ملک سے باہر رہتے ہیں۔ تمہاری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے، میں جانے کب اس دنیا سے چلی جاؤں...... کیا تم ساری زندگی تنہا رہو گی؟'' رابعہ بیگم اس کے پاس بیٹھ کر بہت فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔

''جی امی...... میں اکیلی رہ لوں گی ایک نامکمل اور ادھوری عورت کو اکیلے ہی رہنا چاہیے۔'' فرح نے ...ی سے جواب دیا۔

''بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ بیماری اور حادثات زندگی کے ساتھ، ساتھ چلتے ہیں۔ یہ انسان کو نامکمل یا ادھورا نہیں کرتے بلکہ زندگی کا سامنا کرنا سکھاتے ہیں اور مضبوط بناتے ہیں۔ ان مسائل و حادثات میں جو رشتے آپ سے مخلص ہوتے ہیں وہ آپ کا ساتھ دیتے ہیں اور

غزل

میری آرزو مری زندگی ترا احسن ہے ترا نام ہے
تری خیر ہو مرے ہمنوا ترا حرف میرا کلام ہے

ہے تیری طلب مری زندگی، تری جستجو مری بندگی
ہے شرابِ دید کی آرزو تری دید ہی مرا جام ہے

ترا حرف، حرف ہے معتبر ترا رمز، رمز ہے باخبر
سبھی حکمتیں سبھی وسعتیں سبھی مہر تیرا پیام ہے

ہے دردِ عشقِ فسردگاں تری یاد سایہ فگن رہے
تری قربتیں مری صبحِ نو، تری دوریاں میری شام ہے

ہیں صحیفۂ دل پہ یوں رقم یہ ورق، ورق تری یاد کے
تو کہیں ہو جیسے یہیں کہیں نہیں دور تیرا مقام ہے

درِ دل پہ اے میرے ہم نشیں میں بتاؤں کیا تجھے مخفی حزیں
کبھی رزم ہے کبھی بزم ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

شاعرہ۔ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

جو مخلص نہیں ہوتے ان کی اصلیت اس وقت ظاہر ہو جاتی ہے اور یوں وہ خود بخود ہی آپ کی زندگی سے نکل جاتے ہیں۔'' رابعہ بیگم نے فرح کو بہت اچھی طرح سمجھایا۔

''امی آپ صحیح کہتی ہیں، مسائل اور پریشانیاں آپ کو بہت کچھ سکھاتے ہیں اور لوگوں کے اصلی چہرے جبھی سامنے آجاتے ہیں اس نے دکھ سے سرمد کے بارے میں سوچا۔

''بیٹا مشکل میں ساتھ چھوڑنے والے اپنے نہیں ہوتے، اگرچہ مختصر وقت کے لیے ہماری زندگی میں آتے ہیں مگر گہرا گھاؤ دے جاتے ہیں مگر ایسے لوگوں کا ماتم کیوں کیا جائے جو آپ سے مخلص ہی نہیں۔ یاد تو ہمیشہ اچھے اور دل سے قریب لوگوں کو کرنا چاہیے ناں...... بیٹا!'' امی نے ہمیشہ کی طرح اس کا حوصلہ باندھا۔

''امی، چلیں آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی کیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' فرح نے بات ختم کی۔

فرح کو سرمد اکثر یاد آتا تھا۔ اس کے ساتھ گزرے تمام لمحات ایک، ایک کر کے نظروں کے سامنے سے گزرتے تھے اور پھر آخری لمحہ ٹھہر جاتا تھا۔ جب وہ رشتہ توڑ کر گیا تھا۔ ''مجھے مکمل عورت چاہیے ادھوری نہیں۔'' اس جملے کی بازگشت فرح کو نہیں بھولتی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سرمد اس کی زندگی میں نہیں ہوگا۔ سوچا تو اس نے اس بیماری کے بارے میں بھی نہیں تھا اگر کچھ چیزوں کے بارے میں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور وہ اچانک زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور پھر اچانک زندگی سے نکل بھی جاتی ہیں جیسے یہ بیماری اس کی زندگی میں داخل ہوئی اور اس کے نتیجے میں سرمد اس کی زندگی سے نکل گیا۔ یہ سوچ کر فرح کی پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔

☆☆☆

''بیٹا شادی کی تیاریاں تو مکمل ہو چکی ہیں۔ اب تمہارے بھائی اپنے آنے کا بتائیں تو میں شادی کی تاریخ طے کروں، بیٹا تم نے ثنا کو شادی کی اطلاع دی؟'' رابعہ بیگم نے اس سے پوچھا۔

''جی امی، میں نے ثنا کو بتا دیا تھا وہ اگلے مہینے آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم بھی اپنی تیاریاں فائنل کر لو اور ابھی سے آفس میں چھٹی کی بھی بات کر لو۔'' رابعہ بیگم نے اسے مشورہ دیا۔

فرح نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی سرمد کے بعد اسے کسی میں بھی دلچسپی نہیں محسوس ہوتی تھی، اس نے سب کچھ امی پر چھوڑ دیا تھا۔ یقیناً وہ جو کرتیں اس کے لیے بہترین کرتیں۔

''سر مجھے ایک مہینے کی چھٹی چاہیے۔'' فرح نے سلمان صاحب کو مخاطب کیا۔

''کیوں خیریت ہے؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی سر، وہ دراصل میری شادی ہونے والی ہے۔'' فرح سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ نے بتایا ہی نہیں اتنی اچانک۔'' سلمان صاحب نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

''جی سر، یہ سب امی نے اچانک ہی طے کر دیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی اس میں آپ کی مرضی شامل نہیں ہے؟'' سر نے پوچھا۔

''سر ایک ادھوری اور نامکمل عورت کی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور میں یہ شادی امی کی خوشی کے لیے کر رہی ہوں۔'' فرح نے جواب دیا اور جلدی سے ان کے آفس سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ بہار کی آمد، آمد تھی درختوں پر نئے پتے آنا شروع ہو چکے تھے۔ فرح نے کمرے کی کھڑکی سے لان میں نگاہ دوڑائی۔

''میں نے سوچا تھا خود کو کبھی ادھورا تصور نہیں کروں گی مگر جانے کیوں سلمان صاحب کے سامنے اپنے اندر کے دکھ کا اظہار کر بیٹھی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فرح کو آج آفس میں سلمان صاحب کے ساتھ اپنی کی گئی گفتگو یاد آئی۔

''بیٹا تمہارے آفس کے کوئی سلمان صاحب آئے ہیں۔'' امی کی آواز نے فرح کے خیالات کے تسلسل کو توڑا وہ ہڑبڑا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

''سر آپ یہاں، خیریت ہے؟'' اس نے حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت مشکل سے آپ کے گھر کا پتا ملا۔ خیریت ہے، مجھے آپ کی امی سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

فرح امی کو بلا لائی جو اسے بٹھا کر چائے بنانے چلی گئی تھیں۔ اور خود اب کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔

''آنٹی مجھے آج فرح نے اپنی شادی کے بارے میں بتایا۔ میں آپ کے پاس پہلے ہی آنے والا تھا۔ میری بڑی بہن جو لاہور میں رہتی ہیں ان کا انتظار تھا کہ کسی بڑے کو ساتھ لے کر آؤں مگر آج لگا بہت دیر ہوگئی ہے۔'' سلمان نے رابعہ بیگم کو ایک سانس میں ساری بات بتا دی۔

''بیٹا کیسی دیر...... آپ مجھے کچھ بتائیں تو سہی۔'' رابعہ بیگم نے سلمان کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر کہا۔

''میں فرح سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سلمان نے سر جھکا لیا۔

''بیٹا کیا آپ جانتے ہیں کہ فرح کو بریسٹ کینسر ہو چکا ہے۔'' رابعہ بیگم نے بڑے دکھ سے کہا۔

''آنٹی میں ہر بات جانتا ہوں۔ میری امی اسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئیں۔''

''پھر بھی تم فرح سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو فرح کا نکاح بیماری سے پہلے ہو چکا تھا اور بیماری کے بعد سرمد نے اسے ادھوری عورت کہہ کر چھوڑ دیا۔'' رابعہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آنٹی، میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ انسانی اعضا کی کمی سے انسان معذور یا ادھورا کہلائے۔ میں آپ کی بیٹی کو اس بیماری کے ساتھ قبول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میری والدہ نے یہ بیماری بھگتی ہے اور میں نے دیکھا کہ فرح نے بیماری کو شکست دے کر فتح اپنے نام کی ہے، مجھے اس کی ہمت اور بہادری نے متاثر کیا ہے۔''

رابعہ بیگم نے انہیں نظر بھر کر دیکھا اور سوچا ''شکل صورت میں سرمد سے بھی اچھا ہے اور فرح کے جوڑ کا بھی ہے اور اس سے شادی کے لیے رضامند بھی ہے مگر پھر بھی فرح سے پوچھنا بہت ضروری ہے۔'' اتنے میں [illegible] چائے لے آئی۔ چائے خاموشی سے پی گئی پھر رابعہ بیگم نے گلا کھنکھارا جیسے کچھ اہم کہنا چاہتی ہوں۔

''بیٹا، سلمان تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں ابھی کے ابھی تمہاری رضا معلوم کرنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے بیٹی کو مخاطب کیا۔

فرح ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''آنٹی آپ فرح کو کچھ وقت دیں فیصلہ کرنے کا۔ ان کا جو بھی جواب ہو گا مجھے قبول ہو گا۔'' یہ کہہ کر سلمان نے رخصت لی۔ رابعہ بیگم نے سر سلمان کے ساتھ کی گئی گفتگو سے اسے آگاہ کیا۔

''بیٹا تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہو گا۔ یہ سوچنا کہ میں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ اور اب پھر ایک اور رشتے کے لیے کہہ رہی ہوں بس مجھے اب سلمان پسند آیا ہے اور اس سے بڑھ کی اس کی باتیں...... اب تم اچھی طرح سوچ کر اپنا فیصلہ بتا دینا۔''

زندگی کے واقعات کسی کی دسترس میں نہیں ہوتے کچھ باتیں خود بخود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اچھا برا سب زندگی کا حصہ ہے۔ رات وہ دیر تک اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی اور یہی سب کچھ سوچتی رہی۔ صبح اٹھی تو پھر سے یہی سوچ دماغ میں چکرانے لگی وہ کھڑکی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

''قدرت نے مجھے بیماری دے کر سرمد کا اصل چہرہ دکھایا اور اب اس دکھ کو دور کرنے کے لیے سلمان کو بھیج دیا۔ کیا میں سرمد کی یادوں کو بھلا پاؤں گی اور پھر سے کسی مخلص شخص کے ساتھ محبت کرنے کے قابل ہو سکوں گی۔'' سرمد کا خیال آتے ہی فرح کو دکھ نے گھیر لیا۔

''مگر میں سرمد کا غم کب تک مناؤں گی؟ وہ تو اپنی زندگی میں خوش ہو گا کبھی اس نے پلٹ کر مجھے پوچھا بھی نہیں۔''

انہی سوچوں میں منہمک اس کی نظر لان میں لگے درختوں پر گئی جہاں بہار نے نئے پتے اور پھول کھلا کر خزاں کو مٹا دیا تھا۔ فرح نے اپنے سوال کا جواب پا لیا تھا۔ اور پھر رابعہ بیگم کے آنگن میں خوشیوں نے پھر سے ڈیرا ڈال لیا تھا۔

شادی کی تمام تقریبات اتنی جلدی انجام پائیں کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ سب ایک خواب سا تھا۔ آج فرح، مسز سلمان بن کر سلمان کے ساتھ ہنی مون کے لیے باہر جا رہی تھی۔ رابعہ بیگم بہت مسرور تھیں بہت عرصے بعد ان کی بیٹی کے چہرے پر اطمینان اور خوشی رقصاں تھی۔ وہ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتیں کہ فرح کی خوشیاں قائم رہیں۔

سلمان کے سنگ اس نے زندگی کے خوب صورت ...... رنگوں اور خوشگوار لمحوں سے آگاہی حاصل کی تھی۔ وہ اپنے آپ کی شکر گزار تھی۔ اس نے سرمد کی یادوں کو دل و دماغ سے کھرچ ڈالا تھا اور اب نہایت خلوص اور محبت سے سلمان کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔

ہنی مون سے لوٹ آنے کے بعد دونوں نے آفس جانا شروع کر دیا۔ سلمان بہت اچھا شوہر ثابت ہوا۔ فرح نے سوچا بھی نہیں تھا کہ قدرت اسے آزمائش کے بعد اتنا بہترین انعام عطا کرے گی۔ سلمان سے شادی کے بعد اسے اتنی خوشیاں ملیں کہ وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی اس پاک ذات نے اسے سرمد سے بہت اچھا شوہر دیا۔

''میں بہت خوش ہوں کہ میری دوست کو اللہ نے پھر سے زندگی کی خوشیاں عطا کر دیں۔ اپنا ماضی بھول جاؤ... اور صرف حال پر نظر رکھو۔'' ثنا نے جاتے، جاتے اسے نصیحت کی تھی۔

''مجھے بھی بہت خوشی ہے کہ تم میری شادی میں شریک ہوئیں اور اب باہر جا کر مجھے بھولنا نہیں اور پاکستان آتی رہنا۔'' فرح نے اسے گلے لگایا اور نم آنکھوں سے رخصت کیا۔

☆☆☆

شادی کے ایک سال بعد خدا نے فرح کو پیارا سا بیٹا عطا کیا۔ آج اسے ایسا لگا کہ دنیا کی ہر نعمت اس کی جھولی میں آگئی ہے۔ قدرت جب مہربان ہوتی ہے تو بے حساب عطا کرتی ہے۔ انسان کی سوچ بہت محدود ہے، وہ صرف اپنے وسائل کو مدِنظر رکھ کر سوچتا ہے جبکہ قدرت لامحدود ہے جہاں ہماری سوچ ختم ہوتی ہے وہاں سے قدرت کی عنایتیں شروع ہوتی ہیں۔ یہ سوچ کر فرح نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

زندگی پھر اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ فرح ہر آن اپنے رب کی شکر گزار رہتی۔ سلمان زندگی کے اس سفر میں اس کا بہترین ہم سفر ثابت ہوا اور ماضی کی تمام تلخیاں فرح کے ذہن سے محو ہوگئیں۔

☆☆☆

''سلمان میں ساحل کو لے کر شاپنگ پر جارہی ہوں ایک گھنٹے میں آجاؤں گی۔ آپ کے دوست کے لیے میں نے چائے کے ساتھ اور چیزیں تیار کر دی ہیں۔'' فرح نے گھر سے نکلتے ہوئے سلمان کو آگاہ کیا۔

''ساحل کا بہت خیال رکھنا، یہ بہت شریر ہوگیا ہے۔'' سلمان نے اسے تاکید کی۔

''اکیلے شاپنگ کرنا واقعی مشکل کام ہے اور چھوٹے بچے کے ساتھ آنا تو بہت ہی دردسر ہے۔'' فرح نے اسے گود سے اتارا اور سامان کی ٹرالی میں بٹھا دیا۔

''بیٹا سامان نہیں گراتے۔''

آواز پر فرح نے مڑ کر دیکھا۔ ساحل ٹرالی سے سامان پھینک رہا تھا اور پاس کھڑا شخص اسے منع کررہا تھا۔

''یہ آپ کا بیٹا ہے؟'' یہ کہہ کر سرمد کی نگاہیں فرح پر ٹھہر گئیں۔

''جی، یہ میرا بیٹا ساحل ہے۔'' فرح نے ٹرالی آگے بڑھا دی تھی۔ وہ اسے پہچان گئی تھی اور کیسے نہ پہچانتی کوئی صدیاں تو نہیں گزر گئی تھیں۔

''ٹھہرو فرح مجھے ایک اعتراف کرنا ہے۔'' تبھی سرمد نے تھوڑا آگے بڑھ کر فرح کو روکا۔

''کیسا اعتراف؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی کہ تم ادھوری اور نامکمل عورت نہیں تھیں۔ میں ہی نامکمل اور ادھورا تھا۔ میں نے تمہیں ٹھکرا دیا اور میری بیوی نے مجھے...... کیونکہ شادی کے بعد پتا چلا کہ میں قدرتی طور پر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ ادھورا تو دراصل میں ہوں...... ہاں میں...... مجھ میں یہ اعتراف کرنے کی ہمت نہیں تھی...... لیکن آج قدرت نے مجھے موقع دیا کہ یہ اعتراف میں تمہارے سامنے کرسکوں اور اپنے کیے کی تم سے معافی مانگ سکوں۔ بہت شرمندہ ہوں فرح...... خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔''

''سرمد میرا انتقام قدرت نے خود ہی لے لیا۔ آج مجھے تمام سوالوں کے جوابات مل گئے۔ میں تمہیں پہلے ہی معاف کر دیا تھا اب تمہارے سامنے کہے دیتی ہوں۔ جاؤ سرمد میں نے تمہیں معاف کیا۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

سرمد حسرت بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ فرح کا بچہ پیچھے مڑ کر سرمد کو ہاتھ ہلا رہا تھا۔

''ایک بات آپ جان لیں، میں آپ کو کبھی بانٹ نہیں سکتی۔ اس لیے ایسا دن جب بھی آئے کہ آپ کو لگے کہ اب آپ میری محبت تقسیم کر رہے ہیں تو بے شک مجھے طلاق دے دیں..... میں زندگی سے الگ ہونا برداشت کرسکتی ہوں مگر زندگی تقسیم کرنا نہیں......'' یہ کہتے، کہتے ایبہا کا لہجہ بھرّا گیا۔

کامران کے چہرے پر ایبہا کی یہ شدت دیکھ کر مسکراہٹ آگئی۔

محبت، نفس اور تقسیم

دُرِ صدف ایمان



''ارے یہ میری زندگی تم ہو......اور اپنی زندگی کو بھی کوئی کیا الگ کرسکتا ہے اور ہاں میری محبت پر، میری زندگی پر صرف تمہارا حق ہے صرف تمہارا۔'' لیہا کے چہرے پر سکون پھیلنے لگا۔

''تھینکس آپ بہت اچھے ہیں۔'' احساسِ ممنونیت سے اس نے کہا۔

''اچھا کتنا اچھا ہوں؟ اتنا کہ مجھ سے ابھی طلاق کا کہا گیا؟''

لیہا نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا......اتنی سنجیدگی، وہ گھبرا گئی۔

''نہیں وہ تو......وہ تو بس میں......میں بتارہی تھی کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔''

''اچھا تو بتاؤ ناں کتنی؟'' کامران نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''اچھا تو مجھے بے وقوف بنارہے تھے آپ۔'' لیہا نے منہ بسور کے کہا۔

''بنے ہوئے کیا بنانا......میری جان......'' لیہا نے مزید منہ بسور لیا کامران کا قہقہہ کمرے میں گونجا تھا۔

لیہا اور کامران دونوں کزنز تھے، بچپن میں ساتھ کھیلا کرتے تھے بڑے ہونے پر پسندیدگی ہوئی......جو بعد میں محبت بن گئی، گھر والوں کو۔کوئی اعتراض نہیں تھا لیہا بھی پڑھی لکھی خوب صورت لڑکی تھی، اسی طرح کامران بھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اپنا کاروبار کرتا تھا......لہٰذا جب گھر کے بڑوں کے سامنے بات آئی تو سب ہی خوشی، خوشی انہیں رشتۂ ازدواج میں باندھنے کو تیار ہوگئے۔ دونوں نکاح جیسے خوب صورت رشتے میں بندھ کر اپنے آپ کو خوش نصیب ترین سمجھنے لگے......اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا......دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے، عادتوں سے پسند ناپسند سے واقف تھے، ان دونوں کے درمیان وہ سب کچھ تھا جو کسی بھی رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے موجود ہونا چاہیے۔ دونوں نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی خواہش وجذبات کا احترام بھی کرتے تھے۔

لیہا اگرچہ کچھ جذباتی تھی لیکن کامران کو اس بات پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا......وہ اس کی شدت پسندی سے بھی واقف تھا......اور اس بات پر وہ بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ وہ گیٹ سے ہی آوازیں لگاتا اندر آیا تھا۔

''لیہا، لیہا کہاں ہو؟''

''آپ آج آگئے جلدی خیریت ہے؟''

''ہاں خیریت ہے بس آج صبح آفس جاتے ہوئے ایک لڑکی مل گئی تھی......بہت پُرکشش تھی تمہارے جتنی خوب صورت تو نہیں پر کچھ تو کشش تھی اس میں......'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

''کون تھی......پہلے کتنی بار ملی آپ سے، کس جگہ ملی اور ایسا کیا تھا جواب تک یاد ہے......'' لیہا کے لہجے میں شدید غصہ، تجسس، جھنجلاہٹ اور شک تھا۔

''بس یار کیا بتاؤں لگتا ہے مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اب کہاں ڈھونڈوں اسے۔'' کامران نے آنکھیں بند کیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی......جب کوئی آواز نہیں آئی تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔

''لیہا کیا ہوا......'' سن بیٹھی لیہا کے چہرے کا رنگ اس قدر پیلا پڑ گیا تھا کہ وہ گھبرا گیا۔

''ارے میں صرف مذاق کر رہا تھا......'' جلدی سے پانی کی بوتل لینے گیا واپس آیا تو چہرے ہاتھوں میں چھپائے وہ زور، زور سے رو رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں صرف مذاق تھا، تم خود بتاؤ کیا میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی آسکتا ہے......'' اس کے رونے میں کوئی کمی نہیں آئی تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''اچھا معاف کردو پرامس آئندہ ایسا کچھ نہیں کہوں گا......یہ میری جان میری زندگی۔'' اسے اپنے سے لگاتے ہوئے تسلی دی......''بس چپ ہوجاؤ اب......''

''آپ وعدہ کریں کوئی لڑکی آپ کی زندگی میں نہیں آئے گی، میرے جیتے جی آپ کبھی شادی نہیں کریں گے دوسری......''

''تم پاگل ہوگئی ہو، ایک چھوٹے سے مذاق کو اتنا سیریس لے لیا......''

''آپ وعدہ کریں بس......''

''اچھا ٹھیک ہے وعدہ...... اب تو چپ ہو جاؤ یا بنانے کا ارادہ ہے......''

''ٹھیک ہے...... پر آئندہ ایسا مذاق نہیں کرنا میری پاگل کی تھی......''

''ہاں بابا، نہیں کرتا ڈرا ہی دیا تھا تم نے مجھے...... طلب چائے پلاؤ گی یا نہیں؟''

''جی میں چائے لاتی ہوں......''

''اُف یہ بیبہ بھی نہ پاگل ہے بالکل......''

☆☆☆

دن مہینے سال گزرتے گئے۔ یوں ان کی شادی کو سال ہو گئے...... آنگن میں اب تک کوئی پھول نہیں کھلا...... پہلے سوال دبے، دبے تھے...... اب کھلے الفاظ کے ساتھ پوچھا جاتا، مشورے دیے جاتے لیکن سب ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹرز نے یہی کہا۔ ''رب کی رضا میں راضی رہیں وہ جب چاہے نواز دے گا......'' لیبا کی اداس میں شدت وگریہ زاری میں اضافہ ہو گیا، دوسری طرف کامران تھا جو اسے سمجھاتا کہ اللہ کی رضا میں راضی رہو کیوں اتنا پریشان ہوتی ہو...... اور وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا دیتی کیا بتاتی کہ اس کی ساس، نندیں اس سے یہ کہنے لگی ہیں کہ اپنی محبت تقسیم کر دے، کامران کو دوسری شادی کے لیے تیار کرے...... لیکن کامران سے جب انہوں نے یہ بات کی تو اس نے... صاف الفاظ میں منع کر دیا تھا اسی لیے وہ اب لیبا پر زور دے رہی تھیں کہ وہ اسے تیار کرے۔

لیبا کی زندگی میں جتنا سکون تھا۔ وہ ماں نہ بننے کے جرم میں تباہ ہو کر رہ گیا تھا کامران اس کے ساتھ خوش تھا اسے بھی خوش رہنے کی تلقین کرتا۔ اور وہ کامران کی خوشی کی خاطر خوش رہنے کی کوشش بھی کرتی۔

''بیبہ آج تیار رہنا شاپنگ پر جائیں گے......''

کامران آفس جاتے ہوئے کہہ کر گیا تھا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی تیار ہو گئی...... کامران نے ڈھیروں شاپنگ کی اس کے لیے...... لیکن اس کی نگاہیں بار، بار بے بی گارمنٹس پر چلی جاتیں وہ دل کی خواہش نظر انداز کر کے شاپنگ میں اوپری دلچسپی ظاہر کرتی رہی...... شاید آج کے دن سے لیبا کی زندگی کا امتحان شروع ہوا یا پھر شاید کامران کی آزمائش......

مال سے باہر نکل کر کامران گاڑی ریورس کر کے لیبا کی طرف لا رہا تھا کہ ایک گاڑی آئی اور لیبا کو ٹکر مارتی چلی گئی۔

''لیبا......'' کامران کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ ہوش وحواس سے بیگانہ وہ سڑک پر پڑی تھی، اردگرد لوگ جمع تھے...... لیکن کامران کو لگا کچھ نہیں باقی رہا زندگی میں......

آئی سی یو کے باہر ادھر سے اُدھر چکر لگاتے ہوئے بس ایک دعا تھی۔

''یا اللہ میری لیبا کو زندگی دے دے...... میری لیبا کو زندگی عطا فرما دے......'' جو مانگا ملا تھا...... زندگی مانگی تھی اور رب نے زندگی دے دی...... یہ صحت وزندگی مانگتا تو شاید یہ سننے کو نہ ملتا کہ جان بچ گئی...... لیکن وہ اب خود سے اپنا کوئی کام نہیں کر سکتی، انٹرنل انجری کے ساتھ، ساتھ ریڑھ کی ہڈی کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

کوئی پندرہ دن بعد اسے اسپتال سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ شدید چڑچڑی ہو گئی تھی، کامران نے اس کے آرام وخیال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دو، دو نرسیں رکھ لی تھی جو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔ کامران کی زندگی اور مصروف ہو گئی پہلے صرف آفس کا کام ہوتا تھا اب لیبا کی ذمے داری بھی تھی...... اس کے علاوہ ذہنی اذیت الگ، ماں بہنوں کا ایک ہی مشورہ تھا شادی کر لو...... اور کامران کا وہی ایک جواب...... ''نہیں......''

لیکن یہاں لیبا نے بھی خودغرضی کی انتہا کر دی تھی...... وہ کامران کی دوسری شادی پر نہ راضی تھی اور نہ ہی ایسا چاہتی تھی بلکہ پہلے جو وعدہ وہ مہینوں میں لیتی تھی اب دن میں کئی بار یقین دہانی لیتی کہ کامران دوسری شادی نہیں کرے گا...... اور کامران کا 'نہیں' جواب بیبہ کو

پُرسکون کر دیتا......

☆☆☆

دن گزرتے رہے...... کامران کو بشری تقاضے ستانے لگے۔ وہ توبہ کرتا، نمازوں میں دعا مانگتا، روزے رکھتا...... ایہا کی محبت لاکھ اس کے دل میں تھی لیکن وہ بھی جوان مرد تھا کیا کرتا......

دو سال اور گذر گئے ایہا وہیل چیئر کی عادی ہوگئی...... اور کامران کی طرف سے مطمئن بھی۔

کامران اب چپ، چپ رہنے لگا تھا......

''سر وہ میم کی ٹیبلیٹس آ گئیں گی......'' بظاہر تو اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر اس کا سراپا کامران کی نگاہوں میں کھب گیا۔ اس نے سر جھکا کر لاحول پڑھی اور محض اتنا ہی کہا۔

''ہاں کل آ جائیں گی۔'' اور وہاں سے اٹھ گیا۔

دن پر دن گذر رہے تھے۔ نرس کا انداز بے باکانہ ہوتا جا رہا تھا...... پھر اس کا حل یہ نکالا کہ اسے فارغ کر کے دوسری نرس رکھ لی، اب کی بار بڑی عمر کی خاتون کو رکھا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

آفس گیا تو معلوم ہوا کہ جس سیٹ کے لیے فی میل کی ضرورت تھی وہاں ایک ضرورت مند آ گئی ہے...... چند ہی دنوں میں اپنے کام سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے کام سے مخلص ہے...... کامران سے اس کا زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا...... ایک دن آفس وین خراب تھی...... کامران، سمیرا کی بہت عزت کرتا تھا کیونکہ آفس میں ریپوٹیشن اچھی تھی، محنتی تھی، شوہر نے طلاق دے دی تھی اس لیے ہمدردی بھی تھی...... جب باہر نکلا تو وہ بھی شاید بس کے انتظار میں تھی...... نہ جانے کیا سوچ کر اس نے لفٹ دے دی...... سمیرا نے بھی جھجکتے ہوئے قبول کر لی...... ایک بار اتفاق ہوا...... پھر بار، بار ہونے لگا...... ایسے ہی جب ایک اور دن ڈراپ کیا تو سمیرا نے بہت لگاوٹ سے کہا۔

''سر چائے پی کر چلے جایئے گا......'' اس نے اس انداز سے کہا کہ کامران چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکا۔

ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر چلی گئی جب کچھ دیر بعد آئی تو وہ جو آفس میں اسکارف لپیٹے ہوئے تھی اس وقت بہت ایزی انداز میں دوپٹا ایک طرف ڈالے ہوئے تھی...... کامران کو عجیب سا احساس ہوا...... اسی احساس کو زائل کرنے کے لیے اس نے پوچھا۔

''اور کون، کون ہوتا ہے تمہارے گھر میں؟''

''میری والدہ رہتی ہیں ساتھ...... آج وہ خالہ کے گھر گئی ہوئی ہیں رات تک آ جائیں گی...... میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں......''

کچھ ہی دیر میں سمیرا چائے لے آئی تھی اور پیالی دیتے وقت ایسے انداز میں جھکی کہ کامران کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کس چیز کی دعوت دے رہی ہے۔؟ کشش جوان لڑکی اور تین سال سے نفس پر قابو......

اس کے پسینے چھوٹنے لگے...... بہ مشکل اس نے چائے ختم کی...... سمیرا کی طرف دیکھا تو وہ عجیب انداز میں مسکرا رہی تھی جیسے اس کی حالت سے حظ اٹھا رہی ہو۔

کامران سب کچھ سمجھ گیا تھا...... اس وقت وہ بڑی آزمائش کا شکار تھا۔ ایک طرف نفسانی خواہش دوسری طرف ایہا سے محبت، وفاداری اعتبار اور پھر رب کی نافرمانی۔

نفس و تقویٰ کی جنگ جاری تھی...... شدید جنگ...... دلائل، تاویلات...... لیکن شاید نفس جیت جاتا آخر کامران ایک انسان ہی تو تھا...... خطا کا پتلا......

شیطان کو تالیاں بجانے کا موقع مل جاتا۔

کیا ایہا کی خودغرض محبت نے کامران کو گناہ کی راہ دے کر جہنم کا راستہ دکھا دیا تھا......؟ وہ سخت کش مکش کا شکار تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر سمیرا کے گھر سے تیزی سے نکل چکا تھا۔

ایک وفا شعار بیوی کے لیے وہ اپنا نفس کیسے ہار دیتا کیا اگر یہ سب اس کے اپنے ساتھ ہوتا تو ایہا بھی یہی کرتی؟ بس اسی سوچ نے شیطان کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔

عروسی جوڑا

طیبہ عنصر مغل



"مجھے نہیں کرنی عدن سے شادی آپ صاف، صاف کہہ دیں ان لوگوں کو۔" حور العین نے غصے سے تپے ہوئے لہجے میں اماں سے کہا۔

"اللہ کا خوف کرو لڑکی۔ یہ کوئی وقت ہے شادی سے انکار کا؟ اب جبکہ شادی میں محض پندرہ دن باقی ہیں تو ہم تمہاری اس نکمی سی ضد کے پیچھے اپنی ناک کٹوالیں؟" امی نے صدمے سے چور لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"بس مجھے نہیں پتا، اگر آپ لوگوں نے میری بات

نہیں مانی تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے روتے ہوئے دھمکی بھی دے ڈالی۔

''حورالعین ہوش کرو۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ہم نے کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ لڑکا بھی تمہارا دیکھا بھالا ہے بلکہ تمہارے ایما پر ہی ہم نے رشتے کے لیے ہامی بھری تھی اور پھر کمی کیا ہے؟ پڑھا لکھا ہے، خاندان سے ہے، میری سگی خالہ زاد کا بیٹا ہے۔ اور تمہیں پسند بھی کرتا ہے برسر روزگار ہے اور کتنی مختصر فیملی ہے عدن اور علینہ دو بہن بھائی ہی تو ہیں۔'' سلمٰی بیگم نے اسے سمجھانے میں سارے مثبت پہلو گنوا دیے۔

''ہاں میں مانتی ہوں یہ سب ہے اور میں ہر چیز سے مطمئن بھی ہوں لیکن آپ کو پتا ہے ناں شادی زندگی میں ایک بار ہی ہوتی ہے اور میں چاہتی ہوں میری شادی صدیوں یاد رکھی جائے۔ کم از کم میرا عروسی جوڑا میری پسند سے ہو اور وہ بھی دولھا والوں کی طرف سے ہو۔ شادی اور ولیمے کا جوڑا اتنا خوب صورت ہو، اتنا انوکھا اور بہترین کہ پہلے ایسا کسی نے نہیں پہنا ہو۔ بس اتنی سی تو خواہش ہے میری۔'' حورالعین اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

سلمٰی بیگم کا دل پگھلا لیکن وہ کیا کرتیں حورالعین کی ہر خواہش وہ شروع سے پوری کرتی آ رہی تھیں وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود والدین نے ہمیشہ اس کے منہ سے نکلی ہر خواہش کو پورا کیا تھا اور کبھی، کبھی تو ایسا بھی ہوا تھا کہ حور کی خواہش کو پورا کرنے کے چکر میں سلمٰی بیگم اور رؤف احمد کو گھر کے اخراجات میں کمی بیشی کرنی پڑی تھی۔

حورالعین نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے لیے متواتر رشتے آنے شروع ہو گئے تھے۔ خاندان اور خاندان سے باہر سے بھی لیکن سب رشتے ان کی طرح متوسط طبقے ہی سے آتے رہے تھے۔ عدن کا رشتہ لے کر جب سلمٰی بیگم کی خالہ زاد عطیہ خاتون آئیں تو سلمٰی بیگم کو حورالعین کے چہرے سے کھلتی خوشی کی دھنک نے سمجھا دیا کہ انہیں عطیہ کو ہاں کرنے میں تامل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور یوں دو سال پہلے عدن اور حورالعین کی منگنی کی رسم خوب دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔

تب سے دونوں گھرانے شادی کی تیاریوں میں مگن تھے۔ اب جبکہ حورالعین گریجویشن کر چکی تھی تو دونوں گھرانوں کی باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔

سب کچھ بہت خوب صورت طریقے سے ہو رہا تھا۔ کزن ہونے کے ناتے عدن کے دل میں حورالعین بہت پہلے سے براجمان تھی جبکہ منگنی کے بعد حورالعین کے دل میں بھی عدن کے لیے جو ہلکی پھلکی پسندیدگی تھی وہ محبت میں ڈھل چکی تھی۔ منگنی کے بعد بھی دونوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا اور اسی وجہ سے آمنا سامنا ہونا بھی فطری امر تھا۔ کبھی، کبھی عدن، حورالعین کو فون بھی کر لیا کرتا تھا لیکن دونوں کی اچھی تربیت نے ان کو کبھی اخلاقی دائرے سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ عدن تو مرد ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی ذومعنی بات کہہ بھی دیا کرتا تھا لیکن حورالعین فطرتاً ایک باحیا لڑکی تھی۔

شاید یہ شادی بغیر کسی رکاوٹ کے بہت اہتمام سے تکمیل تک پہنچ جاتی اگر جو حورالعین کی شادی کی تاریخ جو دو ماہ پہلے طے پائی تھی کہ بعد حورالعین کی فرینڈ منتہا جمال کی شادی نہ ہوتی یا اگر ہوئی تھی تو حورالعین اس میں شامل نہ ہوتی۔ لیکن ہونی کو تو ہو کر رہنا تھا سو ہو گیا۔

منتہا جو خود بھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اس کا اور حورالعین کا دوستی کا رشتہ بہت گہرا تھا۔ اس لیے وہ منتہا کی شادی کے تمام فنکشنز میں بڑے اہتمام سے شریک ہوئی تھی۔ منتہا جو تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھی اس کی شادی اپنے خاندان سے باہر طے پائی تھی اور حورالعین جو اب تک خاندان اور خاندان سے باہر اپنے جیسے لوگوں کی مختلف شادیاں اٹینڈ کر چکی تھی وہ سب کی سب شادیاں اسے ایک جیسی لگی تھیں۔ نزدیکی گراؤنڈ میں ٹینٹ لگا کر یا کسی نارمل سے شادی ہال میں بھگتائی جانے والی شادیاں۔ لیکن منتہا کی شادی نے تو اس کے ذہن کے پردے پر ایسی چھاپ چھوڑی کہ اب تو وہ

رنگوں کی ایسی برسات چاہتی تھی جو منتہا کی شادی کے رنگوں کو بھی ماند کر دیتے۔

''حورالعین میرا تم سے وعدہ ہے کہ ایک بار شادی ہونے دو، میں تمہارا ہر ارمان پورا کروں گا لیکن اس وقت تم یہ ضد چھوڑ دو۔تم جانتی تو ہو ہم متوسط طبقے کے لوگ اپنی گزر بسر کیسے کرتے ہیں۔تم جانتی تو ہو کہ تیس ہزار، چالیس ہزار بھی کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی اور تمہارا ولیمے اور شادی کا جوڑا ملا جلا کے تقریباً ساٹھ، ستر ہزار لگے ہیں حالانکہ میں تو اتنے اسراف کے حق میں بھی نہیں تھا۔'' عدن نے فون پر حور کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

''عدن شادی کے بعد مجھے کیا کرنا ہے اور تم کیا کرو گے میرے لیے وہ بعد کی بات ہے۔تم اس اتنے خاص موقع پر میری فرمائش پوری نہیں کر سکتے۔دیکھو بات پیسوں کی نہیں پسند کی ہے، مجھے یہ عام جگہوں کے لہنگے نہیں چاہئیں بلکہ ڈیزائنرز لہنگا چاہیے اور میچنگ کی سونے کی جیولری بھی۔'' وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ''بس دیکھ لی تمہاری محبت!''

''تم محبت کو دولت اور چیزوں کے پیمانے سے پرکھو گی یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا حور۔محبت تو ان چیزوں سے بہت الگ، بہت خاص جذبہ ہے...... لالچ سے پاک۔محبت تو ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کا نام ہے۔ایسا کیا ہے جو میرے گھر والے تمہارے لیے نہیں کر رہے؟ تم جانتی ہو انہوں نے میری شادی کے لیے پلاٹ بھی بیچ دیا ہے۔سارا بینک بیلنس بھی لگا دیا حالانکہ اس پر میری بہن علینہ کا بھی حق تھا۔تمہارے لیے صرف جیولری ہی دس لاکھ کی ہے۔'' عدن نے شکستہ لہجے میں تفصیل بتائی۔

''مجھے اپنے گھر کی مجبوریوں کی داستان مت سناؤ۔اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو میرے خوابوں کی ویسی ہی تعبیر دو۔میں نے تو صرف اپنے لباس کی ہی فرمائش کی ہے جبکہ بہترین شادی ہال، ڈیکوریشن اور جانے کیا، کیا تھا جو منتہا کی شادی میں، میں نے دیکھا۔وہ تو میرے جتنی حسین بھی نہیں ہے۔'' حور کے لہجے میں

ذکر الٰہی اور اطمینان قلب

ذکر الٰہی سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اس کا ایمان ترقی کرتا ہے۔ذکر سے غافل رہنے والے نقصان اٹھاتے ہیں، وہ ہر معاملے میں پریشان رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر کسی سے ڈرتے ہیں۔ان میں وہ اعتماد، وہ جرأت، وہ ہمت اور وہ ثابت قدمی پیدا نہیں ہوتی کہ جو دینی و دنیاوی اعتبار سے کامیاب اور پُرسکون زندگی کے لیے ضروری ہے۔

سرور کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے بندوں میں قیامت کے دن کن لوگوں کا درجہ بلند ہوگا؟

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''اللہ کا ذکر کرنے والے (لوگوں کا) چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔''

ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔''اللہ کو یاد کرنے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مُردہ کی سی ہے۔''

یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور یاد نہ کرنے والا مردہ ہے۔

سورۂ احزاب میں فرمان الٰہی ہے۔

''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو اور بہت ذکر کرو......اور صبح شام اس کی پاکی بیان کرو......''

از: عرشیہ جنید، کراچی

ٹپکتی خود غرضی نے پیچھے کھڑی سلمیٰ بیگم کے ہوش اڑا دیے۔وہ اپنی بیٹی کو جانتی تھیں کہ وہ کتنی ہٹ دھرم ہے۔شاید یہ بے جا لاڈ پیار کا ہی نتیجہ تھا جو آج خود اُن کو ہی بھگتنا پڑ رہا تھا۔اس سے آگے ان سے کچھ سنا نہ گیا اور وہ دبے پاؤں واپس لوٹ گئیں۔

''سلمیٰ اگر تم کہو تو میں بات کروں حورالعین سے۔'' عطیہ خاتون نے لجاجت سے سلمیٰ بیگم سے کہا۔

''نہیں آپا، میری بیٹی ہے وہ۔میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔اگر کسی ضد پر اڑ جاتی ہے تو پھر اپنی ہی کر کے رہتی ہے۔غضب خدا کا ہر روز اس کی ضد کا بخار بڑھتا جا رہا ہے۔لاکھ دو لاکھ کے لہنگے تو ایک طرف اب تو اس کو شادی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں چاہیے ہے اور پتا نہیں کیا الا بلا۔چلو اس کے لیے تو میں نے منع کر دیا کہ بھئی ہم میں اتنا کرنے کی طاقت ہے نہ رواج۔لیکن ایک

بار پہنے جانے والے کپڑے اور لاکھوں کو آگ لگائی جائے۔ آگ لگے ایسے موئے فیشن کو۔'' سلمیٰ نے اپنے من کی بھڑاس نکالی۔

''کہیں ایسا تو نہیں بچی کا رجحان کہیں اور ہو؟'' عطیہ خاتون نے دبی زبان میں خدشہ ظاہر کیا۔

''ارے نہیں آپا! کیسی باتیں کرتی ہیں؟ حورالعین ضدی ضرور ہے لیکن جو آپ سوچ بیٹھی ہیں ایسا کچھ نہیں۔'' اب کے سلمیٰ بیگم کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''تو آخر اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ اب تو کارڈ بھی بٹ گئے ہیں اور شادی میں محض دس دن ہیں۔ تم پھر صاف، صاف بتا دو۔ بدنامی تو دونوں طرف کی ہے سلمیٰ لیکن لڑکیوں کی عزت کانچ جیسی ہوتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ شادی نہیں ہو پائی... تو عدن کے لیے تو ہزار رشتے ہیں لیکن حورالعین کی طرف لوگوں کی انگلیاں جانے کس، کس انداز میں اٹھیں گی یہ سوچ لینا تم۔'' عطیہ آپا نے اٹھتے ہوئے اپنی چادر درست کرتے سلمیٰ بیگم کی ناگواری پہ ان کو تلخ حقیقت کا ادراک کروانا چاہا۔

''خالہ آپ کو اپنے بیٹے کی شادی جہاں کروانی ہے کر ڈالیں لیکن میرے مستقبل کی پیش گوئیاں تو مت ہی کریں۔ ایک ذرا سی فرمائش کیا کر دی آپ نے تو میری کردار کشی سے لے کر اپنے بیٹے کی ڈیمانڈ کتنی ہے تک بتا ڈالا۔'' حورالعین جانے کب سے چائے کی ٹرالی لاتے ہوئے ساری گفتگو سن چکی تھی اور اب روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

''تم خاموش رہو حور! ہم بڑے موجود ہیں ناں! خالہ ہیں تمہاری، معافی مانگو ان سے۔'' سلمیٰ بیگم نے حور کو جھڑک کر کہا۔

''ارے رہنے دو سلمیٰ! بہت ہو گیا۔ گودوں کھلائی بچی آج منہ کو آرہی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے ایک ضد کے پیچھے اپنا آپ دکھا دیا۔ شادی کے بعد تو نہ جانے کیا' کیا، کرتی اور تم..... یہ تمہاری ہی شہ ہے جو لڑکی اتنی ضدی ہو گئی ہے۔ مجال ہے جو میری علینہ نے کبھی چھوٹی سی ضد بھی کی ہو یا زبان چلائی ہو۔ میں تو چلی اب تو یہ معاملہ کھٹائی میں ہی سمجھو۔'' عطیہ آپا بڑبڑاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔ اور سلمیٰ بیگم ''ارے آپا، ارے آپا!'' ہی کرتی رہ گئیں۔

''بس اب خوش ہو جاؤ تم؟ ہو گیا تمہارا مہنگے لہنگوں کا شوق پورا۔ ابھی تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی وہ بیچارے تو تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ کہیں سے بندوبست ہو جائے تو وہ تمہاری ساری ضدیں پوری کر سکیں۔ کیا ضرورت تھی بولنے کی؟'' سلمیٰ بیگم نے اسے خوب لتاڑا۔

کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ روتے ہوئے اندر کی طرف چل دی۔ طے تو وہ بھی کر چکی تھی کہ اب اسے عدن سے شادی نہیں کرنی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی بے جا ضد اس کے والدین کو معاشرے میں کیسے کیسے سوالات سے نبرد آزما کرے گی۔

عدن کے کئی فون آئے اس نے ریسیو نہیں کیے، وہ خود آیا تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دل تو سلمیٰ بیگم کا بھی میلا ہو چکا تھا عطیہ آپا کی طرف سے کیونکہ انہیں علم ہو گیا تھا کہ وہ عدن کا رشتہ اپنے بھائی کی بیٹی ہانیہ سے طے کر رہی ہیں اور اسی مقررہ تاریخ پر شادی کر دینا چاہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی لاڈلی حورالعین پر بھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

''تو یوں بھی ہوتا ہے محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی، محض وقتی کشش ہوتی ہے۔'' وہ اپنی تحقیر پہ آنسو بہاتی تکیہ بھگو رہی تھی۔ آج عدن اور ہانیہ کی شادی ہو گئی تھی اور حورالعین کو ٹھیس لگنا تو فطری امر تھا۔ دو سال کی منگنی کا رشتہ کچھ تو دلوں کو قریب لے ہی آتا ہے۔ سلمیٰ بیگم نے آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سر کو آہستگی سے اپنی گود میں رکھ کر بالوں میں پیار سے انگلیاں چلائیں۔

''بیٹا! تم اپنی ضد چھوڑ دیتیں تو اچھا ہوتا ناں۔'' وہ رسانیت سے بولیں۔

''امی! تو خالہ بھی تو انتظام کر سکتی تھیں ناں میری مرضی کے کپڑوں کا۔ کیسے دل توڑ دیا انہوں نے میرا۔''

''میری چندا..... تمہیں بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ ہم متوسط

1987ء سے خدمت میں مصروف

پھلبہری

قابل علاج مرض ہے

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر

اجمل زیدی

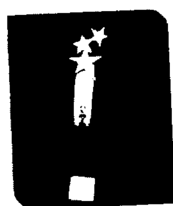
ماہر برص

کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

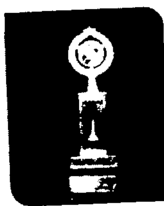




ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مستقل پتہ

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سرپاچوک (تعلیمی چوک) اسلام آباد
فون (051) 2854595 - 2255880
موبائل 0300-8566188
فیکس 2261636

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

قیام

ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک پشاور شہر
فون (0521) 2218215-9
موبائل 0300-8566188

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

قیام

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروزپور روڈ مزنگ چونگی
نزد سنٹر مارکیٹ (ٹرکیز) لاہور
موبائل:0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام

ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

قیام

فورچون سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نزد بس اسٹاپ ملحقہ K.F.C کراچی
فون 021-7012068-9
موبائل 0300-8566188

E-mail syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

طبقے کے لوگ ان سب خرافات کے متحمل نہیں ہو سکتے جن کی خواہش تم پال بیٹھی ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپا نے اچھا کیا لیکن تم نے بھی تو حد کر دی تھی۔'' سلمیٰ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''حد کیوں امی؟ اگر متوسط طبقے والے یہ سب نہیں کر سکتے تو منتہا بھی تو متوسط طبقے کی تھی، اس کی سسرال والے بھی امیر زادے نہیں تھے پھر بھی اس کی کیا شاندار شادی ہوئی آپ بھی تو میرے ساتھ گئی تھیں ناں شادی میں، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ماں کو دیکھا۔

سلمیٰ بیگم نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا کیونکہ اس کے سوال کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا لیکن اس کے سوال نے ان کے اندر بھی بہت سے سوالوں کو جنم دے دیا تھا۔

☆☆☆

''بوا مقیم! آپ بس کوئی ایسا رشتہ ڈھونڈ نکالیں جو کھاتے پیتے گھرانے کے ہوں اور آج کل کے رواجوں کے مطابق ہماری بیٹی کی خواہشات کے مطابق بری لائیں اور اچھے سے انداز سے شادی کریں۔'' سلمیٰ بیگم نے سموسوں والی پلیٹ بوا کی جانب بڑھائی۔

''ارے بھیا! میں تو خدا لگتی کہوں گی ایسے رشتے تو بہت ہیں میرے کنے۔ لیکن تم بھی ہم پلہ جہیز دے پاؤ گی؟ لڑکے کو ہیرے کی انگوٹھی، سونے کے جھمکے ساس کو..... اور.....'' بوا نے منہ میں سموسہ ٹھونسا۔

''ہاں، ہاں آپ فکر مت کریں ہماری اکلوتی بیٹی ہے ہم تو جتنا بھی کریں کم ہے۔ میں نے کون سا دس اولادیں بیاہنی ہیں۔''

''تو لو بھیا! پہلے تو اس محلے سے کوچ کرو کسی سوسائٹی ٹاؤن میں گھر لے لو چاہے کرایے پر لو اُدھر گلیوں محلوں میں کاہے کو آئیں گے ایسے رشتے کرنے والے؟''

''ٹھیک ہے بوا۔ میں رؤف صاحب سے بات کر کے بتاتی ہوں آپ کو۔''

اور پھر رؤف صاحب نے کیا کہنا تھا وہ تو ہمیشہ سے اپنی لاڈلی کے منہ سے نکلی بات پوری کرتے آئے تھے۔ جلد ہی وہ ایک اعلیٰ سوسائٹی میں ایک خوب صورت اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے تھے اور اپنا ذاتی گھر کرایے پہ دے دیا۔ اور جلد ہی بوا نے رشتہ بھی ڈھونڈ نکالا۔

☆☆☆

کمرے کی ڈیکوریشن قابلِ دید تھی۔ ابھی ابھی ہنستی کھیلتی حور العین کی نندیں اس کو تھکا دینے والی رسوم کے بعد اس کے شاندار کمرے میں چھوڑ کر گئی تھیں۔ حور العین نے ان کے کمرے سے جانے کے بعد اپنے جہیز کے قیمتی بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر کھل کر سانس لی تو تازہ پھولوں کی سیج اور اس کے بالوں میں لگے گجروں اور ہتھیلیوں پہ سجی مہندی کی خوشبو نے اس کے مشام جاں کو معطر کر ڈالا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا کمرا تو سارے کا سارا اس کے قیمتی جہیز سے بھرا پڑا تھا لیکن قابلِ دید تو اس کا اسٹائلش، جدید ترین ڈیزائن اور کام کا بیش قیمت لہنگا تھا جس کو اس کی نندیں پھیلا کر گئی تھیں۔ اس نے آئینے میں اپنے جھلملاتے عکس کو دیکھا تو اپنے حسین روپ کو نظر لگنے کے ڈر سے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے نظریں چرا لیں۔

☆☆☆

''شکر ہے اللہ کا ہم اپنی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔'' رؤف صاحب نے اللہ کا شکر ادا کر کے بیگم کی طرف دیکھا۔

''جی الحمدللہ! خیر سے حور العین کی خواہش کے عین مطابق شادی بھی کتنی شاندار ہوئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے حور العین کی خواہشات ناجائز لگتی تھیں لیکن آپ نے دیکھا کیا شاندار طریقے سے ہماری بیٹی کی شادی ہوئی ہے کہ پورا خاندان دانتوں میں انگلیاں دبا کے بیٹھا ہے۔ اور آپا جو مجھے سَو سَو باتیں سنا کے گئی تھیں وہ بھی ہکا بکا دیکھ رہی تھیں۔ اوپر سے داماد بھی تو ہمارا ماشاء اللہ کتنا خوبرو ہے۔ عدن تو اس کے آگے پانی بھرتا نظر آیا۔''

''چلیں آگے بھی اللہ سب خیریت رکھے بیگم۔ اب سو جائیں کل ولیمہ بھی ہے۔'' رؤف صاحب نے

بیگم کو سونے کا کہا اور خود اس قرض کا سوچنے لگے جو اُن کو سمدھیانے کی برابری کرنے کے لیے لینا پڑا تھا۔

☆☆☆

سارے خاندان والوں میں خوب واہ واہ ہو رہی تھی کسی کی شادی نہ تو اتنے اونچے ہوٹلوں میں ہوئی نہ اس طرح سنگیت، مایوں، مہندی، شادی کی رسومات ہوئی تھیں جس طرح سے حورالعین کی ہوئی تھیں۔ اور واقعی اس کا شادی کا جوڑا تو اس قدر حسین تھا... جیسے سونے کے تاروں سے بنا ہو۔ بیش قیمت زیورات ہیروں سے مزین تھے۔ ولیمے کی تقریب بے انتہا خوب صورت لان میں رکھی گئی تھی لیکن اس کی سجاوٹ اور معیار وہ نہیں تھا جو شادی والے دن کے لیے حورالعین کی سسرال والوں نے اس کے والدین سے ڈیمانڈ کیا تھا۔ لیکن شہروز کی سنگت میں سیاہی مائل سبز سنہری ڈیزائنرز لہنگے میں کسی شہزادی کی سی آن بان سے کارپٹ پہ چلتی حورالعین ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ آس پاس ٹیبل پر بیٹھے سب مہمانوں کی نظریں خوب صورت دولہا دلہن پہ ٹکی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

''حور بھا۔بی، حور بھا۔بی پلیز آپ وہ دونوں عروسی جوڑے اور زیورات مجھے دے دیں مما مانگ رہی ہیں۔'' حورالعین کی چھوٹی نند شزا نے پھولی، پھولی سانسوں سے اس کی شادی اور ولیمے کے جوڑے اور زیورات مانگے۔

''کیا کوئی رشتے دار آیا ہے اس کو دکھانے ہیں تو فوٹو دکھا دو شزا،'' شادی کے ایک ہفتے بعد حورالعین نے الماری کھولتے ہوئے آہستہ، آہستہ باہر نکالتے جوڑوں پہ نظر ڈالی اور سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

''ارے نہیں بھابی! وہ ذرا سا اٹکی۔

''وہ دراصل یہ جوڑے ہم جہاں سے لائے تھے وہاں بس آج تک کا کرایہ ہی دیا تھا تو ابھی بہروز بھائی (دیور) نے واپس کرنے جانا ہے۔ تاکہ سیکورٹی کے پیسے واپس مل جائیں۔''

''کرایہ؟ پیسے...... کیا مطلب؟'' حور کا منہ حیرت اور ناسمجھی سے کھلا ہوا تھا۔

''ہاں بھابی کرایہ۔ یہ صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ ہم سب نے جو آپ کی شادی کو یادگار بنانے کے لیے کپڑے پہنے تھے ناں وہ بھی کرایے کے تھے۔ کوئی پاگل تھوڑا ہی ہیں کہ لاکھوں روپے کے سوٹ ایک ایک بار پہننے کے لیے خرید لے اور اتنے پیسے برباد کر دے۔ ہمیں تو بوا نے آپ کی شرائط بتا دی تھیں تو ہم نے بالکل ویسے ہی شادی کر ڈالی۔ ویسے ان کپڑوں اور جیولری کا کرایہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا ہے اور ایک راز کی بات بتاؤں! سب سے زیادہ کرایہ تو آپ کے برائڈل کا تھا کہ آپ نے تو وہ ڈیزائنرز آؤٹ فٹ.... منتخب کر لیے جو ابھی مارکیٹ میں بھی نہیں آئے تھے اور شادی کے باقی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے تو ہمیں اپنا آبائی گھر بھی بیچنا پڑا۔'' شزا اس کے اوپر انکشافات کے پہاڑ توڑتی ہوئی ڈبے اٹھا کر نیچے چلی گئی اور حورالعین کی آنکھوں میں ولیمے کے دن کا منظر پوری جزئیات سمیت گھومنے لگا۔

منتہا اسٹیج پہ اس کے پاس آئی تو بہت پیار سے حورالعین کی تعریف کی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو حور۔''

''ہاں پر تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ اپنی شادی پر تو کیا شان تھی آج بھی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آتی ناں؟''

''ارے! وہ شادی پہ، وہ میرے تھوڑی تھے۔ تو بتا، کتنے کرایے میں برائڈل جوڑا لائی ہے؟'' منتہا کہہ کے زور سے ہنسی۔

''چل دفع ہو۔ میرے اپنے ہیں، میں کیوں بھلا کرایے پہ لوں؟'' اس کے لہجے میں نخوت تھی۔

''میرا تو دو لاکھ کا برائڈل ہے بالکل جدید ڈیزائنر۔'' اپنے خود کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ کاش عروسی جوڑا سستا ہوتا مگر اپنا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کھلی الماری کا وہ خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا جہاں سے اس کے برائیڈل جوڑے جا چکے تھے۔

مکمل ناول

تیری چاہ سے

سدرۃ المنتہیٰ



''زندگی محض ٹین کے ڈبے پر گرتے پانی کے چند قطروں جیسی ہے۔''

اس نے کھڑکی کے ساتھ پٹ کے نیچے کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھا ہوا تھا۔ اور برسات کے قطروں کے ٹین کے کچرے کے ڈبے پر پڑتے ہی نیچے ٹپ، ٹپ، ٹک ٹک ٹوں ٹاں کی ہلکی سی آواز کے ارتعاش پر بغور دیکھا تھا۔ ہلکی سی روشنی اور نیم اندھیرے کا عکس......

''ہلکی روشنی اور نیم اندھیرے میں مجھے تمہاری



صرف آنکھیں نظر آتی ہیں امبر......'' کسی کے کہے جملے ذہن میں ابھرے۔ وہ اسے پیار سے امبر کہا کرتا تھا۔ جبکہ ماں، باپ نے ہمیشہ اسے پورا نام لے کر ہی مخاطب کیا تھا۔

امبرین کے نام کی مختلف اوقات میں مختلف لہجوں کے ساتھ پکار پڑتی تھی۔ ''امبرین چولھے کے پاس لکڑیاں نہیں ہیں۔''

''امبرین...... بارش کے پانی میں کوئلے گیلے ہو جائیں گے۔ اکٹھے کر کے کہیں رکھ دے۔''

''امبرین بستر اندر کر لے بھیگ جائیں گے۔''

کوئلے ،لکڑیاں، بستر ،چارپائیاں ،تار پر لٹکے کپڑے...... ایک امبرین اور یہ چیزیں اتنی زیادہ جو استعمال کے وقت اتنی کم نظر آتی تھیں...... جیسے جھاڑو دیتے وقت کچرا پتا نہیں کہاں سے آ جاتا ہے اور......اور کپڑے دھوتے وقت میلے کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور پہنتے وقت ہمیشہ کمی ہوتی...... یا پھر جھوٹے برتن......

''یہ چھت سے لٹکے پنکھے کے پروں پر کتنی جلدی میل چڑھ جاتی ہے۔'' اس پر جھلاہٹ طاری ہوتی۔ تب ہی اس نے سوچا تھا۔ ''اس دنیا میں ساری بری چیزیں اتنی کثیر تعداد میں کیوں ہوتی ہیں......اور اچھی چیزوں کی تعداد کم رکھی گئی ہے۔'' ماں کا خیال تھا۔ ''یہ بچت پیک خاص غریبوں کے لیے تیار ہوتا ہے۔''

وہ جو کہتا تھا...... ''تمہارے پاس کیا زندگی کے لیے کوئی اچھی تشبیہہ نہیں ہے، کوئی اچھی امید، کوئی خوب صورت جملہ کچھ تو اچھا ہو۔ گھر میں ماں، بہنوں کی چخ چخ، چیخ اور اِدھر تمہاری بدصورت باتیں...... تھک گیا ہوں۔ سہہ، سہہ کر۔'' ایک روز اس نے اس کی باتوں کو بدصورت کہہ ہی دیا۔

''تم نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتے نبیل......؟''

''سمندر میں سوئی ڈھونڈنا آسان ہے نوکری ڈھونڈنا مشکل......''

''چلو تو پھر اور آسان کام کرو۔'' اس نے پانی کے ٹب میں سوئی پھینک دی۔

وہ اسے غصے سے گھورنے لگا تھا۔

''کیا......؟ یہ سمندر تھوڑی ہے، ایک ٹب، ہے۔ ڈھونڈ کر دکھاؤ۔''

اس نے ٹب کے میلے پانی کو کراہیت سے دیکھا۔ جس میں سرف، صابن میں کیچڑ کی ملی جلی بُو تھی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔

''کیا ہو گیا...... کہاں گیا نبیل......؟ چائے بنالی تھی میں نے۔'' اماں کپ لے کر باہر آئی۔

''چلا گیا روٹھ کر۔''

''تم نے خفا کر دیا اسے...... چڑا دیا بلاوجہ......''

''وہ خود ہی چڑ جاتا ہے۔ میں کیا کروں؟''

''تمہیں ذرا سا احساس نہیں ہے اس بات کا کہ وہ روٹھ گیا تو کیا ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا اماں۔'' وہ بڑبڑائی۔

''چھوڑ کر چلا جائے گا ناں تب پتا چلے گا۔''

''چھوڑ کر چلا جائے۔'' وہ دل کڑا کر کے بولی اور اپنے کمرے کی طرف مڑی۔

''کوئی نہیں بیاہنے آئے گا تجھے ان کرتوتوں کے ساتھ۔ اب پورا ایک کپ ضائع ہو گیا۔'' یہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے چائے کا کپ ڈھک کر رکھ لیا کہ شوہر آئے گا تو گرم کر لے گی۔ پتا بھی تھا کہ وہ ذائقہ پہچان لیتا ہے ذرا بھی ذائقہ خراب ہو تو......کپ اٹھا کر دے مارتا ہے فرش پر۔ اور تب یہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ کپ ضائع ہونے پر چار دن ماتم کرتی وہ بھی اس کے سامنے۔

''اچھا ہوا تو مر گئی اماں......'' کہتے ہی آنکھ میں آنسو آ گئے......اور حلق بدذائقہ......

''زندگی بہت بری ہے اماں...... تیرے اندازوں اور میری تشبیہوں سے بھی کہیں زیادہ بری...... مگر اس کے باوجود بھی اسی زندگی کو جینا ہوتا ہے۔ ہر روز برا سوچ کر سو جانا۔ جھوٹی امید کے ساتھ اٹھنا...... صبح سویرے کام سمیٹ کر کالج کے لیے نکل جانا۔''

اسکول اور پھر کالج سے آگے اس کی زندگی نے

کوئی نیا رنگ نہ دیکھا...... پہلے پڑھنا پھر پڑھانا......
چلو کوئی تو بہانہ تھا بوجھ ہی سہی......زندگی اپنی طرف کھینچ
تو لیتی اور وہ......

وہ اب بھی ٹین کے ڈبے پر وہی جو کچرے کا ڈبا تھا۔ جس پر ہلکی سی برسات کی بوندیں گر کر چپ فضا میں ناپسندیدہ آواز پیدا کرتی تھیں۔ اور ساتھ میں گنگناتے ہوئے مچھر کھڑکی سے اس پر کود پڑتے۔

وہ جھلا کر سر جھٹک کر کھڑکی کا ایک پٹ بند کر کے کچھ ان کو، کچھ خود کو کوستی ہوئی...... جہاں پر کاٹ پڑتی وہاں ایک زبردست طمانچہ پڑتا۔ خود ہی ران کم بخت مچھروں کی وجہ سے تشدد مجبوری بن جاتی۔ بکتی جھکتی سوتی بن جاتی اور اوپر سے وہی کھوں کھوں کھانسی کی آواز...... وہی کھنکھار......وہی شیشوں کا گرانا، متوجہ کرنا اور وہی بے بسی...... اور اس کا جھلا کر اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ جانا......زندگی بس ایسی ہی تھی وہی گزرتے رات دن کی کہانی......

☆☆☆

''ابا جی......!''

''ہوں......''

''جاگ رہے ہیں؟''

''شاید......''

''اچھا......'' وہ ہلکی سی ہنسی۔

''کیا لطیفہ سنایا ہے میں نے؟''

''نہیں......اس سے کم......آپ کو اپنے جاگنے کا یقین نہیں؟''

''ہمیں زندگی میں بہت ساری باتوں کا یقین نہیں ہوتا۔ خود اپنے ہونے کا بھی نہیں......'' یہ جملہ آہستگی سے کہا گیا۔

وہ اٹھ کر اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہے...... یہاں کیوں آئی ہو؟'' ابا رات کے وقت بہت چڑچڑا ہو جاتا تھا۔

''میری مرضی...... میرا گھر ہے، میرا کمرا...... سب کچھ میرا ہے جہاں دل چاہے بیٹھوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک میں چیخنا شروع کر دیتی ہوں۔''

''مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا کب چھوڑو گی؟'' اس نے غصے سے گھورا۔

''جب آپ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیں گے۔''

''میں نے کب تمہیں تنگ کیا۔ دل کرتا ہے ایک تھپڑ جڑ دوں اگر بڑی نہ ہو گئی ہوتیں تو کب کا جڑ دیتا۔''

''آپ کو نہیں لگتا آپ کو آج کل بہت زیادہ غصہ آنے لگا ہے۔''

''تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے میرا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ابا......آدم جی......'' وہ اسے چڑانے کے لیے آدم جی کہتی تھی۔ ماں، باپ نے اس کا نام آدم رکھا تھا۔ اسے خود اپنے نام کے ساتھ کوئی جذباتی کیفیت نہیں محسوس ہوتی تھی۔

آدم......ایک دم روکھا پھیکا......سخت سا نام......جیسے صرف کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ جیسے صرف لکڑیاں سیدھی کرنے کے لیے......جیسے صرف خشک تاثر سے کتابیں پڑھنے کے لیے......مگر وہ اس کی چہیتی بیٹی تھی جس نے کہا تھا، جیسے جنگل میں پتوں اور لکڑیوں سے گھر بنانے کے لیے جیسے چرواہا بننے کے لیے......

مگر اگلے ہی لمحے وہ اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

''یہ نام آپ کی شخصیت پر ذرا سوٹ نہیں کرتا ابا جی۔''

آخر آدم کہہ کر وہ اسے چڑاتی، اس سے پہلے وہ اسے کچھ اٹھا کر مارنے لگتا، وہ قہقہے لگاتی قمقموں کی طرح جگمگاتی ہوئی ہنسی کا جلترنگ بجاتی اِدھر اُدھر... کدکڑے لگاتی فریج کے ساتھ یا الماری کے پیچھے چھپ جاتی اور اس کی چڑچڑاہٹ مسکراہٹ میں بدل جاتی۔

''ابا......!''

''ہوں......؟ اب کیا......'' وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

''رونا آ رہا ہے۔''

''کس لیے......؟'' روکھا سا انداز لیے وہ بولا۔

''کام نہیں کیا اس لیے......ابا میں کالج نہیں جانا چاہتی۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''مجھے کالج سے نکلوا دیں۔''
''پھر گھر میں بیٹھ کر کیا کرو گی..... مکھیاں مارو گی؟''
''ہاں، مار لوں گی۔''
''بکومت......''
''آپ چاہتے ہیں میں زبردستی پڑھوں؟''
''ہاں، میری خواہش تھی تم بہت سارا پڑھو، دیکھو تمہاری ماں ماسٹرنی ہے۔ اس سے تو آگے تمہیں پڑھنا چاہیے۔''
''میں آپ پر گئی ہوں ناں اس لیے۔''
''مجھے تو موقع ہی کم ملا۔''
''ایسے تو نہ بولیں، آپ کو پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔''
''نہیں، مجھے میٹرک تک بہت شوق تھا۔ پھر اچانک اُڑ گیا۔ اس کے باوجود بھی میں نے سیکنڈ ایئر اچھے نمبروں سے پاس کیا۔''
''وہ تو آپ کی قسمت تھی۔ چلیں میں بھی سیکنڈ ایئر اچھے نمبروں سے کرلوں گی۔ ایک مہینہ ہی تو ہے ایگزام میں..... اچھا آپ نے بی اے پارٹ ون میں کیوں چھوڑ دیا؟''
''بس دل خراب ہو گیا تھا میرا۔''
''تو سمجھیں میرا بھی دل خراب ہو گیا ہے۔''
''تمہارے ساتھ کیا برا ہوا ہے؟ میرے ساتھ تو بہت برا ہوا تھا۔''
''اگر نہ ہوتا تو میں کہاں سے آتی بھلا۔'' وہ کھلکھلائی۔
''تم میرے نصیب میں تھیں اس لیے آگئیں۔''
''ابا، کیا آپ کو کمپلیکس ہو رہا ہے؟''
''نہیں، کمپلیکس ہونا چاہیے مگر نہیں ہوا۔''
''خالی افسوس ہو رہا ہے؟''
''شاید..... ہاں..... شاید نہیں..... اچھا چلو سو جاؤ..... سر نہ کھاؤ..... کل کام پر بھی جانا ہے مجھے۔''
''ابا.....؟''
''اب کیا؟'' وہی پھاڑ کھانے والا انداز......
''کچھ اچھا ہو۔''
''مثلاً؟''
''کہیں گھومنا پھرنا......''
''نہیں ہرگز نہیں..... جو پیسے میں نے تمہاری شادی کے لیے جوڑے ہیں وہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے میں ضائع نہیں کرسکتا۔ قطعی نہیں۔''
''آپ میرے ساتھ وہی ظلم کریں گے جو آپ کے ساتھ ہوا؟''
اور اسے پتا نہیں تھا کہ عنقریب وہ خود ان سے یہ فرمائش کرنے بیٹھ جائے گی۔

☆☆☆

''زندگی آئینوں کی طرح شفاف ہے اور اس میں تمہاری صورت ایک پری وش جیسی......''
یہ عمر چھپ چھپا کر خوب صورت سے جملے پڑھنے کی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا۔ ٹینا کے چہرے پر خوب صورت پھیلتی چلی جاتی مسکراہٹ سے اور ہونٹ دانتوں تلے دبانے کی حرکت سے لے کر چوری، چوری چٹ پڑھ کر مٹھی میں دبا لینے تک سب وہ جو دیکھا جاتا ہے۔ جواز خود نظر میں آجاتا ہے۔
چھوڑتے بچپن کو پیچھے پلٹے بغیر دیکھے بنا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نئے احساسات سے ہمکنار ہونے کے بعد ہونٹوں پر اچانک مچل جانے والی مسکراہٹ ثبت ہوگئی۔
اسے تیزی سے یہ احساس جاگا کہ وہ یہ عمر پیچھے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اب پیچھے پلٹ کر دیکھنا ایک حماقت تھی۔ ٹینا گراؤنڈ سے نکلتے ہوئے آنکھوں کا پیغام پڑھ کر گیٹ تک گئی تھی۔
مگر وہ..... جو عمر کے مکر و فریب میں پھنس جانے والے دور سے واقف تھی، اس سے پہلے ہی اس کی تاک میں کھڑی تھی۔
''بارش ہونے والی ہے۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں..... میرا رکشا آگیا ہے۔''
''م..... میں..... چلی جاؤں گی۔''
عماد اسے اس طرف آتا دیکھ کر ہٹ گیا تھا۔ اس کا موڈ بری طرح خراب تھا۔
اور ٹینا..... جیسے کوئی چوری پکڑے جانے پر......
چپ چاپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اشارے پر رکشے میں بیٹھ گئی تھی۔ موڈ تو ادھر اس کا بھی آف تھا مگر اسے آن کرنا آتا تھا۔

''تمہارا باپ ایک اچھا آدمی ہے، اس نے کالج والوں کو تمہارے بارے میں خاص ہدایت کی ہے۔''
''اس لیے کہ وہ مجھ سے بہت پیار سے کرتے ہیں۔''
''ہاں، مجھے پتا ہے انہیں بہت فکر ہے تمہاری۔''
''میں اب بچی نہیں ہوں۔''
''مگر حرکتیں بچوں جیسی ہیں۔''
اس نے بہت بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے اگر بس چل جاتا تو جانے کیا کر ڈالتی۔
''تمہارے دیر سے گھر جانے پر وہ کافی پریشان ہوتے ہیں اور بھگتنا کالج کی انتظامیہ کو پڑتا ہے۔''
''مجھے پتا ہے۔''
''تم کیا اپنے باپ سے ذرا نہیں ڈرتیں۔''
''ہاں، مجھے صرف ان کی پروا ہے۔''
''اچھا...... اچھی بات ہے۔ میں تمہاری عمر میں تو اپنے باپ سے بہت ڈرتی تھی۔''
''اب کیوں نہیں ڈرتیں آپ؟''
''تم سمجھتی ہو مجھے اب بھی ڈرنا چاہیے؟''
''جی بالکل!'' عجیب اعتماد تھا لہجے میں۔ ''اب ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔
''نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں مجھ پر بھروسا رکھنا ہے۔ کیونکہ میں اس تمہاری والی بچکانہ عمر سے نکل آئی ہوں۔''
''میرے ابا مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔'' وہی اعتماد......
''ہاں...... جبھی تم ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے چلی تھیں، تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کہ اگر تم اس لڑکے کے ساتھ نکل جاتیں تو وہ کتنے ٹوٹ جاتے۔''
''وہ لڑکا عماد آپ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ آپ جانتی ہیں وہ کتنا اچھا ہے۔ گھر چھوڑنے جا رہا تھا مجھے وہ۔''
''بے وقوف ہو تم...... لڑکیوں کو عقل آتے، آتے پتا نہیں کیوں اک عمر گزر جاتی ہے۔''
''مجھے اپنا برا بھلا پتا ہے۔''
''صرف پتا ہے مگر...... دیکھو تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔''
''سترھواں لگ گیا ہے اس سال...... چھوٹی نہیں ہوں۔''
''تو بڑی بھی نہیں ہو۔'' وہ بلا وجہ ہی ہنس دی۔
''مجھے روک کر آپ کو خوشی ہوئی ہے ناں......''

''ہاں...... بہت زیادہ......''
''مطلب کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔''
''بھلا...... کیا؟''
''کہ آپ ہم دونوں سے جلتی ہیں۔''
''پاگل ہو تم لوگ...... میں جلوں گی وہ بھی تم لوگوں سے۔''
وہ پھر سے ہنس دی تھی۔
''آپ بچوں کی طرح بار، بار میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔''
''کاش تمہیں الفاظ استعمال کرنے کی تمیز بھی ہوتی۔'' وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔
''ارے بھیا کیا ہوا...... اوہ ہو...... آگے پانی ہے۔'' اس نے رکشار کتے ہی دیکھا۔
''جی بی بی اس طرف بہت پانی ہے، نہیں جاسکیں گے۔'' وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہی تھی۔
''چلو تو گھر لے چلو ہمیں۔''
''جی بہتر......''
''میں آپ کے گھر کیوں چلوں گی؟''
''اس لیے کہ جو سڑک تمہارے گھر کی طرف جاتی ہے وہاں پر بہت پانی ہے۔ برسات بھی تو بہت تیز ہے۔''
''دیر سے پہنچنے پر میرے ابا خفا ہوں گے۔ ان کا بھروسا ٹوٹے گا۔''
''نہیں ٹوٹے گا، میرے گھر پر فون ہے، تم انہیں بتا دینا بلکہ میں بھی بات کرلوں گی تاکہ تسلی ہو جائے۔''
''ان کو پھر بھی برا لگے گا۔''
''اس سے پھر بھی کم ہی اگر تم اس لڑکے کے ساتھ نکل جاتیں۔''
''میں اس پر بھروسا کرتی ہوں۔''
''اس سے زیادہ تمہارا باپ تم پر کرتا ہے تو وہ بھروسا زیادہ قیمتی ہے۔''
''وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا۔''
''اور تمہارا باپ تمہارے بارے میں کیا سوچتا؟''
''کچھ نہیں...... بلکہ وہ پوچھتے تو میں بتا دیتی عماد کے بارے میں۔''
''بہت برا طریقہ تھا متعارف کرانے کا......

ملوانے کا۔''
''میری مرضی......''
''تم میں بہت اکڑ ہے، استادوں سے اس طرح بات کرتے ہیں؟''
''ہم کلاس میں نہیں ہیں۔ اس وقت آپ مجھے اغوا کر کے لے جارہی ہیں۔''
''تمہیں اغوا کر کے مجھے کیا ملے گا۔'' وہ پھر ہنس دی۔
''ایک سونے کی پازیب، چاندی کا لاکٹ اور ڈھیر ساری لکڑیاں اور پانچ سو کتابیں۔''
''واہ......زبردست......آفر بری نہیں ہے۔''
''مطلب آپ کی نیت بری ہے؟''
''تم کیا سمجھتی ہو، ایک سونے کی پازیب، ایک چاندی کا لاکٹ، ڈھیر ساری لکڑیاں اور......پانچ سو کتابیں......واہ......کتابوں کی پیشکش اچھی ہے۔ تم نے اپنے پاس پانچ سو کتابیں رکھی ہوئی ہیں؟''
''نہیں میرے ابا نے۔''
''پھر تو بڑے باذوق ہیں وہ۔''
''پتا ہے......بور بھی ہیں بہت......''
اتنے میں رکشار کا وہ دونوں اتر گئیں۔
ٹیتا دو لمحے کے لیے رکی رہی۔
''ارے اس وقت ہر جگہ پانی ہے۔ بھاگ کر کیا کرو گی......آجاؤ......رات ہونے والی ہے۔ اور تمہیں بھوک بھی تو بہت لگی ہوگی۔''
وہ ناچار بھوک کا سوچ کر اس کے ساتھ آگئی۔
''واش روم کہاں ہے؟'' اسے یہ گھر ایک مینڈک کی کا کنواں معلوم ہوا۔ کتنا کھنڈر، کھنڈر سا لگتا تھا۔ اکھڑا پلستر، عجیب وغریب شکلیں بنا رہا تھا دیوار پر وہ ایک دم سے نظر چرا کر بیٹھ گیا۔
اس نے کمرے کے دروازے کی کنڈی چڑھائی۔
''آپ بند کیوں کر رہی ہیں دروازہ؟''
''تمہارے دماغ میں جتنے بھی الٹے سیدھے خیالات ہیں سب کو باہر پھینک دو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں آتی ہوں ابا جی کو دیکھ کر۔''
''تم اوپر مت آنا......واش روم سامنے ہے۔

ساتھ میں غسل خانہ ہے اور وہ بالکونی......'' وہ بالکونی کی طرف آگئی۔
تب اسے تسلی ہوئی اور وہ اٹھ کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ اس نے سر اٹھا کر اونچی چھت میں لٹکے بوسیدہ، ٹوٹے شیشوں والے جھاڑ کو خوف زدہ انداز میں دیکھا تھا، اسے اسی لمحے لگا یہ جھاڑ اور لمبے ڈنڈے سے لٹکا ہوا پنکھا ابھی کے ابھی اس کے سر پر آگرے گا۔ اور اس خیال نے ہی اسے ہولا دیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر خوف زدہ ہو کر سر پر ہاتھ رکھ کر اس طرف سے ہٹ کر بالکونی کی طرف ہوگئی۔ اور تبھی تیزی سے ہٹتے وہ ٹین کے دروازے کے کھلے پٹ سے ٹکرا کر گرتے ہوئے بچی تھی۔
یہ دروازہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔
اس نے جھرجھری لیتے ہوئے اندر جھانکا تھا۔
تصدیقی انداز میں بلاشبہ دیواروں کی خستگی اور چھت سے لٹکتی ہوئی بتی والا فانوس عجیب سا احساس پیدا کر رہا تھا۔
مگر باتھ روم کے فرش کی صفائی قابلِ دید تھی کسی بھی قسم کی بُو کو نہ محسوس کرتے ہوئے وہ ذرا لمبی سانس باہر چھوڑ کر واش روم میں گھس گئی۔ اور ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو کر باہر نکلی تو وہ بالکونی میں کھڑی کچھ سکھا رہی تھی۔ زور، زور سے کپڑے نچوڑ کر جیسے اس نے پوری توانائی کپڑے نچوڑنے پر ہی ضائع کر دی تھی۔
یہ اس کی عادت تھی وہ جو کام بھی کرتی تھی پوری طاقت سے ایسے ہی کرتی جیسے مکمل طاقت خرچ کرنی ہے اور اس کے بعد ایک لمبی سانس کھینچتی۔ مردانہ کپڑے رسی پر ڈال کر اس نے بیسن کا نل کھول کر ہاتھ دھوتے ہوئے ٹیتا کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو جھینپے انداز میں مسکرا دی۔
''مجھے ذرا دیر ہوگئی......انہوں نے کپڑے گندے کر دیے تھے اصل میں۔''
''کس نے......؟''
''ابا جی کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔'' وہ تولیے سے ہاتھ خشک کرتی ہوئی ادھڑے پلستر کی

دیواروں والے لاؤنج سے گزر کر چھوٹے سے ڈبیا نما کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

''مجھے پتا ہے تمہیں بہت بھوک لگی ہے۔ انہیں بھی لگی ہے بہت...... میں نے بیسن کے پکوڑے بنائے تھے دن میں...... ہاٹ پاٹ میں رکھے ہیں ابھی تازہ ہیں۔''

اس نے ہاٹ پاٹ سے پکوڑے نکال کر اخبار میں لپیٹ کر انہیں نمی سے خشک کیا اور توے پر رکھ کر سینک لیے۔

ڈبل روٹی کے چار پیس پڑے تھے جو اٹھا کر اس نے باسی نہ ہونے کی تصدیق کی اور گرم کر کے اس کی طرف پلیٹ میں ڈال کر بڑھا دیے۔ وہ خود باسی غذائیں کھانے کی عادی تھی، اس لیے بے جھجک لے لیے۔

''آج رات اگر مجھے پیٹ میں درد ہوا تو ڈاکٹر کے پاس آپ ہی لے جائیں گی۔'' وہ یہاں ساتھ لے آنے کے جواب میں اسے...... بھرپور طریقے سے زچ کرنا چاہتی تھی، سو اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ سارے بدلے کلاس میں اس سے چکائے جاسکتے ہیں۔

وہ اس کی بات پر محض مسکرا دی اور جلدی، جلدی جو کا دلیا بنانے لگی۔ دلیے کی ایک پیالی اس نے اس کے لیے بھی نکالی۔

''میں نہیں کھاتی یہ مریضوں والا کھانا۔'' اس نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ہے...... تو پھر میں آ کر خود ہی کھالوں گی۔'' وہ دلیے کا پیالہ لے کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

اوپر سے کسی کے کھانسنے کی کھوں، کھوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے دلیے کی پیالی کے کنارے پر انگلی پھیر کر منہ میں ڈالی تو حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔ دلیا اس قدر لذیذ تھا کہ وہ پوری پیالی چٹ کر گئی اور اس کو آتا ہوا دیکھ کر پیالی کے کناروں کو انگلی کی مدد سے چاٹنا چھوڑ دیا۔

وہ تب بھی صرف مسکرا دی تھی۔

اور اب وہ اپنے لیے ہنڈیا میں چمچ چلا چلا کر بچا کھچا آمیزہ چمچ گھما کر نکال رہی تھی۔

جب ہنڈیا پوری صاف ہوگئی تو اس نے دلیے کا آمیزہ سوکھی ہوئی روٹی پر رکھ کر مزے لے، لے کر کھایا تھا۔ اور اتنی دیر میں پہلی بار اسے احساس شرمندگی ہوا کہ اسے پوری پیالی چٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وہ بات بدلنے کے لیے شکایتاً سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ نے کہا تھا فون ہے گھر پر...... کہاں ہے۔''

''اوہ ہاں ہے تو سہی......'' وہ اٹھی اور لینڈ لائن سیٹ میز سے اٹھا کر تار چیک کرنے لگی، لینڈ لائن سیٹ کوئی دس بارہ سال پرانا لگتا تھا، شکر ہے دیوارں کی طرح ابھی اس کا روغن پوری طرح سے نہیں اکھڑا تھا۔ اس نے پہلے کوئی نمبر ملا کر چیک کیا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے؟ اب تم اپنا نمبر ملالو۔''

''وہ تو مجھے یاد ہی نہیں؟''

''لو...... نمبر یاد نہیں ہے...... ہوسکتا ہے میری ڈائری میں لکھا ہو۔'' اس نے فون کے پاس رکھی فون ڈائری اٹھائی جس میں اسٹوڈنٹس نمبرز کی ایک لسٹ تھی۔ جس میں ایک نمبر اس کے گھر کا بھی نکل آیا تھا۔ اس نے شکر بھری سانس لے کر نمبر ملایا اور ریسیور اس کے حوالے کر دیا۔

''ہیلو ابا...... ہاں میں ہوں بیٹا...... ٹیچر کے گھر پر ہوں...... یہ مجھے زبردستی یہاں لائی ہیں، میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ جلدی سے آکر مجھے یہاں سے لے جائیں۔'' وہ مصنوعی فکر سے بولی بغیر اس کا لحاظ کیے اور ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ایڈریس بتا دیں ابا کو۔''

وہ اس کی ڈھٹائی پر اب بھی نہ مسکراتی تو کیا کرتی۔

''جی آدم صاحب...... جی خیریت ہے، ہاں جی اس نے کھانا کھالیا ہے۔''

''صرف پکوڑے اور دلیا......'' وہ پیچھے سے چیخی۔

''وہ بھی تو کھانے میں آتا ہے۔'' اس نے گھر کا اور بات جاری رکھی۔ دو منٹ بعد فون بند ہوگیا تھا۔

''وہ تب تک نہیں آپائیں گے جب تک برسات

نہیں تھم جاتی......اور تمہیں یہاں ہی رہنا ہوگا...... میرے پاس۔''

''اللہ......کتنی گرمی ہے یہاں پر۔''

''چلو میں تمہیں پنکھا چلا دیتی ہوں...... اُدھر آؤ۔'' لاؤنج کے ساتھ ایک چھوٹا کمرا تھا جیسے بے بی کاٹ کے لیے بیڈ رومز کے ساتھ جگہ بنی ہوتی ہے بالکل اسی طرح کا۔ لاؤنج کے ساتھ جڑا ہوا چھوٹا سا کمرا، لکڑی کی چار پائی پر نرم بستر بچھا تھا۔

اور ایک پٹ والی الماری، ساتھ میں چھوٹا سا اسٹول نما میز اور سیف رکھا ہوا تھا۔ بیچ میں دو قدم دھرنے کی بہ مشکل جگہ تھی۔ وہ چپل اتار کر بستر پر چڑھ گئی۔

امبرین نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول لی، جس سے کچھ تازہ ہوا بارش کی پھوار کے ساتھ اندر آئی تھی تو کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔

چھوٹا سا چار جنگ والا پنکھا دیوار پر ٹانگ دیا گیا تھا جس کا سر جھکا ہوا تھا چار پائی کی طرف۔ اس نے وہ چلا دیا۔ ایک چھوٹا سا پنکھا چھت سے بھی لٹکا ہوا تھا جو غالباً بجلی سے چلتا تھا۔ اگر بجلی ہوتی تو......

چھوٹے سے کمرے میں تازگی کا احساس بھر گیا۔

''بات سنو میری الماری کھولو، کوئی بھی دھلا ہوا جوڑا نکال کر پہن لو اور آرام سے سو جاؤ۔ تمہارے ابا جب آئیں گے تو اٹھا دوں گی تمہیں۔''

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' وہ پہلی بار یہاں اکیلے رہنے کے ڈر سے خوفزدہ ہو کر گھبرائی تھی۔

یہ اس کی عادت تھی سونے سے پہلے سو بار ابا سے تصدیق چاہتی کہ وہ جاگ رہے ہیں تو جا کر اسے نیند آتی تھی۔ یہ تب کی عادت تھی جب ماں اسے بستر میں سوتا چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ ڈر گئی تھی۔ یہ عادت اب فطرت ہی بن گئی تھی اس کی۔

''مجھے ابا کو دیکھنا ہے......انہیں سلا کر آجاؤں گی۔''

''میں آپ کے ساتھ چلوں؟''

''نہیں، تمہیں وہاں مزہ نہیں آئے گا بلکہ الجھن ہوگی۔'' وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

مگر اس کے جاتے ہی اس کے پیچھے بھاگی تھی، اوپر جاتی سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ ایک کمرا تھا۔ جس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ریلنگ کے ساتھ ہی ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی مگر زیادہ دیر رک نہ سکی کونے میں رکھے ڈسٹ بن سے آتی بساند نے اسے متوجہ کیا۔

جس میں مردانہ میلے کپڑے پڑے تھے۔ اور شاید برسات کی وجہ سے ان میں سے گیلاہٹ اور بساند ہو مگر یہ بُو اور تھی......اسے الٹی آنے لگی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نیچے کی طرف دوڑی، جب امبرین نے ادھ کھلے دروازے سے اسے تیزی سے سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

پھر دوائیوں کی وہ شیشیاں جو الٹا دی گئی تھیں وہ اٹھائیں۔ ایک سیرپ تھا وہ کل ہی لائی تھی۔ شیشی کی کرچی ٹوٹنے کے ڈر سے اس نے ایک کھلے برتن میں وہ سیرپ چھان لیا اور پھر دوسری خالی شیشی میں بھر لیا تھا۔ اور پھر اسے اوپری طاق میں رکھ دیا۔

اسے پتا تھا ان سے بھی کچھ بھی کہنے کا مقصد تھا مزید غصہ اور شور......جس کا نتیجہ بے سکونی تھی وہی روز کی بے سکونی......روز کی جھلاہٹ اور بے بسی......وہ آخر کتنے آنسو بہاتی اس لیے خود کو بہادر کر لیا تھا۔ ان کے بستر کے ساتھ کھڑا چار جنگ پنکھا اپنا دم کھو چکا تھا۔ تب تک وہ انہیں ہاتھ کا پنکھا جھل کر ہوا دیتی رہی۔ جب تک کہ بجلی نہ آگئی۔

اور تب ان کی نیند بھی گہری ہو گئی تھی۔ کھیس نکال کر ان کے اوپر ڈال کر وہ دروازہ بند کر کے نیچے آگئی تو وہ اس کا نیلے رنگ کا سوٹ پہنے آڑو کھا رہی تھی۔ یہ آڑو پڑوس والی سیما اس کے لیے لائی تھی جب وہ صبح کالج جا رہی تھی اور تب اس نے وہیں رکھ دیا تھا۔

اسے آڑو کھانا برا نہیں لگا جتنا اپنے نئے جوڑے کا گریبان آڑو کے رس کے قطروں سے تر دیکھ کر لگا تھا۔

''کیا......؟ آپ نے کہا تھا جو جوڑا اچھا لگے وہ پہن لینا۔'' وہ اس کی نظروں کا پیغام سمجھ گئی تھی۔

''تم بہت بری طرح کھاتی ہو، گدھوں کی طرح......'' بیزار کن تاثرات سے وہ بولی۔

''مہمان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کون کرتا

ہے جیسا کہ آپ کر رہی ہیں۔"
"مہمان کو اس قدر بھی کوئی سر نہیں چڑھاتا جتنا میں چڑھا رہی ہوں۔"
"تو مت چڑھائیں۔" وہ آڑو کھا کر ہاتھ صاف کرنے اٹھی اس کا بس چلتا تو دوپٹے کے پلو کو رنگین کر کے اسے مزید تاؤ دلاتی مگر رحم آ گیا اس کی صورت پر لکھی بے بسی سے ساتھ میں بھرپور مسکراہٹ جو بالکونی کی طرف جاتے ہوئے ہلکی ہنسی میں بدل گئی تھی۔
وہ سر جھٹک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر اسے آتا دیکھ کر اپنے لیے کرسی سیدھی کی اور گھسیٹ کر چارپائی کے پائنتی کے ساتھ لگا دی۔
اسٹول سے کتابیں اٹھا کر گود میں رکھیں اور ٹانگیں دراز کر لیں...... اب وہ بچوں کے نوٹس چیک کر رہی تھی۔
اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے جاگنے کی تسلی کر کے وہ بستر پر دراز ہوئی اور سوتی بن گئی۔ چند منٹ میں ہی وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور امبرین نے اس کی بے فکر نیند اور بھولے سے چہرے کو نیم اندھیرے میں دیکھا۔
کبھی اس کی نیند بھی پُرسکون ہوا کرتی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر نوٹس کی فائل سینے سے لگائی اور ٹانگیں مزید دراز کیں...... کرسی کی پشت سے تکیہ لگائے سر لکا دیا۔ اور آنکھیں موند لیں جبھی اوپر سے کچھ پھینکنے کی آواز آئی۔
"مطلب وہ جاگے تھے، کتنی بار کہا ہے گھنٹی بجا دیا کریں...... مگر سنتے نہیں ہیں۔" وہ جھلاتی بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ یہی تھی بس اس کی زندگی مرجھائی ہوئی...... اور کملائی ہوئی......
بدرنگ دیوار سے اکھڑ کر گرتے ہوئے پلستر اور جھڑتے ہوئے روغن کے اندر سے جھانکتی سفید چونے کی سی۔
☆☆☆
صبح امبرین کے ساتھ وہ کالج چلی گئی تھی، اس کے ابا وہیں پر آ گئے تھے، کچھ دیر ویٹنگ روم میں بیٹھے

رہے تھے، اس کی چھٹی کے انتظار میں...... اسے پتا تھا وہ گھر جا کر اس کی کلاس لیں گے معلوم نہیں مس امبرین نے کیا کہا ہوگا۔ وہ اپنے اکلوتے دوست کی کھٹارا گاڑی لائے تھے۔ جس کا ہمیشہ کی طرح ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔

''یہ کھٹارا لانے کی کیا ضرورت تھی ابا...... میں رکشے میں نہیں آسکتی تھی کیا۔''

''مجھے پتا تھا تم یہی کہو گی۔ مگر مجھے دو ایک کام اور بھی تھے۔''

''تو مجھے گھر چھوڑ کر پھر کام کے لیے نکلیے گا۔ میں اتنی گرمی میں گاڑی میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔'' وہ جب غیر ضروری بولتی تھی تو وہ چپ ہی رہتے تھے۔

''آخر یہ گاڑی کبھی ہموار سڑک پر خراب کیوں نہیں ہوتی؟'' وہ اسے ناگواری سے دیکھتے رہے۔

''کیسی لگتی ہیں آپ کو مس امبرین؟''

''اچھی انسان ہیں۔''

''پھر کیا خیال ہے؟''

''کس سلسلے میں......'' حالانکہ وہ اس کی ٹون سمجھ رہے تھے۔

''بکومت، عورت ہو کر عورت کی عزت نہیں کرتی ہو۔ تمہاری یہ باتیں سخت بری لگتی ہیں مجھے۔''

''میں تو بس یونہی۔''

''ہاں تم تو بس یونہی مت ہانکا کرو۔'' وہ اتنی دیر میں ٹائر بدل چکے تھے۔ اسے یہی فکر تھی مس امبرین نے کچھ کہہ نہ دیا ہوان سے۔

''ابا...... بات سنیں۔''

''جو تمہارے دل میں ہے وہ کہہ دو ٹیتا۔''

''مس امبرین نے آپ سے میری کوئی شکایت تو نہیں کی؟''

''کس قسم کی شکایت۔'' وہ ناسمجھی سے بولے۔ مگر پھر اسے مشکوک سے انداز میں دیکھنے لگے۔

''مطلب کہ کوئی کارنامہ کیا ہے تم نے؟''

''میں نے تو کچھ نہیں کیا'' مطلب انہوں نے بات نہیں کی اس نے شکر کی سانس لی۔

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔'' انہوں نے سر جھٹکا۔

''ویسے آپ آج بہت اچھے لگ رہے تھے۔''

''مجھے تعریف سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''کوئی اور لڑکی کرتی تو اچھا لگتا...... بیٹی کی کہا اچھی لگے گی۔''

''بہت ذہن خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ فضول بولنے لگی ہو۔''

''آپ کو تو میری صلاحیتیں کبھی نظر نہیں آئیں۔''

''اب میرا منہ مت کھلواؤ تم۔'' گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

آگے جا کر وہ سگنل پر رکے۔ اور ساتھ میں جو گاڑی تھی وہ شاہینہ اس کی ماں کی تھی۔

شاہینہ نے ٹیتا کو دیکھ کر بات کرنا چاہی تھی۔ مگر ٹیتا نے دوسری جانب گردن کر کے یہ ظاہر کیا کہ اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

''وہ تمہاری ماں تھی...... تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' گاڑی جب آگے بڑھی تو آدم نے اسے ڈانٹا۔

''مجھے نہیں فرق پڑتا۔''

''تم کافی عرصے سے ملنے بھی نہیں گئیں اس سے بلکہ اب تو پورا سال ہونے کو آیا ہے۔''

''اس سال میں انہوں نے میری خیریت کتنی بار پوچھی ہے؟''

''مجھے لگتا ہے اسے تمہاری فکر رہتی ہوگی۔ آخر کو تم اس کی بیٹی ہو۔''

''رہنے دیں......'' اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔

''میں نے کبھی تمہیں اس کے خلاف نہیں کیا۔ پتا نہیں کہاں سے تمہارے دل میں اتنی نفرت آگئی ہے۔''

''نفرت نہیں ابا...... محبت بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ......'' وہ اس کی بات پر کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

☆☆☆

''سنیں، میں آپ کے کمرے میں آکر رہ جاؤں؟'' اس نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔

وہ اٹھا اور ناگواری سے دروازہ کھولا۔

''آجاؤ، کبھی سکون کے ساتھ رہنے نہیں دیا مجھے۔ سوچا تھا تم بڑی ہو جاؤ گی تو میں سکون کی سانس

لوں گا کچھ وقت اپنے کام کے ساتھ اور کچھ اپنی کتابوں کے ساتھ مگر نہیں......''

وہ ڈھٹائی سے آکر بیٹھ گئی تھی ان کے بستر پر۔

''اب یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

''بیٹی ہوں آپ کی...... کیا نہیں بیٹھ سکتی؟''

''اٹھو اور صوفے پر سو جاؤ۔''

''ابا، نہیں ناں...... اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے مجھے۔''

''منہ توڑ دوں میں تمہارا، دل تو یہی چاہتا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کب بڑی ہوگی تم؟'' وہ جھلا کر ایک طرف لیٹ گیا۔

''ابا، میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں؟''

''گود میں ہی آجاؤ۔'' وہ سختی سے کہنے لگا۔

''اچھا ابا...... باتیں کریں ناں......!''

''یہ کام تم بہت اچھا کر لیتی ہو۔'' وہ جھلایا۔ ''اچھا ابا خوش ہو جائیں، چلیں میں آپ کی شادی کرا دیتی ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ جیسے لطیفہ سن کر ہنسا تھا۔

''ہاں تو اور کیا......'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اتنی ساری لڑکیاں ہیں میرے کالج میں، آپ کوئی ایک پھنسالیں، اتنے ینگ تو ہیں آپ؟''

''شرم کرو ساری میری بچیاں ہیں، تمہاری عمر کی......''

''چھوڑیں اب ابا، کوئی نہیں بچیاں۔ اچھا چلیں، یہ بتائیں مس امبرین کیسی ہیں؟'' دل کی بات وہ زبان پر لے آئی تھی۔

''اب اگر دوبارہ تم نے یہ بات کی تو میں واقعی تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

''ارے واہ...... کیوں اتنی بری ہیں کیا وہ؟''

''بری نہیں ہیں ٹینا، بیٹا وہ بہت شریف ہیں' عزت دار ہیں۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''اور آج تیسری بار تم نے ان کا اس حوالے سے نام لیا ہے انہیں معلوم ہوا تو کتنا دکھی ہوں گی وہ کہ ہم ان کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں۔''

''انہیں معلوم ہو تب ناں۔''

''تو پھر اب ایسی بات آئندہ مت کرنا۔''

''نہیں کروں گی...... بس وہ ذرا مسکین سی نظر آئیں تو میں نے کہا۔''

''بے فکر ہو جاؤ، میں کسی لڑکی کو مفت میں لا کر تمہاری بدتمیزیوں کا نشانہ نہیں بناؤں گا۔ پہلے تمہاری شادی کروں گا اور پھر مجھے کرنا ہوگی تو خود کر لوں گا۔''

''ارے واقعی......'' وہ خوشی سے اچھلی۔

''تو پھر کوئی لڑکا دیکھوں؟''

''خبردار جو ایسا سوچا بھی تو...... میں ہوں اس کام کے لیے...... خود ہی ڈھونڈ لوں گا۔''

''میں نے اگر ڈھونڈ لیا تو کیا ہو جائے گا؟'' وہ آہستہ آہستہ انہیں ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔

''تمہیں ذرا شرم نہیں آتی، اپنے باپ کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔''

''آپ میرے دوست بھی تو ہیں ناں......''

''اس طرح کی باتوں کے لیے میں تمہارا دوست بن جاتا ہوں۔ اور ویسے کیا دشمن ہوں۔ کوئی ایک بات نہیں مانتیں تم میری۔''

''مانتی تو ہوں...... اب اور کیا کروں...... دیکھیں ابا آپ نے کہا انٹر سائنس میں کروں...... میں نے آپ کی بات مانی۔''

''ہاں میں نے کہا تھا مجھے امید تھی کہ تم اچھے مارکس لاؤ گی اور میں تمہیں میڈیسن پڑھاؤں گا۔''

''حالانکہ آپ کو پتا ہے میں خون دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہوں۔ انجیکشن کسی اور کو لگتا ہے، درد مجھے محسوس ہوتا ہے خوامخواہ میں میرے دو سال ضائع کروا دیے۔''

''چلو اب تو خوش ہو ناں اپنی مرضی کے مضامین لے کر۔''

''اب بس میں نے گریجویشن کے بعد نہیں پڑھنا۔''

''تم فکر مت کرو، میں عنقریب تمہاری شادی کرنے کا سوچتا ہوں۔''

''ہائے ابا آپ کتنے اچھے ہیں۔'' وہ ایک دم گلے لگ گئی۔

''اتنی بے شرم لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں

دیکھی۔ کیسے شادی کی بات پر خوش ہورہی ہے۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''یہ کانفیڈنس آپ نے ہی دیا ہے مجھے۔''

''کانفیڈنس اور بے حیائی میں واضح فرق ہوتا ہے بچے۔''

''توبہ ہے ابا...... کبھی دوست نہ بننا۔''

''دوست بن، بن کر تو تمہارا دماغ خراب کیا ہے۔اب باپ بن کر دکھاؤں گا تو مزہ آئے گا۔''

''اچھا چلیں غصہ نہ کھائیں...... نیند کھائیں۔'' وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی۔

''ابا...... ایک بات پوچھوں؟'' کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔آدم نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کرلیں جیسے سو گیا ہو۔

''ابا مجھے پتا ہے، آپ جاگ رہے ہیں، سنیں ناں۔''

''اب پھوٹو بھی کون سا میرے منع کرنے سے تم چپ رہو گی۔''

''وہ آپ کی میز کی دراز میں ''ان'' کی فوٹو کیوں پڑی ہے؟''

''وہ تمہاری ماں ہے ٹینا۔''

''مجھے پتا ہے ضرور ہوں گی...... مگر آپ نے اب تک وہ فوٹو کیوں رکھی ہے۔''

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ نہیں رکھنی چاہیے تو تم ہٹا دینا۔''

''ابا، آپ کو ان سے محبت ہوگئی تھی کیا؟''

''اب یہ ساری بیکار باتیں ہیں ٹینو۔ اس لیے تم سو جاؤ پلیز۔''

''ابا...... آپ بہت اچھے ہیں...... انہوں نے اپنے نصیب کو خود ٹھکرا دیا۔''

''نہیں ٹینا...... وہ بہت خوش ہے شاید اس نے ایسا کر کے اچھا کیا۔ دیکھو اتنا اچھا گھر ہے، ہر سہولت ہے اس کے پاس اتنی بڑی پوسٹ پر اس کا شوہر تعینات ہے۔ دو بیٹے ہیں اور کیا چاہیے۔''

''چھوڑیں ابا...... وہ تب بھی اتنی خوش نہیں ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا؟ تم نے بات کی ہے کیا اس سے؟''

''نہیں...... وہ تو مجھے بہت کم عقل اور بے وقوف سمجھتی ہیں۔''

''ویسے سمجھتا تو میں بھی تمہیں یہی ہوں۔'' اس نے کافی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''کتنے ہم خیال ہیں آپ دونوں۔''

''نہیں...... ہاں ویسے ہم خیال تو تھے ہم مگر......''

''مگر...... کیا؟''

''تم بہانے، بہانے سے مجھ سے باتیں اگلواتی ہو، ہے ناں؟''

''نہیں تو میں تو صرف یونہی پوچھتی ہوں۔''

''اور میرے خیال سے تمہیں نہیں پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ اس سب کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دیکھو ہر انسان کو اپنی زندگی کا اختیار ہوتا ہے۔''

''انہوں نے میرے لیے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ آپ نے بھی تو میرے لیے دوسری شادی نہیں کی۔''

''دیکھو مجھے تو کوئی ایسی لڑکی ہی نہیں ملی۔ اسے اس کا آئیڈیل مل گیا سو اس نے کرلی۔'' وہ مزید کچھ پوچھنے کو تھی مگر اس نے ڈانٹ کر سلا دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ خود امبرین کے گھر چلا آیا تھا۔ اسے کچھ عجیب بھی لگ رہا تھا مگر اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس کا نمبر ڈائل کر چکا تھا جو کافی دنوں سے بند جا رہا تھا۔

کالج میں اتنے آرام سے بات ہو نہیں پاتی تھی، میٹنگ روم میں ان کے علاوہ بھی چند لوگ موجود ہوتے تھے۔ اور بار، بار اس سے میٹنگ کرنا اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی اور وہ نہیں چاہ رہا تھا اس کی وجہ سے اسے کوئی مسئلہ ہو۔ باہر ملنے کے لیے کہنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا وہ بڑی سوچ بچار کے بعد اس کے گھر آ گیا۔

''وہ میں نہیں آنا چاہتا تھا مگر...... دراصل ...... وہ...... آپ سے کچھ بات کرنی تھی مجھے۔''

''جی آپ بات کریں۔'' وہ ناسمجھی سے بیٹھ گئی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد آدم نے پہلا جملہ بولا تھا۔

''مجھے آپ سے ٹینا کے متعلق بات کرنی ہے۔''

''تو اس نے کچھ کہا آپ سے؟'' امبرین نے ٹھنڈی سانس لی۔ اچانک اوپر سے کچھ چیزیں گرنے کی آواز آئی۔ اور چھناکے کے ساتھ ایک بوتل گرتی

ہوئی سیڑھیوں کے بیچ لڑھک کر زخمی ہوگئی۔ اور محلول بوتل سے آزاد ہوکر سیڑھیوں پر بہتے ہوئے ٹیڑھے، میڑھے راستے کی شکل اختیار کرتا گیا۔

امبرین نے شرمندگی چھپاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ''میں آتی ہوں'' کہا اور سیڑھیوں پر تیزی سے چڑھتی چلی گئی۔

''کیا ہوگیا ہے آپ کو..... حد کرتے ہیں...... یہ طریقہ ہے کیا بلانے کا..... اس طرح کسی کو آواز دی جاتی ہے۔''

اس کی جھلائی ہوئی آواز نیچے تک آرہی تھی۔

آدم نے کوفت بھری صورتِ حال محسوس کرتے ہوئے خود کو کوسا مگر سمجھ نہ آیا کہ فی الفور اٹھے یا انتظار کرے۔

''چلیں اٹھ کر بیٹھیں..... کوشش کریں۔''

ایک دو ہلکی آوازوں کے بعد کچھ لمحوں تک صرف چیزوں کی کھٹر پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اٹھا مگر سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔

سیڑھیوں کی ریلنگ سے نیچے جھانک کر امبرین نے اسے مخاطب کیا۔

''آدم صاحب..... ذرا اوپر آیئے گا۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

کمرا دوائیوں کی بُو سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر گیا تو دیکھا ایک بوڑھا آدمی بے حال چارپائی پر لیٹا ہے، اس کے منہ سے رال بہہ رہی ہے۔ وہ بے سدھ پڑا تھا مگر ہاتھ حرکت کررہے تھے۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا۔

''کیا ہوا انہیں؟''

''پتا نہیں ابھی تو حرکت میں تھے..... میں نے سیدھا کرنا چاہا تو لڑھک سے گئے۔''

''آپ پڑوس سے کسی کو بلا لائیں انہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔'' آدم نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ وہ انہیں قریبی سرکاری اسپتال لے گئے اور ایمرجنسی میں داخل کرادیا۔

حالت کچھ سنبھلی تو انہیں وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ وہاں امبرین کا کھڑا ہونا دشوار تھا۔ میل وارڈ میں طرح، طرح کے مریض اور ان کے تیمار دار تھے۔ امبرین کا دم وہاں گھٹا جارہا تھا۔ آدم نے اسے باہر جانے کا کہا تھا۔ اور خود اندر ہی ٹھہرا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر آیا اسے بینچ پر بیٹھے دیکھا تو آکر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''کب سے ہے ان کی یہ حالت؟''

''کئی سالوں سے مگر پچھلے ایک سال سے زیادہ خراب ہوگئی۔ کبھی ان کو غشی کا دورہ پڑتا ہے تو کبھی ایسے ہی بے دم ہوجاتے ہیں۔ بس ٹکر، ٹکر دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کو پتا نہیں چلتا..... اور کپڑے گندے ہوجاتے ہیں۔''

''اوہ میرے اللہ..... پھر کون آپ کے کام آتا ہے ان کی دیکھ بھال میں آپ کی مدد کرتا ہے؟''

''اب کوئی نہیں آتا..... میں خود ہی.....'' وہ کہتے، کہتے رو پڑی تھی۔ خاموش آنسوؤں سے آدم نے ایک گہری سانس لی۔ کتنی مشکل حالت تھی۔

''کوئی بات نہیں ایک وقت ہوتا ہے جب ماں، باپ بچے کو پالتے ہیں۔ اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب بچے ماں، باپ کو..... میری دادی کے اوپر بھی یہ وقت آیا تھا..... میری ماں کا انتقال ہوچکا تھا۔ میری سابقہ بیوی شاہینہ میری چچا زاد تھی۔ چچا، چچی دوسرے شہر میں تھے، میں اور ابا دادی کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس دوران ابا اور چچا کی مرضی سے میری اور شاہینہ کی شادی کردی گئی۔ شاہینہ مجھ سے آٹھ سال عمر میں بڑی تھی۔ میں اٹھارہ سال کا تھا جب شادی ہوئی تھی۔ اسی سال دادی کا انتقال ہوگیا۔ اور اس سے اگلے سال ٹینا کی پیدائش ہوئی۔''

''آپ دونوں میں علیحدگی کیوں ہوئی آدم؟'' امبرین نے ہچکچاتے ہوئے پوچھ ... ہی ڈالا۔

''یہ ایک مس میچ تھا شاید..... شاہینہ کو ایک سمجھدار آدمی درکار تھا۔ مجھے میں شاید سمجھ کی کمی تھی..... مگر شاید یہ اس کے بہانے تھے۔ دراصل جب کوئی آپ کو اچھا لگتا ہے تو بس لگتا ہے اپنی تمام تر خامیوں کے ساتھ بھی..... اور جب کوئی اچھا نہیں لگتا تو اس کی کوئی بھی خوبی آپ کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ ٹینا ساڑھے تین سال کی تھی جب شاہینہ کو اپنا آئیڈیل مل

گیا۔ اور اس نے مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ میں یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ میرے ساتھ رہ کر ناخوش ہو...... اور مجھے کوستی رہے اور مجھے برا بھلا کہتی رہے۔ مجھے بس اس سے یہ شکایت تھی کہ اس نے ٹینا کو سوتا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بعد میں کچھ دن اپنے ساتھ رکھا۔ مگر ٹینا میرے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ مہینے اسی کشمکش میں گزرے پھر اس کی شادی ہوگئی۔ اور میں ٹینا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ٹینا بہت روئی اس کے لیے...... کئی دن روتی رہی...... بڑی مشکل سے سنبھلی تھی۔ اور شاہینہ تو جیسے سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔ پھر شاہینہ تو کئی سال تک اسے بالکل بھول ہی گئی۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا...... اس کے بعد اس کی پوسٹنگ دوبارہ اسی شہر میں ہوئی وہ فیملی کے ساتھ یہاں شفٹ ہوگئی۔ ایک دو بار اسکول میں ٹینا سے ملنے آئی تھی بس اب تو مہینوں بعد اسے یاد آتا ہے بیٹی سے ملنا...... اور مجھے ٹینا کو ہر دفعہ بہت سارا سمجھنا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے دل میں ماں کی طرف سے نفرت بیٹھے۔''

''آدم...... آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟''

''ٹینا کے لیے...... میں کبھی اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کر پاتا، میں اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔ میرے زیادہ لاڈ پیار اور دوستی نے اسے کچھ چلبلا سا بنا دیا ہے۔''

''ٹینا کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''کہتا تو اسے روز ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں...... مگر مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا اس کے بارے میں۔''

''جی پوچھیں۔'' اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں مگر دھیان اس کا اب بھی وارڈ کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔

''وہ دراصل...... دیکھیں یہ حیرت کی بات تو نہیں ہے مگر...... اب آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ...... وہ یقیناً ابھی بچی ہے مگر دیکھیں آج کل کے حالات بھی تو......'' وہ کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

آدم بے اختیاری سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

''اب مجھے جو سوچنا ہوگا سو میں سوچوں گا۔ آپ کہہ دیں ایسے ہی جیسے میں نے آپ کو کتنے مزے سے کڑوی باتیں بتا دیں۔''

''یہ فن تو آپ کو خیر آتا ہے...... مگر...... بات یہ ہے کہ وہ ایک لڑکا ہے...... اب اس عمر کی پسند کے بھی کیا کہنے بس زیادہ ڈرامے، فلمیں دیکھ کر بچے، بچیوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔''

''ایک لڑکا ہے...... اس کے بعد۔'' آدم اسے بنیادی بات کی طرف خود لے آیا۔

''جی ایک لڑکا ہے جو ٹینا کو بقول اس کے پسند کرتا ہے۔ میں نے ایک دو بار اس کی چٹ پکڑی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ٹینا بھی اس میں غیر ضروری دلچسپی لے رہی ہے۔''

''یہ کب سے ہے؟''

''شاید پچھلے نو دس ماہ سے۔ ویسے آپ پہلے وعدہ کریں کہ آپ گھر جا کر ٹینا کو ڈانٹیں گے نہیں؟ اس طرح وہ مجھے مزید برا سمجھے گی۔ پہلے ہی اس نے مجھے باتوں، باتوں میں بہت کچھ جتایا ہوا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں...... میں بس اس سے بات کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے کر لیجیے گا مگر جذباتی ہو کر نہیں۔''

''میں اسے سر چڑھا کر پچھتا رہا ہوں۔''

''اوہو، میں نے آپ کو فکر مند کر دیا ناں۔'' وہ پریشان ہوگئی تھی۔

''نہیں...... بلکہ خوش کر دیا۔''

''آپ طنز کر رہے ہیں؟''

''نہیں، مذاق کر رہا ہوں۔''

''چلیں میں ابا کو دیکھ لوں۔'' وہ اٹھی۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں...... ویسے انہیں غنودگی کی دوا دی گئی ہے، وہ سو رہے ہوں گے۔''

''آپ کو اب جانا چاہیے آدم صاحب...... ٹینا گھر پر اکیلی ہوگی۔''

''اسے آج میں نے اس کی ماں کے گھر بھیجا ہے ملنے کے لیے رات تک لوٹے گی۔''

''آپ نے اسے سیل فون نہیں دیا؟''
''نہیں، ابھی تک تو نہیں...... اسے خود بھی زیادہ شوق نہیں تھا؟''
''ویسے اسے پڑھائی کا بھی شوق نہیں ہے۔'' وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی۔
''اسے صرف انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق ہے اور مجھے باتوں میں ہرانے کا۔'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔
دونوں باتیں کرتے ہوئے میں اندر وارڈ میں آئے تھے۔
رات گئے ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ ڈاکٹرز نے دواؤں کے نسخے لکھے اور انہیں ڈسچارج کیا۔
وہ ایمبولینس میں گھر تک اس کے ساتھ آ گیا تھا۔
''اب یہ کافی دیر سوتے رہیں گے۔ آپ فکر نہیں کیجیے گا۔''
''یہ سارا دن تو سوتے ہیں۔ دن میں کام والی ماسی کو پیسے دے کر یہاں بیٹھا جاتی ہوں تبھی کالج جا پاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ان کی ہڈیوں کا آئرن ختم ہو گیا ہے۔ پھیپھڑے کمزور ہیں، گردے بھی متاثر ہیں۔ ان میں کبھی کبھار بولنے کی بھی طاقت نہیں ہوتی۔'' وہ کمرے سے باہر آ کر تھکے ہوئے انداز میں اسے بتا رہی تھی۔
''اللہ نے آپ کو بہت ہمت دی ہوئی ہے۔ مزید حوصلہ رکھیں۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ لفظی تسلی کچھ نہیں دیتی۔''
''آپ بہت اچھے ہیں آدم۔'' وہ صاحب کہتے، کہتے رکی۔
''اللہ آپ کو خوش رکھے۔'' وہ اس دعا پر کھوکھلی ہلکی ہنس دیا۔
اور اسے جواباً تسلی دے کر اپنا پرسنل فون نمبر دے کر کہا...... ''اگر کبھی ضرورت ہو تو فون کر لیجیے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔''
وہ لفظوں سے اس کا شکریہ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ رات دیر سے گھر آیا تو ٹینا کو سوتا ہوا پا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔
یہ تین کمروں کا اِک درمیانہ گھر تھا۔ ایک کمرا اس کا...... دوسرا ٹینا کے حوالے تھا اب اور تیسرا ابھی اس کی دادی کا ہوا کرتا تھا۔ جس میں اب ضروری اور غیر ضروری کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ اسے شروع سے پرانی چیزوں کو نیا کرنے کا شوق تھا۔ پہلے جب اس کی جنگلات کے شعبے میں نوکری ہوتی تھی تو لکڑی سے فرنیچر اور ہر چیزیں بنانے کا وقت نہیں مل پاتا تھا۔ شاہینہ سے مکمل علیحدگی کے بعد اور اس کی شادی کے بعد جب ٹینا کی ذمے داری مکمل طور پر اس پر پڑی تو اسے یہ ملازمت چھوڑنی پڑی اور اس کے بعد تو جیسے سرکاری ملازمت نہ ملنے کی حد لگ گئی۔ وہ دوڑ، دوڑ کر تھک گیا اور تب دوبارہ اسے اپنے ہنر نے پناہ دی۔
اور وہ دوبارہ فرنیچر کی دکان پر جا بیٹھا۔ جہاں سیٹھ اس کی کمائی آدھی تو ہضم کر جاتا تھا۔ اس کے عمدہ کام کی مانگ بہت ہوتی تھی اور سیٹھ اس سے فائدہ اٹھا لیتا تھا۔
ایک بار لکڑی کی کٹائی کے دوران آرا اس کے بازو پر جا لگا اور گوشت چر گیا۔ اس کے بعد ٹینا اس کا پٹی میں جکڑا بازو تھام کر روتی رہی تھی اس نے اپنی بچی کی خاطر یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ کچھ تو اسے بھی وہم ہونے لگا تھا کہ آرا چلائے گا تو لکڑی کی جگہ بازو، ٹانگیں، پیر سب آ جائیں گے۔ ہاتھ زخمی ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ دادی کے پرانے فرنیچر کی مرمت سے ہار کر اس نے لکڑی کا شاہی پلنگ دادی کے کمرے میں رکھ دیا۔ اور برآمدے کی آدھی جالی کاریگر کو بلوا کر مکمل کروائی اور اس کے بعد پھر سے ملازمت ڈھونڈنے لگ گیا۔
پھر اسے لائبریرین کی جاب ملی اور وہیں سے اس کو کتابیں پڑھنے کی عادت پڑی۔ کئی ہزار کتابیں پڑھ کر اور اپنی پسند کی چند سو کتابیں جمع کر کے وہ خوش تھا۔
لائبریری اب کچھ سالوں سے بند تھی۔ اور اب وہ پرائیویٹ جابز پر گزارہ کر رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ٹینا کے لیے ایک اچھی سی گاڑی لے سکے مگر اس کی جیب نے کبھی اسے یہ اجازت نہیں دی۔ ٹینا کو بچپن سے گاڑیوں کا بہت شوق تھا۔ اور ہر بار وہ اپنے دوست سہیل کی کھٹارا لے آیا کرتا تھا۔
رات دیر تک بستر پر لیٹا وہ بیٹی کے متعلق سوچ گیا۔

''وہ کب اتنی بڑی ہوگئی...... کہ اسے کوئی پسند کرنے لگا یا پھر وہ کسی کو......'' سوچتے ہی عجیب لگتا ......تبھی وہ صبح ناشتے پر اسے بغور دیکھے گیا۔

''رات کب آئے تھے ابا؟'' وہ چائے بنا کر لائی تھی۔

''کافی دیر ہوگئی تھی۔''

''تقریباً؟'' وہ پہلے سے ہی چڑھائی کر لیتی تھی۔

''تقریباً ڈھائی، تین بج چکے تھے شاید۔''

''ویسے بتایا نہیں آپ رہ کہاں گئے تھے؟''

''ضروری نہیں سمجھتا، تم اٹھو اور کالج کے لیے تیار ہو جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔'' ناشتا کر چکنے کے بعد وہ اٹھ گیا۔

اتنے میں وین کا ہارن سنائی دیا تھا۔

''تو مطلب آپ نہیں بتائیں گے؟''

''عماد کون ہے؟'' اس نے بیٹا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ٹیچر کے ہاں گئے تھے ناں؟'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''بولو عماد کون ہے؟''

''میرے ساتھ پڑھتا ہے۔''

''اس کے علاوہ؟''

''کچھ نہیں۔''

''تم نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا کبھی۔''

''آپ نے بھی کبھی نہیں بولا تھا آج سے کچھ دیر پہلے۔''

''وہ جھوٹ نہیں تھا۔ میں نے کہا میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''اگر میں بھی یہی کہوں؟''

''نہیں کہہ سکتیں، میں تمہارا باپ ہوں۔''

''اور میں آپ کی بیٹی ہوں۔''

''صاف، صاف بتاؤ۔''

''اس نے کہا میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔''

''اور کیا کہا؟''

''اور کچھ نہیں......'' اب جیسے حلق میں ٹوسٹ کا پیس اٹکنے لگا تھا۔

''چٹ لکھی؟''

''اس حد تک بات ہوئی ملن سے؟'' وہ چونک گئی۔

''شٹ اپ......'' وہ چلّایا۔

''آپ شاؤٹ کرنے لگے ہیں، اچھے باپ ایسا نہیں کرتے۔''

''بکومت......اچھی بیٹیاں بھی ایسا نہیں کرتیں میں کہہ رہا ہوں صاف، صاف بتاؤ، پسند کرتی ہو اسے؟''

وہ چپکی رہی۔ چپ کو بھی تو رضامندی سمجھا جاتا ہے۔

''شرم نہیں آئی، پڑھائی تو مکمل ہونے دی ہوتی۔''

''میں نے کیا کیا ہے بھلا؟'' وہ چائے کا آدھا کپ چھوڑ کر اٹھی۔

''کالج جا رہی ہوں دیر ہو جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ نکل گئی۔

وہ دروازے تک گیا۔ اسے چھوڑ کر دروازہ بند کیا۔۔اور میز تک واپس آیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ آگے بڑھے گا یا رک جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ پڑھے۔ وہ اپنی ماں سے مختلف تھی۔ اس پر تو کام، ترقی اور پڑھائی کا بھوت سوار رہتا تھا۔ کسی سطح پر اس نے اپنی بیوی کو آئیڈیالائز بھی کیا تھا۔ اس میں بہت معاملہ فہمی تھی۔

سوائے اس کی ذات میں دلچسپی کے وہ ہر معاملے میں اچھی تھی۔ یہی ایک فالٹ تھا، جس نے رشتے میں مخلصی برقرار رکھنے نہیں دی۔

اگلے دن اسے امبرین سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

''آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔''

''کس سلسلے میں؟''

''ابا سے بات ہوئی تھی......آپ نے تو میرا کام ہی آسان کر دیا۔ جو بات کہنے کے لیے مجھے دقت تھی، وہ آپ نے بتا کر میری جان چھڑا لی۔''

امبرین اس کے لہجے کے طنز کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اسی لیے اس کی بات پر ٹھیک سے یقین نہیں کر سکی تھی۔

''انہوں نے تمہیں ڈانٹا۔''

''نہیں......قطعی نہیں۔۔۔ وہ تو خوش ہوئے تھے۔''

''خوش تو نہیں ہوئے ہوں گے۔ میں انہیں

ہوں گی۔''

''کس حوالے سے؟ آپ کو کہنے کی کوئی ضرورت ہے اب...... ابا نے کہا ہے عماد کی فیملی کو بلوالو......''

''اوہ......'' وہ پریشان ہوگئی۔ ''اور وہ آئیں گے، میرا مطلب ہے عماد فیملی لائے گا؟''

''ظاہر ہے یہ اب اس پر ہے۔'' وہ ذرا بے پروائی سے کہہ کر نکل گئی تھی۔

گھر جا کر اس نے فوری طور پر آدم کو فون کیا تھا۔

''عمر نہیں ہے اس کی آدم، آپ نے بہت زیادتی کی ہے۔''

''اس کے رزلٹ وہ خود بھگتے گی تو ہی سدھرے گی۔''

''اور اس کے پیچھے وہ تھکے گی۔ فرض کریں وہ لوگ آجاتے ہیں اور آپ کو یہ رشتہ کرنا پڑجاتا ہے پھر......؟'' وہ فکر مند تھی۔

''عماد کے پیچھے کچھ نہیں ہے...... باپ اس کا سرکاری ملازم ہے۔ بڑی مشکل سے بیٹے کو پڑھایا ہے، اب تک وہ پاؤں پر نہ کھڑا ہوجائے دشوار ہوگا۔''

''اسے خود دیکھنا چاہیے یہ سب۔'' آدم نے کہا۔

''ایسا نہیں ہوتا...... بچی ہے وہ ابھی...... مسائل کا سامنا نہیں کرپائے گی۔''

''پہلے بھی تو چھوٹی عمروں میں لڑکیوں کی شادیاں ہوجاتی تھیں اب بھی ہوتی ہیں، اس کی عمر تو اچھی بھلی ہے۔''

''تب بھی وہ معصوم ہے آدم صاحب۔'' اس کے لہجے میں آزردگی تھی۔ ''میں آپ کو بتارہی ہوں کہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھایئے گا فوراً سے۔''

''آپ ناحق پریشان ہورہی ہیں امبرین۔''

''میں بالکل ٹھیک پریشان ہورہی ہوں۔ مجھے تو افسوس ہے کہ میں نے آخر بتایا کیوں آپ کو۔''

''اب اگر میرا رویہ اس کے برعکس ہوتا تو آپ فون کرکے مجھے یہ سمجھا رہی ہوتیں کہ زندگی اس کی ہے وہ باشعور ہے، مجھے اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اپنا اچھا، برا سمجھتی ہے وغیرہ، وغیرہ......''

''میں بس آپ کو ہی سمجھا رہی ہوں کہ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''دیکھیں گے، ان لوگوں کو تو آجانے دیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔ آپ چھوڑیں یہ بتائیں کہ ابا کیسے ہیں آپ کے؟'' یہ پوچھتے ہی وہ نرم ہوگیا تھا۔

''وہ ویسے ہی ہیں۔''

''امبرین...... ایک بات کہوں؟ آپ اپنے لیے بھی کچھ سوچیں۔''

''بھلا کیا سوچوں؟''

''شادی کرلیں۔''

وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی۔

''آپ زیادتی کررہی ہیں اپنے ساتھ......''

''اس کا وقت نہیں ہے فی الحال......''

''وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا امبرین۔''

''مجھے پتا ہے آدم صاحب...... مگر میں اپنے باپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتی تو یقیناً سو تلخیوں کے بعد بھی وہ مجھے چنتے مجھے اپنے ساتھ رکھتے اور میرا سہارا بنتے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا...... اور کچھ الگ بھی نہیں...... وہی جو والدین ہمارے لیے کرتے ہیں، اس سب کا کچھ حصہ ہی۔''

''اگر ٹھیک وقت پر شادی ہوجاتی تو آپ اس امتحان میں نہ کھڑی ہوتیں...... یا پھر یہ کہ آپ کو آسانی ہوجاتی...... کسی کا ساتھ...... یا پھر...... حوصلہ، ساتھ پاکر۔''

''اگر شادی ہوچکی ہوتی تو کیا ہوجاتا...... زیادہ سے زیادہ اپنے بچے پال رہی ہوتی...... اس حسرت میں کہ یہ بڑے ہوکر میرا سہارا بنیں گے۔ تو وہ کیوں نہیں جو تب میرا سہارا تھا، جب میں ناسمجھ تھی۔ چھوٹی تھی...... ان کا کیا قصور کہ کوئی اور ان کا سہارا نہیں ہے۔'' وہ بڑے پتے کی بات کہہ رہی تھی۔ ''چلتی ہوں...... ابا بلارہے ہیں۔'' پھر سیڑھیوں سے ٹین کے ڈبے کی لڑھکتی ہوئی ٹھن ٹھناٹھن کی آوازیں تھیں اور وہ تھی۔ وہ فون رکھ کر چلی گئی۔

اور اس کے کانوں میں ٹھن، ٹھن کی آوازیں گونجتی گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی بیٹی کو بیاہ دے گا، وہ کبھی اپنے بڑھاپے کا بوجھ اس

پر نہیں ڈالے گا۔ یہی سوچ تھی جس کے تحت اس نے عماد کے گھر والوں کو بلالیا مگر مطمئن نہ ہوسکا تھا۔

فی الحال بات آئی گئی ہوگئی۔ ان سے وقت لیا گیا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ عماد کی تعلیم مکمل ہوجائے اور ملازمت کے بعد ہی وہ شادی کر پائیں گے۔ وہ بیٹا کو گھر میں چھوٹے، چھوٹے کام خود سکھانے لگا، وہ سب کام جو ایک ماں اپنی بیٹی کو سکھاتی ہے۔ کھانا پکانا، روٹی بیلنا، مسالا پیسنا...... یہاں تک کہ گھر کی صفائی اور کپڑے دھونا وغیرہ...... جو ہمیشہ اس نے خود کیا یا کروایا تھا۔

''ارے کپڑے ٹھیک سے نہیں ڈالے، اوہو کھنگالے بھی نہیں...... دیکھو صابن کا پانی ٹپک رہا ہے۔ اور کپڑے تار پر ڈالنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح تو لباس سوکھے گا کم اور سکڑے گا زیادہ۔''

''اُف ابا...... مجھے نہیں کرنا یہ سب۔''

ایک دن تو وہ رو پڑی۔ ''مجھے شادی نہیں کرنی۔ کبھی نہیں کرنی۔''

''کیوں......'' کیا ہوا؟''

''شادی کرنے کے لیے اگر صبح سے لے کر بستر پر جانے تک کتوں کی طرح کام کرنا پڑے گا تو مجھے معاف ہی کریں۔''

''مثال پلٹ دی تم نے...... کتے تو آوارہ گھومتے ہیں۔ گدھے کام کرتے ہیں۔'' وہ اطمینان سے آکر بیٹھ گیا۔

''مجھے گدھے سے کتا بننا منظور ہے۔''

''انسان بنو انسان......''

''ابا...... پلیز......'' ان کے کندھے سے سر ٹکا کر وہ رو پڑی۔

''مجھ سے ایسا سلوک مت کریں کہ مجھے لگے میری ماں نہیں ہے۔''

وہ خود بھی رو پڑا تھا۔

''میں تمہیں یہ سب اس لیے سکھانا چاہ رہا تھا کہ تمہیں آگے جا کر دقت نہ ہو۔ تم کہیں یہ نہ سوچو کہ ماں ہوتی تو سب کچھ بتاتی، سکھاتی، تمہیں اب پتا لگا مائیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔'' وہ اپنے آنسو پوچھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں صاف کیں۔

''مجھے شادی نہیں کرنی ابا۔''

''پھر کیا کرنا ہے؟''

''پڑھنا ہے...... بس پڑھنا ہی ہے فی الحال......''

''سوچ لو...... پھر کہوگی ابا ظالم سماج نکلا۔''

''نہیں کہوں گی...... بلکہ ابا تو اس سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا......''

''ہیں......؟'' مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''جی......'' مسکراہٹ روکی۔

''اچھا......'' وہ مسکرایا۔

''تمہیں کیا پتا تمہاری یہ... مسکراہٹ مجھے کتنی عزیز ہے۔'' وہ اسے تکنے لگا۔

''عماد کو کیا کہا؟''

''اسے کہہ دیا جا کر پڑھو اگر ملازمت ملنے کے بعد تم میرے گھر آئے تو پکا...... ورنہ تم پر ذرہ نہیں...... وہ بیچارہ مجبور ہے۔''

''تو مطلب کہ بھوت اتر گیا؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مطلب کہ یہ سب آپ کی چال تھی؟''

''نہیں بھئی، میں نے تمہیں فیصلے کا اختیار دے دیا ہے۔''

''آپ گوٹ میری جیب میں ڈال کر مطمئن ہیں؟'' اس نے شکایتاً کہا۔

''تمہارا ابا ہوں۔''

''میں بھی بیٹی ہوں آپ کی......''

''پتا ہے مجھے...... مجھ سے کم سیکھی ہوئی ہو۔''

''چار ہاتھ آگے ہوں آپ سے...... ہاں۔''

''ہاں صرف زبان چلانے میں...... عقل......''

''مان گئی آپ کو ابا......'' منہ بسور کر وہ لیٹ گئی۔

''سب تمہارے لیے ہی کرتا ہوں...... مانو یا نہ مانو۔''

''بڑے سازشی ہیں آپ......''

''پھر سے ابا کو الزام دے رہی ہو......''

''میں تو سمجھی تھی آپ صرف میرے آدم، میرے دوست ہیں۔ بار، بار ابا نکل آتے ہیں۔''

''میں تمہارا دوست بھی ہوں اور ابا بھی سمجھیں۔''

''اور آپ میری ماں بھی ہیں۔''

''ٹینا!'' آواز بوجھل تھی۔
''جی ابا......!''
''ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے کیا؟''
''پتا نہیں......شاید وہ ہوتیں تو آپ مجھ سے اتنا پیار نہیں کرتے۔''
''میں ہر حالت میں تم سے پیار کرتا بچے۔''
''ابا آپ ابھی تک ان سے محبت کرتے ہیں ناں......''
''شاید......'' کھوکھلا لہجہ لگا۔
''ایک راز کی بات بتاؤں؟''
''ہوں......بتاؤ۔''
''وہ بھی کرتی ہیں۔'' اس کا ٹینا کے سر پر تھپکتا ہاتھ رک گیا۔
''ہاں یہ سچ ہے ابا۔''
وہ چپ تھا......اندر کہیں جیسے کچھ ٹوٹا پھر جڑا......پھر ٹوٹ گیا۔ عجیب کیفیت تھی۔
''اس نے تم سے کہا؟''
''سب کچھ کہنا نہیں ہوتا ابا......کچھ تو محسوس بھی کیا جا سکتا ہے ناں......!''
''ایک بات پوچھوں؟'' بڑی دیر بعد وہ بولا۔
''پوچھیں؟''
''تمہیں عماد بہت پسند تھا؟''
''بس پسند تھا......بہت کا نہیں پتا۔''
''تمہاری اس سے شادی کروا دوں؟''
''نہیں ابھی نہیں......''
''تمہیں یقین ہے وہ لوٹے گا۔''
''پتا نہیں......اس کا یقین شاید خود اسے بھی نہیں......اچھا اگر اس کا یقین آپ کو نہ ہو تو کیا انتظار کرنا چاہیے۔''
''یقین اور انتظار الگ ہیں کیا؟ جب یقین ہوتا ہے تب ہی تو انتظار کیا جاتا ہے ناں......'' وہ اس کی بات سمجھنا چاہتا تھا۔
''یقین اور انتظار الگ نہ ہوتا تو......اماں کی واپسی کا یقین پا کر بھی آپ ان کے پلٹنے کا انتظار نہ کرتے۔''
''ہاں مگر یہ انتظار اب رک چکا ہے ٹینا۔''

''اور اب کیا ہے ابا؟''
''اب کچھ نہیں ہے بیٹا۔''
''آپ شادی کر لیں......اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔''
''میرے پاس کچھ نہیں کسی کو دینے کے لیے......یہاں تک کہ دل بھی نہیں۔''
''آپ ایسے کیوں ہو گئے ہیں، ابھی تک تو چالیس کے بھی نہیں ہوئے آپ۔''
''اس کے لیے عمر نہیں، حالات اور واقعات کا قصور ہوتا ہے۔''
''چھوڑیں ناں......کوئی اچھی بات کریں۔''
اور پھر وہ تب تک باتیں کرتے رہے، جب تک ٹینا کو نیند نہیں آ گئی۔

☆☆☆

وہ اس کی آواز اتنے سالوں بعد بھی پہچان گیا تھا۔
''شاہینہ......؟ خیریت ہے؟''
''آدم......سب خیریت ہے؟'' وہ رک، رک کر بولی تھی۔
''کیسے فون کیا؟ ٹینا کالج گئی ہوئی ہے۔''
''معلوم ہے اس وقت وہ کالج میں ہوتی ہے، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''
''سن رہا ہوں۔'' کتنا خالی لہجہ تھا۔
''پلیز کوئی پرانی بات نہیں ہوگی۔'' آدم نے اس کے بولنے سے پہلے ٹوک دیا تھا۔
''تم کیسے ہو؟ اب یہ مت کہنا کہ جو کہنا چاہتی تھیں وہ کہو کیونکہ اس کے لیے تم مجھے منع کر چکے ہو۔ ٹینا......کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ تمہیں بتایا ہوگا اس نے؟'' اسے یہ گفتگو بے معنی سی لگی۔
''ہاں بتایا تھا اس نے...... پھر......؟''
''پھر تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ بولی۔
''یہ پوچھنے کے لیے تم نے وقت نکالا ہے کہ میرا کیا خیال ہے؟''
''میں مانتی ہوں میں نے ماضی میں تمہارے

ساتھ بہت زیادتی کی تھی مگر......'' کہتے ہوئے وہ رکی
مگر کیوں یہ وہ پوچھ نہ سکا۔
اور وہ بتا بھی نہ سکی۔

''آدم......!'' جیسے دل خالی تھا...... پل میں بھرنے لگا، پرانی باتوں کے غبار سے......وہ کچھ کہنا چاہتی تھی......اور کچھ کہتے، کہتے بہت کچھ کہہ بھی جاتی۔

زندگی میں کبھی انسان رنجش کو دھونا بھی چاہے تو وقت کو کیسے پلٹائے۔ معافی یا تلافی...... کچھ نہیں...... بس دل کا بوجھ ہٹانا ہوتا ہے۔

''ٹینا نے شاید تمہیں بتایا نہیں کہ معاملہ آگے تک گیا تھا۔ اور پلٹ بھی گیا......تفصیلات اسی سے پوچھ لینا۔ وہ وقت سے پہلے زندگی کا بار اٹھانے جارہی تھی۔عماد کم ہمت بھی ہے، کم عمر بھی...... انہیں وقت دینا ہے سو وقت دے دیا ہے۔ میں کبھی اپنی بیٹی کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا ہوں نہ بنوں گا۔خود سے زیادہ اس کی پروا رکھتا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہاں رشتے نباہنے کے اہل ہو تم......''

''بس کوشش کررہا ہوں، ایک رشتہ اچھے سے نباہ لوں۔''

''تم بہت اچھے باپ ہو...پر میں اچھی ماں نہ بن سکی۔''

''صرف ٹینا کے لیے۔'' وہ جتانا نہیں چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا۔

''ٹھیک کہتے ہو......'' اس کے لہجے سے ادھورا پن جھلکا۔

''کہہ دو جو کہنا ہے۔'' وہ بے بس ہوکر کہہ بیٹھا۔

''تم سے معافی کے لیے الفاظ نہیں ہیں آدم۔''

''معاف کردیا......''

''بس اتنی آسانی سے؟'' وہ تو بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتی تھی۔

''آج میں اکیلی ہوں...... شوہر اور دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی۔''

''اللہ تمہارے بیٹوں کو تمہارے لیے نرم کردے۔''

''تم بہت حوصلے والے ہو آدم......''

''آدھی عمر تو نکال چکا ہوں، اب تعریف ... ہوئے خوشی نہیں ہوتی، ہنسی آجاتی ہے۔''

''نہیں......تم ینگ ہو......شادی کرلو۔''

''شکریہ!'' وہ ہنسا......''پہلے ٹینا اپنے گھر کی ہوجائے پھر دیکھیں گے۔''

''تو تم ٹینا کی شادی کرکے گھومنے چلے جانا... یاد ہے تمہاری ورلڈ ٹور کی خواہش تھی۔''

''اتنے پیسے میں کبھی نہیں لاسکتا۔''

''ایک دنیا ہمارے اندر ہوتی ہے جو تم گھوم چکے ہو دیکھ چکے ہو، سمجھ چکے ہو؟''

''تمہیں خوش کرنا آگیا ہے۔'' وہ پھر سے ہنس دیا، وہ بھی ہنسی......

''اپنا خیال رکھنا۔''

''رکھتا ہوں......مجھ سے زیادہ بیٹی رکھتی ہے۔تم بھی رکھنا اپنا خیال......''

''کوشش تو روز کرتی ہوں۔''

''اللہ حافظ......!'' وہ ہنس نہ سکی۔

دوسری طرف سے بھی اللہ حافظ......کہتے ہوئے فون لائن ساکت ہوگئی۔

دل بوجھل تھا......زندگی شاید کبھی ہاتھ نہیں آتی۔ اور اگر آ بھی جائے تب بھی کتنی مشکل ہوتی ہے۔سب اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے ہی جیتے ہیں......تب بھی ایک دوسرے کو دکھ دیتے ہیں......اور کہیں ایک دوسرے کی خوشی کے لیے جیون تک ہار دیتے ہیں مگر تب بھی ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔

وہ سمجھ نہیں سکا کہ اتنے عرصے بعد انسان اگر پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھتا ہے تو کیا چاہتا ہے؟ کچھ خود سے دینا......یا کچھ اس سے لینا......اور جب دے بھی نہ سکو......اور لے بھی نہ سکو......ہاتھ بھی خالی ہوں اور دل بھی...... ذہن نفی کررہا ہو تب بھی دھیان کسی میں اٹک گیا ہوتا ہے۔اور جہاں اٹکا ہوا ہوتا ہے...... وہاں پھنس ہی جاتا ہے......نکالنا چاہو بھی تو ٹوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے......چھوٹ نہیں پاتا...... بٹ جاتا ہے...... تقسیم ہوجاتا ہے۔آدھا اِدھر......آدھا

اُدھر......اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم چھوڑ آئے ہیں جبکہ گزرا ہوا ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا ہے۔
ظاہری طور پر کوئی زندگی سے چلا گیا پر اندر کہیں......کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔ انسان خود کو مکمل میسر کیوں نہیں ہوتا۔ اسے خود سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

وہ نبیل تھا، امبرین کے دروازے پر آیا تھا۔
اتنے سالوں بعد، وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا لینے کے لیے آئے ہو مگر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ''اندر آجاؤ۔''
''کیسی ہو؟'' وہ نظر ملائے بغیر پوچھ رہا تھا۔
''کیسے آنا ہوا؟'' اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اس نے خود سوال کرلیا۔
''خالو اب کیسے ہیں؟'' پوچھ کر اب وہ اندر آچکا تھا۔
''کوئی ضروری بات کہنی ہے تو بتادو؟'' اس کے انداز میں سرد مہری تھی۔ جبھی اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔
''تم سے......معافی مانگنی تھی۔''
''کس لیے......؟''
''میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا۔''
''بہت پرانی بات ہے یہ......'' اس نے سرد آہ بھری۔
اوپر کھٹکا ہوا......وہ اٹھی......بغیر کچھ کہے اوپر چلی گئی۔ وہ بیٹھا رہا۔
دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
وہ اٹھا اور دروازہ کھولا تو آدم کھڑا تھا دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔
''جی......؟''
''وہ امبرین صاحبہ......شفٹ کر گئیں شاید......'' زیر لب بڑبڑایا۔ جبھی امبرین سیڑھیوں سے اترتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے آدم کو دیکھ لیا تھا۔ مسکرا کر سلام کیا اور اندر آنے کو کہا۔
وہ ایک تھیلا لیے اندر آیا......ساتھ فروٹ باسکٹ تھی۔
''اس کی کیا ضرورت تھی!'' امبرین شرمندہ سی ہوگئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے میز پر باسکٹ رکھی، تھیلے میں کچھ ضروری چیزیں تھیں، کچھ کھانے پینے کا سامان اور کچھ راشن کے پیک ڈبے۔
''میں ادائیگی کردوں گی۔'' امبرین نے ادھ کھلے منہ سے جھانکتی اشیا کے پیکٹس دیکھ کر اندازہ لگایا۔
''بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟'' وہ اس بات پر ہنس دیا۔
''کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹھ جائیں۔''
نبیل دونوں کے درمیان کوئی تعلق دریافت کرنے کی سوچ میں خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اسے امبرین نے ابھی تک بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔
آدم بیٹھ گیا تھا۔ مگر نبیل کی موجودگی کو اب محسوس کرکے وہ مزید کچھ نہ بولا۔
''میں پھر آؤں گا۔'' نبیل نے اتنا کہا اور جانے کو بڑھا۔
''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادینا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی امبرین کے چہرے پر اس کے جملے سے طنزیہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا اور اسی طرف آگئی جہاں آدم بیٹھا ہوا تھا۔
''تم بیٹھنا میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔''
''میں چلوں ساتھ، ان کے کپڑے تبدیل کرنے ہوں گے؟'' وہ اٹھا۔
''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ ''تم بس بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔
وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور سامنے پڑا ہفتہ پرانا باسی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔
وہ آئی تو آدم اخبار پڑھنے میں منہمک تھا......
اس نے اس کے لائے ہوئے سامان پر تفصیلی نظر ڈالی اور انہیں جگہوں پر رکھنے لگی اس نے اندازہ لگایا، کوئی مہینے بھر کا راشن تو ضرور تھا۔
''تم اتنی چیزیں لائے ہو......میں کیا کہوں تمہیں۔''
''کچھ مت کہو......بس دوست سمجھ کر رکھ لو۔''
''دوست......'' ابھی تک اس کے ساتھ ہوئی ملاقاتوں میں وہ اپنے اور اس کے درمیان کے ہمدردانہ تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔
''دوست......اچھا ہے یہ......'' زیر لب دُہرا کر وہ مسکرائی۔
''اس ایک لفظ میں کتنی پناہ ہے، کتنی آسودگی ہے۔

توتم میرے دوست ہو؟'' وہ اتنی اچانک آپ سے تم پر آئی تھی کہ خود اسے بھی پتا نہیں چلا تھا۔
''اور تم بھی......؟''
''ہاں......شاید۔'' وہ ہنس پڑی تھی ہلکے سے۔
''تمہیں اندازہ ہوگیا کہ میں اس بار پیسے ختم کرچکی ہوں۔'' دونوں اب مل کر سامان رکھ رہے تھے۔ امبرین نے برنیاں اور مرتبان نکال کر کچن کاؤنٹر پر رکھ دیے تھے۔ سارا سامان رکھ کر اب وہ فروٹ باسکٹ کی طرف بڑھی تھی۔
''وہ میرا سابقہ منگیتر تھا...... اسے چھ سال بعد خیال آیا کہ مجھ سے معافی مانگ لے۔''
اسے پتا تھا آدم سوچ رہا ہوگا مگر پوچھے گا نہیں اس کے متعلق......
''لوٹ آیا ہے......تو قبول کرلو اسے۔'' آدم نے یہ بات اسے دیکھے بغیر کی تھی۔
وہ سیب چھیلتے ہوئے رک کر اسے دیکھنے لگی۔
''سوری...... مجھے لگا تمہارے دل میں اس کے لیے جگہ ہوگی۔''
''میرے دل میں اب کسی کے لیے کچھ نہیں...... خود اپنے لیے بھی...... ویسے وہ شادی کرچکا تھا......اور اسے اولاد نہیں ہوئی۔ اب اس کی ماں کو احساس ہوا ہوگا کہ مجھے منالے اور......''
''پھر تو سوچا جاسکتا ہے اگر گنجائش نکالو تو......''
''نہیں آدم......اب نہیں......''
''تو پھر کب؟''
''کبھی نہیں۔''
''پاگل مت بنو......ویسے میں سوچ رہا تھا تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈوں......کیا خیال ہے؟''
''ایسا کام نہ کرنا۔'' وہ اس کی بات پر سر جھٹک کر مسکرائی۔
''کیوں نہ کروں...... جب تم اپنے لیے نہیں سوچتیں تب کوئی تو سوچے گا ہی۔''
''میں ابا کو یہ کھلا آؤں؟'' وہ سیب چھیل چکی تھی۔
''بے شک کھلا دو......مگر......میری بات مت ٹالو۔''
''اچھا، وقت پڑا ہے ابھی سوچیں گے۔'' کہہ کر وہ اٹھی۔ ''میں اوپر جاؤں گی تو تم چلے جاؤ گے؟''
''نہیں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں......'' وہ اس کے ساتھ اوپر آیا تھا۔
وہ سیب کی قاش توڑ مروڑ کر اس کا رس ان کے منہ میں ٹپکا رہی تھی۔
''انہیں غنودگی ہے یا غشی؟''
''پتا نہیں۔'' وہ سرسری سا بولی۔ سیب کا رس ان کے منہ میں جا کر باچھوں پر پھیل رہا تھا۔
ان کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا مگر حواس جیسے بے سدھ تھے۔
''انہیں اسپتال لے چلیں؟'' ان کی حالت اسے تشویش ناک لگی۔
''نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' آدم نے دیکھا سرہانے پنج سورہ رکھا تھا۔
''یہ تم پڑھتی ہو؟''
''ہاں......'' وہ پلیٹ رکھ کر دوبارہ اٹھی اور کمرے سے باہر آئی۔ آدم کو لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔
''کیا ہوا امبرین؟ مجھے بتاؤ۔''
''صرف سانس چل رہی ہے آدم......بس...... صرف سانس۔'' اس کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔
''ڈاکٹرز نے کہا ہے ان کے لیے دعا کرو...... آسانی ہوجائے، مجھے بتاؤ آدم...... میں اپنے باپ کی موت کی دعا کس منہ سے کروں......'' اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔
''آج یا کل...... پرسوں یا ہفتے کو...... ڈاکٹرز کہتے ہیں اب بچاؤ ناممکن ہے۔ بس دعا کریں جتنی جلدی ہوسکے...... انہیں رہائی ملے...... میں تو ان کی صحت ہی کی دعا کروں گی ناں......'' وہ اس کے ساتھ وہیں سیڑھیوں پر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔
''رات بہت خوف ناک ہوجاتی ہے اور دن تھکا دینے والا...... مجھے لگتا ہے میں ایک زندہ لاش کے ساتھ کھڑی ہوں۔ بیٹھی ہوں......خوف سے سو بھی نہیں پاتی۔''
''میں آج رات ٹینا کو یہاں چھوڑ جاتا ہوں اگر

میرا رکنا مناسب ہوتا تو رک جاتا۔ بڑی مشکل سے آ پاتا ہوں، ڈر لگتا ہے تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہ کہہ دے۔'' وہ خاموشی اور بے بسی سے بیٹھی تھی۔

''میرے لیے ایک کام کرو آدم......''

''بولو......''

''ان کے لیے دعا کرو کہ اللہ اب ان کے لیے آسانی کر دے۔''

وہ اس کے لرزتے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی بھی نہ سکا تھا۔ دل کو کمزور سا پایا تو اٹھ گیا......اور سیڑھیاں اترتا ہوا بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی...... بے نام آنسوؤں سے خاموش رونے لگی...... پتا نہیں کون، کون سا درد رو دیا تھا۔

☆☆☆

''ٹینا اٹھو...... چلو میں تمہیں امبرین کے گھر چھوڑ دوں۔''

''خیریت ہے ابا......؟''

''وہ پریشان ہے ٹینا......اس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے اور اس صورتِ حال میں وہ اکیلی ہے۔''

''مگر ابا میں......؟''

''ہاں دیکھو تم......دیکھو میں تو نہیں رک سکتا ناں، تم ہی چلی جاؤ......''

''آپ رکنا چاہتے ہیں؟''

''تمہیں ہر سوال کا جواب کیوں چاہیے ہوتا ہے۔'' وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''اپنے کپڑے اٹھالو......''

''میں رات کو لوٹ آؤں گی ابا۔''

''ہرگز نہیں......تم کچھ دن وہیں رہو۔''

''مجھے وہاں نیند نہیں آتی۔''

''بکومت......میں تمہیں آرام کرنے کے لیے نہیں اس کا ساتھ دینے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ کئی راتوں سے سوئی نہیں ہوگی......''

''تو آپ کا مطلب ہے وہ سو جائیں اور میں اس بھوت بنگلے میں جاگتی رہوں۔''

''کبھی تو سمجھدار بن جایا کرو۔''

پھلوں کا رس ایک نعمت

1۔ پھل عام طور پر زود ہضم ہوتے ہیں۔

2۔ پھلوں میں عام طور پر پانی کا حصہ زیادہ ہوتا ہے جبکہ شکر اور کچھ روغنیات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اجزا جسم انسانی کی نشوونما اور توانائی کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ پھلوں کے رس کے ذریعے سے ملنے والی شکر (فرکٹوس) دوسری شکر کے مقابلے زود ہضم اور لذیذ ہوتی ہے۔ آج کل پھلوں کا رس بہت آسانی سے مل جاتا ہے اور گھر میں بھی نکالا جاسکتا ہے۔

3۔ پھلوں کا جوس...... بیماریوں میں بہت فائدہ مند ہوتا ہے جیسے ناشپاتی، نارنگی، امرود، پپیتے اور کیلے میں قبض سے نجات دلانے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر قبض شدید ہو تو انجیر، خوبانی، انگور جیسے قبض کشا پھل مفید ثابت ہوتے ہیں۔

4۔قدرت نے پھلوں کے رس میں خون صاف کرنے کی بڑی صلاحیت رکھی ہے۔ جو لوگ پھلوں کا رس استعمال کرتے ہیں ان کی رنگت سرخ وسفید اور چہرہ بارونق نظر آتا ہے اور وہ ظاہری حسن کے لیے کسی مصنوعی کریم کے محتاج نہیں ہوتے۔ فروٹر اور کینو کو لیجیے، اس کے باقاعدہ استعمال سے خون کے فاسد مادے خارج ہوجاتے ہیں، جلد کا رنگ نکھرتا ہے اور یہ پھل خوب صورتی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے استعمال سے داغ، کیل، چھائیاں وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ جو لوگ خون کی کمی کا شکار ہیں، ان کے لیے پھلوں کا رس بہترین دوا ثابت ہوتا ہے کیونکہ پھلوں کے رس سے خون کی کمی قدرتی طور پر پوری ہوتی ہے۔ پھلوں کا رس چہرے پر بھی لگایا جاتا ہے۔ اعصابی کمزوری اور حیاتین کی کمی کے شکار افراد ادویہ کے بجائے پھلوں کے رس سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ قدرت نے پھلوں میں حیاتین کا بھرپور خزانہ رکھا ہے۔ ایسے پھل جن میں ترشی ہوتی ہے، جلدی امراض اور فسادِ خون جیسی شکایات میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے اصحاب کو کینو، مالٹے سنگترے اور لیموں استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ مرض ذیابیطس میں پھلوں کا بکثرت استعمال مفید نہیں ہوتا تاہم اس کے مریض جامن خوب استعمال کرسکتے ہیں۔

6۔ پھلوں کا رس بدن میں فوری چستی پیدا کرتا اور طبیعت میں فرحت لاتا ہے، دل و دماغ کو سکون ملتا ہے، پھلوں کا رس عام صحت مند انسان اور مریض دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

از: زرینہ خان، بہارہ کہو

''اچھا چلی جاتی ہوں مگر رات کو ڈر لگا تو چیخیں ماروں گی۔''
''خبر دار...... دیکھو اسے میری درخواست سمجھو پلیز...... کسی کا مشکل میں ساتھ دیتے ہیں ٹینا۔''
''کسی کا......'' وہ لفظ چبا کر کہتے ہوئے کپڑے نکالنے لگی تھی۔
''کوئی بدتمیزی نہیں چلے گی...... سمجھیں۔''
''پرائی بیٹی کے لیے اپنی بیٹی کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔''
''ٹینا......'' وہ اسے گھورتے ہوئے باہر تک لایا، رکشا کھڑا تھا۔
''مجھے تو پہلے سے ہی شک تھا کہ کچھ کالا ہے۔''
''بکومت...... اور وہاں جا کر کوئی ایسی ویسی بکواس مت کرنا۔''
''میری ماں بھی تو اکیلی ہے کبھی ان کے پاس تو نہیں چھوڑا آپ نے مجھے......'' وہ بیٹھنے کے بعد بھی بول رہی تھی۔
''اس کے پاس اس کے بیٹے ہیں، شوہر ہے۔''
''شوہر نہیں ہے......اور بیٹے بھی شوہر کے ہیں۔ان کے ساتھ صرف چھوٹا رہتا ہے، بڑا اپنے ابا کے ساتھ ہوتا ہے۔''
''وہ دونوں الگ رہنے لگے ہیں؟''
''ان کی طلاق ہوگئی ہے ابا......''
''کب؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔
''سال ہوگیا۔''
''اور تم مجھے اب بتا رہی ہو یہ بات......'' اسے اچنبھا ہوا۔
''انہوں نے منع کیا تھا۔''
اور تم نے ہضم کرلیا...... حد ہے۔''
''آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کہ ان کی زندگی میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں۔''
''ہاں، ٹھیک کہتی ہو، مجھے کسی کی بھی زندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
''کسی کے لیے تو خیر پڑتا بھی ہے۔''
''رکنا بھیا، یوٹرن لے لو، گھر واپس چلو۔'' وہ رکشے والے سے مخاطب ہوا۔
''کیا ہوا......؟''
''نہیں بلکہ گولڈن ٹاؤن چلو......'' وہ جیسے الجھ گیا تھا۔
''اب وہاں کیوں؟ آپ مجھے وہاں چھوڑ رہے ہیں؟''
''ہاں کیونکہ تمہاری ماں اکیلی ہے ناں... جب جی بھر جائے تب لوٹ آنا۔''
''تا کہ آپ آرام سے وہاں رہ سکیں۔''
''کہاں......؟'' وہ بے یقینی سے دیکھنے لگا۔
''یہ تو آپ کو خود بھی جانتے ہیں۔''
وہ بہت دکھ سے اسے دیکھے گیا۔
''جی کر رہا ہے چار جڑ دوں تمہیں......میری بیٹی ہو کر کس حد تک گری ہوئی سوچ ہے تمہاری......دکھ ہو رہا ہے مجھے......''
''مجھے گولڈن ٹاؤن نہیں جانا۔''
''دفع ہو جاؤ...... جہاں جانا چاہو، جاؤ۔''
''ارے بھیا، بی بی جہاں کہیں انہیں ڈراپ کر دو۔'' اس نے رکشا روکا اور ایڈوانس کرایہ ادا کر دیا۔
''مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ آپ بیٹھیے پلیز ابا۔'' وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے سڑک کے کنارے ہوگیا۔
''بی بی کہاں جانا ہے آپ نے؟'' رکشا ڈرائیور پوچھنے لگا۔
''گولڈن ٹاؤن لے چلو۔'' اس نے اپنی ماں کے گھر کا پتا سمجھایا اسے، آدم نے دوسرے رکشے میں ان کا پیچھا کیا، جب رکشے کو گولڈن ٹاؤن کے اندرونی گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تو تسلی سے سمت بدلی۔
زندگی بھی کتنی سخت ہے، دنیا تو دنیا خود اپنی اولاد بھی سوال کرتی ہے......کیچڑ اچھالتی ہے......تنگ کرتی ہے، رات دیر ہوگئی......اس کے دل میں امبرین کے لیے پریشانی تھی۔ اُدھر ٹینا کا رویہ اور باتیں، عجیب حالت تھی اس کی۔
وہ تھکتا جارہا تھا اور سمجھ کچھ نہیں آرہا تھا، کیا کرے......زندگی نے ایک عجیب دوراہے پر لاکھڑا

کیسا تھا۔ شاہینہ کی علیحدگی...... ٹینا کا اس کی طرف پلٹنا...... امبرین...... ایک بے سہارا...... تنہا...... سہمی ہوئی خاموش تو کبھی مدھم گفتگو کرتی ہوئی نرم ملائم روئی جیسی معصوم سی لڑکی...... معاشرہ...... اور تخی...... اس سب میں دل کہاں تھا...... اسے کچھ پتا نہیں چلا...... بس سوچے گیا...... اور جتنا سوچتا اتنا الجھتا ہی جارہا تھا۔

☆☆☆

اس کی ماں کسی سمینار میں گئی ہوئی تھی۔ وہ اسی وقت گھر لوٹ گئی تھی، اندازہ تھا کہ ابا گھر میں ہی ہوگا...... مگر نہیں تھا۔ اس نے امبرین کے گھر فون کیا...... ایک دو تین، چار بار بیل جارہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

رات بہت ہو چکی تھی...... اسے اکیلے گھر میں خوف آتا تھا۔ چاہے اپنا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ گھر سے باہر نکلی...... اس وقت تو کسی سواری کا ملنا بھی محال تھا۔ اسے فکر سی ہوئی، اندازہ تھا کہ باپ ناراض ہو کر گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے، صبح وہ تیار ہو کر کالج گئی تو اسے مس امبرین کے والد کے انتقال کی خبر ملی تھی۔

وہ چھٹی کے بعد سیدھی امبرین کے گھر چلی گئی تھی۔ وہاں محلے کے لوگ تھے مگر اس کا باپ نہیں تھا۔

وہ کوئی افسوس نہ کرسکی۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر گھر آ گئی۔ شام ہو چکی تھی۔

گھر آئی تو وہ لکڑیاں آرے سے صاف کررہا تھا۔

''آپ نے پھر سے یہ کام شروع کردیا ابا......'' وہ کتابیں رکھ کر آئی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

''اگر پھر سے اللہ نہ کرے کچھ لگ گیا تو؟'' وہ اب بھی چپ تھا۔

''میں نے دیر کردی...... آپ کچھ پوچھیں گے نہیں؟''

''اب تم جوان ہو، اپنی مرضی کی مالک ہو، جو چاہے کرو، جو چاہے بولو، جو جی چاہے سوچو......'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

''آپ کہاں تھے رات؟ مس امبرین کے پاس گئے؟''

''اب اس کا نام تم نہیں لوگی اپنے منہ سے سمجھیں؟''

''کیوں......؟''

''میں کسی امبرین نامی خاتون کو نہیں جانتا...... اور تم کوئی بات گھر پر آ کر نہیں کروگی کالج کی...... سمجھیں۔''

''ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔''

وہ آرا چلاتے ہوئے رکا...... آرا زمین پر پھینکا۔ دو لمحے بعد اسے ایک زبردست گھوری ڈالی غصے سے اور کپڑے جھاڑ کر اٹھا، قمیص پہنی اور کف چڑھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ رکیں ناں...... ابا......'' وہ دروازے تک گئی۔

''آپ کا تو کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ناں پھر؟''

آدم نے کھٹاک سے باہر دروازہ بند کیا اور نکل گیا۔

وہ اندر آ کر لمبی سانس لے کر بیٹھ گئی۔

''پتا نہیں آپ مجھے کب ٹھیک سمجھیں گے۔''

کچھ دیر بعد اس کی ماں کا فون آ گیا تھا۔ اور اس نے ساری بھڑاس فون پر نکال دی پھر جب دل خالی ہوا تو یاد آیا ان سے پوچھ لے کہ فون کیسے کیا۔ وہ اس کے سوال پر ہنس دی۔

''آپ ہنسی کیوں؟''

''تم فطرت میں کچھ، کچھ ہماری دادی پر گئی ہو ٹینا۔ وہ بھی سب کچھ کہنے کے بعد پوچھتی تھیں کہ اگلے بندے کو بھی کچھ کہنا ہے۔''

ٹینا شرمندہ سی ہو گئی۔

''آپ بھی آدم جی کی طرح مجھے فضول سمجھنے لگی ہیں۔''

''تم اپنے باپ کا اس طرح نام مت لیا کرو ٹینا۔''

''امی...... آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا۔'' وہ اچانک اس کے شکوے پر چپ ہو گئی۔

ٹینا کو اچانک ہی رونا آ گیا۔'' مجھے پتا ہے میں بہت بری ہوں۔ شاید میں پوری طرح آپ کی دادی پر گئی ہوں شاید ان سے بھی لوگ ایسے ہی چڑتے ہوں گے۔''

''ٹینا میری بات سنو میری جان۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا...... میں ہمیشہ اپنی بات کہتی ہوں، مجھے کسی اور کی پروا نہیں ہوتی۔ بس اب میں نے

کسی کو تنگ نہیں کرتا۔'' وہ کہہ کر فون رکھ چکی تھی۔
اور اِدھر شاہینہ نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

☆☆☆

''اس میں ایسا کیا برا تھا کہ میں نے یہ خواہش دل میں رکھ لی کہ میری ماں اور باپ ایک چھت کے نیچے میرے ساتھ زندگی گزاریں۔'' وہ آیا تھا اپنی چیزیں درست کر رہا تھا۔ خود کمرے کی صفائی کی۔

''ایک بات میری کان کھول کر سنو ٹینا اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی بھی چیز چالاکی سے نہیں جیتی نہیں جاسکتی۔ ہوشیاری سے نہ ہی ذہانت سے دنیا کی کوئی بھی چیز...... اگر چیز نہیں تو انسان اور اس کا دل صرف اور صرف سچائی سے جیتا جاسکتی ہے۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں چالاک ہوں، مکار ہوں۔''

''مگر ہونے کی پوری کوشش کر کے دیکھ لی ہے تم نے۔''

''آپ میرے ساتھ بہت تلخی سے پیش آتے ہیں۔''

''میں تمہارا باپ ہوں کچھ تمیز کے ساتھ پیش آؤ۔''

''اب میں رو دوں گی آدم......''

''رولو...... سب سے آسان اور بزدلی والا یہی کام ہے۔''

''آپ میری بات نہیں سنیں گے کیا؟''

''تم مطلب کی بات کرو تو سنوں...... بات کو ہمیشہ سو طریقوں سے گھما کر کرتی ہو۔''

''میرا صرف یہ قصور تھا کہ میں نے چاہا کہ آپ اور امی دوبارہ ایک ہو جائیں۔ مجھے جیسے ہی محسوس ہوا کہ آپ مس امبرین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، مجھے خوف سا آنے لگا کہ آپ ان سے کہیں شادی نہ کرلیں۔''

''اور اسی لیے تم یہ ساری بکواس کر رہی تھیں۔''

''جی......'' اس نے بالآخر بات کو بکواس تسلیم کر ہی لیا تھا۔

''ایک رشتہ حسنِ سلوک کا بھی ہوتا ہے ٹینا۔ ہم جب سارے انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں ایک دنیا میں اور ایک جیسے حالات سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو آپس میں ہمدردانہ رشتے جڑ ہی جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی کسی کو نہ پوچھے کوئی کسی کے کام نہ آسکے۔ وہ لڑکی مشکل میں تھی...... اس سے جا کر پوچھ لینا یا تھوڑی سی ہمدردی دکھانا کیا غلط ہے؟ اس دن اگر تم راستے میں تماشا نہ کھڑا کرتیں تو میں تمہیں چھوڑ آتا...... کم از کم ایک رات ہی سہی......ہم اس کے غم میں حصہ لے لیتے...... اسی رات اس کے والد کا انتقال ہوا اور وہ لڑکی اکیلی تھی۔ اگلے دن شام کے بعد مجھے پتا چلا...... اور میں اس کے کچھ کام نہ آسکا...... معلوم نہیں اس نے کیسے اپنے باپ کے کفن کا بندوبست کیا ہوگا؟ کیسے سب کیا ہوگا...... وہ اکیلی عورت آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو افسوس کرنے کے لیے آرہے تھے...... وہ بظاہر کتنی مضبوط تھی مگر اندر سے کتنی نڈھال ہوگی جو کئی دن سے سوئی نہ ہوگی...... نہ کھانا ڈھنگ سے کھایا ہوگا جسے ہر وقت یہ فکر ہوگی اچانک کسی وقت پیسے ختم ہو جائیں گے اور اگر ایسا ہوگا تو کیا ہوگا......''

''آپ کو کتنا احساس ہے ان کا......''

''تم نے پھر بات کو غلط رنگ دے دیا ٹینا۔'' وہ بیچارگی سے اسے دیکھنے لگا۔ ''تم کب سمجھوگی حقائق کو۔''

''میری ماں...... جس کی دوسری شادی اس عمر میں آکر ٹوٹ گئی...... جس کا بڑا بیٹا ان سے باغی ہے اور چھوٹا ساتھ رہتے ہوئے بھی شکایتیں کرتا رہتا ہے۔ کیا ان کا حق نہیں ہے کہ وہ بےفکری کی زندگی گزاریں؟''

''اس نے رشتوں کو اتنا اہم کب سمجھا تھا۔ اس کے سامنے تو بس، کام، ترقی، نام، پیسہ، اشیا کی اہمیت تھی۔ وہ سب اسے مل گیا۔ اس شخص نے اگر اس عمر میں آکر اسے چھوڑا ہے تو میں اس سب کا قصور وار صرف اسے نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس سب میں شاہینہ کا بھی ہاتھ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جو بھی ہے مگر اب تو موقع ہے ناں......''

''تم اس کے ساتھ رہنا چاہو تو رہ لو مجھے اعتراض نہیں ہے، میں آکر مل لیا کروں گا تم سے۔''

''آپ تو ان سے محبت کرتے تھے ناں......''

''کرتا ہوں...... مگر دوبارہ شادی کی غلطی نہیں

کروں گا۔"

"اگر وہ خود آپ کو کہیں تب بھی......؟"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ جذباتی طور پر مجھے گھیرنے کی صلاحیت آزما سکتی ہے، میں نے تمہیں یہ سب چیزیں تو نہیں سکھائی تھیں ٹیٹا۔"

"آپ سب مجھے برا سمجھتے ہیں۔"

"اور اب تمہیں رونا آرہا ہوگا...... ہے ناں...... تو رو لو......"

"آپ پہلے والے باپ نہیں رہے۔"

"اور نہ ہی تم پہلے والی بیٹی رہی ہو۔"

"آپ کو میرے رونے کی بھی پروا نہیں رہی...... پہلے تو آپ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپتے تھے۔"

"بے وقوف تھا......" کہہ کر وہ کمرے سے نکلا۔

"آپ مجھے پھر سے چھوڑ کر جارہے ہیں...... یاد رکھیں میں اب امی کے پاس گئی تو لوٹ کر نہیں آؤں گی۔" اس پر اس کی کسی بلیک میلنگ کا اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنی چائے کا کپ ختم کرچکا تھا۔ والٹ اٹھایا، گھڑی پہنی، سیل فون جیب میں رکھا اور نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی وہ دھپ دھپ کرتی اندر چلی گئی اور ماں کو فون ملایا۔

☆☆☆

امبرین گھر پر اکیلی تھی اور باہر سے تالا لگا ہوا تھا اس کے وہاں کھڑے رہنے پر پڑوسی نے آکر جھڑکا تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا گھر کے اندر بتی جلی ہے اور جھری سے وہ نظر بھی آگئی تھی۔

"یہاں تالا کیوں لگایا ہے؟"

"تاکہ کوئی چور اچکا نہ گھس جائے۔"

"یہ زیادتی ہے...... اندر گھر میں ایک اکیلی لڑکی بیٹھی ہے۔ اسے کسی بھی چیز کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس کے باپ کو گئے ہوئے چوتھا دن ہے اور آپ لوگوں نے یہ ظلم شروع کردیا ہے۔"

"پہلی بات کہ اس کے ساتھ محلے کی ایک عورت ہے دوسری بات یہ کہ اگر وہ اکیلی بھی ہو تو تجھے کیا...... تو کیا لگا ہے اس کا بتا......"

"میں نہیں لگتا تو آپ کیا لگتے ہیں؟"

"زیادہ بک، بک نہ کر...... ویسے بھی چند دن میں اس کا نکاح ہورہا ہے میرے ساتھ۔"

"تمہارے ساتھ......؟" آدم نے اسے سرتاپا دیکھا۔

وہ جو چار چھ بچوں کا باپ الستھ، ساٹھ کی عمر کا دبلا پتلا سا مریل، نشئی...... اس کا خون کھول گیا...... دو چار دستکیں دے ڈالیں جب اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو لوٹ آیا اور اسے اس وقت سے کال ملا رہا تھا مگر وہ اٹھا نہیں رہی تھی۔ رات کے نو بجے تھے، جب وہ گھر کی طرف جارہا تھا۔ تب اس کی کال آگئی۔

"ہیلو امبرین...... کہاں ہو...... کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں......" تھکی ہوئی آواز تھی۔

"میں آیا تھا...... کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔"

"میں سوئی ہوئی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو امبرین......"

"پھر کیا کروں...... سچ بولنے سے بتاؤ کیا مل جاتا ہے؟"

"امبرین تم یہ سب تماشے دیکھ رہی ہو؟ اور برداشت کررہی ہو۔"

"تو پھر کیا کروں...... لڑنے کی طاقت نہیں ہے اب آدم......"

"تو کیا تم اس آدمی کے ساتھ شادی کرلوگی؟"

وہ چپ رہی۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ تم نبیل کو بلالیتیں۔"

"اس کا نام مت لو......"

"پھر کس کا نام لوں......؟"

"بتاؤ کون ہوگا جو مجھ بے سہارا کو اپنائے گا۔"

"تم اتنی کم ہمت تو نہ تھیں امبرین۔"

"اب ہوگئی ہوں آدم...... ساری زندگی لڑ لڑ کر انسان تھک جاتا ہے۔ اب تک میں سمجھتی رہی کہ میں اپنے باپ کا سہارا ہوں یہ بھول گئی تھی کہ میرا اپاہج کمزور باپ بھی میرا سہارا تھا چاہے نام کا ہی...... پر تھا تو......"

"امبرین تھوڑا...... وقت لے لو...... کوئی راستہ نکالتے ہیں یار......"

''فون کرنے کا شکریہ، آدم!'' یہ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دو بار ملاتا رہا..... مگر ناکام رہا ایک طرف شاہینہ بھی جس کے لوٹنے کا اِک عمر اس نے انتظار بھی کیا تھا..... اور وہ اب لوٹ رہی تھی۔ ٹینا تھی جو خوش رہ سکتی تھی ماں کے آنے سے..... اس کا کیا قصور تھا کہ جب موقع ملا تب بھی وہ اس کی نہ سنتا.....

زندگی کبھی انسان پر آسان نہیں ہوتی..... ہمیشہ غیر یقینی اور کشمکش کی صورتِ حال رہتی ہے۔ اور اب یہ لڑکی..... اکیلی، بے آسرا..... وقت کے ہاتھوں تھکی ہوئی..... اور اب ایک اور امتحان اس کے سر پر کھڑا تھا..... اس نے کچھ لمحے سوچ بچار کی نذر کیے۔ پھر پھرتی سے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس گیا۔ شواہد لیے، دو چار افراد کے ساتھ محلے کی ایک خاتون کو لیا، اس کے گھر تک آیا مولوی اور لوگوں کے پریشر سے اس آدمی نے باہر کا تالا کھولا اور وہ لوگ اندر چلے گئے..... آدم سے نکاح کا پوچھ کر مولوی کھٹکا کر کے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

جہاں وہ نماز سے فارغ ہو کر تسبیح کر رہی تھی۔ مولوی صاحب کرسی پر بیٹھے اور اسے فائل تھمائی اور آدم ابن احمد شکیل کے نکاح میں آنے کی قبولیت پوچھی..... عورت نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پہلے تو وہ حواس باختہ انہیں دیکھتی رہی پھر قبولیت کی ہاں دے کر دستخط کیے۔

مبارک کی بھنبھناہٹ تھی..... وہ چار افراد میں مٹھائی بانٹی گئی۔

آدم نے اسے سامان سمیٹنے کا کہا۔ اس نے اپنا مختصر سا کچھ سامان کپڑے، چند ضرورت کی اشیا تھیلے میں ڈالیں۔ گاڑی باہر کھڑی تھی، سامان رکھوا کر وہ اندر آیا۔ امبرین پڑوسی خواتین سے ملی، شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں آ بیٹھی۔

سب کچھ اتنی اچانک ہو گیا تھا کہ نہ کچھ اسے سمجھ آ رہا تھا نہ ہی آدم کو..... مگر بس اتنی تسلی تھی کہ اب کی بار جو شخص اس کی زندگی میں آیا تھا وہ اس کا ہمدرد تھا۔ اس کا ساتھی تھا اور دوست تھا..... دوستی کو ایک پختہ تعلق نے جوڑ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا جو صبح اجنبی تھا، شام ایک خیال تھا۔

اور رات شروع ہونے تک اس کے لیے آسرا بن گیا تھا۔ اس کا سائبان بن گیا تھا۔

☆☆☆

''آپ نے امبرین سے شادی کر لی ہے؟''

وہ پورے ہفتے بعد گھر لوٹی تھی۔ وہ بھی آدم کے دس مرتبہ کال کرنے پر۔

''ہاں..... میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔''

وہ اسے اندر آنے کے لیے جگہ دے کر ہٹا تھا۔

''اگر یہ ارادہ تھا تو مجھے بتانے میں کیا قباحت تھی۔''

''تمہیں پتا ہے کہ پہلے میرا ارادہ ایسا نہیں تھا۔''

''آپ کے دل میں تو تھا ناں.....''

''تمہیں شکایت ہے؟ کیا مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے؟''

''مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ آپ نے خود کو مجھ سے چھپایا اگر یہ خواہش تھی تو مجھ سے کہتے، میں کروا دیتی، میں تو خود آپ کو یہ کہتی تھی اور تب آپ میرے سامنے بنتے تھے۔''

''بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں، اب یہ بحث تو چلتی ہی رہے گی۔''

''مجھے بچوں کی طرح مت بہلائیں ابا.....''

''میرا اگر ارادہ ہوتا یا چلو میرے دل کا تو مجھے پتا ہوتا اور میں تم سے قطعی نہیں ڈرتا سمجھیں..... مگر میں تمہاری پروا کرتا ہوں..... اس لیے ضرور بتاتا۔ امبرین کے کیا حالات تھے یہ تو تم جانتی تھیں مگر کیا ہو گئے تھے یہ تمہیں نہیں پتا تھا۔''

''آپ خوش ہیں یہ شادی کر کے؟''

''یہ شادی میں نے اپنی خوشی کے لیے نہیں کی..... البتہ میں مطمئن ضرور ہوں۔''

وہ کچن میں آ گیا۔

''مجھے چائے نہیں چاہیے..... کھانا، کھانا ہے.....''

''تم کھانا کھا کر نہیں آئیں؟'' اسے تعجب ہوا۔ شام ہو رہی تھی اور اس وقت وہ صرف چائے پیتی تھی۔

''نہیں...... کیونکہ امی کو کہیں جانا تھا۔''
''وہ تمہارے لیے کھانا بنا کر جاسکتی تھی ٹیٹا۔''
''مگر نہیں بنایا...... انہیں دیر ہورہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا میں باہر سے کچھ منگوالوں......''
''تم انہیں بتائے بغیر آئی ہو۔ وہ پریشان ہوگئی۔''
''وہ نہیں ہوتیں اتنی معمولی سی باتوں پر پریشان، یہ آپ کو بھی پتا ہے۔''
''تب بھی انہیں فون کردو ٹیٹا......'' اب وہ کھانا گرم کرنے لگا تھا۔
''وہ جب لوٹیں گی اور مجھے نہیں دیکھیں گی تو سمجھ جائیں گی۔''
''تم سچ، سچ بتاؤ کیوں آئی ہو اس طرح...... تم نے تو کہا تھا تم مہینہ بھر رہو گی ان کے پاس۔''
''مہینے میں چار ہفتے ہوتے ہیں ابا...... ایک ہفتہ رہ لیا ناں بس بہت ہے۔ البتہ یہ الگ بات کہ آپ کو میری موجودگی اچھی نہ لگے۔''
''بکومت' اس بات پر میں تمہیں کس کر تھپڑ مار سکتا ہوں۔''

''ماردیں۔'' وہ اسٹول پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔
آدم نے بریانی گرم کر کے پلیٹ میں ڈال کر ساتھ رائتہ اور سلاد رکھ کر ٹرے اسے دی۔
''آپ کی بیوی اچھا کھانا پکاتی ہے۔''
''وہ تمہاری ٹیچر بھی ہے...... اور اب تم ایسے بات کرو گی۔''
''تو پھر کیسے کروں؟ آپا، باجی کہوں اسے یا امی جی۔''
''کچھ نہیں امبرین ہی کہو۔''
''ویسے ہیں کہاں وہ؟''
''سو رہی ہے بیچاری۔''
''اوہ بیچاری!'' وہ ہنسی تو نوالہ اٹکا۔
''بری بات ہے ٹیٹا۔'' آدم نے اسے پانی تھمایا۔
''بیچاری کسی کا عزت دار لقب کم، ہمدردانہ زیادہ ہوتا ہے۔''
''بڑی ہمدردیاں ہیں بھئی۔''
''مجھے پتا ہے دنیا مجھے نہیں سنائے گی، جو سنانا ہوگا تم ہی سناؤ گی۔'' وہ بولا۔
''اب آپ میری باتوں کا برا ماننے لگے ہیں۔''
''اب تم میری نانی بننے کی کوشش مت کرو ٹیٹا۔''
''بڑے بیزار آئے ہوئے ہیں مجھ سے۔''
''وہ تو کئی سالوں سے ہوں۔'' اب وہ اس کی ٹون میں بات کرنے لگے تھے۔
ہنسنے لگی، سمجھ گئی تھی۔
''چلیں وہ بیچاری سو رہی ہے۔''
''تم اسے بیچاری نہیں کہو گی۔''
''چلیں نہیں کہتی...... مگر ایک بات پوچھوں؟''
''پوچھنے کے بعد عمل کرو گی؟''
''نہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں...... اچھا میری بات سنیں...... آپ اماں سے محبت کرتے تھے ناں......؟''
''تمہیں......'' وہ کہہ کر رک گئے...... ''بڑا بے وقت سوال ہے یہ۔''
''مجھے جواب پتا ہے' آپ کرتے ہیں...... مگر آپ ان کے ساتھ رہ نہیں سکتے تھے یا پھر وہ...... میں بھی ان کے ساتھ محبت کرتی ہوں ابا...... پر میں بھی ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی...یا پھر وہ...... اس سے پہلے کہ وہ مجھے کہتیں اپنے باپ کے پاس جاؤ میں خود آگئی...... معلوم ہے وہ مجھ سے تھک جاتی ہیں۔''
''تم نے اسے تنگ کیا ہوگا؟''
''نہیں ابا...... تنگ تو صرف آپ کو کرتی ہوں۔ ان کے ساتھ تو رہتی ہوں، ان سے توجہ چاہتی ہوں اور......'' وہ رک گئی تھی۔
''اور......اور کیا؟'' وہ بولا۔
''وہ جب چاہتی ہیں تو دے دیتی ہیں۔ جب نہیں چاہتیں تو...... ان کے پاس صرف ان کی اپنی قدر ہے۔'' وہ اسٹول سے نیچے اتر آئی...... برتن سنک میں رکھے۔
''میں نے سوچا تھا ان کو دکھ ہوگا آپ کی شادی کا سن کر مگر نہیں ہوا...... یا پھر وہ خود پر قابو رکھنا جانتی ہیں، میں انہیں سمجھ نہیں پائی ابا۔''
''میں بھی اسے سمجھ نہیں سکا تھا۔''

''ابا......امبرین اچھی لڑکی ہے......آپ نے بہت اچھا کیا۔''
''تم جب اتنی سیدھی ہو جاتی ہو تو مجھے رج کے تعجب ہوتا ہے ٹینا......''
''ابا...... میں تھک گئی ہوں...... مغرب تک سو جاؤں؟''
''سو جاؤ......پھر میں اپنی بچی کے لیے بہت اچھی سی چائے بناؤں گا۔''
''ابا......میری اگر امبرین سے دوستی نہ ہو سکی؟''
''کوئی بات نہیں......امبرین تمہیں جانتی ہے...... اور اب تو یہ بھی میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم مجھے پیار میں آدم جی غصے میں اے آدم سنو اور دل سے ابا کہتی ہو۔''
''مگر اب اس کے سامنے میں آپ کو ابا ہی کہوں گی۔''
''اچھا فیصلہ ہے قائم رہنا اس پر۔''
''سو کر اٹھوں گی تو چائے بنی ہونی چاہیے۔''
''اچھا بھئی سن لیا۔''
کہتے ہوئے اندر آیا تو امبرین اٹھ چکی تھی۔
''تمہاری نیند پوری ہوئی؟''
''پوری تو نیند کبھی نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ تو ہو گئی ہے آج کے لیے۔''
''تم بھی ٹینا کی طرح جواب دیتی ہو کبھی کبھار......''
''ٹینا آئی ہے؟''
''ہاں مگر اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی ہے۔''
''تم نے اسے کچھ کہا تو نہیں آدم؟''
''میں کیا کہوں گا اسے؟''
''دیکھو وہ میرے ساتھ جس طرح بھی رہنا چاہے۔''
''مجھے پتا ہے بھئی......اور وہ ہے بھی ایسی۔ تم فکر مت کرو......''
''وہ خوش ہے؟''
''اس سے خود پوچھ لینا تم۔''
''ڈرتی ہوں بھئی......''
''کب سے؟''
''شروع سے ہی۔'' وہ ہنس پڑا اس کی بات پر......

''چلو اٹھو چائے پیو گی۔''
''ہاں اور وہ بھی آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔''
''دیکھو بھئی میں تو دودھ پتی کی بناتا ہوں، ہاتھ کی کون بناتا ہے۔''
''وہی کہہ رہی ہوں۔'' چپل پہنتے ہوئے وہ اٹھی۔
''ٹینا اٹھے گی تو شام کے بعد گھومنے چلیں گے۔ ڈنر بھی باہر کریں گے۔''
''ٹینا سے پوچھ لیجیے گا۔''
''وہ گھومنے پھرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔''
''میں ذرا فریش ہو جاؤں۔'' وہ کپڑے نکالنے لگی الماری سے۔
''اور میں تمہارے لیے چائے بنانے جاتا ہوں۔''
''میں چاہوں گی آپ ہمیشہ میرے لیے اسی طرح بناتے رہیں۔'' وہ آنکھ مار کر بولی۔
''ہمیشہ بناؤں گا......'' مسکراہٹ دبا کر وہ باہر نکلا۔
''میں آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں آدم......'' دروازے سے جھانک کر کہا تھا۔
''جس دن چائے نہ بناؤں اس دن یہ جملہ کہنا۔''
''پھر سوچنا پڑے گا۔'' کہتے ہوئے وہ ہنسی اور کپڑے...... لے کر واش روم میں گھس گئی۔
زندگی ٹپ، ٹپ کرتے ہوئے گرتے پانی کے چند قطروں جیسی شفاف اور دھلی ہوئی سی تھی۔ پانی کے قطرے جب بوند، بوند گرتے ہوئے ایک چھوٹا سا تالاب بنا لیتے ہیں۔
انسان کی زندگی بھی تقدیر سے بوند، بوند لے کر خوشیاں جمع کرتی ہے چھوٹی، چھوٹی......مگر دل کو سنبھالا دینے والی خوشیاں چھوٹے، بڑے دکھوں کو سمیٹ لینے والی پُرسکون خوشیاں ایک تصویر میں مقید ہو گئی تھیں جو اس کی سنگار میز کے تاج پر رکھے ہوئے فریم میں جڑی تھی، جس میں دائیں طرف آدم، بائیں امبرین اور بیچ میں ٹینا تھی۔
ایک جان دار مسکراہٹ ان کے آپس کے تعلق کو بیان کر رہی تھی۔



اخترشجاعت

شانِ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یا صاحبُ الجمال و یا سیّدُ البشر
من وجھک المنیر لقد نور القمر
لایمکنُ الثناء کما کان حقّہ
بعد از خدا بزرگ توی قصہ مختصر

☆☆☆

تمام تر حمد و ثنا اور تمام تعریف کا سزا وار خدائے بزرگ و برتر تو ہی ہے۔تو ہی ہر شے کا مالک حقیقی اور قادر مطلق ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کون کرسکتا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام اور رفعتِ شان کو ان کے خالق ان کے رب کے علاوہ کون جان سکتا ہے۔جس کو جو ملا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور حضور ہی کے صدقے میں ملا......آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ہی اُسرارِ قرآن کھلتے ہیں اس کے بغیر نہ علم، علم ہے نہ عمل، عمل ہے۔

(اپنے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ ایک بار درود شریف پڑھ لیں)

حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اعلیٰ صفات، آپ کے اوصاف، آپ کے فضائل آپ کی شان عظمت، شان نبوت، شان رسالت اور شان ختم نبوت ان تمام کا احاطہ کرنا اور بیان کرنا انسانی قدرت و طاقت کے باہر ہے کیونکہ جس ہستی کی تعریف خود پروردگار کرے تو پھر بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اخلاق و عادات کی تمام خوبیاں اور کمالات اور اعلیٰ صفات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں جمع فرما دیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین و آخرین کے علوم سے جو آپ کے شایان شان تھے بہرہ مند فرمایا تھا۔آپ کو کائناتِ ارضی کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں مگر آپ نے آخرت کو ترجیح دی۔دنیاوی مال و متاع کے بدلے آپ سب سے زیادہ علم و حکمت کے جاننے والے......سب سے زیادہ محترم، سب سے زیادہ منصف، حلیم و بردبار، پاک دامن، صبر و تحمل کا پیکر......سب سے زیادہ حسین، بہادر اور فیاض......تمام تر جملہ جسمانی اور روحانی کمالات کے جامع اور خوب صورتی اور نیک سیرتی کے حامل تھے۔

آج ہم مسلمانوں کی پستی کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ ایسے ہیں جو دین کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو دین کی راہ پر تو ہیں لیکن اپنے محور کی پہچان بھول گئے ہیں۔جس طرح راستے سے بھٹک جانے والا شخص تمام عمر چلتا رہے تو بھی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح دین کے محور کو فراموش کردینے والا شخص ساری زندگی عبادت، ریاضت اور مجاہدے میں گزار دے مگر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا اس کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ اپنے محور کو پہچانے اور پھر اس کی معرفت حاصل کرے اور جب یہ معرفت حاصل ہو جائے گی تو پھر عبادت، ریاضت، نتیجہ خیز ثابت ہوں گی......

اور وہ مرکز و محور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک ہے......اور اس کی اصل اساس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت و تعلق ہے جو حقیقتاً ایمان ہے، یہ تعلق مضبوط و مستحکم ہو تو ایمان کامل ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں جس نے جس قدر ڈبکیاں لگائیں وہ اتنا ہی دُھلا اتنا ہی نکھرا......اور پھر اس سمندر سے بیش قیمت لعل و گوہر سمیٹے......ساحل پر بیٹھ کر لعل و گوہر نہیں ملتے اس کے لیے عشق و محبت کے سمندر میں اترنا پڑتا ہے......ڈوب جانا ہوتا ہے تب ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم کس، کس شان، کس کس فضیلت کا ذکر کریں کہ ہر شان و فضیلت ایک سے

بڑھ کر ایک ہے۔ امام ابراہیم ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ ''جس کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کیے بطور تمثیل ہی کیے ہیں اور ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔''

حضرت امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں۔ ''اسلاف نے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف کا جو تذکرہ کیا ہے یہ بطور تمثیل ہے ورنہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور مقام اس سے بہت بلند ہے۔''

نہ تو قلم میں اتنی سکت ہے کہ ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان تحریر کر سکے اور نہ ہی زبان کو بیان کرنے کا یارا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اول و آخر ہیں سب سے پہلے نبوت آپ کو عطا ہوئی آپ خود فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت نبی تھے جب حضرت آدم ابھی آب و گل (مٹی) میں جلوہ گر میں تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیا اور رسول تشریف لاتے رہے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے وہ ایک خاص قوم کی طرف آیا کرتے تھے مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک تمام جنات اور تمام انسانوں اور تمام قوموں اور قبیلوں اور تمام زمانوں اور تمام مکانوں کے بسنے والوں کے لیے رسول ہیں اور نبی ہیں۔

دیگر انبیا کے مقابلے میں جس قدر خصائص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا ہوئے ہیں۔ وہ متعدد معتبر حدیثوں میں خود زبان اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ مجھے رعب اور دھاک کے ذریعے سے فتح و نصرت دی گئی...... میرے لیے تمام زمین سجدہ گاہ بنائی گئی...... غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا......

مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا...... مجھ سے پہلے انبیا خاص اپنی، اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے...... اور میں تمام عالمین کے لیے مبعوث ہوا...... اور حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضرتؐ کی زبانی چھ باتیں گنوائی ہیں۔

1۔ مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔

2۔ رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔

3۔ مالِ غنیمت میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔

4۔ روئے زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔

5۔ مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔

6۔ اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں۔ وہ ان سب کو جامع ہیں...... یعنی تکمیل دین...... اور ختم نبوت......

☆☆☆

اسلام کا صحیفہ قرآن مجید جوامع الکلام ہے کہ اس کی ایک، ایک آیت کے اندر سیکڑوں اسرار معانی لطائف ہیں...... جب یہ صحیفہ ایسا جامع ہے تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آئے کامل ہوگا۔

قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے قریب مسلمانوں کے عظیم اجتماع کے دن حجتہ الوداع پر اعلان عام کیا۔

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا...... اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لیے پسند کیا۔'' اسلام قرآن کے عقیدے کے مطابق اس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے، اپنے وقت میں پیغمبر کو عطا ہوا اور عہد بعید دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ کر تمام ہو گیا...... اور یہ منصب خاص صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے لیے روز ازل سے مقدر ہو چکا تھا آپؐ نے فرمایا......

''میں پیغمبر آخر تھا اور آدم علیہ السلام ابھی آب و گل میں پڑے تھے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے۔ فرمایا۔ ''میری اور دوسرے انبیا کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے بڑا حسین و جمیل اور کامل مکمل محل بنایا...... مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس لوگ اس محل کے گرد گھومتے اور اس کی عمدگی پر تعجب کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پُر کر دی جاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... تو میں وہ آخری اینٹ ہوں......'' عمارت دین و نبوت ہے اس کی ایک، ایک اینٹ ایک، ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین و شریعت ہے اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجودِ اقدس ہے۔

قرآنِ دین کا کامل صحیفہ خاتم الانبیا کی وحی اور دائمی

معجزہ بن کر آیا۔ تو یہ تکمیل دین یہ آیات مبین خود اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ کے وجود اقدس پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہوگیا اور نبوت و رسالت کا سلسلہ منتہی ہوگیا اور اب دنیا میں کوئی نیا پیغمبر نہیں آئے گا...... اسی لیے سورۂ مائدہ میں تکمیل کی بات کی گئی۔ اور سورۂ احزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن خدا کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔'' تو شان نبوت، ختم نبوت اسلام کا نہایت اہم اور بنیادی عقیدہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ختم نبوت قرآن وسنت کے قطعی.... نصوص سے ثابت ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کردیا گیا...... آپ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد کسی شخص کو منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا۔

حافظ ابن کثیر آیت خاتم النبین کے تحت لکھتے ہیں۔

''اور ختم نبوت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث متواترہ وارد ہوتی ہیں۔ جنہیں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے بیان فرمایا ہے۔'' اور علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النبین ہونا ایسی حقیقت ہے جس پر قرآن ناطق ہے اور احادیث نبویہ نے اس کو واشگاف طور پر بیان فرمایا ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے۔ پس جو شخص اس کے خلاف کا مدعی ہو اسے کافر قرار دیا جائے گا اور اگر اس پر اصرار کرے تو اس کو قتل کیا جائے۔'' (روح المعانی) حدیث مبارکہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا۔'' تم مجھ سے وہی نسبت رکھتے ہو جو ہارون (علیہ السلام) کو موسیٰ (علیہ السلام) سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''میرے پانچ نام ہیں...... میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ خدا میرے ذریعے سے کفر کو محو کرے گا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا...... اور میں عاقب آخری ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر انبیا کے مقابلے میں اپنے جو مخصوص فضائل گنوائے ہیں ان میں ایک شانِ ختم نبوت بھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی سیاست خود ان کے انبیا کیا کرتے تھے جب کسی نبی کی وفات ہوتی تھی تو ان کے بعد دوسرا نبی آتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انبیا کی آمد بند ہے البتہ مجددینِ امت ضرور آئیں گے جیسا کہ حدیثؐ میں آیا ہے کہ

''بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی پر ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جو اس کے لیے دین کی تجدید کریں گے۔''

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں...... حالانکہ میں خاتم النبین ہوں، میرے بعد کوئی قسم کا نبی نہیں۔''

☆☆☆

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ مسلیمہ کذاب کے بارے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا تھا اس وقت تک لوگوں میں اس کے بارے میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز خطبہ دیا اور حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا...... ''یہ شخص جس کے بارے میں تم لوگ رائے زنی کررہے ہو وہ تیس کذابوں میں سے ایک کذاب ہے جو دجال اکبر سے پہلے نکلیں گے۔''

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''رسالت و نبوت ختم ہوچکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی......''

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں۔''

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''نبیوں میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں اور آخری نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......) ہیں۔''

شان ختم نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لیے عزت و رحمت ہے کیونکہ سلسلہ نبوت کے خاتمے سے انسانی صلاحیتیں اور قوتیں اس خطرے سے محفوظ ہوگئیں کہ تھوڑے، تھوڑے وقفے اور دور کے فاصلے پر ایک

نئے نبی یا دعوت کا ظہور ہوا اور وہ سب ضروری کام چھوڑ کر اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کرنے میں لگ جائیں تو اس آزمائش سے بچا لیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے خاندان اس کے مال اور انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اسرائیلیات میں مروی ہے کہ ایک آدمی دو سو برس تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی و سرکشی میں بڑھ چڑھ کر جرأت و دیدہ دلیری دکھاتا رہا۔ جب وہ مرگیا تو بنی اسرائیل نے اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹ کر ایک کوڑے پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ''اس کو غسل دے کر کفن پہناؤ اور تمام بنی اسرائیل کو لے کر اس کی نماز جنازہ پڑھو......''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسے ہی کیا......اس بات پر بنی اسرائیل کو تعجب ہوا اور لوگوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کوئی سرکش اور زیادہ نافرمان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا...... ''میں جانتا ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے معلوم کریں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار سے التجا کی اور کہا اے پروردگار! تو جانتا ہے جو یہ کہہ رہے ہیں...... اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی...... ''انہوں نے سچ کہا اس نے دو سو سال تک میری نافرمانی کی مگر اس نے ایک روز توریت کو کھول کر اس میں میرے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لکھا دیکھا تو اس کو بوسہ دیا اور دونوں آنکھوں سے لگالیا...... میں نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اس کے گناہ بخش دیے......'' سبحان اللہ......! آقاؐ کا کیا مقام ہے پروردگار کے نزدیک۔

☆☆☆

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے عشق و محبت رگِ مسلم میں سرائیت کیے ہوئے ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت و عقیدت ہی ایک مسلمان کا اصل سرمایہ حیات ہے......اور پھر یہ محبت کیوں نہ ہو؟ وہ جو آقا ہے میرا اور آپ کا...... کالے اور گورے کا، عربی و عجمی کا، عالم اور جاہل کا، شہری اور بدوی کا، قطب اور ابدال کا، وہ جو محسن ہے ہر ستم رسیدہ مظلوم کا...... ہرلٹی ہوئی بیوہ کا...... ہر غبار آلود بے سہارا یتیم کا...... اس بیٹی کا جس کا وجود باعثِ شرم تھا۔ وہ جو رحمت ہے نباتات کے لیے جمادات کے لیے انسانوں کے لیے......حیوانوں کے لیے غلاموں کے لیے، شاہوں کے لیے، رحمت کا سائبان سب پر ہے......اس کی تعلیم سب کے لیے، وہ انسان کامل ہے، ہر اعتبار سے کامل، ہر پہلو سے کامل، ظاہر و باطن کے اعتبار سے، اخلاق و ملکات کے اعتبار سے......وہ جو محبوب ہے صحابہ کرامؓ کا......اہل اللہ کا صدیقین و صالحین کا، اہل علم کا اور سب سے بڑھ کر رب کبریا کا......ایسی عظیم الشان ہستی سے محبت کیوں نہ ہو؟ عشق کیوں نہ ہو؟ ایسے عظیم پیغمبر خاصہ کائنات کے نام و ناموس پر اپنی جان کا آخری قطرۂ خون کیوں نہ بہا دیا جائے۔

سچی اور حقیقی محبت رسول آخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ہے...... سچی پُرخلوص اور بے ریا اطاعت و بندگی کا نام ہے۔

آیئے بارگاہ الودود جل جلالہٗ میں دست دعا دراز کریں۔ قلب حزیں اور نم آنکھوں سے نفسانی اور شہوانی محبت کے بجائے سچی، حقیقی، ایمانی اور روحانی محبت کی التجا کریں......الٰہی ہمیں اپنی محبت عطا کر اور اس عمل کی محبت دے جو ہم کو تجھ سے قریب تر کردے......آمین۔

حرف آخر:

یا اللہ یا رحمٰن و یا رحیم! اے میرے رب یہ محض تیرا کرم اور فضل عظیم ہے کہ تو نے اس عاجز و گناہ گار کو بے نوا بے مایہ علم و عمل کو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں چند سطریں لکھنے کی توفیق و سعادت عطا کی......تو اے میرے پروردگار اس ناچیز کو اپنی بارگاہ اور اپنے محبوب اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کریمانہ نگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما......اس میں جہاں کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد ہوگئی ہو تو میرے رب مجھے معاف فرما دینا۔ اور دونوں جہاں میں سرفرازی عطا فرما......اور یا اللہ جن نفوس قدسیہ کی متبرک کتابوں سے میں نے استفادہ کیا ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرما...... ان کے درجات بلند فرما دے......اور اس تحریر کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس کے تمام علمی و عملی منافع عطا فرما اور اطاعت و اتباع اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توفیق عطا فرما...... (آمین) اور اسے ہم سب کے لیے سرمایۂ نجات و آخرت بنا دے......آمین یارب العالمین......

☆☆☆

وہ آئے بزم میں ......

نزہت اصغر





ماضی قریب کی مایہ ناز
افسانہ نگار اور آج کے دور
کی کامیاب ڈراما نگار

سیما مناف

کی خوشگوار آمد سے سجی ہماری خوب صورت بزم

موسم سرما کا لطف اٹھاتے پیارے، پیارے قارئین کی خدمت میں خلوص بھرا سلام...... آج کی بزم آپ کی پسندیدہ ڈراما نگار کی گرما گرم باتوں سے پُر حدت ہو رہی ہے جی ہاں یہ محترمہ کبھی باقاعدگی سے افسانے لکھا کرتی تھیں پر آج اپنی تحریری صلاحیتیں اسکرپٹ رائٹنگ پر صرف کر رہی ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو اور ہماری پیاری باہنر اور باصلاحیت سیما مناف افسانہ نگاری کی جانب واپس لوٹ آئیں، آمین۔ آج کی محفل سیما کے

نام..... تو آئیں قارئین انکشافات سے پُر اور خاصی دلچسپ بات چیت کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧ ......جی جناب آج ہم آپ کو پروڈکشن ہاؤس سے بالآخر کھینچ ہی لائے، کیا کہیں گی اس بارے میں؟

سیما مناف ❖ ......بہت شکریہ نزہت......اس



محبت وعنایت کا...... پروڈکشن ہاؤسز سے تو میرا تعلق بہت بعد میں بندھا ہے، لوگوں کے سامنے میری پہلی پہچان ڈائجسٹ رائٹر کی ہے۔ (بہت خوب، بالکل درست کہا)

پاکیزہ ✧ ......ارے بھئی کھینچ لانا تو محاورتاً کہہ دیا برا مت منایئے گا، ہم نے تو اپنی بزم کو رونق بخشنے کے لیے آپ کو باقاعدہ مدعو کیا ہے ٹھیک ہے ناں......؟

سیما مناف ❖ ......لیجیے اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے، یہ تو عزت افزائی ہے میری۔

پاکیزہ ✧ ......جی تو اب سوال پر سوال ہوتا جائے گا آپ تیار ہیں ناں......؟

سیما مناف ❖ ......جی میں بالکل تیار ہوں آپ کہیے۔ (شکریہ جی!)

پاکیزہ ✧ ......ماشاء اللہ آج آپ جانی پہچانی اور نہایت مصروف اسکرپٹ رائٹر ہیں، کیسا لگتا ہے؟

سیما مناف ❖ ......اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور میری امی کی دعائیں ہیں...... میں اللہ کی بہت شکرگزار ہوتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی عزت دی ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے جب لوگ ایک کامیاب رائٹر کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں......لیکن اس میں میرا کوئی کمال نہیں، سب اس رب کی مہربانی ہے۔ (جی یہ تو ہے، یہ سب رب کی دی ہوئی صلاحیتیں ہیں)

پاکیزہ ✧ ......بھئی ڈائجسٹ اور رسالوں کی دنیا سے تو آپ بظاہر دور ہوگئی ہے ناں اب تو پروڈکشن ہاؤسز، پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، ایکٹرز اور ناظرین تو ایسے میں قارئین کی یاد نہیں آتی؟

سیما مناف ❖ ......بالکل آتی ہے، جب میں صرف ڈائجسٹ رائٹر تھی اور لوگ میرے افسانوں کو سراہتے تھے، تب بھی اچھا لگتا تھا، کبھی کسی افسانے یا ناولٹ کی اگلے مہینے تعریف ہوتی تو دل بڑا ہو جاتا تھا۔ میرا ناول بہاراں ہے، جو پاکیزہ میں قسط وار شائع ہوا اور اسے لوگوں نے بے حد سراہا۔ بعد میں اس پر میرا ڈراما میرا یقین بنا جو میرا ایک کامیاب ڈراما کہلاتا ہے۔ تو یہ میرے قارئین کی پسندیدگی تھی جس نے اسے کامیاب بنایا۔

پاکیزہ ✧ ......رسالوں کے لیے لکھنا جو چھوڑ دیا تبھی تو پوچھ رہے ہیں اسکرین کی دنیا اتنی بھا گئی؟

سیما مناف ❖ ......میں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ میں لکھنا چھوڑ ہی نہیں سکتی، ہاں بس میڈیا تبدیل ہوگیا ہے۔ (جبھی تو رسالوں کے لیے لکھنے کی بات کی تھی ڈیئر)

پاکیزہ ✧ ......اس کا مطلب ہے آپ بڑی اسکرین کے لیے بھی بہت جلد لکھیں گی......کوئی آفر ہے؟

سیما مناف ❖ ......ہاں ایک بار آفر ہوئی تھی سرسری سی......لیکن ابھی میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی فلم کا اسکرپٹ ایک الگ فارمیٹ ہے... مستقبل کا کہہ نہیں سکتی، اگر کوئی اچھی آفر ہوئی تو شاید کوشش کرڈالوں (جی ضرور)

پاکیزہ ✧ ...... سیما چلیں ذرا اپنے لکھنے کا نقطہ

آغاز تو ہمارے قارئین سے شیئر کریں۔ کب پہلی تحریر لکھی؟

سیما مناف ❖......میں نے پڑھنا تو بہت بچپن میں ہی شروع کر دیا تھا۔ گھر میں کتابوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ادبی، مذہبی ہر طرح کی کتابیں گھر میں موجود تھیں۔ گھر میں بچوں اور بڑوں کے کم وبیش دس بارہ رسائل ہر ماہ آیا کرتے تھے۔ امی کو پڑھنے کا بہت جنون تھا۔ بس پڑھ، پڑھ کر لکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ فرسٹ ائیر میں تھی تو پہلا افسانہ لکھا۔ جو بعد میں پڑھا تو بہت برا لگا۔ لیکن پھر لکھتی رہی جمع کرتی رہی اور بی اے فائنل کرتے ہی پہلا افسانہ شائع ہوا۔ (بہت خوب، پھر تو ماشاء اللہ سلسلہ چل پڑا)

پاکیزہ ✧......اس قلمی سفر میں کیا، کیا مشکلات پیش آئیں کوئی ایک دو یادگار لمحے بتائیں؟

سیما مناف ❖......اللہ کا شکر کوئی بھی مشکل پیش نہیں آئی......گھر کا ماحول بہت ادبی تھا، سب بہن، بھائیوں اور امی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ عقلمندی یہ کی کہ پہلا افسانہ ہی لکھ کر فوراً شائع ہونے نہیں بھیج دیا......بلکہ بار، بار لکھتی رہی......میں اپنی تحریروں کی بہترین نقاد تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ابھی اس قابل نہیں ہے۔ پھر دوشیزہ ڈائجسٹ کو پہلا افسانہ بھیجا جس کا عنوان تہی داماں تھا اور جب وہ پہلا افسانہ ہی شائع ہوگیا تو بتا نہیں سکتی، پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پورے گھر میں شور مچا کر اپنی یہ خوشخبری سب کو سنائی اور سارے گھر والے میری اس خوشی میں خوش تھے۔ (بالکل جی، سب کا یہی حال ہوتا ہے)

پاکیزہ ✧......رسالوں میں لکھتے لکھتے ڈراما نگاری کی طرف کیونکر دھیان گیا؟

سیما مناف ❖......کبھی، کبھی کوئی ڈراما دیکھنے بیٹھتی تو بہت اچھا لگتا، رائٹر کو سراہتی۔ لیکن کچھ ڈرامے دیکھ کر مجھے لگتا......بغیر کسی میسج کے کیسے یہ ڈراما آن ائیر ہوگیا......پھر مجھے لگا میں بھی لکھ سکتی ہوں......مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے، سو کر ڈالی۔ (ماشاء اللہ کوشش کامیاب رہی)

پاکیزہ ✧......کیا اس کامیابی کی دوڑ میں کسی نے آپ کا ساتھ دیا؟

سیما مناف ❖...... جی بالکل ڈائجسٹ میں لکھتے وقت میری امی میری بہترین ناقد تھیں۔ مجھے گھر میں لکھنے کا ماحول فراہم کرتی تھیں آج اس کامیابی کے وقت وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ وہ ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ میرے بہنوئی انور علی رومی بھائی نے میرے افسانوں کو ڈائجسٹ کے اداروں تک پہنچانے کی ذمّے داری لی ہوتی تھی۔ پھر میرے شوہر جاوید نے بھی یہ ذمّے داری بڑی خوش اسلوبی سے اٹھائی



اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ڈراموں کی دنیا میں پہلے قدم پر میرا ساتھ میری دوست رفعت سراج نے دیا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے مجھے نور الھدیٰ شاہ کے پاس بھیجا...... جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا...... نور نے مجھے ہم ٹی وی کے فصیح باری خان کے پاس بھیجا، جہاں سے فصیح نے مجھ سے قصوں کی چادر کے لیے ایک سنگل پلے گھٹن لکھوایا۔ فصیح نے بھی اسکرپٹ رائٹنگ میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں مستقبل میں آپ کو ایک کامیاب رائٹر کی صورت میں دیکھ رہا ہوں...... اور سب سے آخر میں، میری جان سے عزیز دوست ''ماہا ملک'' جسے آپ ایک کامیاب رائٹر کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نے مجھے مشہور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بابر جاوید کے پاس بھیجا...... جہاں سے میرا پہلا سوپ سیریل ٹوٹے ہوئے پر پیش کیا گیا۔ پھر بس آگے کا سفر شروع ہوگیا۔

پاکیزہ ✧...... تو پھر واپس افسانے اور ناول کی دنیا میں کیوں نہ آپائیں؟

سیما مناف ❖...... بس ڈراما رائٹنگ میں بےانتہا مصروف ہونے کے باعث ٹائم ہی نہیں مل پاتا لیکن افسانہ نگاری کا ایک الگ حسن ہے، کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے لیے وقت نکالوں۔

پاکیزہ ✧...... ہم نے تو مختلف النوع آرا، تجربات اور خیالات اسکرپٹ رائٹنگ کے حوالے سے سن رکھے ہیں۔ مثلاً آئیڈیا یا پلاٹ چرالینا، بلاوجہ آپ کے خیال کو رد کر کے کسی اور سے ذرا سی تبدیلی کر کے لکھوالینا وغیرہ، وغیرہ......

سیما مناف ❖...... بالکل میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ جب میں ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئی تھی۔ فصیح باری خان نے مجھے ہم ٹی وی بلایا، انہیں مجھ سے کوئی ٹیلی فلم لکھوانی تھی۔ میں نے جب انہیں اسٹوری بتائی تو وہ حیران رہ گئے۔ ایک مشہور ڈراما رائٹر نے ان کو اس پر ٹیلی فلم لکھ کر دی تھی۔ فصیح نے انہیں فون کیا تو انہوں نے معصوم بن کر کہا کہ مجھے یہ کہانی کسی نے سنائی تھی۔ فصیح نے ان سے کہا کہ یہ تو سیما مناف کے ایک ایسے افسانے پر ہے جسے ایوارڈ ملا ہے۔ فصیح اور موبل شنید نے اس ڈرامے کو فوراً رکوایا جس پر میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔ بعد میں، میں نے اس کہانی پر ڈراما بے خودی لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح میرے دو افسانوں پر دو مشہور رائٹرز نے سیریل بنالیے۔ دونوں بہت پسند کیے گئے اور میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ مجھے لوگوں نے بہت اکسایا کہ تم اس بارے میں اخبار میں لکھو لیکن میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے صبر کرلیا۔ لیکن لوگوں کی ہمت پر مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسے یہ چوری اتنے دھڑلے سے کرلیتے ہیں (ارے بیچاری بہت سی رائٹرز نے یہ شکایت کی ہے)

پاکیزہ ✧...... آپ کا ذاتی تجربہ کیا کہتا ہے؟ اگر تو تلخ ہے تو پھر ڈائجسٹ رائٹرز کو وہاں نہیں جانا چاہیے کیوں ٹھیک ہے ناں؟

سیما مناف ❖...... اپنا تجربہ میں بتا چکی ہوں، یہاں بہت کچھ ہو رہا ہے لیکن ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے لیکن ضمیر میں بھی تو ایک عدالت لگتی ہے۔ کیا اس میں بھی وہ لوگ خود کو اتنی آسانی سے بری کر دیتے ہیں؟ (ضمیر صاحب کو سلیپنگ پلو پر رکھا جاتا ہے)

پاکیزہ ✧...... ویسے کمرشلائزیشن تو ہر شعبے میں ہے اور معاشی طور پر مضبوط سے مضبوط تر ہونا ہر ایک کا حق ہے مگر اندھا دھند دوڑنا کیا کہلاتا ہے؟

سیما مناف ❖...... دیکھیں کرپشن بھی تو ہر شعبے میں ہے اور ہم کسی کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، معاشی طور پر بھی مضبوط ہونا ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے لیکن اس کے لیے ہر جائز ناجائز طریقہ استعمال کرنا بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے تو آج ہمارا ملک اس نہج پر پہنچ گیا ہے۔ اس کی روک تھام اور پکڑ ہونی چاہیے۔ (سیما اگر اپنی ذات میں ہم خود راست باز ہوں تو آگے ان برائیوں کی نوبت ہی نہیں آئے، ہر کوئی اپنا احتساب خود ہی کرلے)

پاکیزہ ✧...... اچھا یہ بتائیں کہ ماہناموں اور رسالوں سے شہرت پانے والے آج ڈائجسٹ میں واپس



سیما مناف کی اپنے بچوں، شوہر و دیگر اعزا کے ہمراہ بھرپور سیلفی

آنے سے کیوں جھجکتے ہیں؟

سیما مناف ❖ ......جی...... اس کی ایک وجہ شاید معاوضے کی بے حد کمی بھی ہے۔ اس کو بہتر بنایا جانا چاہیے تاکہ اچھے رائٹر ڈائجسٹوں میں بھی اسی خوشی سے لکھیں۔ صرف شہرت سے کسی بھی ادیب کا پیٹ نہیں بھر سکتا...... نہ ہی وہ اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ (ڈیئر اب تو وہ ٹی وی سے بھی اتنا کمار ہا ہوتا ہے تو ڈائجسٹ جو اس کی پہلی درس گاہ ہے تو اس سے تو اتنا ڈیمانڈنگ نہیں ہونا چاہیے ناں......!)

پاکیزہ ✧ ......چلیں اگر اسی نہج پر گفتگو ہوتی رہی تو کافی تلخ بھی ہوسکتی ہے آپ بتائیں اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کی بھی ڈرامائی تشکیل کی کہ نہیں؟

سیما مناف ❖ ......جی ہاں میرے دونوں ناول جو پاکیزہ میں ہی شائع ہوئے ان پر ڈراما ''کہر'' اور ''میرا یقین'' بن چکے ہیں اور میرے کافی ناولٹ اور افسانوں پر بھی ڈراما سیریل بن چکے ہیں۔ سمجھیں چلے ہوئے کارتوس چلا رہی ہوں۔ (اوہ یہ تو آپ نے خود ہی کہہ دیا)

پاکیزہ ✧ ......کتابی شکل میں بھی آپ کی تحریریں آئیں؟

سیما مناف ❖ ......جی ہاں میرے دونوں قسط وار ناول بہاراں ہے اور کہر میں کرن، کتابی شکل میں آچکے ہیں۔

پاکیزہ ✧ ......آپ نے اتنا لکھا تو اس میں یکسانیت بھی آہی گئی ہوگی، کس طرح ہر کہانی کو منفرد رکھنے کی کوشش کرتی ہیں؟

سیما مناف ❖ ......کوشش تو کرتی ہوں کہ یکسانیت نہ آئے۔ کیونکہ میں کہانیاں عموماً اپنے مشاہدے اور قریبی لوگوں سے ہی لیتی ہوں۔ میرے کردار مافوق الفطرت نہیں ہوتے اسی دنیا سے ہوتے ہیں۔ (ویسے اب پریوں اور جنوں پر بھی کہانیاں ہونی چاہئیں)

پاکیزہ ✧ ......پاکیزہ سے ناتا کب جڑا......؟

سیما مناف ❖ ......پاکیزہ سے میرا ناتا میری لکھاری دوست دلشاد نسیم کے کہنے سے جڑا...... میں نے ان دنوں دوسرے رسالوں میں ہی لکھا تھا۔ دلشاد نے مجھے مشورہ دیا کہ تمہیں پاکیزہ میں بھی لکھنا چاہیے۔ یہ لوگ معاوضہ بھی اچھا دیتے ہیں اور پاکیزہ کا ایک نام ہے۔ میں نے اپنا ایک افسانہ ''دریچوں میں چاندنی بھی نہیں'' پاکیزہ میں بھیجا جو اگلے ہی ماہ دسمبر 1989ء میں شائع ہو

گیا پھر پاکیزہ سے ایک مضبوط تعلق بن گیا۔ (بہت شکریہ یہ تعلق بنانے کا اور نبھانے کا)

پاکیزہ ✧......چلیں اب مطالعہ تو رہتا ہی ہوگا۔ پاکیزہ کے متن و مضامین پر کیا کہیں گی؟

سیما مناف ❖......کافی عرصے سے کسی ڈائجسٹ میں نہیں لکھا اس کے باوجود پاکیزہ مجھے آج بھی اسی طرح ملتا ہے۔ جس کے لیے میں عذرا رسول کی شکر گزار ہوں، پاکیزہ کے افسانے اور مضامین منفرد ہوتے ہیں۔ اور یقیناً ان سے قارئین بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......اپنے طالب علمی کے دور کی کوئی خوشگوار یاد، کوئی نا قابلِ فراموش، واقعہ؟

سیما مناف ❖......ہائے......کیا یاد دلا دیا نزہت......میں نے اسکول اور کالج میں بہت فعال زندگی گزاری ہے۔ ڈرامے، ٹیبلو، نعت خوانی، بیت بازی کوئی شعبہ نہیں چھوڑا۔ ہمارا سات لڑکیوں کا گروپ تھا کالج میں...... فرزانہ، شاہین، عذرا، شبانہ، عائشہ، صبیحہ اور میں......شرارتی ٹولا مشہور تھا ہمارا...... مجھے اسکول اور کالج دونوں کی فیئر ویل پارٹی میں شرارتوں پر ٹائٹل ملے......آج سب سہیلیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ بہت یاد آتی ہیں، ان میں سے چار تو ملک سے باہر ہیں۔ باقی کہاں ہیں پتا نہیں وہ شاید آج یہ پڑھ کر رابطہ کریں......لیکن ان دوستوں کی کمی آج میری رائٹرز دوستوں سے پوری ہو جاتی ہے۔

پاکیزہ ✧......اپنے مشاہدے، تجربے، کس حد تک اپنی تحریر میں ڈالے؟ اور اب ڈراموں میں بھی اپنے اردگرد کا ماحول کس حد تک نمایاں کرتی ہیں؟

سیما مناف ❖......میں ذاتی مشاہدے، انسانی نفسیات، لوگوں کے رویّوں، اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر ہی لکھتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم سب گھر والے پکنک پر گئے تھے۔ اپنی بھانجی حرا کے کہنے پر میں نے اس کے لیے ریت سے ایک گھروندا بنایا تو اس میں کھڑکیاں بنانا بھول گئی۔ وہ اس وقت محض چھ، سات سال کی ہوگی کہنے لگی ''کاکا! آپ نے اس گھر میں کھڑکیاں تو بنائی ہی نہیں......اس میں تو جو رہے گا اس کا تو دم ہی گھٹ جائے گا۔'' میں اتنی چھوٹی بچی کے منہ سے یہ بات سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ پھر میں نے اس بات سے متاثر ہو کر ایک افسانہ بند کھڑکیاں لکھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ہما کوکب بخاری نے اس افسانے کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ عُنوان اتنا منفرد تھا کہ میں پڑھنے پر مجبور ہوگئی اور افسانے کے اختتام پر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا واہ......'' میرے اس افسانے کا موضوع بھی یہی تھا کہ عورت کے لیے گھر بنا دینا کافی نہیں ہوتا اسے تازہ ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل میں ہم ٹی وی کے لیے اس پر ایک سیریل لکھ رہی ہوں اور انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ اپنے بچپن میں اتنی گہری بات کرنے والی میری جان سے پیاری بھانجی کا صرف 30 سال کی عمر میں برین ہیمبرج سے ڈھائی سال پہلے انتقال ہوگیا۔ صرف بند کھڑکیوں کی وجہ سے۔ (اوہو، بہت افسوس ہوا جان کر)

پاکیزہ ✧......سنا ہے رائٹرز...... پروڈیوسر اور فنانسرز کے ہاتھوں یوں مجبور ہوتے ہیں کہ وہ جو چاہیں لکھوائیں؟ کیا ایسا ہی ہے؟

سیما مناف ❖......نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے لکھتی ہوں جس کہانی پر میرا دل و ذہن رضا مند نہ ہوا سے مجھ سے کوئی نہیں لکھوا سکتا۔ ہاں میرے دو ڈراموں کے ساتھ ایسا ہوا کہ ان کو بڑھانے کے لیے اس میں مزید سینز (scencs) ڈالے گئے۔ جس پر میں بہت خفا ہوئی اور پھر اس پروڈکشن ہاؤس کے معافی مانگنے اور یہ یقین دہانی کرانے پر راضی ہوئی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجبوری یہ ہے کہ رائٹر کے پاس کوئی کاپی رائٹ کا حق نہیں ہے۔ (آپ سب رائٹرز مل کر کچھ سوچیں ناں مگر......آہم مم مم)

پاکیزہ ✧......آج آپ کے ڈرامے گھر والے کتنے شوق سے دیکھتے ہیں اور تنقید کتنی کرتے ہیں؟

سیما مناف ❖......میرے ڈرامے شروع، شروع میں میرے گھر والوں اور بہن، بھائیوں نے بہت شوق سے دیکھے......پانچ ڈراموں تک یہ سلسلہ چلا کہ پہلی قسط پر میرے بہن، بھائی تحائف اور مٹھائی وغیرہ لے کر وہ



ماشاءاللہ سدا سلامت رہے یہ جوڑی، آمین

قسط میرے ساتھ ہی دیکھتے تھے۔ چند سسرال والے، میری خالہ اور میرے کزنز نے بھی تحائف دیے پھر لوگوں کے لیے یہ ایک عام سی بات ہوگئی لیکن میرے شوہر جاوید آج بھی میرے ہر نئے ڈرامے کی پہلی قسط والے دن میرے لیے کیک اور بکے لاتے ہیں۔ دونوں بیٹوں نے صرف ٹوٹے ہوئے پر کی چند اقساط دیکھی تھیں.....تنقید کا تو پتا نہیں ہاں سب ہی تعریف کرتے ہیں۔ شاید منہ دیکھے ہ.....ہاہاہا.....(اچھا ایسا ہے)

پاکیزہ ✧.....انسان کی فطرت ہے تنقید مشکل سے برداشت کرتا ہے.....آپ کیا کہتی ہیں؟

سیما مناف ❖.....نہیں میں ہر تنقید بہ آسانی برداشت کرلیتی ہوں.....بشرطیکہ وہ واقعی تعمیری تنقید ہو۔ جیسے میرے ڈرامے بے خودی..... پر شروع میں ہی تنقید ہونے لگی کہ سیما مناف کو کیا ہوگیا۔ ایک rapist کو رومینٹک ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ میرا کہنا ہے کہ جب تک اس کا اینڈ نہ ہوجائے اس پر تنقید کرنا بالکل بھی جائز نہیں اور جب بے خودی ختم ہوا تو تعریفوں کے انبار لگ گئے۔ لوگوں نے اس ڈرامے کو لکھنے کا میرا مقصد سمجھ لیا تھا۔ اللہ کی حدود کو پار کرنے والے کی سزا اسی دنیا میں شروع ہوجاتی ہے۔ اس لیے ایسے ناقدین سے میری گزارش ہے کہ تھوڑا صبر سے کام لیا کریں۔ اور آخر تک اسے دیکھ کر تنقید کریں۔ (مگر بیچارہ رائٹر بھی تو صبر کا پیمانہ لبریز نہ کروائے ناں ڈیئر!)

پاکیزہ ✧.....تنقید برداشت نہ کرنے والے کس طرح بہتری کی راہ کی طرف جاسکتے ہیں؟

سیما مناف ❖.....تنقید اگر تعمیری ہو تو ضرور برداشت کرنی چاہیے، اس سے بعض مرتبہ ہم اپنی تحریروں میں بہت بہتری لے آتے ہیں (جی ہاں، بالکل)

پاکیزہ ✧.....ڈیئر سیما شاید پہلی دفعہ آپ اتنا تفصیلی انٹرویو دے رہی ہوں گی تو سوالات تو مختلف نوعیت کے ہوں گے.....کیسا لگ رہا ہے؟

سیما مناف ❖.....بہت اچھا لگ رہا ہے، بہت دوستانہ انداز میں بہت خوب صورت سوالات کا جواب دینا۔ بہت سی ایسی باتیں میں جو میں اپنے دوستوں، اپنے گھر والوں اور اپنے پڑھنے والوں سے کرنا چاہتی تھی، اس انٹرویو کے ذریعے کررہی ہوں۔ اس کے لیے بہت شکریہ ڈیئر نزہت.....! (آپ کا بھی شکریہ مصروفیات سے وقت نکالنے کا اور ہمارے تیکھے سوال برداشت کرنے کا)

پاکیزہ ✧.....اچھا دوستی کے بارے میں بات ہوجائے آج بھی نوجوانی کی دوستیاں، ناتے قائم ہیں؟

سیما مناف ❖..... دوستی ایک بہت مضبوط رشتہ ہے لیکن دوستی کبھی یکطرفہ نہیں ہوتی اور دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا.....ہاں میرے بہت سے پرانے دوست ابھی تک رابطے میں ہیں۔

پاکیزہ ✧.....آج آپ اپنی اس مصروفیات

میں گھر والوں کو رشتے داروں کو اور دیگر ملنے جلنے والوں کو کس حد تک وقت دے پاتی ہیں؟

سیما مناف ❖ ...... مجھے لوگوں سے ملنا جلنا اچھا لگتا ہے۔ میں رشتے داروں، دوستوں سب سے ملتی رہتی ہوں۔ مصروفیت اپنی جگہ، لیکن رشتے بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ (جی ...... یہ تو ہے انہی سے تو ہمیں ہمت ملتی ہے)

پاکیزہ ✧ ...... پُرخلوص اور سچے دوست کی کیا تعریف ہے؟

سیما مناف ❖ ...... وہ دوست جس سے آپ اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک، بنا کسی خوف کے کرسکیں۔ جو آپ کی خوشی میں خوش ہو اور آپ کے کڑے وقت میں آپ سے کندھا ملا کر کھڑا ہو اور جس سے بات کر کے آپ کو لگے کہ ماحول کی ساری گرانی، خوشگوار ماحول میں تبدیل ہوگئی ہے۔ (واہ کیا خوب صورت وضاحت کی ہے)

پاکیزہ ✧ ...... اچھا تو ان خصوصیات پر ہم خود بھی اپنے آپ کو پرکھتے ہیں؟ یا صرف توقعات ہی رکھے چلے جاتے ہیں؟

سیما مناف ❖ ...... ٹھیک کہا آپ نے ...... ہم لوگوں سے تو توقعات رکھ لیتے ہیں اور خود ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتے۔ لیکن میرے دوست احباب اس بات کے گواہ ہیں کہ میں ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ ان کی توقعات پر پوری اتروں ...... کہیں انجانے میں کوئی کوتاہی ہوجائے تو اس کے لیے پیشگی معذرت ......

پاکیزہ ✧ ...... سیما مناف ایک افسانہ، ناولٹ، ناول نگار اچھی ہے یا ایک ڈراما رائٹر ...... آپ خود کو کیا سمجھتی ہیں؟

سیما مناف ❖ ...... اس کا جواب تو میرے قارئین اور ناظرین ہی دے سکتے ہیں، میں خود سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ (چلیں یہ قارئین سے پوچھ لیتے ہیں)

پاکیزہ ✧ ...... اپنی کچھ ذاتی پسند ناپسند سے بھی آگاہ کریں؟ مثلاً پسندیدہ کھانا، خوشبو، ذائقہ، کتاب، کوئی یادگار جملہ، کوئی شعر وغیرہ، وغیرہ ......

سیما مناف ❖ ...... کھانے میں سب کچھ صبر و شکر سے کھالیتی ہوں ...... ویسے تمام سبزیاں، تمام دالیں اور بیسن سے بنی ساری چیزیں پسند ہیں۔ اس کے علاوہ چائنیز، خوشبو، موتیا کے پھول کی عشق کرنے کی حد تک پھول بھی موتیا کا، لباس شلوار قمیص دوپٹا، تمام پہاڑی مقامات، موسم برف باری اور بارش کا، رشتے سب پیارے ہوتے ہیں اگر وہ سچے ہوں ...... لیکن ماں کی محبت کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا ...... کتاب قرآن سے بہتر کون سی کتاب ہوسکتی ہے۔ اسے درست تجوید، ترجمہ اور تفسیر سے پڑھیں کہ یہی اس کا حق ہے۔ اس کے علاوہ ادبی کتابوں کی ایک لمبی لائن ہے۔ خلیل جبران کی ٹوٹے ہوئے پر، صدیق سالک کی یاراں دوزخ، اور مشتاق احمد یوسفی کی آب گم وغیرہ، شاعری میں احمد فراز، فیض، ابن انشا، پروین شاکر بہت پسند ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ کوئی بھی اچھا شعر صرف ان کا ہی ہو۔ کوئی بھی شعر کسی بھی وقت اچھا لگ سکتا ہے۔ شعر تو اتنے یاد ہیں کہ آپ کا پورا ڈائجسٹ ختم ہوجائے گا۔ شعر ختم نہیں ہوں گے۔ بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہوں ناں (ارے کوئی ایک شعر تو سنا دیتیں)

پاکیزہ ✧ ...... اچھا خود بھی دیگر ٹی وی ڈرامے دیکھتی ہیں یا بس لکھتی ہی رہتی ہیں؟

سیما مناف ❖ ...... نہیں جو بھی اچھا ڈراما ہو میں بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ خلیل الرحمٰن قمر اور عمیرہ احمد میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ پہلے اشفاق احمد اور حسینہ معین کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی۔

پاکیزہ ✧ ...... آخری پاکستانی، مووی کب اور کون سی دیکھی؟

سیما مناف ❖ ...... ہر فلم نہیں لیکن کوئی بہت اچھی فلم ضرور دیکھتی ہوں جو بس دل کو اچھی لگ جائے لیکن فی زمانہ ایسی اچھی فلمیں بن نہیں رہی ہیں۔

پاکیزہ ✧ ...... کیا کبھی اس غرض سے بھی کچھ دیکھتی ہیں کہ کوئی نیا آئیڈیا مل جائے؟

سیما مناف ❖ ...... نہیں کبھی سوچ کر تو ایسا نہیں کیا کیونکہ میرے لکھنے کا ایک اپنا انداز ہے ...... اور میں اس ڈگر سے ہٹ کر دوسروں کو کاپی نہیں کرسکتی۔

پاکیزہ ✧ ......اپنی فیملی کا بھی مختصر تعارف کروائیں؟

سیما مناف ❖ ......جاوید مسعود میری زندگی کے ساتھی ہیں اور میرے بہترین دوست، میرے دو بیٹے ذوہیب اور طہٰ ہیں۔ دونوں شکاگو امریکا میں زیرِ تعلیم ہیں، ہماری چھوٹی سی فیملی میں بہت یگانگت ہے۔ بچوں کے دور جانے سے زندگی بہت ٹھہر گئی ہے لیکن جب ہم ان سے ملنے جاتے ہیں تو یقین کریں پتا نہیں چلتا وقت کیسے بیت گیا......ہم چاروں میں بہت دوستی ہے اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت انجوائے کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧ ......بچپن کی یادیں، باتیں، شرارتیں، کوئی ایک ہم سے بھی شیئر کریں؟

سیما مناف ❖ ......بچپن میں بہت شرارتیں، کزنز اور دوستوں کے ساتھ کیں۔ ہم سارے کزنز ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ خوب انجوائے کرتے تھے۔ مجھے آج تک جنوری کی وہ یخ بستہ رات یاد ہے جب ہم سب چھت پر فولڈنگ بیڈ بچھا کر لحاف اوڑھے کھلے آسمان کے نیچے باتیں کررہے تھے۔ رات دو بجے ارادہ کیا کہ آئس کریم کھائی جائے۔ سب اسٹوڈنٹ تھے۔ بڑی مشکل سے پیسے جمع ہوئے۔ میرا کزن لالی اور گڈو آئس کریم لے کر آئے اور ہم نے دانت بجاتے ہوئے وہ آئس کریم کھائی......سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ آج ہمارے بچے یہ حرکت کریں تو ہم انہیں کتنا ڈانٹیں گے۔ جاوید کو یہ واقعہ ایک دن سنایا تو انہوں نے فوراً کہا تم لوگ پاگل ہی تھے۔

پاکیزہ ✧ ......جب آپ رسالے میں لکھتی تھیں تو کیا موضوعات چنتی تھیں اور اب ڈرامے میں کیا فوکس کرتی ہیں؟ ظاہر ہے دونوں فیلڈز میں فرق ہے آپ اپنے تجربے کے حوالے سے واضح کیجیے؟

سیما مناف ❖ ......میں جب ڈائجسٹوں میں لکھتی تھی تب بھی میرا موضوع رشتے ہوا کرتے تھے اور آج بھی میں رشتوں کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میرے کردار ہمیشہ اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ مافوق الفطرت نہیں۔

پاکیزہ ✧ ......پڑھنے میں کیا ترجیح رکھی مطلب مطالعہ تو آج بھی کرتی ہوں گی؟

سیما مناف ❖ ......ہاں مطالعہ کیے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی۔ اچھی ادبی اور مذہبی کتابیں اور رسائل ہمیشہ میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ لیکن جب سے قرآن پاک کو ترجمے اور تفسیر سے پڑھنا شروع کیا سب کچھ پیچھے رہ گیا۔ قرآن زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے یقین کریں ایک مرتبہ اسے سمجھ کر پڑھنا شروع کردیں۔ پھر کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ (جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ ✧ ......اپنی ہم عصر رائٹرز زرابطے میں رہتی ہیں یا اب بس ڈراما نگاران سے ہی دوستی ہے؟

سیما مناف ❖ ......میری ہم عصر رائٹرز تو میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم سب اکثر کہیں نہ کہیں جمع ہونے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ سب اتنی پیاری ہیں۔ سب سے مل کر میں ذہنی طور پر فریش ہوجاتی ہوں۔ صبیحہ شاہ، عذرا رسول، منزہ سہام، غزالہ رشید، شائستہ عزیز، سیما رضا، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، عقیلہ حق، دلشاد نسیم، انجم انصار، فرزانہ آغا میری بہت اچھی دوستیں ہیں۔ جن سے رابطہ رہتا ہے۔ (کسی کا نام لینا بھول گئی ہوں تو معذرت) کئی ڈراما رائٹرز سے بھی اچھی بات چیت ہے۔ لیکن میری جانِ عزیز دوست ماہا ملک ہے جسے میں مصروفیت یا کسی اور وجہ سے فون نہ کرپاؤں تو چوتھے دن مجھے یقین ہوتا ہے کہ اس کا فون ضرور آجائے گا اور یقین کریں آجاتا ہے۔ وہ جتنی اچھی رائٹر ہے اتنی ہی پیاری شخصیت اور خوب صورت دل کی مالک ہے۔ میری راز دار، غمگسار اور ہمدرد بے حد پیاری سی دوست، جس سے دوستی کو فقط آٹھ سال بیتے ہیں لیکن لگتا ہے، ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔ اللہ اس دوستی کو ہمیشہ قائم رکھے، آمین۔ (اللہ ایسے دوست سب کو دے سیما) صبیحہ شاہ میں مجھے دوست سے زیادہ ایک بہن نظر آتی ہے۔ بہت ڈیسنٹ، مخلص اور محبتوں سے بھرپور، عذرا رسول کا کیا کہوں......جب سے ان سے دوستی ہوئی ان کی گرم جوشی اور محبت مجھے سرشار کردیتی ہے۔ اور جب وہ یہ

کہتی ہیں کہ سیما مناف تم سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے (بہت سی باتیں آف دی ریکارڈ ہیں) کیونکہ میں چاہتی ہوں ہماری دوستی کو نظر نہ لگے اور یہ دوستی ہمیشہ قائم رہے تو یقین کریں میں بے انتہا خوش ہو جاتی ہوں۔ منزہ سہام کیوٹ سی، بہت پیاری صورت والی ہنس مکھ لڑکی...... میری گڈ لک میں سرفہرست ہے۔ شائستہ عزیز اور میری دوستی جب ہوئی جب ہمیں ایک ساتھ پہلا ایوارڈ ملا...... اور یہ دوستی آج تک قائم ہے۔ اللہ اسے قائم رکھے، آمین۔ (بہت، بہت اچھا لگا پُرخلوص اور پیاری، پیاری دوستوں کے متعلق جان کر...... اللہ آپ کو اور ان سب کو صحت و سلامتی سے رکھے، آمین۔)

پاکیزہ ✧ ......نئی لکھنے والیاں کیسا لکھ رہی ہیں، آپ کوئی مشورہ، کوئی گُر انہیں بتائیں گی؟

سیما مناف ❖ ......اپنی جانب سے ہم سب ہی اپنا بیسٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں، نئے لکھنے والوں کو میں صرف یہ میسج دینا چاہوں گی کہ محنت کریں، ناکام بھی ہو جائیں تو بھی محنت اور کوشش کرتے رہیں۔ ہمیشہ سچ لکھیں، عام فہم لکھیں اور اپنی کہانی میں کوئی نہ کوئی معاشرتی یا مذہبی پیغام ضرور دیں، یقین کریں کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

پاکیزہ ✧ ......پاکیزہ کے لیے اپنے قیمتی خیالات، جذبات کا اظہار بھی کیجیے؟

سیما مناف ❖ ......پاکیزہ ایک صاف ستھرا جریدہ ہے جو بہت ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں نے سالوں پہلے ڈائجسٹوں میں لکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ آج تک مجھے اسی طرح ملتا ہے۔ اللہ اسے مزید کامیابی و کامرانی عطا کرے، آمین۔ (چلیں اب جلدی سے اپنی تازہ ترین تحریر سے بھی نوازیں ڈیئر سیما!)

پاکیزہ ✧ ......اپنے قارئین سے کیا کہنا چاہیں گی؟

سیما مناف ❖ ......ڈیئر قارئین و ناظرین......
آپ کی محبتیں ہی میرا سرمایہ ہیں۔ جب آپ لوگ میری کسی تحریر کو سراہتے ہیں، دل خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو خوش و خرم رکھے...... اور جب بھی کسی افسانے یا ڈرامے میں آپ کو کوئی مثبت پیغام ملے...... اسے ضرور اپنائیے۔ اللہ، اس کے رسول اور وطن سے محبت کیجیے...... اپنے گھر والوں کے لیے وقت نکالیے، اور بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیجیے...... حقوق اللہ کے ساتھ، ساتھ حقوق العباد کو کبھی نظر انداز نہ کریں، کسی کا حق کبھی نہ ماریں۔ اپنے ہر مسئلے کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کریں۔ زندگی کبھی آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ (بے شک)

پاکیزہ ✧ ......ہماری بزم میں آپ تشریف لائیں کیسا لگا یہاں آنا؟

سیما مناف ❖ ......بہت، بہت اچھا...... مجھے نہیں لگا کہ میں کوئی انٹرویو دے رہی ہوں۔ نزہت آپ کے سوالات بہت دلچسپ اور زندگی سے بھرپور تھے۔ (نوازش بہت، بہت) پاکیزہ کا شکریہ کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا اور اظہار کا موقع دیا۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ اٹوٹ ہے۔ عذرا ہمیشہ محبت سے مجھے بلاتی ہیں اور میں اسی محبت سے دوڑی چلی آتی ہوں جیسے آج چلی آئی۔ (دوڑتی ہوئی آئی تھیں۔ جبھی تقریب میں اول نمبر پر تھیں، ہے ناں......!)

☆☆☆

سیما مناف آپ کا بہت، بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو بھی ہیں کہ آپ کی یہ خوب صورت مصروفیات سدا آپ کو اور آپ کے چاہنے والوں کو محظوظ کرتی رہیں۔ ہمیں بہت ہی اچھا لگا سیما کہ آپ نے بھرپور جوابات دیے اور سیر حاصل باتیں ہوئیں۔

قارئین اب اجازت...... وقت اور صحت نے مہلت دی تو اگلے ماہ پھر یہ بزم سجائیں گے۔ سدا خوش رہیں اور اپنے پیاروں کو خوش رکھیں، آمین!

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

جانے انجانے میں سرزد ہونے والی سالِ رواں کی دلچسپ غلطی یا حماقت

شائستہ زریں

یہ بجا کہ بسا اوقات انسان اپنی غلطیوں اور حماقتوں سے وہ سبق حاصل کرلیتا ہے جو علم و دانش کی کتابیں گھول کر پینے کے باوجود نہیں سیکھ سکتا۔ غلطیوں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں دانستہ غلطی، نادانستہ غلطی، سنگین غلطی، سادہ سی غلطی، بڑی غلطی، چھوٹی غلطی وغیرہ اور بعض غلطیاں تو ایسی دلچسپ اور معصومانہ ہوتی ہیں جو جب بھی یادوں کی دہلیز پر دستک دیتی ہیں تو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ ہم خواتین سے تو ایسی معصومانہ غلطیاں اکثر سرزد ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص اس وقت جب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام نمٹانا ہو، ذہن کئی سمتوں میں سفر کر رہا ہو یا ایک سے زائد کام ہاتھ میں ہوں اور وہ بھی باورچی خانے سے وابستہ امور...... ایسے میں خواتین کی ایسی ایسی بدحواسیاں منظرِ عام پر آتی ہیں کہ عام حالات میں وہ ان کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ گویا خواتین سے سرزد ہونے والی بیشتر حماقتوں اور غلطیوں کی آماجگاہ ان کے گھر کی رونق، جی ہاں باورچی خانہ ہی ہوتا ہے لیکن یہ مخصوص کلیہ نہیں، دلچسپ غلطی یا حماقت کہیں بھی سرزد ہوسکتی ہے۔ بنیادی شرط بروقت حواس بحال نہ رکھنا ہے۔

2017ء رخصت ہونے کو ہے۔ ہم نے سال بھر گاہے بگاہے مختلف موضوعات پر سروے رپورٹس پیش کیں۔ سال کا آخری مہینہ ہے ہم نے سوچا کیوں نہ رواں سال کو خوشگوار طریقے سے رخصت کریں۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے آپ کے لیے ایک دلچسپ سروے رپورٹ کا اہتمام کرکے خواتین سے معلوم کیا کہ......

سوال: سالِ رواں میں جانے انجانے میں آپ سے سرزد ہو جانے والی کوئی دلچسپ غلطی یا حماقت جو اب بھی یاد آجائے تو بے اختیار ہنسی آجائے؟

گویا سال کے آخری ماہ میں ادارہ پاکیزہ کی جانب سے مسکراہٹوں اور ہنسی کی سوغات پیشِ خدمت ہے۔ جب بات حماقتوں کی چل نکلی ہے تو کیوں نہ آغاز خود اپنی ہی کسی حماقت سے کرلیا جائے۔

کل ہی کی بات ہے۔ ظہر کی نماز پڑھ کے امی آرام کرنے کی نیت سے لیٹی تھیں۔ میں بھی امی کے برابر تخت پر لیٹ گئی۔ تخت فرش سے کافی اونچا ہے۔ اس خیال سے کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے امی.... بے آرام نہ ہوں، دونوں موبائل تخت کے نیچے بچھی چاندنی پر رکھ دیے۔ اور خود کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوگئی، یکایک موبائل ایک تسلسل سے پُرزور آواز میں بجنے لگا۔ موبائل کی آواز فوری بند کرنے کے لیے وہیں لیٹے، لیٹے میں نے موبائل اٹھانے کی کوشش کی اور پلٹ کر امی کو بھی دیکھنے لگی کہ امی کی آنکھ تو نہیں کھل گئی۔ امی کسمسا رہی تھیں۔ بدحواسی کے عالم میں چہرہ امی کی جانب اور میں ہاتھ نیچے کیے تخت کے نیچے سے موبائل اٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ کے ساتھ، ساتھ میں خود پوری کی پوری تخت کے نیچے تھی جلدی سے ہاتھ بڑھا کر موبائل بند کر کے امی کو دیکھا امی سوتی جاگتی کیفیت میں تھیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں موبائل کی آواز کم کردیتی۔ یا تخت سے اتر کر فوری موبائل کی آواز بند کر دیتی۔ مگر حواس ٹھکانے پر ہوتے تب ناں۔ (ہاہاہا)

اقبال بانو

(مصنفہ و اسکرپٹ رائٹر بول چینل)

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اور ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کبھی کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ غلطیاں تو بار، بار ہوتی ہیں۔ جیسے چند ماہ پہلے بازار میں بہت باریک چینی آئی



جیسا کہ نمک ہوتا ہے۔ میں نے بھی کوفتے کے سالن میں نمک ڈالنے کے بجائے چینی ڈال دی یعنی ہماری اس چھوٹی سی خطا سے کوفتوں کے مرچوں والے سالن میں مٹھاس بھی شامل ہوگئی۔ گزارہ اس لیے ہوگیا کہ نمک کم استعمال ہوتا ہے لیکن جب دو چار روز بعد چائے بنائی تو اس میں چینی کے بجائے جب نمک ڈال دیا تو سب کو پتا چل گیا کیونکہ وہ چائے پانچ چھ بندوں کے لیے بھیجی گئی تھی۔

اپنی کئی غلطیوں میں سے ایک اور غلطی یاد آرہی ہے۔ کچن میں تیل کی بالٹی کے اوپر موبائل رکھا اور جب کام کے دوران بالٹی کا ڈھکنا کھولا تو موبائل تیل کے ڈبے میں غوطہ کھا گیا۔ اورہمیں دن میں تارے نظر آگئے۔ کیونکہ اپنی حماقت سے میں موبائل سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ میری صرف ایک غلطی سے دل کے سارے ارمان تیل میں بہہ گئے۔ یہ ضرور کہوں گی کہ غلطیوں کی تو معافی ہوتی ہے لیکن زیادتیوں کی معافی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ایسی ہر خطا کو ہم سے دور رکھے، آمین

مسرت پرویز
(معلمہ)

تقریباً ایک ماہ قبل میں اور میری دوست عذرا کھانا کھانے باہر گئے۔ کھانے کے بعد جب ویٹر نے بل لاکر دیا تو میں نے بہت غور سے بل دیکھا۔ دوبارہ دیکھا پھر عذرا سے کہا کہ کتنا ہلکا پرنٹ کیا ہے کہ نظر ہی نہیں آرہا، عذرا نے دیکھا تو انہوں نے بھی میری تائید کی۔ ہم دونوں ہی پریشان حال، بل کو ہاتھوں میں لیے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اچانک میں نے بل کو پلٹا تو انکشاف ہوا کہ میں نے بل تو الٹا پکڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہمیں واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم دونوں کی نزدیک کی نظر کمزور ہے اور ہم دونوں ہی نے اپنے گلاسز اپنے، اپنے بیگ میں رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے گلاسز نکال کر بل پڑھا اور ادائیگی کر دی۔ لیکن یہ سوچ کر ہنس دی کہ ابھی میں ویٹر کو بلا کر کہنے ہی والی تھی کہ یہ کیسا بل ہے؟ کیسی خفت اٹھانی پڑتی۔ اگر اس سے کہہ دیتی تو؟ اب جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے یہ سوچ کر ہنسی آجاتی ہے کہ ہم دونوں کی نزدیک کی نظر تو زمانۂ طالبعلمی ہی سے خراب تھی کیا گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ ہماری نزدیک کی عقل بھی کمزور ہوگئی ہے جو گلاسز لگائے بنا پڑھنے کی غلطی کر ڈالی۔

فرحین اظفر
(قلمکار)

چھٹی کا دن تھا اور ہم اپنے میاں جی کے ساتھ سارا دن باہر کی خاک چھان کر تھکے ہارے گھر لوٹے تھے۔ تھکن سے یہ حالت تھی کہ اب گرے کہ جب، لہ تھکن دور کرنے کے لیے چائے کی طلب ستائی چائے بنانے کے دوران ہم نے دیکھا کہ اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر ہمارے سسر جنہیں ہم بابا جان کہتے ہیں انہاک سے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ جب ہم ان کے کمرے میں گئے تو یہ دیکھ کر ہمیں ایک جھٹکا سا لگا کہ...

ٹی وی تو وہاں تھا ہی نہیں، ہم نے از راہِ مذاق کہا بابا جان آپ تو ایسے بیٹھے ہیں جیسے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''ٹی وی ہی تو دیکھ رہا ہوں'' ان کا کہنا تھا کہ ہمارے مسکراتے ہونٹ لٹک گئے اور ہمارے منہ سے ہوائیاں ایسے اڑیں جیسے کھیر سے پستے' بادام کی ہوائیاں اڑ جاتی ہیں کیونکہ ٹی وی تو اپنی جگہ پہ تھا ہی نہیں اور ہم نے سامنے دیوار پر دیکھنے کی زحمت نہیں کی، بس چند لمحوں کی بات تھی ہم نے اپنے ننھے سے دماغ کا گھوڑا بحرِ ظلمات تک دوڑایا۔ یا اللہ بابا جان اتنے بھی ضعیف العمر نہیں، اُف کیا میں اتنا تھک گئی کہ مجھے ٹی وی نظر نہیں آ رہا۔ ہائے اللہ کسی نے ہم پر کچھ کر تو نہیں دیا؟ مجھے ٹی وی (شیطان کا ڈبا) نظر آنا ہی بند ہو گیا۔ ایک ٹی وی نظر نہ آنے کی وجہ سے ہم نے کہاں سے کہاں تک سوچ ڈالا تھا۔ ہم نے ایک بار پھر خالی ٹیبل کو دیکھا جس پر صبح گھر سے نکلتے وقت ہم ٹی وی چھوڑ کر گئے تھے۔ پھر بابا جان کو پھر ٹیبل کو۔ اگر ٹی وی نہیں ہے تو ٹی وی کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی ہماری نظر دیوار پر نصب LED پر پڑی۔ تو ہم نے سکھ کی سانس لی لیکن اس کے ساتھ ہی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا ہم نے اپنے ہونق پن میں اپنے سسر کو بھی حصہ دار بنا کر لطف اندوز ہونے کا... موقع دیا۔ اور بالآخر دل ہی دل میں شرماتے ہوئے اعتراف کیا یہ بابا جان کی عمر کا نہیں بلکہ ہماری عقل کا قصور ہے۔ وہ ایسی پاگل پن کی حرکت تھی جو اب بھی یاد آ جائے تو بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔

نگینہ ضیا بنگش
(مستقل تبصرہ نگار، گھریلو خاتون)

ایک ایسی دلچسپ غلطی ہوئی تھی جس کو یاد کر کے اب تو کیا میرے بچے اور ضیا بھی ہنستے ہیں۔ ہوا یوں کہ رمضان میں افطاری کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ اس دن شدید گرمی تھی۔ میں پکوڑے تل رہی تھی۔ میں نے مہرین سے کہا تم صحن میں جا کر فروٹ چاٹ بنا لو کیونکہ کچن میں بہت گرمی ہے۔ پکوڑے تلنے کے ساتھ، ساتھ میں جلدی، جلدی شربت بھی بنانے لگی تاکہ فریج میں رکھ دوں افطاری تک ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تو جناب جب افطاری میں شربت کا گھونٹ لیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے جلدی میں چینی کے بجائے نمک ڈال کر شربت بنا لیا۔ ضیا نے ساختہ ہنستے ہوئے کہا یہ تو اچھا ہوا دن بھر اتنا پسینہ بہہ جانے کے باعث جسم سے نمکیات کی کمی بھی ہماری بیگم نے پوری کر دی اور وہ بھی ایک پل میں۔

سیدہ انیس زہرا
(براڈکاسٹر)

ہماری عادت ہے کہ گھر واپس آ کر بیگ سے چیزیں نکال کر رکھ تو دیتے ہیں لیکن واپس رکھنا بھول جاتے ہیں، عموماً پاؤچ۔ اس دن بھی یہی ہوا دفتر جانے کے لیے ہم نے اپنے بیگ میں چیزیں چیک کیں کہ سب کچھ بیگ میں ہے ناں؟ ہم نے چشمہ لگائے بنا سامان بیگ میں رکھا تھا۔ بیگ بند کر کے ہم دفتر روانہ ہو گئے۔ دفتر پہنچ کر آٹو کا کرایہ دینے کے لیے پرس کھولا تو پاؤچ ..... ندارد۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے چشمہ تو لگایا نہیں تھا۔ نیلا رنگ دیکھ کر جسے ہم نے بیگ میں رکھ لیا تھا وہ ہمارا پاؤچ نہیں بلکہ جیومیٹری باکس تھا اور کرایے کی رقم پاؤچ میں تھی۔ چونکہ ہمارا جیومیٹری باکس اور پاؤچ دونوں ہی نیلے ہیں اس لیے یہ غلطی ہو گئی۔ خیر اس وقت تو کھسیاتے ہوئے اپنی کولیگ سے پیسے لے کر کرایہ ادا کیا۔ لیکن آج بھی ہمیں اپنی یہ حماقت یاد آ جائے تو.... بے اختیار ہنستے ہوئے دل ہی دل میں ہم اپنا عہد دُہراتے ہیں کہ چشمہ لگائے بنا بیگ میں سامان نہیں رکھنا ورنہ؟

صائمہ سجاد بنگش
(تبصرہ نگار، گھریلو خاتون)

ہماری اکثر شادیوں میں کھانا کھانے کے وقت اکثر افراتفری مچ جاتی ہے۔ جیسے کہ کھانا نہ ملے تو گھر بھوکے ہی جائیں گے۔ لیکن اب بھی بڑے لوگ ذرا مہذب انداز میں کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سب کے اپنے، اپنے ہی طریقے ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک شادی کے موقع پر جب کھانا سرو کیا گیا تو سب لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اپنی، اپنی پلیٹ بھر رہے تھے۔ میری کزن اور میں جب اٹھے تو سیخ کباب تمام میزوں

سے ختم ہو چکے تھے ہم نے سوچا تھا کہ صرف کباب ہی لیں گے اور ہمارے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکے تھے۔ جب ہم واپس مڑے تو ایک میز پر سلاد، چٹنی اور رائتہ کی ڈشز تھیں اس کے ساتھ ہی ایک بڑی پلیٹ میں بہت سارے کباب پڑے تھے۔ میری کزن نے اشارہ کیا تو میں نے اٹھا کر دو کباب اپنی پلیٹ میں ڈال لیے... یکایک ایک بھاری بھرکم خاتون پیچھے سے آن دھمکیں اور میرے چٹکی بھر کر کہنے لگیں ''یہ میری پلیٹ ہے جی، میں روٹی لینے گئی تھی جی۔'' ''جی'' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں مارے خفت کے میرے منہ سے صرف سوری ہی نکل سکا۔ میرا اور میری کزن کا ہنس، ہنس کے برا حال تھا۔ مجھے رہ، رہ کر اپنی حماقت پر ہنسی آرہی تھی کہ بنا پوچھے میں نے کباب لیے ہی کیوں؟ لیکن کبھی، کبھی خیال آتا ہے کہ یہ ہماری غلطی تھی یا ان خاتون کی جو پلیٹ بھر کباب اپنے لیے رکھ کر روٹی لینے چلی گئی تھیں۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے خاتون کی چٹکی کی کسک بھی محسوس کرتی ہوں، سچی میں۔

سیدہ ایمن ریحان
(پاکیزہ قاری، گھریلو خاتون)

میری ماموں زاد بہن کی شادی تھی۔ میں ماموں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دس افراد کی چائے بنانی تھی اور مجھے کچن کی چیزوں کا علم نہیں تھا۔ غلطی سے چائے میں چینی کی جگہ نمک ڈال دیا میں بہت شرمندہ ہوئی، رہی سہی کسر میری کزن نے پوری کر دی بجائے اس کے کہ وہ چائے پھینک کر نئی بناتی اس نے اسی چائے میں خوب ساری چینی ملا کر مہمانوں کو پلا دی۔ لیکن اس دن کی غلطی کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر کسی نے مجھ سے چائے بنوانے کی فرمائش نہیں کی۔ اپنی اور اپنی کزن کی حماقت در حماقت اب بھی یاد آجائے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن ساتھ ہی ندامت بھی بہت ہوتی ہے۔



☆☆☆

عزیز قارئین! جیسا کہ میں نے ابتدائیہ میں لکھا تھا کہ خواتین سے اکثر غلطیاں باورچی خانے میں سرزد ہوتی ہیں۔ سروے میں شریک بعض خواتین کی حماقتیں اس کا ثبوت ہیں۔ مجھ سمیت جتنی بھی خواتین کی حماقتیں یہاں مذکور ہیں بدحواسی ان غلطیوں کا نقطہ آغاز تھی۔ چشمیاتی حماقتوں کے واقعات نے مجھے اپنی ایک اور حماقت کی یاد دلا دی جو میں ہنستے ہوئے تحریر کر رہی ہوں۔ بھابی کے ساتھ خریداری کر کے گھر لوٹی، چشمہ نکالنے کے لیے پرس کھولا لیکن چشمہ تو وہاں تھا ہی نہیں، چشمے کے بغیر پڑھوں گی کیسے؟ کل کو سروے رپورٹ بھی ارسال کرنی ہے کاپی جانی ہے۔ کمپوز کیسے کروں گی؟ میرے اپنے ہی سوالات مجھے ہولا رہے تھے۔ میری جان پر بن آئی تھی۔ خوب ڈھونڈیا گئی میرے ساتھ گھر والے بھی چشمہ تلاش مہم میں حصے دار بن گئے۔ اچانک امی نے کہا۔ ''تم کس کا چشمہ تلاش کر رہی ہو؟ اپنا؟'' میں نے خاصی پریشانی سے کہا۔ ''تو پھر یہ کس کا چشمہ لگایا ہوا ہے؟'' میرا جواب سن کر امی نے میری آنکھوں پر لگے چشمے کی جانب اشارہ کیا۔ ''ارے میرا چشمہ مل گیا۔'' میں خوشی سے چلا اٹھی ''بھلا کہاں سے ملا؟'' میری بے حد سنجیدہ مزاج امی نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہاں موجود افراد کے قہقہوں سے کمرا گونج اٹھا اور یک بیک میرے حواس بحال ہو گئے۔ اب ان قہقہوں میں میری جھینپی، جھینپی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی رواں سال اپنے اختتام کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے لیکن اپنی یہ حماقت یاد کر کے اب بھی میں بے اختیار ہنس دیتی ہوں۔

سو قارئین اکرام! کتنی ہی شدید مصروفیت اور پریشانی کیوں نہ ہو ہمیشہ حواس برقرار رکھیں ورنہ اپنی حماقتوں کی وجہ سے آپ اپنی ہی نہیں اوروں کی ہنسی کا سامان بھی فراہم کر دیں گے۔

☆☆☆

فکاہیہ کالم — گوشۂ ظرافت — ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمن کا شمار ملک کے معروف ومقبول اساتذہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ماہ انہی نامور مزاح نگار کی کتاب ''پرواز'' سے انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین ضرور محظوظ ہوں گے۔

مجبوریاں

ایک روز ایک اجنبی حضرت اپنا رومان انگیز افسانہ دکھانے لائے تاکہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکوں۔ وہ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا۔

''وہ دیر سے کھڑا نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا جس پر طرح، طرح کے پھولوں نے سلمیٰ ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں خیالات اس روانی کے ساتھ آرہے تھے جیسے کوئی اعلیٰ درجے کی سنگر مشین بخیہ کر رہی ہو یا کوئی تیز قینچی کتر، کتر چل رہی ہو۔ بعض اوقات کوئی پرندہ دفعتاً چیخ اٹھتا اور اس کے خیالات کا سلسلہ یوں منقطع ہو جاتا جیسے دھاگا ٹوٹ جائے یا یا یک سوئی چبھ جائے۔ وہ اپنی نگاہوں کے گز سے قدرت کا ناپ لے رہا تھا۔ سر پر آسمان نیلے رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس میں بادلوں کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے سفید بٹنوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ نالے کا بہتا ہوا پانی سفید ململ کے کھلے ہوئے تھان کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں سورج کی نارنجی شعاعوں نے گوٹا کناری کا کام......''

''معاف کیجیے......'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کہیں درزی تو نہیں ہیں؟''

''جی نہیں......!'' وہ شرما کر بولے۔ ''میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔''

میرے ایک دوست جو موٹروں کے ورکشاپ کے مالک تھے اور مدت سے موٹروں کا علاج معالجہ کر رہے تھے، موٹریں اور پُرزے ان کے دماغ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چلا کر کہتے۔ ''بریکیں لگاؤ......اسٹارٹ کرو۔''

ایک دفعہ ہم دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ میں آگے تھا اور مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ ہم ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں پانی ہی پانی تھا۔ اونٹ کچھ تیز ہو گیا، ایک جگہ تو پھسلتے، پھسلتے بچا...... میرے دوست گھبرا کر بولے...... ''بھئی اونٹ کو نمبر تو میں لے آؤ۔'' ایک وقفے کے بعد بولے۔ ''میرا مطلب ہے ذرا آہستہ چلاؤ۔''

اس اونٹ کی طبیعت میں کچھ ایسی بے نیازی تھی کہ جو ہدایات میں اسے دیتا وہ ذرا پروا نہ کرتا...... جب ہم اسے روکنا چاہتے تو وہ رکتا ہی نہیں۔ ایک جگہ میرے دوست بولے۔ ''اس اونٹ کی بریکیں خراب ہیں۔'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ جلدی سے کہنے لگے۔ ''یعنی اسے روکنا چاہو تو بہت دیر میں رکتا ہے۔'' اور ساتھ ہی ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا گویا کہہ رہے

ہوں کہ میں مجبور ہوں، میں جانتا ہوں کہ اونٹ میں نہ گیئر ہوتے ہیں نہ بریکیں ہی ہوتی ہیں لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔

☆☆☆

فرماتے ہیں

سعدی صاحب (فارسی زبان کے مشہور و معروف شاعر شیخ سعدی شیرازی) فرماتے ہیں کہ ''غصہ کبھی مت کرو، غصیل دکاندار کے شہد پر مکھیاں بھی نہیں بیٹھتیں۔''

فرصت ہو، آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہوں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ ہو، دوسرے میں کتاب۔ پڑھتے، پڑھتے یہ فقرہ آجائے تو واللہ سرور آجاتا ہے۔ کیا بات ہے، خوب فرمایا ہے۔ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اسی وقت ایک وزنی سی قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ ہرگز غصہ نہیں کریں گے۔ اگر کبھی غصہ آیا بھی تو سعدی صاحب کا یہ فقرہ یاد رکھیں گے۔

اگلے روز کسی کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیتے ہیں۔ بیرا نہ جانے کہاں مرجاتا ہے یوں غائب ہوجاتا ہے جیسے یہاں کبھی تھا ہی نہیں۔ طبیعت میں پہلے بیزاری سی آتی ہے پھر چڑچڑاپن پھر خون گرم ہوتا ہے اور کچھ دیر میں باقاعدہ کھولنے لگتا ہے۔ نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں، جی میں آتا ہے کہ یا تو بیرے کو قتل کردیں یا کیفے کے منیجر کو۔ اسی وقت منیجر سے شکایت کی جاتی ہے، بیرا پھر بھی نہیں آتا۔ صدیوں کے بعد آتا ہے اور ابھی آیا کہہ کر غائب ہوجاتا ہے۔ تب اصلی غصہ آتا ہے اور نہ جانے کیسے، کیسے خیالات دل میں آتے ہیں۔ اس وقت ''سعدی صاحب'' یاد تو آتے ہیں، ان کی نصیحت بھی یاد آتی ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ سعدی صاحب نے ہرگز ایسے فضول کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر نہیں دیا ہوگا۔ اور اگر دیا ہوگا تو اس قدر سست اور کام چور بیرے سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔

تب ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ کر خوب غصہ کرتے ہیں، دل کھول کر غصہ کرتے ہیں یہاں تک کہ کافی زہر معلوم ہوتی ہے۔ اور سارا دن بری طرح گزرتا ہے۔

☆☆☆

کتابوں میں غصہ، چوری، غریبی، ناکامی، غم، غرور ہر موضوع پر لوگ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔ ''اگر ناکامیاں نہ ہوں تو کامیابی کی قدر کیونکر معلوم ہو۔'' کیا پتے کی بات کہی ہے۔

دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ ''دنیا کی نکتہ چینی سے تم تب ہی بچ سکتے ہو، جب تم بت بن کر بیٹھ جاؤ۔ نہ کچھ سوچو، نہ کچھ کہو، نہ کچھ محسوس کرو، یہاں تک کہ تم کچھ بھی نہ ہو۔'' یہ پڑھ کر ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ''اگر تم ہوائی قلعے بناتے رہتے ہو تو کوئی حرج نہیں، فقط ان کے قلعوں کے نیچے بنیاد رکھنی شروع کردو۔''

پھڑک اٹھتے ہیں، اش اش کرنے لگتے ہیں۔

ایک اور حضرت نے فرمایا ہے کہ ''کسی چیز سے محبت کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہر وقت یہ فرض کرتے رہو کہ وہ چیز تم سے عنقریب چھن جائے گی۔''

جہاں تک فرمانے کا تعلق ہے، دنیا میں تین قسم کے آدمی ہیں، ایک تو وہ جن کو چوبیس گھنٹے یہی خبط رہتا ہے۔ جو اپنا ٹائم ٹیبل دوسروں کے فرمانے کے مطابق بناتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت نپولین کا حوالہ دیں گے کہ اس نے کہا ہے کہ بالکل آہستہ، آہستہ کھاؤ، ایک نوالے کو چالیس بار چباؤ، چلتے وقت بقراط کا ذکر ہوگا۔ اس نے آہستہ، آہستہ چلنے کو کہا ہے۔ حجامت کے سلسلے میں پھر نپولین کی رائے بیان کی جائے گی۔ اس کا قول ہے کہ اپنی حجامت خود بناؤ۔ حجام کا ہرگز اعتبار مت کرو کیونکہ اس کے ہاتھ میں تیز استرا ہے اور تمہاری گردن نزدیک ہے۔ اور نپولین نے یہ بھی کہا تھا کہ رات کو دیر تک جاگتے رہو۔ اس سے دماغ روشن رہتا ہے۔ (لیکن نپولین تو گھوڑے پر بیٹھے، بیٹھے سو جایا کرتا تھا۔ اس کا نہ کوئی

حوالہ دیا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے۔)

''فرماتے ہیں کہ'' معتقد ہنسنے ہنسانے سے منکر ہوتے ہیں کیونکہ حکیم بوعلی سینا نے فرمایا ہے کہ جو زیادہ ہنستے ہیں وہ جلد روئیں گے۔ دوسروں پر ہنسنا وہ گناہِ عظیم سمجھتے ہیں کیونکہ چندر گپت موریہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی شخص پر ہنسنے سے پہلے یاد رکھو کہ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔''

اگر چوری ہو جائے تو چور کا سراغ لگانے کی زیادہ کوشش نہیں کرتے کیونکہ نانا فرنویس صاحب نے فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ اس چیز کی چور کو تم سے زیادہ ضرورت ہو۔

غرضیکہ ایسے حضرات کی گفتگو میں گفتگو کم ہوتی ہے اور ''فرماتے ہیں'' زیادہ......

ویسے ''فرماتے ہیں'' کا ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی، کبھی اس کے استعمال سے آپ دوسروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں تو فوراً کہہ دیجیے کہ لارڈ کرزن صاحب فرماتے ہیں کہ سگریٹ پینے سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان زہر پی لے۔''

اور اگر سگریٹ نوشی کی تعریفیں ہو رہی ہوں تو کہہ دیجیے کہ مہا کوی کالیداس فرماتے ہیں کہ تمباکو ہی ایک ایسا نشہ ہے جو نشہ ہے بھی اور نہیں بھی۔''

یونہی کسی کا نام لے کر جو جی میں آئے کہہ دیجیے۔

اب رہے بڑے آدمیوں کے نام سو جہاں کچھ کہہ ہو یا اور نام یاد نہ آتے ہوں تو وہاں فوراً شیکسپیئر کا نام لے دیجیے۔ کسی کی کیا مجال جو آپ کو ٹوک دے۔ شیکسپیئر نے دنیا کے ہر موضوع پر، ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ ضرور فرمایا ہے۔

اس کا نام آپ جب چاہیں بلا جھجک لے سکتے ہیں۔ اگر حساب لگایا جائے تو سب سے زیادہ شیکسپیئر صاحب فرماتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر سعدی صاحب اور تیسرے نمبر پر گوئٹے، کنفیوشس اور نطشے آتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے جو حضرات فرماتے تھے وہ بھی آپ کی، ہماری طرح ہی تھے۔ غصے کے خلاف فرمانے والے نوکروں پر اس قدر خفا ہوتے تھے کہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ لڑائی جھگڑے کی برائیوں کے متعلق فرمانے والے مار پیٹ میں سب سے آگے رہتے تھے۔

قرض کے نقصانات پر فرمانے والے اکثر مقروض رہتے تھے۔

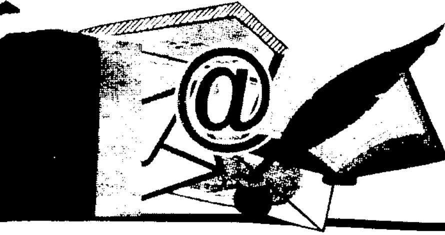
وہ سب کے سب ہم آپ جیسے انسان تھے۔

باقی رہا فرمانا سو فرصت کے وقت جب بھی دور کی سوجھتی ہوگی تو فوراً فرما دیتے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ فرمانے کے بعد بالکل بھول جاتے ہوں کہ کیا فرمایا تھا۔

ڈاکٹر جانسن فرماتے ہیں کہ ''جو شخص صبح دیر سے اٹھتا ہے وہ زندگی بھر کوئی معرکے کا کام نہیں کر سکتا۔''

حالانکہ ڈاکٹر جانسن خود زندگی بھر علی الصباح نہیں اٹھے، ہمیشہ دیر سے اٹھتے تھے۔





بہنوں کی محفل
مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

بہت پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!
تمام تعریفیں اس رب العزت اللہ جل شانہ کو زیبا جو کل عالمین کا پروردگار ہے...... یکتا و وحدہ لاشریک ہے...... اور لاتعداد درود و سلام حبیب خدا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن کو تمام مخلوقات کے لیے رحمتہ اللعالمین بنا کر بھیجا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کا خاتمہ ایمانِ کامل پر ہو...... دنیا و آخرت میں کامیابی ملے اور ہمارے عزیز وطن کو سدا اپنی حفظ و امان میں رکھے...... آمین۔

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو السلام علیکم......! پُرخلوص دعاؤں کا تحفہ لیے ایک مرتبہ پھر آپ کی اس پیاری محفل میں حاضر ہوں...... کیسے کیا حال ہیں؟ امید ہے آپ موسم سرما سے بھرپور لطف اٹھا رہی ہوں گی اور سرما کے خاص پکوانوں کا اہتمام بھی کر رہی ہوں گی... جیسے نت نئے مزیدار حلوا جات اور مختلف قسم کے ساگ وغیرہ...... اگر آپ کے علاقے کے یا خاندان کے کوئی خاص پکوان ہوں تو ان کی ریسپی ہم سے بھی ضرور شیئر کریں۔
آج پہلا ذکر لالہ موسیٰ سے ہماری بے حد دیرینہ قاری صفیہ بیگم کا کرتے ہیں کہ جنہوں نے ہم سے مان بھرا شکوہ کیا ہے۔ فون کرنے والوں میں ہمارا بھی ذکر کر دیا کریں ہم بھی تو آپ کو فون کرتے رہتے ہیں۔" صفیہ بہن آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر، اس طرح تو مجھے بہت ساری بہنوں کا ذکر کرنا پڑے گا۔ جیسے ہماری تسنیم ماپارا، عقیلہ حق، طیبہ عنصر میری دوست یاسمین وغیرہ کہ جو وقتاً فوقتاً رابطہ کر کے اپنی، اپنی رائے اور مشورے دیتی رہتی ہیں، اس طرح نام بنام ہر دفعہ سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں رہتا...... میں دل سے ان سب کی مشکور ہوں جو مجھے فون کر کے حوصلہ بھی دیتی ہیں اور اپنی خدمات بھی پیش کرتی ہیں کہ پاکیزہ کے سلسلے میں ہمارے لائق کوئی بھی کام ہو تو بلاتکلف آپ ہم سے کہہ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں، میں رضوانہ پرنس کی بہت شکرگزار ہوں کہ اس کی پُرخلوص ٹیلی فون کال نہ صرف میرا موڈ خوشگوار کرتی ہے بلکہ بھرپور توانائی بھی پہنچاتی ہے۔ رضوانہ تمہارا بے حد شکریہ ہمیشہ خوش رہو۔
آپ بہنیں پاکیزہ کے لیے تجاویز اور رائے دیتی رہتی ہیں جس کے لیے شکریہ...... اچھا بہنو بشرط زندگی اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی...... اب اجازت...... اپنا، اپنے گھر والوں کا اور اپنے پاک وطن کا بے حد خیال رکھیں...... اللہ حافظ......!
دعا گو عذرا رسول



جی عزیز بہنو......! عذرا صاحبہ نے تو موسم سرما کے پکوانوں کا ذکر کیا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ملک بھر میں سردی کی پہلی بارش اور پہاڑی علاقوں پر برف باری بھی ہو چکی ہے۔ جہاں پکوانوں کا اہتمام وہیں سردی سے بچاؤ کی ترکیبیں بھی اور سب سے بڑھ کر بدلتے موسم کی سوغات یعنی نزلہ، زکام، کھانسی، بخار، فلو جسم میں درد اور خشکی اور جانے کیا، کیا اس کے لیے تو ساتھ ساتھ گھریلو ٹوٹکے ضرور استعمال کریں جو صدیوں کے آزمودہ چلے آ رہے ہیں۔ ماہ دسمبر اور موسم سرما افسانہ نگاری اور شاعری کی آمد کے لیے بڑا موزوں وقت ہے۔ تخلیق کاروں کی صلاحیتیں سطح قرطاس پر بکھرنے کو بے چین ہیں کیوں ٹھیک کہا ناں...... اس دسمبر کے گزرنے سے پہلے اپنی یادوں کو مجتمع ضرور کیجیے جو کبھی کبھی سرمایہ حیات بھی بن جایا کرتی ہیں۔

آپ بہنیں جس طرح فون کالز اور خطوط کے ذریعے مسلسل میرا حوصلہ بڑھا رہی ہیں، اصلاحی تنقید کے ساتھ قابل عمل تجاویز اور مشورے بھی دے رہی ہیں اس کے لیے جزاک اللہ......ان سب سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کس قدر دلی وابستگی رکھتی ہیں ہم سے بھی اور ہمارے پاکیزہ سے بھی......اللہ آپ سب کو اسی طرح ہنستا بستا رکھے، آمین......آپ کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کو ہماری ٹیلی فون لائنز مستعد ہیں۔نزہت اصغر موبائل نمبر۔ 03316266612 ۔پاکیزہ آفس نمبر 02135802552۔107۔02135386783Ext 122 میسج کرتے ہوئے اپنا نام اور شہر ضرور لکھیں۔

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری پیاری مصنفہ، شاعرہ اور معروف ریڈیو براڈ کاسٹر سیمارضا ردا نے پاکیزہ میں اپنے حالیہ اختتام پزیر ہونے والے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا کہ سلسلے میں بیچ لگژری ہوٹل، کراچی میں ایک ہائی ٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں ماہنامہ پاکیزہ کی روح رواں محترمہ عذرا رسول نے بطور خاص شرکت کی۔ اس پروقار تقریب میں انجم انصار، عظمیٰ آفاق، غزالہ رشید، رضوانہ پرنس، عقیلہ حق، سیما مناف، صبیحہ شاہ، منزہ سہام، ہما بیگ، شگفتہ شفیق، مسرت بانو، عنبرین حسیب عنبر، ریحانہ علی، سائرہ غلام نبی، ثنا غوری، فرح دیبا اور ہم (نزہت اصغر) بھی شریک تھے۔ تقریب میں سیمارضا کی ادبی خدمات، ان کی پُرتنوع شخصیت اور حالیہ ناول پر بطور خاص گفتگو ہوئی۔ سیمارضا کی پُرتکلف ضیافت سے سب بہت لطف اندوز ہوئے۔ (جیتی رہیں سیما اور کامیابیاں سمیٹتی رہیں)

☆ مصنفہ میمونہ صدف، راول پنڈی کی شادی گزشتہ دنوں بخیر وخوبی انجام پائی (مبارک باد)

☆ نامور صحافی، مصنف اور صدر پی این ای ضیا شاہد کی تصنیف ”امی جان“ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے، کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ضیا شاہد کی باہمت والدہ مرحومہ کے حالات زندگی ان کی شخصیت اور ان کی زندگی کے حیرت انگیز و متاثر کن حقائق سے پُر ہے۔ کتاب کا ٹائٹل بھی بہت نفیس ہے اور صفحات بھی بہت عمدہ اور معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ضیا شاہد کے جواں سال مرحوم فرزند عدنان شاہد کی المناک موت پر لکھے گئے کالمز بھی شامل ہیں، کتاب کی قیمت صرف 500 روپے ہے، ملنے کا پتا قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، یثرب کالونی بینک اسٹاپ والٹن روڈ لاہور کینٹ ہے۔ فون نمبر 0300.8422518/0300.0515101

☆ مستقل قاری مسرت پرویز، کراچی کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ (مبارک باد) مسرت کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی پیاری بیٹی فریال چائنیز لینگویج کا دو سالہ کورس کرنے اسکالرشپ پر چین گئی ہے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ نگینہ ضیا بنگش، کراچی کی پیاری بیٹی صباحت ضیا نے نویں جماعت کے امتحان میں A1 گریڈ سے کامیابی حاصل کی ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو) نگینہ ضیا کے حوالے سے دوسری خوشخبری یہ ہے کہ ان کی چھوٹی بہن نایاب منہاج بنگش کی پشاور میں داؤد خان سے منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کی التماس ہے

☆ پاکیزہ کی بے حد سینئر قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی ناہید اصغر بریسٹ میں گلٹی کی تکلیف کا شکار ہوگئی ہیں، ان کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے سب خاندان والے بے حد پریشان ہیں، (اللہ آپ کی یہ پریشانی خیریت سے ٹل جائے، آمین)

☆ مستقل قاری، نازیہ، راول پنڈی کے گیارہ سالہ بیٹے کی صحت کے لیے خصوصی دعا۔

☆ مستقل تبصرہ نگار فرخندہ جعفری کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔

☆ مصنفہ اور شاعرہ پروین عذرا تشنہ کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ مستقل قاری نبیلہ، اوکاڑہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری اب رفتہ، رفتہ روبصحت ہیں (الحمدللہ)
☆ مستقل قاری وتبصرہ نگار، امینہ عندلیب، سلانوالی کی مکمل صحت وسلامتی کے لیے خصوصی دعا۔
☆ مستقل تبصرہ نگار صائمہ سید، کراچی پچھلے دنوں چکن گونیا کے بخار میں مبتلا رہیں۔

انتقال پُرملال

☆ مصنفہ بشریٰ سیال کے جواں سال بہنوئی کا انتقال ہوگیا ہے۔
☆ مستقل قاری ذوالنورین، ہری پور ہزارہ کی دادی جان اور پھران کے ماموں جان انتقال کر گئے (اللہ آپ کو یہ صدمے برداشت کرنے کی طاقت دے)
☆ انجم انصار کی خالہ ساس ڈاکٹر شمیم فاطمہ صدیقی انتقال کر گئیں۔ مرحومہ ایک ماہر اور معروف معالج ہونے کے ساتھ، ساتھ فلاحی وسماجی کاموں میں بھی پیش، پیش رہتی تھیں۔ ان کی یہ خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔
☆ غزالہ جلیل راؤ کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال فرما گئیں۔
☆ نازنین آفریدی، پشاور کے والد ماجد کی برسی کے سلسلے میں فاتحہ خوانی ہوئی۔
☆ پاکیزہ رائٹر ام ایمان، علی پور چٹھہ کے والد گرامی قاضی احسان احمد کی اس ماہ برسی ہے۔

☆☆☆☆

بہنوں! اب آتے ہیں آپ کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......
☆ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ ”رسالہ تو ماشاء اللہ روز بروز نکھرتا جارہا ہے۔ خدا اور ترقی عطا فرمائے، آمین.... سب سے پہلے تو ذکیہ بہن اور اختر شجاعت تعریف اور شکریے کی مستحق ہیں۔ بہت ہی خلوص اور خوب صورتی کے ساتھ دین سکھارہی ہیں۔ ذکیہ بہن کی قرآنی معلومات پر انسان اش اش کر اٹھتا ہے۔ خدا دونوں بہنوں کو صحت اور لمبی زندگی عطا فرمائے۔ آمین...... دونوں ناول بہت بہترین طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں، شیریں حیدر کے ناول میں لفظ پیاری کا بہت استعمال ہے۔ جی خوش ہوگیا...... ورنہ اب تو ڈیئر ہی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے مگر پیاری میں جو مٹھاس ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں...... شکریہ شیریں...... خواب گزیدہ اور سر دیوار لکھتا ہوں، پسند آئے...... گوشہ ظرافت بھی اچھا جارہا ہے۔ ہم کو عبث بدنام کیا کا انجام بھی اچھا رہا۔ فریدہ خانم کی دونوں غزلیں خوب صورت ہیں۔ بہنوں کی محفل تو پسندیدہ اور دلچسپ ہمیشہ سے ہے مگر اس بار تو احوال کلیوں کی مہک کا نے بہت ہی لطف دیا۔ پڑھ کر بالکل ایسا لگا جیسے کہ سارا بہنوں کے ساتھ میں بھی اسی محفل میں موجود ہوں۔“ (جی آپ سب ہی لوگ ہمارے ساتھ شامل رہتے ہیں)
☆ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ”پاکیزہ پاکر راحت سی ہوتی ہے۔ سارے سلسلے لاجواب ہیں، ناولٹ افسانے خوب، بوجھ نے دل کے سارے بوجھ اتار پھینکے۔ کراچی والے بلکہ کراچی والیاں خوش نصیب ہیں کہ عذرا رسول صاحبہ محفل دوستیاں سجادیتی ہیں، کوئی ایک آدھ چھینٹا ادھر بھی...... ایک آس تھی کہ انجم انصار (یادش بخیر) کبھی اسلام آباد میں بھی محفل سجانے کا ذریعہ بنتیں...... مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ارے...... اس شہر کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں ہم رہتے ہیں آ ہم...... چلیں ہم اتنا دور سے ہی خوش ہوجاتے ہیں، ہم ترستے رہ گئے۔ وہ مسکرا کر چل دیے۔ (چلیں کسی وقت راولپنڈی، اسلام آباد کی رائٹرز کو بھی خوش کردیں گے فریدہ) خواب گزیدہ نے تو الجھا کے رکھ دیا...... اور ہاں...... اکو کو اب علیحدہ گھر لے لینا چاہیے۔ کاش بس اتنی سی بات کا بہوئیں خیال رکھیں کہ ان کی ماں بھی کسی کی ساس ہوگی...... نکلے جو قدم شیطان کا بہکاوا لڑکیوں کو گھر سے قدم نکالنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ قدم ساری زندگی طعنے کی شکل میں زنجیر پا رہتے ہی، ہوش اس وقت آتا ہے جب ان کی اپنی بیٹیاں جوان ہوجاتی ہیں، جبکہ مرد برابر کا شریک ہوتا ہے اس قدم میں...... اس جرم میں...... کوئی تعویز ہو رد بلا کا...... نارسائی کے درد کا کوئی تعویذ نہیں ہوتا...... پہلا قدم ہی روک لینا چاہیے تھا۔ خوش رہیں خوش رہنا سیکھیں...... رفاقت جاوید کی فصل محبت نے یقیناً سارے لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا کردیا ہوگا۔ اگر ہر عورت اسی طرح ڈٹ کر معاشرے کے فرسودہ رواجوں کو جھٹلا کے اپنا جائز شرعی حق مانگے تو کوئی عورت بے اماں بے سروساماں نہ رہے۔ مائیں لڑکیوں کو یہ کہتی ہیں اپنے گھر جا کر کرنا اور کرنا...... وداع ہوکر ساس اسے غیر، درآمد شدہ سمجھ کر مرد اپنی مردانگی کے زعم میں زور آور، اگر قرآن کی تعلیم کو سمجھ کر زندگی گزاریں

جائے نہ کوئی کسی کا حق کھائے نہ مرد اپنی انا کا مسئلہ بنائے عورت کو اس کا جائز مقام دے تو بگڑا معاشرہ سدھر سکتا ہے (جی بالکل) وہ عورت بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہے جسے اس کا شوہر عزت دیتا ہے اور قدر داں) ہوتا ہے۔ ویل ڈن رفاقت جاوید صاحبہ......!

☜ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ”پاکیزہ ڈائجسٹ کی بطور مدیرہ نامزد ہونا آپ کو بہت مبارک ہو، معذرت خواہ ہوں تاخیر ہوگئی۔ بوجہ خرابی صحت اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے، آمین 1 (اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے آمین) جون تا نومبر کے ڈائجسٹ خریدے مستقل سلسلے آنٹی ذکیہ بلگرامی، باجی اختر شجاعت انٹرویو، سروے رپوٹ، پاکیزہ ڈائری پڑھتی ہوں۔ سلسلے وار ناول، افسانے، کہانیاں کافی عرصے سے نہیں پڑھ رہی صحت اجازت نہیں دیتی۔ محترم باجی انجم انصار نے ان تھک محنت کی ہے نہ صرف ہماری لکھنے لکھانے کی تربیت کی ہم سب کو محبت اور خلوص کے رشتوں میں جوڑ دیا۔ اخلاقی تربیت بھی کی۔ بہت کچھ سیکھا، اچھی مدیرہ، اچھی دوست، بہن اچھی ماں کسی کی آنٹی ان کی نذر شعر (باجی انجم انصار)

ملے ہر قدم پر رفاقت تمہاری
کہاں ہم کہاں یہ عنایتیں تمہاری
ہمیں چاہیے بس تعلق تمہارا
کسی سے بھی ملنا اسے جیت لینا
بڑی دلنشیں ہے یہ عادت تمہاری
نہ دیکھا جہاں میں کوئی اور تم سا
بڑی منفرد ہے طبیعت تمہاری

اللہ پاک محترم باجی انجم انصار کو سلامت رکھے، آمین۔ اللہ پاک انکل معراج رسول کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ آپ سب میرے لیے بے شمار دعائیں مانگتی ہیں اللہ پاک آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی ہوں کراچی سے دعاؤں کا سفر شروع ہوتا ہے۔ میں سب کے لیے دعائیں کرتی ہوں .... میرے پاس آپ سب کے لیے دعاؤں کے پھول ہیں، دعاؤں کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے نہ ہی خوشبو کم ہوتی ہے۔ دعاؤں کا نعم البدل تحفہ نہیں اللہ تعالیٰ آپ سب کو سلامت، خوش، آباد رکھے آمین......“ (بہت پیار بھرے خط کا شکریہ)

☜ عقیلہ حق، کراچی سے۔ ”رسالہ ماشاء اللہ ہمیشہ کی طرح مکمل اور پرفیکٹ رہا، تمام افسانے بہترین تھے۔ شہناز وسیم کا الٹ بوجھ ایک بہترین تحریر رہی، لوگ بھول جاتے ہیں زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی ہے، لہٰذا جب ہم اوپر ہوں تو نیچے والے کا ہاتھ تھام لینا چاہیے کیونکہ جب یہی پہیہ گھومے گا اور نیچے آئیں گے تو اوپر والے ان کا ہاتھ پہلے سے تھامے ہوں گے......رفعت سراج صاحبہ کا ناول اور سیمارضا کی تحریر قابلِ تحسین ہے، میں رسالہ مکمل نہیں پڑھ سکی، میرے بڑے بھائی جمیل احمد کا 11 نومبر کو بائی پاس ہے۔ ہم سب بس اسی پریشانی میں لگے ہوئے ہیں، آپ سب کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔ ان تمام بہنوں کا بے حد شکریہ جنہیں میرا افسانہ درد، تکلیف اور دکھن پسند آیا۔ میری پیاری بہن سلمیٰ غزل صاحبہ تنقید کا آپ کو بالکل حق ہے لیکن زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ میں نے جس بہن کا کردار لکھا ہے ان کو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں، یہ کہانی ایک سچی کہانی ہے۔ جس معاشرے میں باپ بیٹی کی آبروریزی کرے اس معاشرے میں آپ اس کردار پر یقین نہیں کر رہیں مجھے حیرت ہوئی......ارے ہاں یاد آیا پچھلے ماہ طیبہ عنبر مغل کا ناولٹ پڑھا، بے حد بہترین تحریر رہی، طیبہ جو لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں، ماشاء اللہ صبیحہ شاہ صاحبہ کی تحریر بھی خوب تھی......تبصرہ مختصر ہے، بس پریشانی اور مصروفیات بے حد زیادہ ہے۔ شائستہ زریں صاحبہ کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے مجھے تبصرے میں شامل کیا، امید کرتی ہوں کہ آپ کو میرا جواب پسند آیا ہوگا......ویسے میں بڑی معصوم سی ہوں جواب دینے کی عادت ہی نہیں۔“ (بہت شکریہ مختصر تبصرے کا......اللہ آپ کے بھائی کو صحت کاملہ عاجلہ نصیب کرے، آمین)

☜ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ”اس ماہ تو پاکیزہ کو چار نہیں بلکہ آٹھ چاند لگے ہوئے ہیں، وہ پیاری معزز اور اپنی جان مار کر لکھنے والی رائٹرز جن کے نام اور تحریریں پڑھ کر خوش ہوتے تھے وہ تقریباً تمام سینئر رائٹرز عید ملن پارٹی میں شامل تھیں اس دعوت کی محنت کا کام محترمہ عذرا رسول صاحبہ، نزہت اصغر صاحبہ اور آمنہ حماد کو جاتا ہے۔ اس طرح لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ورنہ تو اتنے زیادہ لوگوں کو ایک جگہ بلانا اور دعوت یعنی بڑا کھانا دینا بہت ہی مشکل کام ہے۔ تصویریں اتنی

پیاری اور مدبر آئی ہیں کہ میں بار، بار ایک گھنٹے سے صرف تصویریں دیکھ رہی ہوں۔(اچھاجی) محترمہ عذرا رسول صاحبہ کی اپنی ہی معصومیت ہے لگتا نہیں کہ وہ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اور معراج رسول کو صحت تندرستی دے، ان کے بچوں کو سلامتی دے، آمین۔ کاش میں کراچی میں ہوتی تو شاید نزہت اصغر صاحبہ مجھے بھی دعوت میں بلا لیتیں۔(جی ضرور) احوال کلیوں کی مہک کا رخ چوہدری نے اپنے معطر قلم سے بہت خوب صورت الفاظ میں لکھا ہے۔ پھر تمام رائٹرز نے اپنی، اپنی تجاویز اور اچھی، اچھی رائے دی ہے۔ جونیئر رائٹرز کی واقعی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ اور اچھے سوال پر چھوٹا موٹا انعام بھی دینا چاہیے۔ شمیم فضل حق نے اکو کی شادی کا احوال خوب لکھا ہے۔ کسی کو کسی جسمانی نقص کے ساتھ قبول کرنا اچھی بات ہے اب اکو اور شہزادی انجم مل کر نوکری کریں اپنا، گھر الگ بنائیں، بہنوں کے کمروں پر نظر نہ رکھیں۔(واہ بھئی) نیلم احمد بشیر بہت سینئر اور اچھی رائٹر ہیں ان کی کہانیاں ہمیشہ حقیقت کے قریب ہوتی ہیں واقعی 2005ء والا زلزلہ قیامت..... سے کم نہیں تھا۔ مگر کہانی کہانی کی حد تک ٹھیک تھی، اس کو حقیقت کا روپ نہیں دے سکتے گستاخی معاف۔ عقیلہ حق درد، تکلیف، ودکھن عقیلہ حق صاحبہ جو بھی لکھتی ہیں لاجواب لکھتی ہیں، واقعی زخم بھر جاتے ہیں، تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ مگر جن کو اپنے سگے دکھ دیتے ہیں، وہ دکھن قبر تک ساتھ جاتی ہے۔ کہانی بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ ہما بیگ، زنجیر جنوں، ہاجرہ ریحان، جائم بیٹا، سحر ساجد، عنان کیر، صید ضیافت، نگہت سیما نے تائی کا کردار بہت برا پیش کیا ہے مگر سب تو ایسی نہیں ہوتیں...... تمام تائیاں ناراض ہوگئی ہیں۔ بہر حال تمام کہانیاں بہت اچھی اور محنت سے لکھی گئی ہیں، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ نے قرآن شریف کی تمام سورتوں آیات ان کے شروع اور آخر حروف کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے یہ ان کی بہت بڑی کاوش اور لگن ہے۔(جی بالکل) اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اسما قادری کی بدصورت بہت سبق آموز ہے، کسی بھی بہن، بیٹی کے ساتھ اس طرح نہ ہو...... شہناز وسیم کی بوجھ بہت عمدہ کہانی ہے۔ لیکن لوگ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنے اوپر اٹھ جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی روزی کا وسیلہ سمجھنے لگتے ہیں بالکل اسی طرح کی ایک پرنسپل سے مجھے بھی واسطہ پڑا تھا...... وہ محترمہ اسٹوڈنٹ پر ذہنی ٹارچر اور گالیاں دیتے، دیتے ان کے والدین تک پہنچ جاتی تھیں۔ ام ایمان...... بلاعنوان کے نام سے بہت سبق آموز کہانی لکھی ہے۔ جو بچیاں اپنی عزت کے ساتھ والدین کی عزت اور اعتبار داؤ پر لگا دیتی ہیں ان کا انجام یہی ہوتا ہے۔ رفاقت جاوید صاحبہ کا ناولٹ فصل محبت یہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ آج کل جو بہن اور بیٹی ترکے میں کچھ مانگے تو اس کا وہ حشر کیا جاتا ہے کہ دوبارہ وہ اس بارے میں سوچتی بھی نہیں۔ اگر اسے تھوڑا سا دے بھی دیا جائے تو ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے مرگئی آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا۔ حالانکہ قرآن پاک میں ترکے کی تقسیم کا ذکر بار، بار آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی تمام کہانیاں، ناولٹ، منی ناول بہت محنت سے لکھے گئے ہیں...... شائستہ زریں کا سروے...... اکیسویں صدی کے تقاضے اور بچوں کی تربیت سب بہنوں نے بہت اچھا انٹرویو دیا ہے۔ تمام بیماروں کو شفا عطا ہو اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت......(فرخندہ بہت دنوں بعد آئیں، اللہ آپ کو صحت سے رکھے۔)

ہما بیگ، کراچی سے بڑے حسب موقع شعر کے ساتھ آئی ہیں۔

”محفل میں آپ کی ہم کچھ اور تو نہ لائے، الفاظ میں سجا کے جذبات لے کے آئے

آپ کی محفل میں پہلی دفعہ شریک ہو رہی ہوں، سب سے پہلے آپ سب کا میرے افسانے، زنجیر جنوں، پسند کرنے کا شکریہ...... سلامت رہیے اور بہنو دوسری گزارش یہ کہ آپ اپنے ساتھ، ساتھ اپنے گھر والوں، بچوں کو بہن، بھائیوں کو بھی پاکیزہ پڑھنے اور اس میں لکھنے کی ترغیب دیجیے کیونکہ لکھے ہوئے الفاظ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بنتے ہیں، پاکیزہ درحقیقت پاکیزہ خیالات کا حامل رسالہ ہے۔ جسے تمام خاندان والے یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ خوش رہیے۔“(بہت شکریہ ہما چھوٹے سے خط کا)

سعیدہ منان حمزہ، خیبر پختون خواہ سے۔ ”زندگی کی الجھنوں کو سلجھاتے، سلجھاتے وقت تیزی سے گزر رہا ہوتا ہے، اپنے اور اپنی الجھنوں کے علاوہ کچھ اور دھیان نہیں رہتا مگر جب کبھی بہت مشکل سے ہم کوئی ایک ساعت...... چند لمحے حاصل کر پاتے ہیں کہ جس میں ہم نئے لوگوں، نئے رشتوں سے آشنا ہوتے ہیں تو خوشی از حد ہوتی ہے...... ایسی ہی خوشی نزہت مجھے آپ سے بات کر کے حاصل ہوئی۔ قلم سے دوستی تو مدت سے ہے مگر اسی قلم کی بنیاد پہ جب آپ سے بات ہوئی تو اپنوں کی

تعداد میں ایک عدد اضافہ ہوتا ہوا محسوس ہوا یوں جیسے آپ سے دوستی بھی بہت مدت سے ہو (بہت شکریہ بھی) آنکھیں اوپر اٹھا کے دیکھوں تو بہت ساری ڈھیروں سیڑھیاں ہیں جن کا سرا اللہ جانے کہاں سے جاملا ہے...... ایک گھنے پیڑ کی لمبی اور دور تک پھیلی ہوئی شاخیں ان سیڑھیوں پہ چھایا کیے ہوئی ہیں، شاخوں پر پرندے ہیں، رنگ برنگی تتلیاں ہیں چمکتے دمکتے جگنو ہیں، یقیناً یہ شجر علم کا ہے اردو کا ہے، ادب کا ہے، یہ تتلیاں، پرندے اور جگنو شاید لکھنے والے ہیں، میں پہلی سیڑھی پر کھڑی ان پھیلی ہوئی شاخوں تتلیوں اور جگنوؤں کو حسرت اور خوشی سے دیکھتی ہوں...... دل میں آتا ہے کاش کبھی ان سیڑھیوں کو طے کر کے ان شاخوں تک پہنچوں اور کوئی تتلی یا جگنو بن کے علم اور ادب کی فضاؤں میں اڑسکوں...... (ضرور، اوپر کی سیڑھیوں کو بھی آپ کے قدم چھوئیں گے) اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمام مسلمانوں کے لیے نفع بخش اور ہدایت سے بھرپور علم مانگتی ہوں...... اللہ ہم سب کا نگران ونگہبان ہوں...... آپ کے ڈائجسٹ اور اس سے جڑے ہوئے تمام افراد کو ہزاروں کامیابیاں ملیں...... آمین۔ اللہ میرے پاکستان کو ہمیشہ کھلے ہوئے تازہ خوشبو دار پھول کی طرح رکھنا جسے نہ خزاں آئے نہ آندھی نہ طوفان...... آمین......'' (بہت پیارے خط کا شکریہ، اب تبصرہ بھی بھیجے گا)

ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ''میں گزشتہ چند ماہ سے بہنوں کی محفل میں شرکت نہیں کرسکی۔ باجی آپ کو ایڈیٹر شپ کی بہت مبارک ہو اللہ پاک آپ کو یہ عہدہ مبارک کرے...... (شکریہ) انجم انصار باجی کو میرا بہت سلام اور دعا...... (ان کی طرف سے بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں) ڈاکٹر ذکیہ صاحبہ سے ملاقات اور ان کا مضمون اللہ اور اس کا نور بہت زبردست تھا۔ سحر ساجد کے من جانبازم کا اختتام اچھا تھا۔ سحر آپ نے ہر قسط میں ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا تھا۔ ستمبر کے شمارے میں بیٹی کے ساتھ بیٹی کی اتنی توہین پسند نہیں آئی کہ یہ تو سگھڑ ماؤں کا طریقہ ہے۔ سلسلے وار دونوں ناول بھی اچھے جارہے ہیں، مصروفیت کی وجہ سے مکمل رسالہ نہیں پڑھ سکی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ادارہ آپ کی رہنمائی میں اور آپ کے زیرِسایہ مزید ترقی کرے۔ معراج رسول صاحب کو اللہ صحت وتندرستی عطا فرمائے اور عذرا رسول آپی کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

☆ ایمان زہرا، شیرازی، چکوال۔ پیاری بیٹی آپ کے بھیجے گئے اقوال پچھلے شمارے میں بھی ہیں اور اب بھی شامل ہیں۔ آتے تو ہیں، آپ کی چیزیں وقتاً فوقتاً لگتی رہیں گی۔ آپ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔ اپنے دل کی باتیں بھی ضرور کریں۔

اسما...... ''1999ء سے... پاکیزہ پڑھ رہی ہوں 2005 میں شادی کے بعد تھوڑا وقفہ پڑھنے میں آگیا تھا۔ پر ابھی پھر پڑھنا شروع کیا ہے...... اس میں بہت ساری تبدیلیاں آچکی ہیں، تھوڑی تعریف، تھوڑی تنقید کے ساتھ اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اسٹاف کو اس محنت کا اجر دے۔'' (اللہ دعائیں دینے والوں کو سلامت رکھے)

ناہید، آزاد کشمیر سے۔ ''میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور آزاد کشمیر کے ضلع باغ سے تعلق ہے ہمارے گھر سے ڈاکخانہ دور ہے کبھی کبھی ہی جانا ہوتا ہے آپ کہیں تو تبصرہ بذریعہ فون لکھوا دیا کروں (جی لکھوا سکتی ہیں مگر کبھی خط بھی ضرور بھیجیں)

صائمہ بخاری، سرگودھا سے۔ ''پاکیزہ میں کچھ لکھنا چاہ رہی ہوں۔ بہت اچھا رسالہ ہے، میں شوق سے پڑھتی ہوں۔'' (جی ضرور لکھیں)

طاہرہ ضلع خوشاب سے۔ ''رسالہ کبھی، کبھی دیر سے ملتا ہے۔ مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے، بس تفصیلی تبصرہ لکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔

مسز یٰسین، لیہ سے۔ ''میں دس گیارہ سال سے پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ اپنے پاکیزہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سب بہنیں بہت اچھا لکھتی ہیں، سب کا اور آپ کا بہت شکریہ...... (آپ کے مطالعے کا شکریہ)

نادیہ، راولپنڈی سے۔ ''بہت عرصے سے پاکیزہ پڑھتی ہوں، گھریلو حالات جیسے بھی ہوں، میں ہر ماہ یہ رسالہ پڑھ لیتی ہوں۔ باجی عذرا کیسی ہیں، آپ سے بات نہیں ہوتی تھی۔ انجم باجی سے میری بات ہوتی رہتی تھی۔ میرا اسلام کہیے گا انہیں شروع میں فکر ہوئی تھی کہ پاکیزہ میں اب کیا ہوگا مگر آپ بھی بہت اچھا سنبھال رہی ہیں، مجھے نگہت سیما کی صید ضیافت کہانی اچھی لگی تھی۔ ایسا لگا کہ میرے حالات پر ہے۔ مجھے ذکیہ بلگرامی آپا سے دعا کرانی ہے، میرا بیٹا گیارہ سال کا ہے جو بیمار رہتا ہے، آپ لوگ میرے رزق کے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ پاکیزہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے میں ایک جمعرات سے دوسری جمعرات تک قرآن پاک بھی ختم کرلیتی ہوں۔ شیریں حیدر کا امرت لگتا ہے ہمارے خاندان کی کہانی ہے، زیادہ بچے اور رشتے داریاں ہوں تو ایسے ہی ہوتا ہے، آپ یقین کریں گی کہ

میں تو اس ناول کے پورے صفحات فوٹو اسٹیٹ کروا کر کتاب کی شکل میں رکھ رہی ہوں۔'' (ارے واہ بھئی)

(ماشاء اللہ، بہت شکریہ نادیہ، خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ ذکیہ آپا ہر پڑھنے والے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔)

مزمل سلیم، فیصل آباد۔ آپ کہانی ضرور بھیجیں مگر پاکیزہ کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھیں اس کے علاوہ نامور ادیبوں اور آج کے قلمکاروں کو بھی ضرور پڑھیں۔

☆ آسیہ مظہر چوہدری، آزاد کشمیر۔ آپ کہانیاں میل کر کے فوراً پوچھا کریں کہ مل گئیں پھر اس کے ڈیڑھ ماہ کے بعد اشاعت کا پوچھ لیا... کریں اس طرح پریشانی نہیں ہوگی...... یہ بات سب بہنوں کے لیے ہے۔ میل کرنے کے بعد ضرور تصدیق کیا کریں۔

ریما نور رضوان، کراچی سے۔ ''باجی میری کہانیوں پر بھی نظر کرم کر دیں۔'' (جی انشاء اللہ جلد ہی)

نگہت غفار، کراچی سے۔ ''سر پر آنچل لیے ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، ہمیشہ کی طرح بے حد مفید اور سبق آموز تحریر تھی۔ اللہ اور اس کا نور...... محترمہ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا باب نہم، بہت زیادہ باریک بینی سے مطالعہ کر کے ہم تک پہنچایا گیا ہے۔ ذکیہ صاحبہ کی تحریر قابل ستائش ہے۔ (جی بے شک) محفل میں سب سے پہلے مرحومین کے لیے مغفرت کی دعائیں اور لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعائیں۔ اللہ رب العزت تمام مرحومین کو اپنے دربار میں اعلیٰ مرتبے پر فائز فرمائے (آمین) پیاری نازنین آفریدی اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی ہر نعمت عطا کرے، آپ کو میری کہانی پسند آئی۔ حافظہ ست البنات اللہ آپ کی عمر دراز کرے آپ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کرے۔ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ دلی خوشی ہوئی۔ پیاری پروین افضل سدا اسلامت رہیں پہلے تو یہ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کو میری کہانی اچھی لگی۔ شکریہ پاکیزہ ڈائری میں حمد باری تعالیٰ نعت رسولؐ، بہترین نصیحت، پیغام کربلا، دعا کیا ہے؟ مجھ سے ملیے...... یہ تحریریں پسند آئیں۔ سب سلسلے ہی بہت پسند آئے۔ عقیلہ حق کا افسانہ پڑھا۔ عنوان کی مناسبت سے افسانہ بہت میچ کر رہا تھا۔ ثمر کاظمی مختصر مگر پُر اثر کہانی تھی۔ ہما بیگ کی کہانی بھی اچھی تھی۔ ہاجرہ ریحان ان کی بھی کہانی مختصر مگر اچھی تھی۔'' (بہت شکریہ تبصرے کا)

☆ فوزیہ، لاہور۔ اللہ پاک کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو ہزار در کھولتا بھی ہے۔ دعا کی کثرت مشکلات کو کم کرتی ہے۔ آپ بھی انشاء اللہ سکھ کی گھڑیاں ضرور دیکھیں گی۔

☆ سارہ مشتاق، تلہ گنگ ...... بیٹیاں یقیناً اللہ کی رحمت ہیں اور یہ رحمت جتنی دیر بھی ساتھ رہے مزید رحمتیں لاتی ہے سو پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی مسب الاسباب ہے۔ دعا سے اپنی پریشانیوں کو بھگائیں کہ دعا ہی مومن کا ہتھیار ہے۔

☆ ثانیہ ارشد، گجرات۔ پاکیزہ کو پسند کرنے کا بہت شکریہ......

☆ سائرہ مثال، کراچی۔ آپ کی کہانی جلد لگے گی، کوشش کریں کہ آئندہ غیر ضروری طوالت نہ ہو۔

☆ ایمل آرزو، اوکاڑہ۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کہانی بھی جلد لگے گی۔

☆ آپا شمیم فضل خالق، پشاور۔ کیسی ہیں آپ، اپنی کہانی کے متعلق آرا تو پڑھ لی ہوں گی۔ جی اب آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ پاکیزہ کے مطالب سراہنے کا شکریہ۔

☆ نازیہ، ضلع جہلم سے۔ ''باجی ایک تجویز ہے کہ ہر ماہ ہماری جو مصنفات دنیا سے چلی گئی ہیں۔ ان کی کہانیاں دیا کریں، یا پرانی مصنفات کی سپر ہٹ کہانی بھی دیں جو آج کے قارئین نے نہیں پڑھیں۔ پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے آپ بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ (بہت شکریہ، نازیہ بہن، آپ کی تجویز پر بھی کبھی عمل کیا جاسکتا ہے)

نورین شہزاد، کراچی سے۔ ''بوجھ شہناز وسیم کی ایک بہت اچھی کاوش تھی انسپائرنگ اور بہت ساری motivation اُم ایمان کی بلاعنوان اندر تک دکھ دے گئی۔ محبت زادِ راہ حیا بخاری کی بس ایک عام حالات پر کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ خواب گزیدہ دردانہ نوشین کی بھی کچھ مسٹری لیے ہوئے کچھ سسپنس کے ساتھ کچھ دکھ کا ملا جلا نچوڑ تھی۔ سرِ دیوار لکھتا ہوں پسِ دیوار سنتا ہوں، نصرت یوسف کی مکافات عمل کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ اللہ نے جسے گناہ سے بچانا ہوتا ہے اسے بچالیتا ہے۔ بس اتنی سی بات ناہید چوہدری کی کاوش اچھی تھی معاشرے کے کچھ لوگوں کو جھنجوڑنے کے لیے تھی۔ نکلے جو قدم ریحانہ آفتاب کا ایک اچھا انسپائرنگ افسانہ تھا...... عمرے کا سفر سنبل ملک اعوان نے بہت اچھی طرح ہمیں مکہ مدینہ کی سیر کروائی گھر بیٹھے دل سے بے ساختہ دعا نکلی اے اللہ ہمیں بھی عمرہ ...

نصیب ہو۔ (آمین) احوال کلیوں کی مہک کا خود کو بھی اس محفل میں محسوس کیا..... ایسا ہوتا ہے کہ ہماری فیلنگز بہت اچھی ہوتی ہیں اندر سے ہم اطمینان میں ہوتے ہیں کہ اچانک ماضی کی کوئی غلطی کوئی بری یاد آجاتی ہے۔ اور ہم خود کو دکھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے آپ فوراً آعوذ باللہ کا ورد شروع کر دیں..... اور دماغ کو آپ کے کنٹرول میں ہونا چاہیے نہ کہ آپ مائنڈ کے کنٹرول میں آپ اپنے دماغ کو کہیں وہ تکلیف اسی وقت کے لیے تھی اور مجھے اس لیے یاد آئی کہ مجھے کوئی سبق دینے کے لیے کہ میں کچھ سیکھ لوں بس کوئی بھی مشکل اتنی بڑی مشکل نہیں ہوتی کہ حل نہ ہو سکے ایک بات یاد رکھیں، کبھی ہار نہ مانیں..... نیت صاف ہو گی تو منزل آسان ہو جائے گی۔'' (بہت شکریہ اچھی، اچھی باتیں بتانے کا)

☙ مسرت پرویز، کراچی سے۔ ''میری تو عمر گزر گئی پاکیزہ پڑھتے ہوئے، ساری عمر اسکول کی جاب کی اب دل چاہتا ہے کچھ لکھنے، پڑھنے والی جاب مطلب رسالے، اخبار کی (اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے) کلاس سیونتھ سے رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ بہت کچھ سیکھا ہے میں نے اس سے۔ اب تو میرے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے، ایک بیٹی ڈاکٹر ہے جو لندن پڑھنے گئی ہوئی ہے۔ (اللہ آپ کو خوش رکھے، مسرت آپ بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔)

☙ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ آپ سب لوگ کیسے ہیں؟ (بالکل ٹھیک) پاکیزہ میں اس ماہ تقریب کا احوال پڑھ کر مزہ آگیا ناں..... انجم انصار بہت یاد آئیں۔ (جی یہ تو ہے انشاء اللہ کسی اور تقریب میں دیکھ لیجیے گا) پاکیزہ میں سب کا ذکر پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ (آپ کا بھی اس ماہ بطور خاص ذکر ہوا ہے صفیہ)

☆ پروین عذرا تشنہ، کراچی۔ آپا کتاب بھیجنے کا بہت شکریہ۔ کہانی جلد لگے گی..... اللہ آپ کو صحت سے رکھے۔

☙ آسیہ عامر، گلشن اقبال کراچی سے۔ ''باجی میں نے تبصرہ بھیجا تھا۔ (ہمیں نہیں ملا بہن) تقریب کا احوال پڑھ کر خوب مزہ آیا نزہت آپی آپ تو بہت اسمارٹ ہیں (تصویر سے دھوکا کھا گئی ہو) سب رائٹرز کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ دونوں قسط وار ناول امرت اور یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، بہت خوب جا رہے ہیں۔ نایاب جیلانی سے بھی کچھ لکھوائیں۔ (جلد لکھیں گی) مجھے بھی آئندہ کسی تقریب میں ضرور آنا ہے (جی بالکل آپ کسی وقت آفس بھی آسکتی ہیں)

☙ نسرین یاسین، حیدر آباد سے۔ ''میں ماہ نامہ پاکیزہ ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں اور باقاعدگی سے ان میں شائع ہونے والے مقابلوں میں بھی حصہ لیتی رہتی ہوں۔ میں آپ کی توجہ ماہ نامہ پاکیزہ ستمبر 2017ء کی طرف دلاتی ہوں جس میں بزم پاکیزہ میں انعام پایا۔ جس کے لیے میں آپ کی اور ادارے کے تمام لوگوں کی بہت مشکور ہوں کہ میرے سوال کو بہترین سوال قرار دیا اور انعام سے نوازا۔'' (جی یہ آپ لوگوں کے لیے ہی تو ہے)

☙ ثریا فرخ، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے، آپ کی بات میرے دل میں اتر گئی۔ حقیقت ہے کہ یہ معصوم بچے مزدوری کرتے، سڑکوں پر رلتے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے مگر ہم صرف دن منا کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں، اور پھر اگلے سال اسی طرح کا ایک اور دن منا کر اپنا فریضہ ادا کر دیتے ہیں۔ اللہ کرے آپ کے دل کی بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ (آمین) آپ کی مبارک باد کا شکریہ۔ ابھی صرف چند افسانے ہی پڑھے ہیں، تفصیلی تبصرہ ادھار رہا۔'' (جی ضرور) امرت کے ساتھ کیا برا ہونے والا ہے۔ شیریں حیدر نے بڑے خطرناک موڑ پر کہانی کی قسط ختم کی ہے۔ احوال کلیوں کی مہک کا۔ سب سے پہلے پڑھا محترمہ عذرا رسول کی یہ بات بھی بہت پسند آتی ہے کہ وہ ہر موقع پر اپنے احباب کو اپنی قلم کار بہنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اور واقعتا ہم سب ہی ایسی حسین محفلوں میں شرکت کے متمنی ہوتے ہیں۔ اللہ ان کے شوق و ذوق اور جذبوں کو سلامت رکھے، میری طرف سے عذرا صاحبہ کو بھی سلام کہیے۔ (ان کی طرف سے بھی سلام و دعائیں)

☙ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چکوال سے۔ ''ماہ نومبر کا رسالہ لیٹ ملنے پر جتنی مجھے کوفت ہوئی..... اتنی ہی شام کو میری یہ کوفت راحت میں بدل گئی۔ چھ نومبر کا دن تا زیست مرے یادگار دنوں میں شمار رہے گا۔ صبح کو پاکیزہ رسالہ ملا۔ بہنوں کی محفل پڑھی۔ احوال تقریب کا پڑھا اور رسالہ رکھ دیا کہ رات کو تسلی سے پڑھوں گی..... شام کو کچن میں تھی کہ بیٹی نے کہا امی فون ہے..... میں نے نمبر دیکھا تو کراچی کا کوڈ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں مبتلا کہ کراچی سے مجھے کون فون کرے گا..... بہر حال ڈرتے، ڈرتے ہیلو کیا تو آگے سے جس پیاری من موہنی سی شخصیت نے اپنا تعارف کروایا۔ میں مارے خوشی کے بے ربط بولنے لگی..... حالانکہ یہ میرا ریکارڈ ہے کہ میں کسی سے بھی یوں متاثر نہیں ہوتی۔ میری شدت سے خواہش تھی کہ کبھی عذرا آپی سے بات کروں

لیکن یہ سوچ کر کہ پاکستان کی اتنی مشہور و معروف بزنس وومین نہ صرف پاکستان بالکل غیر ممالک میں پاپولر خاتون بھلا ہم جیسی عام قاری سے کیونکر بات کریں گی۔ عذرا آپی نے میری دیرینہ خواہش پوری کی اور اپنے مصروف ترین ٹائم سے کچھ قیمتی لمحے میری نذر کیے......تو تب مجھے یقین آ گیا کہ جیسا عذرا آپی کے بارے میں سنا پڑھا ویسی ہی ہیں۔'' (جی ہاں بالکل کبھی کراچی آکر مل بھی لیجے گا) میں ساتویں کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اب تو تقریباً پچیس سال ہوگئے ہیں پاکیزہ پڑھتے ہوئے دلکش کا اجرا ہوا تھا ہم نے دلکش کو پاکیزہ کی چھوٹی بہن کا نام دیا۔ (جی اچھا) مگر بڑی گراں گزری تھی ہمیں دلکش کی جدائی۔ اور آپ کا ساتھ چھوٹنا......اب آپ نے جو پاکیزہ کی ادارت سنبھالی تو بہت کچھ یاد آ گیا۔ (نرگس نسیم بہت پیاری باتوں کا شکریہ......آپ پندرہ تاریخ تک تبصرہ بھیج سکتی ہیں کہ بس اٹھارہ، انیس کو تو مل ہی جائے۔ سالانہ خریداری کے لیے 800 روپے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام پر ارسال کر دیں۔)

✿ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''اس ماہ نومبر کا پاکیزہ کافی زبردست لگا شاید اس لیے بھی کہ بہنوں کی محفل میں، میں بھی شریک تھی جو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں شکریہ......شہناز وسیم کا بوجھ مقصد اور کہانی کے اعتبار سے لاجواب مگر حقیقت سے کوسوں دور......کیونکہ شاید انہیں سرکاری ملازمتوں کا تجربہ ہے نہ مشاہدہ......اور میں نے اسکول اور کالج دونوں کا تجربہ کیا ہے، سرکاری ملازمت کسی بھی ادارے کی ہو صرف عیاشی اور فارغ البالی اول تو کسی سرکاری ادارے کا سربراہ خواہ اسکول ہو ٹائم پر نہیں آتا تو پھر ٹیچرز کا کیا حال ہوگا......(لیکن آج کل ایسا نہیں ہے) میری جاننے والی ایک خاتون کی بہن دس سال گھر بیٹھی رہیں۔ اسکول کے میڈیا ماسٹر اور کلرک جیب میں تنخواہ ڈالتے رہے اور پھر انہوں نے دوبارہ جوائن کر لیا۔ میرے میاں اور میں نے حج کے لیے اپلائی کیا گورنمنٹ جاب کی وجہ سے N.O.C ضروری تھا۔ سب نے ڈرایا ائیر پورٹ سے واپس کریں گے۔ N.O.C تمہیں نہیں ملا اور میں مطمئن حج سے واپسی کے دو ماہ بعد......NOC ملا۔ کیسا (اوہ بڑی حیرت ہے) خدا کا شکر ہے مجھے best teacher کا ایوارڈ بھی ملا اور رزلٹ بھی ہمیشہ 100% کیونکہ خوف خدا کی وجہ سے میں عبادت سمجھتی تھی اور خیانت نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے گورنمنٹ اداروں میں بھی devoted لوگ ہوتے ہیں لیکن آٹے میں نمک کے برابر......رفاقت جاوید تو ہمیشہ ہی مقصد سے بھرپور لکھتی ہیں مگر اس پر عمل ہونا......مشکل بلکہ ناممکن......شگفتہ شاہ کی عورت کتھا پڑھ کر اپنا زمانہ یاد آ گیا بالکل حقیقت سے قریب محبت زادِ راہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ حیا بخاری نے خوب لکھا زبردست دردانہ نوشین کا خواب گزیدہ مزہ نہ دے سکا حالانکہ وہ خوب لکھتی ہیں۔ ثریا فرخ نے اپنے بہو بیٹے کے حج پر اپنے تاثرات خوب قلمبند کیے۔ سبحان اللہ نصرت یوسف کا افسانہ بھی با مقصد تھا بھرپور اختتام کے ساتھ......سارہ احمد کا سقوط انا بس ٹھیک لگا۔ شمیم فضل خالق تو بہت کہنہ مشق رائٹر ہیں مگر اکو کی شادی لگتا ہی نہیں کہ یہ ان کی تحریر ہے۔ بہرحال یہ میری رائے ہے وہ بھی ذاتی......ناہید چوہدری کی بس اتنی سی بات تو چھا گئی کاش بیٹے اس پر ہمیشہ عمل کر لیں اور بہویں ساتھ بھی دیں۔ ریحانہ آفتاب تو چھا گئیں حالانکہ اس موضوع پر پہلے بھی کئی مرتبہ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کا انداز منفرد دار الگ لگا ویل ڈن ریحانہ آفتاب......کاش ہر ماں، باپ کو سمجھ آ جائے اور بشریٰ رخ چوہدری نے بھی تقریب کا حال خوب لکھا......اب ایک تجویز ہے آپ بے شک ہر ماہ نہ صحیح چھ ماہ میں ایک مرتبہ تقریب رکھ لیں مگر بوجھ اس کا ساری رائٹرز مل کر اٹھائیں۔ صرف نئی اور پرانی رائٹرز کو مدعو کریں اور ایک مخصوص رقم طے کر دیں اضافی رقم آپ کا ادارہ ارادہ کرلے اس پر کسی پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا اور مصنفین کو ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ (خوب تجویز ہے بھئی) اختر شجاعت بھی خوب لکھتی ہیں اور ذکیہ بلگرامی کا تو کہنا ہی کیا سارے سلسلے بہت اچھے ہیں مگر نئے اور پرانے لکھنے والوں کو بھی اپنے بارے میں لکھنے کی دعوت دیں تو ایک اچھا سلسلہ رہے گا۔'' (جی اس کے لیے رائٹرز کے انٹرویوز کا سلسلہ چل رہا ہے ناں)

✿ فریدہ جاوید فری......لاہور سے۔ ''نومبر کا پاکیزہ ملا پاکیزہ کیا تھا افسانوں اور ناولوں کا گلدستہ تھا۔ ہماری صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ (الحمدللہ) سب بہن، بھائیوں کی دعاؤں سے ٹھیک ہوگئی ہوں مگر کمزوری بہت ہے سب سے پہلے ذکیہ جی کا اللہ اور اس کا نور پڑھا بے حد سرور ملا......اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور لمبی عمر عطا کرے، آمین۔ اس مرتبہ تو ریحانہ آفتاب صاحبہ نے کمال کا افسانہ لکھا پڑھ کر بے حد اچھا لگا، خوش رہو۔ اکو کی شادی شمیم فضل جی نے خوب لکھا۔ سارہ احمد کا سقوط انا بھی اچھی تحریر تھی۔ عورت کتھا شگفتہ شاہ، خواب گزیدہ، ناولٹ بوجھ کیا ناولٹ تھا پاکیزہ کے ناولٹ اور افسانے بہت معیاری ہوتے ہیں کہ پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ اپنی شاعری دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس مرتبہ میگزین میں اپنی ہم نام فریدہ کو پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جیسے فریدہ فضل، فریدہ افتخار، فریدہ ہاشمی، فریدہ خانم، فریدہ سیفی تمام فریدہ کو بے حد سلام دعا......کوثر خالد کی نظم بیٹوں کے نام بے حد پسند

آئی۔ آخر میں اپنی پیاری دوستوں کو بے حد سلام دعا۔ احوال کلیوں کی مہک کا کاش ہم بھی ہوتے۔ (آپ بھی تو تھیں ناں بھئی)

یاسمین اقبال، لاہور سے۔ ''مجھے پاکیزہ کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے جب آؤ جیسے آؤ بانہوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور ہماری بھیجی ہوئی کوئی تحریر ضائع نہیں کرتا ہے وہ مہینوں پرانی ہو، بہت سنبھال کر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے سال بھیجی گئی میری نظم ستمبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ میں جسے بھول بھی چکی تھی۔ جیون ساتھی کے نام سے شائع ہونے والی نظم کے لیے آپ کی مشکور ہوں۔ (یہ تراشے آپ کی امانت ہوتے ہیں) خاندان میں ہونے والی ڈھیروں شادیوں کی مصروفیت ہے۔ بس ابھی اپنے فیورٹ ناول کہاں بچیں کہ دل، کی قسط پڑھی ہے دیکھیے اب آگے زارا اور ساحل کیا گل کھلاتے ہیں۔ انجم کیسی ہیں، بہت یاد آتی ہیں ان کو میرا سلام ضرور کہیں۔ (بالکل ٹھیک ہیں اور دعائیں کہتی ہیں)

عذرا آفتاب، کراچی سے۔ ''میں آپ کے توسط سے اپنی رائٹرز بہنوں سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کہ خدارا گھروں کو جوڑنے والی کہانیاں لکھا کریں، آج کل ٹی وی پر بھی بھائی، بہنوں کے درمیان سنگدلی کے مظاہرے دکھائے جارہے ہیں۔ ہمارے رائٹرز اتنے سنگدل کیسے ہوگئے...... جن گھروں میں بھائی نہیں ہوتے، وہاں بہنیں، تنہا اور خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ اور اکثر منہ بولے بھائی بنا کر اس کی درازی عمر کی خدا سے دعا مانگتی ہیں، بھائی کی شکل سے ملتا ہوا کوئی نظر آئے تو دیر تک اس کا خیال رہتا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے ایک ڈرامے کا ایک سین دیکھا۔ ایک بھائی اپنی بہن کو گھسیٹ کر کچن میں لے گیا۔ ماں راستے میں تو اسے ایک کمرے کی طرف دھکا دیا اور بہن کے اوپر تیل انڈیل کر ماچس کی تیلی روشن کر کے پھینک دی......اور اگلی صبح میت میں گھر آنے والے لوگوں کے درمیان بہت پُرسکون بیٹھا تھا۔ ہمارے رائٹر، ڈراما بنانے والے اور ایکٹر کیسے بھول گئے اپنے گھر میں اپنی بہنوں سے کیسے نظر ملائیں گے۔ نزہت اصغر آپ اپنے قلم کے ذریعے پلیز......اس بیماری کو معاشرے سے نکال پھینکیں جہاں رشتوں کا تقدس پامال کیا جارہا ہو۔ ہمارے لوگ کس سوچ کی طرف جارہے ہیں۔ اور ہم کس راستے پر جارہے ہیں۔ ہمارے رائٹرز، ہمارے پروڈیوسر ہمارے اداکار ایسے رول بہت سنگدلی سے لکھ اور کر بھی رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کی تربیت کسی اور انداز میں ہونی چاہیے۔ معاشرے کی خوب صورتی زندگی کی بقا ہے، ایک وقت تھا جب گھر کے سب افراد اکٹھے بیٹھ کر ڈرامے کا انتظار کرتے تھے۔ اور......اب......آپ کی رائٹرز ماشاء اللہ باشعور ہیں وہ اس معاملے پر ضرور غور کریں گی۔'' (جی عذرا، آپ نے بہت حساس موضوع اٹھایا، اللہ پاک ہمیں ہدایت دے)

اچھی بہنو! محفل کا اختتام کرتے، کرتے پیاری قابل صد احترام نئی لکھاری بہنوں سے درخواست ہے اپنی کہانیاں ضرور بھیجیں مگر ایک کہانی ایک ہی رسالے میں، جس میں بھی آپ کا دل چاہے' ایک ہی کہانی کئی رسالوں کو بھیجنا اخلاقی طور پر درست نہیں...... آپ لوگ اپنے قارئین کو اچھی، اچھی باتیں بتاتے ہیں ان کو سنوارتے ہیں اور یقیناً یہ بہت کمال کی بات ہے، ہر ایک میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ امید ہے لکھاری بہنیں اپنے وقار اور ساکھ کو مدنظر رکھتے ہوئے سہواً بھی ایسا نہیں کریں گی۔ اچھے وقت کا انتظار تو کیا ہی جاتا ہے اسی طرح قابلِ اشاعت ہونے کے بعد کہانیاں بھی ضرور لگتی ہیں۔ بے صبری تو کسی شعبے میں مناسب نہیں ہے ناں...... ہمیں اپنی تمام رائٹرز بے حد عزیز ہیں اور ہم دل سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ اصل مسودہ آپ ہمیں ارسال کریں اور ریکارڈ کے لیے ایک فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیں۔ انشاء اللہ آپ سب کے تعاون اور رہنمائی سے ہم پاکیزہ بہتر سے بہترین بنانے میں کوشاں رہیں گے۔ رب کائنات کے حضور دعا گو ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، اللہ جل شانہ تو ہماری خطاؤں لغزشوں، فروگزاشتوں سے صرفِ نظر کر کے ہماری رہنمائی کر۔ ہمیں اس سیدھے حق کے راستے پر چلا جو تیرے مقربانِ خاص کی راہ ہے۔ اور ہماری آل اولاد اور تمام ملت اسلامیہ پر رحم فرما اور ہمارا خاتمہ بالخیر ہو۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کی خیر خواہ

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

نام اللہ

ہر کام سے پہلے نامِ اللہ
ہر کلام سے پہلے نامِ اللہ
وہی تو آقا، وہی تو مولا
وہی تو رب ہے، وہی تو داتا
اس کے سوا نہیں کوئی اللہ
لا الہ الا اللہ
سارے جہاں کو اس نے بنایا
تاروں سے پھر فلک سجایا
پہاڑوں کو زمیں کی میخیں بنایا
اس کی قدرت ہر شے سے عیاں
لا الہ الا اللہ
ہر جنّ و بشر کو اس نے بنایا
ان کو پھر زمیں پر پھیلایا
سیدھا رستہ نبیوں سے سمجھایا
اور زمیں کو دارِ فنا بنایا
لا الہ الا اللہ
اپنا تو خالق ہے اللہ
اپنا تو مالک ہے اللہ
اپنا تو رازق ہے اللہ
اپنا تو معبود ہے اللہ
پھر کیوں رہیں گے ہم تشنہ
راز یہ جب پا ہی لیا
لا الہ الا اللہ

کلام: پروین عذرا تشنہ، کراچی

نعت

اِک حسیں ماہتاب آیا ہے
حکمتوں کا نصاب آیا ہے
آپؐ کے آنے سے زمانے بھر میں
رحمتوں کا سحاب آیا ہے
ہوگئی ہیں سہل کڑی راہیں
مشکلوں کا جواب آیا ہے
چھاگئی ہر شجر پہ ہریالی
خوب رُت پر شباب آیا ہے
آمدِ مصطفیٰ سے ہر جانب
تازگی میں گلاب آیا ہے
حسن ایسا ملا محمدؐ کو
چاند کو بھی حجاب آیا ہے
آرزو ہے مدینہ کو جاؤں
پیار کچھ بے حساب آیا ہے
ہم پہ احسانِ حق تعالیٰ ہے
وہ جو لے کر کتاب آیا ہے
آپ کو عمر بھر کبھی واللہ
نہ غضب نہ عتاب آیا ہے
دنیائے لاشعور میں ساگر
آپؐ سے انقلاب آیا ہے

شاعر: محمد ایوب ساگر

انتخاب: نمرہ نور، فوجیوں والا، رینالہ خورد

جشنِ آمدِ رسولؐ مرحبا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں تمام انبیا کی صفات حسنہ جمع ہیں۔ خاتم الانبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کا استقلال، حضرت موسیٰؑ کی جواں مردی، حضرت ہارونؑ کی نرمی، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت یعقوبؑ کی محبتِ پدری، حضرت داؤدؑ کی سپہ سالاری، حضرت سلیمانؑ کا دبدبہ اور عدل، حضرت یحییٰؑ کی سادگی، حضرت عیسیٰؑ کی خاکساری غرض یہ تمام اوصاف

امام الانبیاؐ کی ذاتِ اقدس میں جمع ہو گئی تھیں۔

قرآن کریم میں خود رب کائنات شہادت دے رہا ہے۔ ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہیں۔''

حضورؐ کے اخلاق و عادات قرآن کریم کی عملی تصویر ہیں۔ آپ خادم کے ساتھ نہ صرف کھانا تناول فرماتے بلکہ اس کے کاموں میں مدد بھی کرتے تھے۔ سلام میں ادنیٰ و اعلیٰ سب پر سبقت لے جاتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت کلامی سے شدید نفرت تھی۔ آپؐ نے امت کو سخت کلامی سے منع فرمایا۔

ارشادِ نبویؐ ہے۔ ''لوگوں سے بات چیت احسن طریقے سے کیا کرو۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات سادگی، اخلاص اور خاکساری و شیریں کلامی میں فقید المثال ہے۔ اللہ کے حبیب روزمرہ کی زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی خود انجام دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری حیات مبارکہ میں بے مثال حکمت، عدیم المثال خلق و عنایت اور بے نظیر محبت کے اعلیٰ معیار قائم فرمائے اور بنی نوع انسان کو مثالی اخلاق اور بے مثال کردار کا عملی درس دیا۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

جشنِ میلاد النبیؐ

میلاد النبی جشن ہے آج کی رات
بھیجو کثرت سے درود پاک آج کی رات
کرسکوں میں بھی روضے کے آگے نعت خوانی
ہو جائے مہرباں جو مجھ پر میرا رب آج کی رات
بس جائے نگاہوں میں میری نور محمدؐ
اتنا میں کروں یاد انہیں آج کی رات

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

دعا بحضور سرور کونینؐ

ہردم انہیؐ کا نام ہو وردِ زباں یارب
شاید پڑے اسی طرح جان میں جاں یارب
ان کے جو در سے پھول ملیں چند کرم کے
میرے لیے ہے مہکا ہوا گلستاں یارب
در پہ جو ان کے جاؤں تو واپس نہ آؤں میں
در پہ بنادے ان کے میرا آستاں یارب
ان کی نگاہِ کرم پہ سو جائیں واردوں
حضورؐ پہ ہیں قربان میرے دل و جاں یارب
کوکب یہ آرزو ہے کہ بس ان کے واسطے
میں پیش کرتی جاؤں یونہی نذر جاں یارب

عقیدت گزار: ثمینہ کوکب، جہلم

حُجّت کس بات کی

انسان کے لیے جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے اور دوسرے کے بعد تیسرا...... مگر جب تیسرا دروازہ بند ہوتا ہے تب اللہ کے فضل کا وہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے جہاں سے اس کو دینے کے لیے اللہ کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس بہت کچھ کو پانے سے پہلے ہمیں ہمارے پاس موجود سب کچھ دینا ہوتا ہے...... دراصل اس دینے میں ہی ہمارا سب کچھ پالینا پوشیدہ ہوتا ہے...... پھر اگر ہم نہیں دیں گے تو لے تو تب بھی لیا جائے گا...... تو پھر حُجّت کس بات کی!

از: فرح طاہر، ملتان

ذرا غور کریں

☆ زمانے کا شکوہ مت کرو بلکہ خود کو بدلو کیونکہ پاؤں کو گندگی سے بچانے کا طریقہ جوتا پہننا ہے...... نہ کہ سارے شہر میں قالین بچھانا۔

☆ پھولوں کی مہک کچھ دن بعد ختم ہو جاتی ہے مگر...... حُسنِ سلوک اور اخلاق کی مہک انسان کی موت کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔

☆ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے...... بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا ہی بہت دیر سے سیکھتے ہیں۔ (مولانا روم)

از: زرین کمال، کوٹ ادو

عورت

عورت تو مٹی ہے
ہر پل جوا ڑتی ہے

ذرا جو کہیں ٹھہرے
اپنی خوشبو بھی چھوڑ جاتی ہے
لفظوں میں بکھر جاتی ہے
جذبوں سے سمٹ آتی ہے
آنکھوں میں خوابوں کو بسائے
ادھوری تعبیروں پر روتی ہے
حساس دل کی ہے مگر
مضبوط سی بنی ہوتی ہے
عورت محبت کی پجاری ہے
اسی پر جیتی اسی پر مرتی ہے
ہاں محبت ملے تو نکھر اٹھتی ہے
عزت نہ ملے تو بکھر جاتی ہے

کاوش: نرمین سرہیو، سندھ

خوب صورت دعا

دل سے نکلی ہوئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک ایسا رشتہ یا راستہ ہے جسے صرف کرنے والا ہی جانتا ہے۔ ہر کوئی طالبِ دعا ہوتا ہے۔ کب، کہاں کس کی دعا ہمارے کام آ جائے یہ کوئی نہیں جانتا شرط صرف یہ ہے کہ خلوصِ دل سے مانگی جائے۔

برسوں سے میری خواہش حج پر جانے کی تھی۔ بھائی، بہن، امی، ابا سب اس کے دربار میں جا چکے تھے۔ میری نانی نے مجھے دعا دی تھی اور صرف اتنا کہا تھا امی سے کہ اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس وقت تو میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ لیکن شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِذن تھا اور اسی سال یعنی 1987ء چار دن میں تیاری کر کے میں پہنچ گئی تھی۔ اس حج کی خوشی مجھے آج تک یاد ہے۔

ترس رہی ہوں کوئی ماں سا مہربان وجود
دعائے نور پڑھے اور مجھ پر دم کر دے

تحریر: فریدہ فضل، یو۔ ایس۔ اے

محبت سے نفرت

چلو ہم پاس رکھ لیں گے
تری باتیں تری یادیں
محبت تیرے صدقے میں
یہی ملتی ہے سوغاتیں
ہنسیں گے دل سے مل کر ہم
گلے دل کو لگائیں گے
تمہیں ہم یاد کر لیں گے
تجھے ہم بھول جائیں گے
چلو منزل سے پہلے ہم رستہ موڑ جاتے ہیں
کہ جن کو دل میں رکھتے ہیں وہی دل توڑ جاتے ہیں
محبت تم سے نفرت ہے

انتخاب: سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ

غزل

صرف اتنا اسے بتا دینا
مجھے آتا نہیں بُھلا دینا
میری باتیں تو صرف یادیں ہیں
یاد آئیں تو مسکرا دینا
کبھی گزرو تو یوں صدا دینا
اپنے ہونے کا پھر بتا دینا
یاد آ جاؤں عبادت میں اگر
ہاتھ اٹھا کے بس دعا دینا

کاوش: مسز یسٰین، لیہ شہر

حسین لمحات

زندگی کے حسین لمحات واپس نہیں آتے لیکن اچھے لوگوں سے تعلقات اور ان سے وابستہ اچھی یادیں ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔

☆ علم تبھی کامل ہوتا ہے جب انسان رب کے لیے جھکنا اور اس کے بندوں کے کام آنا سیکھ لے کیونکہ علم کی پہچان عاجزی اور جہل کی پہچان تکبر ہے۔

☆ انسان جب اندر سے ٹوٹ جاتا ہے تو باہر سے خاموش ہو جاتا ہے۔

☆ برا بھی وہی بنتا ہے جو اچھا بن کر ٹوٹ جاتا ہے۔

☆ ادب کی بات ہوتی ہے ورنہ جو سن سکتا ہے وہ

بول بھی سکتا ہے۔

☆انسان تلوار سے نہیں طعنے سے مرجاتا ہے۔

☆زہر مرنے کے لیے تھوڑا مگر جینے کے لیے بہت سارا پینا پڑتا ہے۔

از: ایمان زہرا شیرازی، ڈھڈیال، چکوال

پگلی

چپ چپ تنہا تنہا
رہتی کیوں ہو ہر دم جاناں
زلف پریشاں زرد سا چہرہ
بکھرا کاجل ٹوٹا گجرا
میں نے جب یہ اس سے پوچھا
کس نے کیا ہے حال یہ تیرا
آنکھ میں اس کے آگئے آنسو
زخمی نظر سے مجھ کو دیکھا اور پکاری
تیری نظر سے ہو گئی گھائل
تیرے پیار میں ہو گئی پاگل

فریدہ جاوید فری، لاہور

غور و فکر

آج جس بات نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے میڈیا کے اثرات ہماری زندگیوں میں کیا تبدیلیاں لے کر آرہے ہیں، آج کل بچے، بڑے سب انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے زیرِ اثر ہیں۔ ہر چیز کا زیادہ استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل جو ہمارے ملک کا سرمایہ ہے، بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے۔ ہمارے بچے جس تباہی کی طرف جارہے ہیں ہم اس سے لاتعلق ہیں والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ رہنمائی کریں، اچھی اور بری چیزوں کے بارے میں آگاہی دیں۔ قرآن و حدیث کی معلومات بچوں کو دیں تاکہ بچے اپنے دین اسلام سے روشناس ہوسکیں۔

ہماری نوجوان نسل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر گانے اور فلمیں تو دیکھ سکتے ہیں پر کچھ وقت دین کی باتیں سیکھنے کے لیے نہیں نکال سکتے۔ بچوں کے ذہنوں میں اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں یہاں والدین اور اساتذہ کو اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔ تاکہ بچوں کو برائی سے دور رکھا جاسکے۔ ہماری تھوڑی سی کوششوں سے ہماری نوجوان نسل تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے۔

از: صدف نورین، لاہور

خلاف ورزی

ایک خاتون تیز رفتاری سے ٹریفک سگنل توڑتی ہوئی نکل گئی۔ کانسٹیبل وہاں موجود ایک عینی گواہ خاتون کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”کیا آپ اس گاڑی والی خاتون کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟“ خاتون کہنے لگی۔ ”اس نے گرے کلر کی ساڑی پہن رکھی تھی، لاکٹ میں زمرد لگا ہوا تھا۔ پنک لپ اسٹک، آؤٹ لائنر کے ساتھ استعمال کی گئی تھی۔ پنک نیل پالش اور مسکارا بھی استعمال کیا ہوا تھا۔“

”اب آپ جلدی سے گاڑی کا نمبر بھی بتادیں۔“ کانسٹیبل خوش ہو کر کہنے لگا۔

”سوری جناب، نمبر دیکھنا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ خاتون ایک دم گھبرا کر بولی۔

از: صبا نور، لیہ

غزل

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص
میں کس ہوا میں اڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سو بچھا گیا اک شخص
پلٹ سکوں نہ میں آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص
محبتیں بھی عجب اس کی نفرتیں بھی کمال
مری ہی طرح سے مجھ میں سما گیا اک شخص
کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص

انتخاب: تسنیم گل، لوہی، بلوچستان

☆☆☆



☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ
آسائشِ حیات تو مل جائے گی کہیں
لیکن سکونِ دل تو مقدر کی بات ہے
☆زرمینہ خان...... بہارہ کہو
بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں پڑی
ہر لاش نے مکان کا ملبہ پہن لیا
☆گلشاد نذیر......اسلام آباد
حادثوں سے ہار جانا فطرتِ انساں نہیں
حادثے تو کھیلتے ہیں عظمتِ انسان کے ساتھ
☆ثمینہ کوکب......جہلم
احباب کے فریب بڑے کام کر گئے
مجھ پر کبھی خلوص کا مطلب کھلا نہ تھا
☆زرناب......ٹوبہ ٹیک سنگھ
نہ آپ یوسف ہیں نہ میں مصر کا کوئی تاجر
اپنی اس بے رخی کے دام ذرا کم کیجیے
☆نازنین آفریدی......پشاور
پھر ان کی گلی میں جائے گا
پھر سہو کا سجدہ کرلے گا
اس دل پہ بھروسا کون کرے
ہر روز مسلماں ہوتا ہے
☆فرخندہ جعفری......گجرات
دنیا نے ضبطِ غم کے سلیقے سکھا دیے
حد سے بڑھا ملال تو ہم مسکرا دیے
☆ممتاز خانم......کراچی
تو نے کہا تھا میں تیری کشتی پہ بوجھ ہوں
چہرے کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ
☆تہمینہ حیات......پشاور
ہم کو ہمارے منہ پہ وہ کہتے ہیں بے وفا
احسان ہم خدا کی قسم بولتے نہیں

☆کوثر خالد......جڑانوالہ
کسی مقصد کو پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
نئے رشتے بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
وفا کی بھٹیوں میں ذات کو ایندھن بناتے ہیں
جفاؤں کو مٹانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
☆ساجدہ ظفر......کمالیہ
چھت ٹپکتی ہے تو کیچڑ نہیں ہونے دیتے
کتنے اچھے ہیں مرے گھر کے پرانے برتن
☆انجم طاہر ...... کراچی
سچ بات پہ ملتا ہے سدا زہر کا پیالہ
جینا ہے تو پھر جراتِ اظہار نہ مانگو
☆یاسمین کنول......پسرور
بن جائیں کوئی جگنو یا بن جائیں اک کرن
روشن کریں چراغ کوئی تیز ہوا میں
کہتے ہیں لوگ ہم کو عبادت ہے محبت
اب کون کرے پیار بھی نفرت کی فضا میں
☆تسنیم کوثر......کراچی
ہم ان کے دل میں اگر کچھ جگہ عدم رکھتے
تو اتنا سہل نہ ہوتا ہمیں بھلا دینا
☆عرشیہ جنید......کراچی
زمانہ لاکھ تجھے بے وفا کہے لیکن
میری نگاہ تیرا احترام کرتی ہے
☆سعیدہ بانو......مری
دکھاؤں داغِ محبت جو ناگوار نہ ہو
سناؤں قصۂ فرقت اگر برا نہ لگے
☆زبیدہ ......پسرور
اپنے اندر کرلے یقیں پیدا
وہ جو ہم کو پرکھنے آیا ہے

☆ارم کمال......فیصل آباد
پانی میں بھی، ریت پہ تڑپی، چُنی گئی
بنتی رہی ہے درد کا عنوان محبت
طاقت سے بناتی ہے کبھی تاج محل یہ
جذبوں کے دیس کی ہے حکمران محبت

☆صائمہ ممتاز خان......اسلام آباد
تُو تو سرمایۂ ہستی ہے تیرا ذکر ہی کیا
ہم تو دشمن کو بھی اے دوست دعا دیتے ہیں

☆نگینہ ضیا بنگش......کراچی
چوک میں لوگ جب کھڑے ہوں گے
وہ کسی سوچ میں پڑے ہوں گے
اس زمانے میں سچ جو بولے گا
اس کے پیچھے ہی سب پڑے ہوں گے

☆نیلوفر خان......کراچی
ان سے فضا میں رنگ ہوا میں کھنک سی ہے
اڑتے ہوئے پرندوں کو زنجیر مت کرو

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
ویرانے میں جا کر کبھی دیکھو تو
سناٹے بہت ہی شور کرتے ہیں

☆ارم سلیم......مردان
مرجھائے تو پھر پیڑ نے بھی گوارا نہیں کیا
چلی ہوا تو خود ہی بکھر گئے پتے

☆ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ
آسان نہیں زیست کی منزل سے گزرنا
اس راہ میں کچھ مرحلے دشوار بہت ہیں
پُر درد گزر جائیں تو بیکار ہیں صدیاں
لمحے جو سکوں بخش ہوں دو چار بہت ہیں

☆ماہا احمد......کراچی
آہ! معلوم نہیں، ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے، سو یہ کدھر جاتے ہیں

☆سعیدہ......مردان
آمد جو سنی ان کی اللہ رے انتظار
آنکھیں بچھا دی ہم نے جہاں تک نظر گئی

☆جبیں نیاز......ملتان
اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

☆عروبہ ناز......کوٹلی
اب پوچھتے ہیں مجھ سے میری داستانِ غم
جب عرضِ حالِ زار کی طاقت نہیں رہی

☆ارم خان......ڈیرا غازی خان
ہم فقیروں کو برائی سے سروکار نہیں
ہم زمانے میں فرشتوں کی طرح رہتے ہیں
لوگ کہتے ہیں برا ہم کو تو حیرت کیا ہے
کہنے والے تو خدا کو بھی برا کہتے ہیں

☆مسز نگہت غفار......کراچی
جس کی خوشبو سے برہم ہیں تیرے شہر کے لوگ
ابھی وہ لفظ تو میں نے تجھے کہا بھی نہیں
تمہیں اس لیے بھی اپنا مقدر نہیں مانا
کہ مقدر کا لکھا ہمیں کبھی ملا بھی نہیں

☆ناظمہ شاہین......واہ کینٹ
وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھولیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

☆صبا نور......لیہ
مجھ کو لگتی ہے اپنی ہر آواز
جیسے خالی مکان بولتا ہے
کس سے چھپتا ہے خون کا لہجہ
میرے قاتل نشان بولتا ہے

☆ رانی ....کمالیہ
مہکنا نہیں بارشوں سے کبھی
مجھے پکا آنگن نہیں چاہیے
میں چمکتے سورج کی کرتی ہوں دعا
گھر اپنا ہی روشن نہیں چاہیے

☆فرح طاہر......ملتان
اب تری چاہ سے رخصت طلب ہوں میں
اس بار میرے دل سے سچ مچ اتر گیا تو

☆☆☆

منتخب غزلیں



بہترین شعری ذوق رکھنے والے آپ جیسے قارئین کے لیے اپنی طرز کے منفرد شاعر جون ایلیا کے ماہِ پیدائش کی مناسبت سے ان کی دو خوب صورت غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔



دل کا دیارِ خواب میں دور تلک گزر رہا
پاؤں نہیں تھے درمیاں آج بڑا سفر رہا

ہو نہ سکا ہمیں کبھی اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا لوحِ خیال پر رہا

نقش گروں سے چاہیے نقش و نگار کا حساب
رنگ کی بات مت کرو رنگ بہت بکھر رہا

جانے گماں کی وہ گلی ایسی جگہ ہے کون سی
دیکھ رہے ہو تم کہ میں پھر وہیں جا کے مر رہا

دل مرے دل مجھے بھی تم اپنے خواص میں رکھو
یاراں تمہارے باب میں میں ہی نہ معتبر رہا

شہرِ فراق یار سے آئی ہے اک خبر مجھے
کوچۂ یادِ یار سے کوئی نہیں ابھر رہا

ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر
اس کے بغیر اس کی تمنا کیے بغیر

انبار اس کا پردۂ حُرمت بنا میاں
دیوار تک نہیں گری پردا کیے بغیر

یاراں وہ جو ہے میرا مسیحائے جان و دل
بے حد عزیز ہے مجھے اچھا کیے بغیر

میں بسترِ خیال پہ لیٹا ہوں اس کے پاس
صبحِ ازل سے کوئی تقاضا کیے بغیر

اس کا ہے جو بھی کچھ ہے مرا اور میں مگر
وہ مجھ کو چاہیے کوئی سودا کیے بغیر

یہ زندگی جو ہے اسے معنیٰ بھی چاہیے
وعدہ ہمیں قبول ہے ایفا کیے بغیر

اے قاتلوں کے شہر بس اتنی ہی عرض ہے
میں ہوں نہ قتل کوئی تماشا کیے بغیر

خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں

گوشت آلو میتھی

اشیا ◆ آلو، (ٹکڑے کرلیں) دو عدد، بڑے۔ میتھی، چھوٹے پتوں والی چار گڈی۔ (کاٹ کر اچھی طرح دھولیں) مٹن، آدھا کلو۔ پیاز، (سلائس کاٹ لیں) 4 عدد۔ ٹماٹر، (چوپ کرلیں) دو عدد۔ (بڑے) نمک، حسب ذائقہ۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچیں، 4 چار عدد۔ ادرک لہسن پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ تیل، ایک کپ۔

ترکیب ◆ کڑاہی میں تیل گرم کرکے مٹن، پیاز، نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ادرک لہسن پیسٹ، ہری مرچیں ڈال کر گلنے دیں۔ گل جائے تو اس میں ٹماٹر ڈال کر بھونیں مسالا بھننے لگے تو اس میں آلو میتھی ڈال کر مزید بھونیں اتنا کہ میتھی کی اچھی سی خوشبو آنے لگے اور تیل الگ ہونے لگے تو آلو گلنے تک دھیمی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ (چاہیں تو سوکھی قصوری میتھی بھی استعمال کرسکتے ہیں)

مرسلہ، میمونہ انیس، کراچی

سبزیوں کی بریانی

اشیا ◆ آلو، تین عدد (درمیانے)۔ گاجر، تین عدد۔ پیاز، دو عدد (درمیانی)۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ دو کھانے کے چمچ۔ پھول گوبھی، ایک پاؤ۔ (پھول ہوں صرف) سفید بینگن، دو عدد۔ شلجم، تین عدد۔ تازہ مٹر کے دانے، ایک پیالی۔ ہری مرچ، ٹماٹر، دو عدد۔ (کیوبز کاٹ لیں) پودینہ، حسب پسند، ہرا دھنیا، نمک، کٹی لال مرچ اور تیل حسب ذائقہ اور حسب ضرورت۔ ثابت کالا زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ ثابت گرم مسالا ایک کھانے کا چمچ سب ملاکر (دار چینی، لونگ، کالی مرچ، تیز پتا .... بڑی الائچی، چھوٹی الائچی، بادیان کے پھول) چاول بریانی، تین کپ۔ چکن کیوبز، ایک عدد۔ دہی، آدھی پیالی۔

ترکیب ◆ دیگچی میں حسب ضرورت تیل ڈال کر پیاز باریک کاٹ کر گولڈن کریں...... تھوڑی سی تلی ہوئی پیاز نکال لیں۔ گارنشنگ کے لیے باقی پیاز میں لہسن، ادرک پیسٹ، نمک، مرچ، زیرہ گرم مسالا، دہی، چکن کیوب اور ٹماٹر ڈال کر تھوڑا بھونیں۔ پھر مٹر، گاجر، آلو ڈالیں اور دس منٹ بعد باقی کی سبزیاں بھی ہری مرچ سمیت ڈال دیں...... پانی کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا ڈال لیں۔ اب سبزیاں گل جائیں تو اس میں بھیگے چاول ڈال دیں اور اندازے سے پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔ اندازہ کرلیں کہ اسی پانی میں چاول گل جائیں گے۔ نہیں تو ہلکا سا چھینٹا ڈال دیں۔ تیار ہونے پر ہرا دھنیا یا پودینے کی پتیاں اور پیاز چھڑک دیں۔ مزیدار سبزی بریانی، چٹنی اور اچار کے ساتھ نوش فرمائیں۔

از نگہت زیدی، بہارہ کہو

اسپائسی گارلک بیف

اشیا ◆ بیف، آدھا کلو۔ لہسن کے جوئے، چھ سے سات عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت لال مرچیں، چار سے چھ عدد۔ چینی، آدھا چائے کا چمچ۔ انڈے کی زردی، ایک عدد۔ سرکہ، آدھا چائے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، حسب ضرورت۔ (اس میں چکن بون لیس بھی استعمال کرسکتے ہیں)

ترکیب ◆ اس ڈش کو بنانے کے لیے سب سے پہلے چٹپٹی سی مایونیز بنالیں۔ وہ اس طرح کہ صاف خشک پیالے میں انڈے کی زردی ڈال کر اس میں چینی، نمک، آدھا چائے کا چمچ کالی مرچ اور دو جوے

لہسن کو کچل کر ڈالیں۔ ایک منٹ الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ کراس میں تھوڑا، تھوڑا کر کے آدھی پیالی کوکنگ آئل شامل کریں اور گاڑھا ہونے پر آخر میں اس میں سرکہ ڈال کر ایک منٹ پھینٹ لیں۔ گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے صاف دھو کر چھلنی میں رکھ کر خشک کر لیں۔

پتیلی میں دو کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈال کر ایک منٹ گرم کریں، اس میں لال مرچوں کو سنہری فرائی کر کے نکال لیں۔ پھر اس میں لہسن کے جوؤں کو پیس کر ڈالیں۔ ایک سے دو منٹ فرائی کر کے اس میں گوشت کی بوٹیاں، نمک اور کالی مرچ ڈالیں اور اسے ہلکی آنچ پر ڈھک دیں (ضرورت محسوس کریں تو تھوڑا سا پانی شامل کر دیں)

جب گوشت گلنے پر آجائے تو اس میں فرائی کی ہوئی لال مرچیں اور مایونیز ڈالیں۔ تین سے چار منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں۔ (اس ڈش کو ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

نکہت آصف، اسلام آباد

میٹ بال سوپ

اشیا: مرغی، آدھا کلو۔ ہری پیاز و ہرا لہسن (کٹا ہوا) آدھی پیالی۔ کارن فلاور، پون پیالی۔ نمک، کالی مرچ، سویا ساس، دو، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، آدھی چائے کی چمچی۔ دودھ، ایک پیالی۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: مرغی ابال کر یخنی نکال لیں اور گوشت کے باریک، باریک ریشے کریں۔ ان ریشوں کو کارن فلاور اور پانی کے چھینٹے کی مدد سے گول، گول بنالیں جیسے چھوٹے، چھوٹے کوفتے بناتے ہیں۔ (یخنی نکالتے وقت تھوڑا نمک اور ثابت کالی مرچ ضرور ڈالیں) اب ایک برتن میں مکھن گرم کر کے اس میں کارن فلاور مکس کریں۔ گٹھلیاں نہ بننے دیں پھر لہسن اور پیاز بھی ڈال دیں اور باقی نمک، مرچ بھی ملا دیں۔ اب اس میں یخنی ڈال کر خوب پکائیں۔ کچھ گاڑھا ہونے لگے تو گوشت کے گولے بھی ڈال دیں پھر چینی اور دودھ کا بھی اضافہ کریں۔ دیگچی پکڑ کر ہلائیں اور اب چمچہ زیادہ نہ چلائیں۔ اب چولھے سے اتار کر سویا ساس ملائیں اور ڈش میں نکال کر سرو کریں۔ مزیدار سوپ سے لطف اٹھائیں۔

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

جھٹ پٹ مٹر

دو پیالی مٹر کے دانے ایک ٹیبل اسپون تیل میں ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ اس میں دو چٹکی سفید ثابت زیرہ اور نمک و کالی مرچ پاؤڈر حسب ذائقہ اضافہ کریں اور باریک ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر ڈش میں سجا کر گرم، گرم چائے سے تناول فرمائیں۔ اس میں آپ فرنچ فرائز اور ابلے انڈوں کے سلائس سے سجاوٹ بھی کر سکتی ہیں۔

از: زرینہ خان، بہارہ کہو

مونگ کی دال کا حلوا

اشیا: مونگ کی دال، ایک کلو (دو گھنٹے کے لیے بھگو دیں)۔ بناسپتی یا دیسی گھی، آدھا کلو۔ بادام، پستہ، اخروٹ، حسب پسند۔ کھویا، ایک پاؤ۔ الائچی، دو سے چار عدد۔ چینی، ایک کلو سے دو مٹھی کم لے لیں۔ پانی، آدھا لیٹر، زردے کا رنگ، آدھی چائے کی چمچ۔

ترکیب: مونگ کی دال کو گرائنڈر میں پیس لیں۔ اب ایک کڑاہی میں بناسپتی گھی اور دال ڈال کر فل آنچ پر پکائیں اور برابر چمچ چلاتی رہیں تاکہ دال کڑاہی میں چپک نہ جائے۔ جیسے چنے کی دال کا حلوا بناتے وقت چمچ چلاتے رہتے ہیں۔ اب ایک دیگچی میں پانی، زرد رنگ، الائچی کوٹ کر چولھے پر رکھ کر ابال لیں کہ شکر گھل جائے۔ اب اسی پانی کو دال میں ملا دیں اور درمیانی آنچ پر اتنا پکائیں کہ اس کا پانی خشک ہو جائے لیکن چمچ کو برابر چلاتی رہیں۔ تیل چھوٹنے لگے تو کچھ دیر پکائیں اب ڈش میں نکال لیں اور بادام، پستے، اخروٹ سے سجا کر پیش کریں۔

از: علیزہ حیدر، کراچی

☆☆☆

بزم پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: دلہن، دولہا کے بڑے بھائی کو جیٹھ اور چھوٹے بھائی کو دیور کہتی ہے، وہ دولہا کے جڑواں بھائی کو کیا کہے؟

جواب: واہ بڑے پائے کا سوال لائی ہو، بھئی جڑواں بھی پانچ منٹ چھوٹا بڑا تو ہوتا ہی ہے ناں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ زمین سرھیو......حیدر آباد

سوال: لوگ یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہم سے اچھی تو سب سے اچھی ہوگی اور...... یہ ہمارے ساتھ بری ہے تو سب کے ساتھ بری ہوگی؟

جواب: ایسا تو ہوتا ہے ناں بھئی...... ایک ہی انسان بیک وقت برا اور اسی وقت کسی اور کے لیے اچھا ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ تو جس کے ساتھ برا ہے اسے سوچنا چاہیے ایسا کیوں ہے۔

☆ حمنیٰ قندیل......کمالیہ

سوال: آسمان کے تاروں اور پلکوں کے تاروں میں کیا فرق ہے؟

جواب: ایک کو عاشق آج تک توڑ کے نہ لا سکا ہاں پلکوں پر لانے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

سوال: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟

جواب: جب دل و دماغ میں اختلاف نہ ہو۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال: کہتے ہیں کہ منہ پر تعریف نہیں کرنی چاہیے پھر لوگ کیوں میری اتنی تعریف کرتے ہیں؟''

جواب: تم نے یہ نہیں بتایا تمہارے منہ پر کس کی تعریف کرتے ہیں، کیا تمہارے میاں جی کی......

سوال: ظالم سماج میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ میں رسالے کیوں پڑھتی ہوں، بتائیں میں کیا کروں؟

جواب: کیا آپ کے شوہر کا نام بدل گیا ہے۔

سوال: میں نے صبح صبح جب اپنے میاں کو دیکھا تو؟

جواب: وہ تمہیں منہ چڑا رہے تھے اور تم فوراً ناراض ہو گئیں بھئی ایسا تو وہ روز کرتے ہیں ناں......

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال: اگر دماغ بھی جیب کی طرح خالی ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: وہی جو جیب خالی ہونے پر کیا جاتا ہے۔

سوال: دل کی آواز اتنی دلنشین کیوں ہوتی ہے؟

جواب: چلیں کوئی آواز دلنشیں تو ہوتی ہے ورنہ تو بھانت، بھانت کے لوگ اور بھانت، بھانت کی آوازیں......

☆ ثمینہ کوکب......جہلم

سوال: نادان مال کو عقلمند کمال کو ڈھونڈتا ہے تو عام آدمی کیا ڈھونڈے گا؟

جواب: جمال کو......مل جائے تو دھمال ڈالتا ہے کون سا ''جمال؟'' یہ آپ سوچیں......

☆ یاسمین کنول......پسرور

سوال: صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا کیوں نہیں کہتے؟

جواب: اگلے دن سے پہلے جو واپس آجاتا ہے ناں......بھئی ویسے بھی لوگ صبح کے نکلے رات کو تو واپس

آتے ہی ہیں۔

سوال: محبت کے دم سے یہ دنیا حسین ہے محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے؟

جواب: سو فی صد سچائی۔

سوال: موسم کی انگڑائی ہماری زندگی کو کتنا متاثر کرتی ہے؟

جواب: یہی انگڑائیاں ہی تو ہمارے مزاج کو قابو میں رکھتی ہیں۔ ورنہ یکسانیت سے تم گھبرا نہیں جاؤ گی۔

☆ صائمہ سید......کراچی

سوال: کرسی تو لکڑی کی ہوتی ہے پھر ہمارے سیاستدان اس کے لیے اتنا لڑتے کیوں ہیں؟

جواب: اس لیے کہ وہ عام لکڑی کی نہیں "اربوں" کی ہوتی ہے۔

سوال: دیواروں کے صرف کان ہوتے ہیں آنکھیں یا ناک کیوں نہیں ہوتیں؟

جواب: وہ بھی ہوتی ہیں جبھی تو پڑوسی کے گھر کے پکوان کی خوشبو آجاتی ہے اور ان کے ہاں کون، کون آیا ہے یہ بھی نظر آجاتا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں......

سوال: دسمبر اور اگست کی بارشوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب: وہی فرق جو جنوری اور جولائی کی بارشوں میں ہوتا ہے۔

☆ ہانیہ......جہلم

سوال: اگر پہلی تاریخ روز آتی تو؟

جواب: روز جیب گرم اور کیا۔

☆ شازیہ ہاشم......قصور

سوال: یا وری قسمت میں خزینۂ وفا ہے بس......؟

جواب: سفینۂ حیات میں وفائے لازوال چن......

☆ صبغہ ہاشم......قصور

سوال: م، ح، ب، ت......نے توڑ دیا مجھے؟ آخر اُن کی وہ جو ہوئی......؟

جواب: بیچارے لفظ کو توڑ مروڑ کر لکھو گی تو یہی ہوگا ناں......

☆ یاسمین اقبال......لاہور

سوال: وہ کون سی قدیم بیماری ہے جسے حضرت آدمؑ کے بعد پیدا کیا گیا؟

جواب: تم کیا آج کل بیماریوں پر ریسرچ کر رہی ہو۔

سوال: ہم رات بہت روئے بڑی آہ و فغاں کی۔ دسو جی بھلا کیوں؟

جواب: دانت کے درد نے سونے نہ دیا ہوگا اور بھلا کیوں......

سوال: کیا آپ مانتی ہیں کہ خوشیاں پیسوں سے نہیں خریدی جاسکتیں۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو کیا اپنے تمام پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیں گی؟

جواب: اگر جواب نہیں میں ہوتو کیا تم ایسا کرو گی۔

سوال: عورت تو ہر لمحہ بیچاری کہلاتی ہے، مرد بیچارہ کب کہلاتا ہے؟

جواب: لمحے کے ہزارویں حصے میں، بس اتنی ہی دیر بیچارہ رہتا ہے۔

☆ فرخندہ جعفری......گجرات

سوال: انسان کے آنسوؤں اور مگرمچھ کے آنسوؤں میں کیا فرق ہے؟

جواب: ظاہر ہے جانور اور اشرف المخلوقات کے آنسوؤں میں فرق تو ہوگا ناں۔

سوال: دنیاداری نبھانے کا کوئی ایک طریقہ بتائیں؟

جواب: اللہ کی خوشنودی کی نیت سے لوگوں کے کام آتے رہو سب طریقے آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔

☆ نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

سوال: بی وی اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

جواب: بھئی بہت پرانا سوال لائی ہو، ٹی وی کو تو سوئچ آف کیا جاسکتا ہے مگر......

سوال: چھتی چھتی آ ونیں تو......؟

جواب: کی کرے گی کڑی چھتی دس......

سوال: آج میری جیٹھانی نے جو میرے چند بال بچے ہیں پکڑ کر؟

جواب: تیل لگا کر کس کر چٹیا بنادی...... ہیں ناں۔

☆☆☆



حسن نکھار ہے

مہ جبیں

پیاری، پیاری خوب صورت و حسین بہنوں کو مزید نکھار کے ہم گھریلو نسخے بتاتے ہیں۔ آپ بہنیں ہماری معلومات سے استفادہ کررہی ہیں یہ تو اچھی بات ہے۔

موسم سرما کا آغاز ہوچکا ہے، اس کا مطلب ہے خشک وکھُردری جلد کی شکایات بھی عام ہوگئی ہیں۔ بس جلدی سے مطلوبہ سامان مہیا کریں اور جلد کی حفاظت کے لیے تیار ہوجائیں۔

خشک میوہ جات کھائیں بھی اور دوتین اپنی جلد کے بیرونی استعمال کے لیے رکھ لیں۔

☆ چار عدد بادام، دوعدد سوکھی خوبانی، (گٹھلی نکال لیں) دوچمچ عرق گلاب، دوچمچ بکری کا کچا دودھ اور ایک چمچ جو کا آٹا (اوٹ میل) باریک پیس لیں۔ اوردن میں دودفعہ اس کالیپ ہلکے ہاتھوں سے کریں۔ پندرہ منٹ بعد ہلکے گرم پانی سے چہرہ اور ہاتھ دھولیں، نہانے سے پہلے گردن پر بھی یہی عمل کریں۔

☆ رات کو چہرے کی کلینزنگ کرکے زیتون کا تیل اوراگر میٹھے بادام کا تیل میسر ہوتو دو، دوچمچ دونوں کو ایک پیالی میں مکس کرلیں اور چہرے ہاتھ، پیر، گردن کا مساج کریں یہاں تک کہ جلد تمام چکنائی پی جائے صبح اٹھ کر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

نوٹ: (اکثر بہنیں کہتی ہیں کہ تہجد یا فجر میں وضو کے لیے مشکل ہوتی ہے تو نماز سے کچھ وقت پہلے اٹھ کر اپنے ریگولر فیس واش سے منہ ہاتھ دھوکر خشک کریں پھر وضو بنائیں۔ چکنائی نہیں رہے گی)

☆ زیتون کے تیل میں نمک ڈال کر ہاتھ پیر پر اچھی طرح ملیں پھر صابن سے دھولیں۔ کھُردری جلد نرم وملائم محسوس ہوگی۔

خشک بالوں کے لیے ٹوٹکا

چار چائے کے چمچ میٹھے بادام کا تیل، ایک چمچہ شہد اور ایک انڈے کی زردی خوب پھینٹ کر یہ آمیزہ بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ دس منٹ تک پوروں سے مساج کریں پھر پلاسٹک کیپ یا گرم پانی میں بھگویا ہوا تولیا سر پر اچھی طرح لپیٹ لیں اور آدھے گھنٹے بعد شیمپو سے بال دھولیں۔ بہترین نتیجہ آپ خود دیکھ لیں گی۔

دہی اور ایک انڈا خوب پھینٹ کر بالوں میں لگائیں اور آدھے پون گھنٹے بعد بال دھولیں۔ تیز گرم پانی سے سردھونے اور نہانے سے گریز کریں۔

سردیوں میں نہانے سے پہلے روغنِ زیتون سے اگر جسم کی مالش کریں اور پھر نہائیں تو جلد پر خشکی نہیں ہوگی...... یہ عمل ہفتے میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی کریں۔

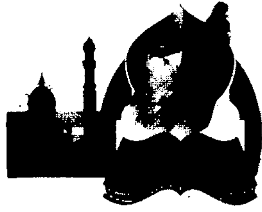
خصوصی نسخہ از طرف فضہ بتول، بہارہ کہو

مہ جبیں باجی میں اپنی بہنوں کے لیے لیموں کا ایک نسخہ لائی ہوں۔ لیموں کا رس یا گودا اگر چہرے پر ملا جائے تو اس سے جھائیاں دور ہوجاتی ہیں۔ بشرطیکہ چہرے پر دانے نہ ہوں۔ اگر یہ گودا دانتوں اور مسوڑھوں پر ملا جائے تو دانتوں کی پیلاہٹ دور ہوتی ہے اور اگر لیموں کے چھلکوں کو گیلا ہی یا سکھا کر باریک پیس کر کسی بھی کولڈ کریم میں ملا کر آنکھوں کے حلقوں پر لگایا جائے تو حلقے دور ہوجاتے ہیں۔

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ



تمام اوراد و وظائف اپنی زبان پر لانے سے قبل اپنے دل و دماغ کو بدی، غیبت، طعنہ زنی اور بدگوئی سے ہر حال میں بچائیں تاکہ زبان میں تاثیر ہو اور دعائیں مستجاب ہوں پہلے اپنے مومن، مسلم بھائی کے لیے دعا کریں پھر اپنے لیے۔

اوقات قبولیت دعا

کتاب کافی میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بہترین وقتِ دعا وقتِ سحر ہے۔ اور حضرت امام علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ دعا کے لیے چار اوقات غنیمت ہیں۔

(۱) تلاوت کلام پاک کے بعد (۲) اذان کے وقت۔

(۳) بارش برسنے اور ہواؤں کے چلنے کے وقت اور علی الخصوص نصف شب کے بعد جو دعا کا بہترین وقت ہے

(۴) وقتِ جہاد جبکہ دونوں صفیں آپس میں ملیں۔

حضرت امام علی ابن ابی طالب نے فرمایا ہے کہ جس وقت تم کو رقت طاری ہو تو اس وقت دعا کیا کرو کیونکہ جب تک خلوص نہ ہو رقت طاری نہیں ہوتی۔

مقاماتِ قبولیت دعا

کتاب تحفۃ الدعوات میں ہے کہ دعا کی قبولیت کے بہترین مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مسجد الحرام (۲) میدان عرفات (۳) مشعر الحرام (۴) مسجد نبویؐ اور مدینہ منورہ (۵) مسجد کوفہ (۶) بیت المقدس (۷) تمام مساجد (۸) مقابر شہدا اصلحا و والدین۔

آیت الکرسی کی فضیلت

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی کتاب میں سب سے اعظم آیت، آیت الکرسی ہے۔ (مسلم شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ہر چیز کے لیے زروۂ اعلیٰ و چوٹی ہے اور قرآن کے لیے ذروہ اعلیٰ و چوٹی سورۂ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت ہے (آیت الکرسی) جو آیات کی سردار ہے (ترمذی)

حدیث انسؓ میں ہے کہ آیت الکرسی چہارم قرآن ہے (رواہ احمد)

ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا داخلِ جنت ہوگا (طبرانی)

سوتے وقت آیت الکرسی پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اس کی، اس کی اولاد کی، اس کے گھر کی اور اس کے گھر کے اردگرد سب گھروں کی حفاظت کرتا ہے اور جنّ کے مکر و فریب سے بچاتا ہے۔ (مشکوۃ)

آیت الکرسی

اس آیت کا پڑھنا بہت ہی زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ہر نماز کے بعد اس آیت مبارکہ کا پڑھنا فراخیِ رزق کا باعث ہے۔ اگر روزانہ رات کو تلاوت

کرے تو موذی جانور اور دشمن کے حملوں سے محفوظ رہے گا اپنے پاس رکھنے سے ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ صبح کی نماز کے بعد سات مرتبہ پڑھنے سے ہر قسم کے ضرر ونقصان سے محفوظ رہے گا۔ اور روزی کے دروازے دن بھر کھلے رہیں گے۔

غم دور ہونے کی دعا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی امر غمگین کرتا تو آپ پڑھتے۔

یا حی یا قیوم برحمتك استغیث
(ترمذی)

اے سدا زندہ، سب کو تھامنے والے، ساتھ تیری رحمت کے فریاد کرتا ہوں۔

ملاحظہ: یہ بڑا مجرب اور مستجاب وظیفہ ہے اگر پانچ صد بار روزانہ صبح یا شام پڑھتے رہیں تو غم واندوہ کے پہاڑ ٹل جاویں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سایہ فگن رہے۔

سورۂ بقرہ

سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ھم المفلحون تک کا ورد اپنی حاجت کو ذہن میں رکھ کر ہر فرض نماز کے بعد پانچ مرتبہ کریں۔

ہر درد کی دعا

جس شخص کو اپنے بدن میں درد یا کسی اور چیز کی شکایت ہو اسے چاہیے کہ دایاں ہاتھ درد کی جگہ پر رکھے اور پڑھے۔ بسم اللہ (تین بار) اور یہ دعا سات بار......

اَعُوذُ بِعِزَّةِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ

پناہ مانگتا ہوں ساتھ اللہ کے غلبے کے اور اس کی قدرت کے اس کی برائی سے جو میں پاتا ہوں اور ڈرتا ہوں آئندہ کو۔

پھر قل آعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس یہ دونوں سورتیں پوری پڑھیں۔ پھر اپنے اوپر دم کرلیں۔ (بخاری مسلم۔ موطا وغیرہ) جسم کے دردوں اور عام شکایتوں کے لیے یہ وظیفہ بڑا موثر ہے۔

جمعہ کے روز کثرتِ درود

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ یہ درود شریف پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِہٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْماً .... اس کے اسی سال کے گناہ معاف ہوں گے اور اسی سال کی عبادت کا ثواب اس کے لیے لکھا جائے گا۔

فضائل و فوائد

نقش وتعویذات کے مقابلے میں آیاتِ قرآنیہ اور وہ دعائیں جو حدیث پاک میں وارد ہوئی ہیں یقیناً بہت زیادہ مفید اور موثر ہیں۔

عملیات میں انہیں چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

فخر الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینی یا دنیاوی کوئی حاجت اور غرض ایسی نہیں چھوڑی جس کے لیے دعا کا طریقہ نہ تعلیم فرمایا ہو۔ اسی طرح بعض مخصوص آیات کا مخصوص مقاصد کے لیے پڑھنا مشائخ کے تجربات سے ثابت ہے۔

مجرب عمل

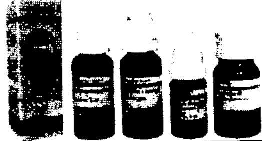
”اگر کسی پر آسیب کا شبہ ہو تو سورہ حشر کی آخری چار آیات لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیں اور پانی پر دم کر کے مریض پر چھڑک دیں اور اگر گھر میں اثر ہو تو ان آیات کو پانی پر پڑھ کر گھر کے چاروں گوشوں میں چھڑک دیں۔

اسی طرح سورۂ حدید کے آغاز کی چار آیات کا ورد اپنا معمول بنالیں کہ جس میں زمین و آسمان کی صناعی کا ذکر ہے۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ڈسمینوریا

منیبہ......فیصل آباد

مجھے ماہانہ ایام کے وقت الٹیاں شروع ہوجاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ میری کمر کے نچلے حصے، پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں۔ کبھی، کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھیلتے جارہے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کا رنگ بھی خراب ہوگیا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہوجاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال بھی نکل آئے ہیں۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں۔ اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔ ایک دن بعد

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جنوری 2018ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ .... لیں۔

لیکوریا

اقصیٰ ...... سکھر

میرا مسئلہ لیکوریا کا ہے۔ یہ تقریباً 14 سال سے ہے۔ میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں، افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ پیچیدہ ہوجائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax-30، Calc. carb-30، Pulsatilla-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ میں لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

معدے کا مسئلہ

عبدالحنان ...... کراچی

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً ۲ سال سے ہے۔ معدے میں درد ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد کبھی فوراً اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہوجاتی ہے۔ کافی علاج کراچکا ہوں مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر اس کو معدے کا السر بتارہے ہیں۔ الٹراساؤنڈ رپورٹ نتھی کررہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔



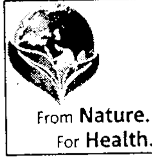
جواب: کھانے کے ساتھ اور بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغن اور بھاری کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی، چٹ پٹی چیزیں، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کے کس چیز سے تیزابیت ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا باعث بنتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے دس قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

گردے کی پتھری

شہناز ...... ضلع بدین

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 6 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہوجاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 2cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہوکر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہوگئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ یورین ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کردیں تاکہ پھر آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو پتھری بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی



گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ یورین آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم ازکم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ یورین جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں' روکنے کی عادت ترک کردیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں۔

جوڑوں کا مسئلہ

ارسلان...... ضلع جھنگ

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگ ہلاتا تھا تو ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں۔

جواب: ارسلان قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ غذا متوازن لیں۔ اپنے سونے جاگنے کا وقت مقرر کریں۔ بے مصرف کاموں میں وقت نہ گزاریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Staphisagria-30، Calc. phos-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

یادداشت کی کمزوری

یاسمین...... مالاکنڈ

میں انٹر کی طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

۱: اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں ؟
۲: ایام کے دنوں میں استعمال کرسکتی ہوں؟
۳: کریٹکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟
۴: اس کی دوا قیمت؟

جواب: بی بی دماغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو بڑھانے کے لیے کریٹکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی ضمنی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہانہ ایام کے دنوں میں بھی اس کو لیا جا سکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم ازکم ایک ماہ تک استعمال کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 420 روپے ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہے۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں۔ اس کے علاوہ Ancardium 30 شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

آنکھوں کی کمزوری

اسامہ...... بھکر منڈی

میری بیٹی کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے اسے

ڈیڑھ سال سے عینک لگی ہے۔اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت ہوتی تھی۔بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور ہی نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر بات کی ٹینشن لیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پہ سوار کرلیتی ہے۔حد سے زیادہ حساس ہے۔برائے کرم ایسی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ نظر بہتر بھی ہوجائے۔شکریہ۔

جواب: بچی کو صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے باغ کی سیر کرائیں۔نہار منہ سونف، مصری، بادام سب کو ہم وزن لے کر پیس کر رکھ لیں اور روزانہ ایک کھانے کا چمچہ کھلا کر دودھ ایک پیالی پلا دیں۔گاجر کا استعمال خوب کرائیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی درج ذیل ادویات تین ماہ تک استعمال کرائیں۔ Physostigma 30,Calc Phos 30, Calc.Flour 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کرائیں۔

نسوانی بیماریاں

روحانہ الماس......راولپنڈی

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ چہرے پر دانے اور داغ دھبے ہیں، میری... پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ دیر بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہوجاتی ہے۔معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔خون کی کمی اور کیلشیم کی بھی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، وغیرہ کی رپورٹس بھجوا رہی ہوں۔کوئی کریم یا میڈیسن بتادیں۔چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کردیں۔آپ کی بہت نوازش ہوگی۔



جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیو پیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ہاں صحت کے اصولوں کی پابندی یقیناً صحت اور حصولِ صحت کے لیے شرط ہے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔لال گوشت (بکرا، گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، آم، چیری، فالسہ، آلو بخارا سیب، انار سنگترہ وغیرہ کا بھرپور استعمال کریں۔صبح سویرے اٹھیں۔نمازوں کی پابندی کریں۔کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں چہل قدمی کریں۔پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔کم از کم 12 گلاس روزانہ پئیں۔کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔البتہ ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے جوس مفید ہیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. sulph-30، Ferrum met 30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔جبکہ Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ Asa foetida Petarka Ptk 12,Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے دس قطرے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ پئیں۔دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

سفید بال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80% بال سفید ہوچکے ہیں۔بال بھی گرتے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے ہوجائیں اور گرنا بھی

رک جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ پھلوں، سبزیوں اور گوشت کا استعمال بڑھائیں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی مندرجہ ذیل ادویات Cantharis 30 ،Lycopodium-30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

ناک کا گوشت

کامران ندیم......بوہڑے والا

مسئلہ نمبر ا تقریباً 10 سال کی عمر میں میری ناک میں بائیں جانب غدود ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا میرے سر میں درد رہنے لگا۔ دوسرا مسئلہ تقریباً ۴ سال سے گرمیوں میں میرے پورے منہ میں چھالے ہو جاتے ہیں اور شدید درد ہوتا ہے۔ دوائی کھاتا رہوں تو ٹھیک رہتے ہیں۔ دوائی چھوڑ دوں تو پھر چھالے بن جاتے ہیں۔ اور تین چار سال سے سینے میں بھی درد رہتا ہے۔ .E.C.G کرائی تو ڈاکٹر نے کہا کہ گیس کا درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ 24 گھنٹے ہلکا، ہلکا سر درد رہتا ہے۔ سر درد کے لیے پیناڈول ایکسٹرا کی گولی کھاؤں تو کچھ دیر کے لیے آرام ہو جاتا ہے۔ جب تیز ہوا چلتی ہے تو سانس بھی رک جاتی ہے۔ عرصہ تقریباً دو تین سال سے دائیں ٹانگ میں گھٹنے سے لے کر پیر کے اوپر تک درد ہوتا ہے۔

جواب۔ آپ نفسیاتی ہوتے جا رہے ہیں۔ نزلے کا مسئلہ ہے، ٹھنڈی، کھٹی چیزیں، شربت، کولڈ ڈرنکس وغیرہ سے بچیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی 2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ چبا کر کھائیں Cinnabaris Pantarkan Ptk-31، 10 قطرے آدھے کپ سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں Spigelia Pantarkan- Ptk-81 کے۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

جوڑوں کا درد

سلطانہ بیگم......راولپنڈی

ڈھیر ساری دعاؤں کے بعد عرض ہے کہ 40 سال ہو گئے ہیں میرے جوڑوں میں درد ہوتا ہے جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہونے لگی ہیں ......اب تو مکمل ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں سے میں کوئی کام بھی نہیں کر سکتی۔ بوڑھی ہو گئی ہوں مگر کتابیں پڑھنے کا ابھی بھی بہت شوق ہے۔ بچپن سے رسالے پڑھنے کا شوق ہے۔ میری نظر بھی کمزور ہے۔ ایک آنکھ کا آپریشن کروایا ہے دوسری آنکھ کا ابھی کرانا ہے۔ سالوں سے یہ حالت ہے کہ کچھ دور تک چلتی تھی تو تھک جاتی تھی، کسی اونچی جگہ پر بیٹھ جاتی تھی، نیچے بھی نہیں بیٹھ سکتی کہ گھٹنے ٹیڑھے نہیں کر سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ نچلے دھڑنے.... کام کرنا چھوڑ دیا۔

جواب۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhus toxicodendron Ptk-73 15 قطرے ہر 3 گھنٹے بعد لیں، Calc.Carb-30، .Kali Phos-30 کے 7.7 قطرے دن میں 4 مرتبہ لیں، تین ماہ بعد طبیعت سے دوبارہ مطلع کریں۔

☆☆☆